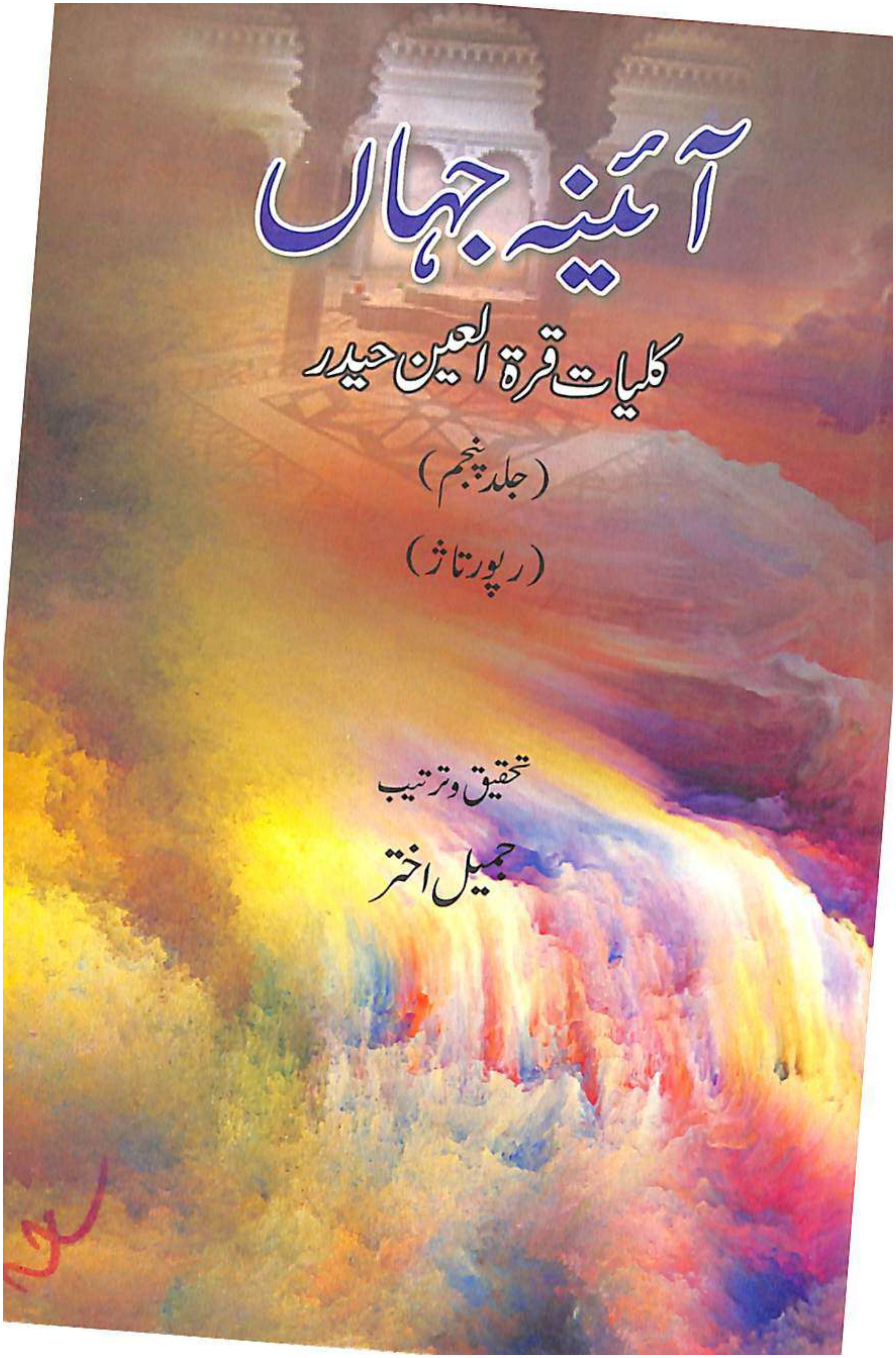
آئینہ جہاں
کلیاتِ قرۃ العین حیدر
(جلد پنجم)
(رپورتاژ)
تحقیق و ترتیب
جمیل اختر

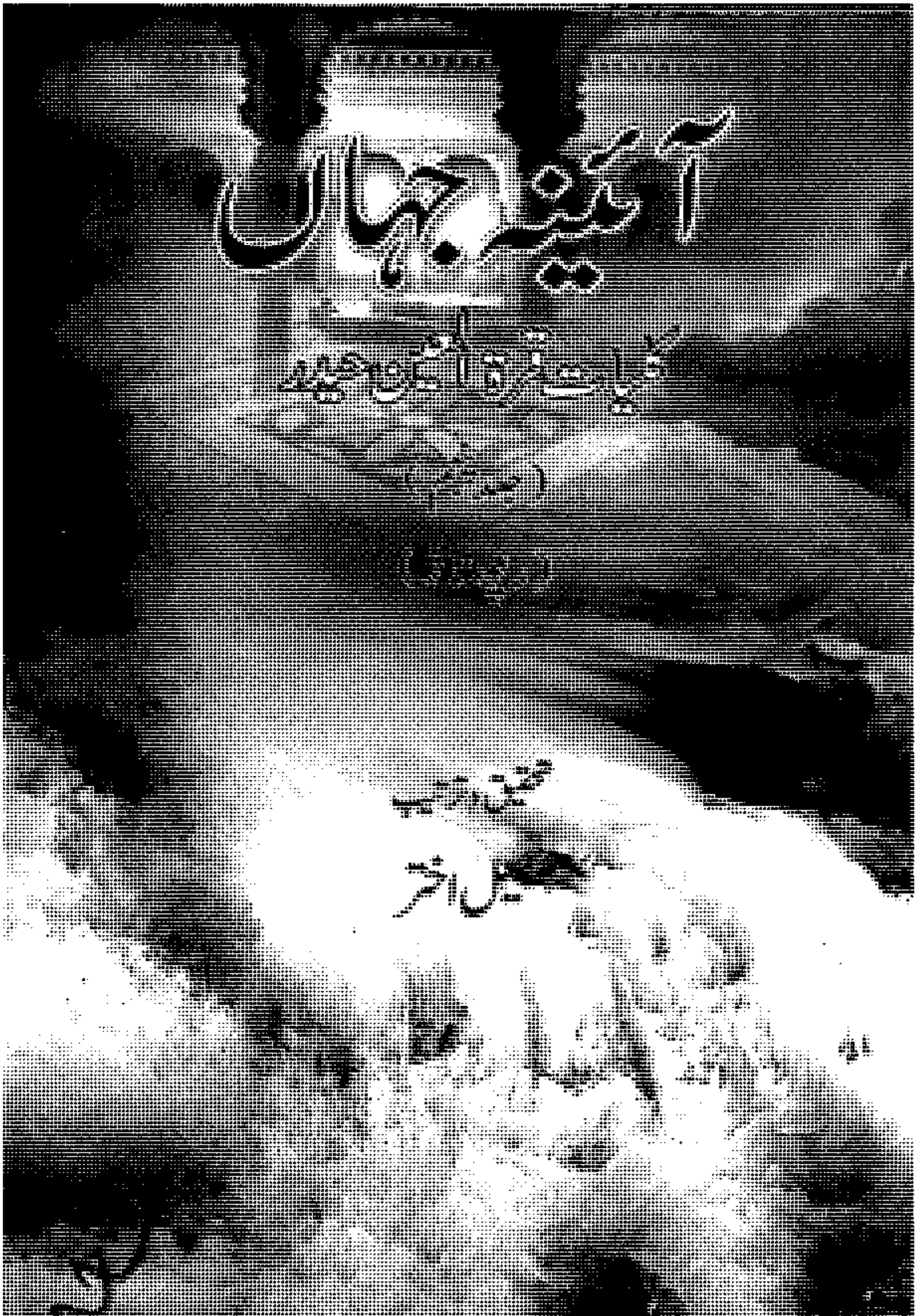
آئینۂ جہاں
کلیاتِ قرۃ العین حیدر
تحقیق و ترتیب
جمیل اختر

آئینۂ جہاں

کلیات قرۃ العین حیدر

(رپورتاژ)

(جلد پنجم)

تحقیق و ترتیب

جمیل اختر

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

فروغ اردو بھون ایف سی، 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولا، نئی دہلی۔110025

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

پہلی اشاعت	:	2016
تعداد	:	550
قیمت	:	-/182 روپے
سلسلۂ مطبوعات	:	1889

Aaina-e-Jahan

Kulliyat-e- Quratulain Haidar Vol. 5

By: Jameel Akhtar

ISBN :978-93-5160-123-4

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا،
جسولہ، نئی دہلی 110025، فون نمبر: 49539000، فیکس: 49539099
شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک۔8، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔ 110066 فون نمبر: 26109746
فیکس: 26108159 ای۔میل: ncpulsaleunit@gmail.com
ای۔میل urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in
طابع: جے۔ کے۔ آفسیٹ پرنٹرز، بازار مٹیا محل، جامع مسجد، دہلی۔ 110006
اس کتاب کی چھپائی میں 70GSM, TNPL Maplitho کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

پیش لفظ

انسان اور حیوان میں بنیادی فرق نطق اور شعور کا ہے۔ ان دو خداداد صلاحیتوں نے انسان کو نہ صرف اشرف المخلوقات کا درجہ دیا بلکہ اسے کائنات کے ان اسرار و رموز سے بھی آشنا کیا جو اسے ذہنی اور روحانی ترقی کی معراج تک لے جا سکتے تھے۔ حیات و کائنات کے مخفی عوامل سے آگہی کا نام ہی علم ہے۔ علم کی دو اساسی شاخیں ہیں باطنی علوم اور ظاہری علوم۔ باطنی علوم کا تعلق انسان کی داخلی دنیا اور اس دنیا کی تہذیب و تطہیر سے رہا ہے۔ مقدس پیغمبروں کے علاوہ، خدا رسیدہ بزرگوں، سچے صوفیوں اور سنتوں اور فکر رسا رکھنے والے شاعروں نے انسان کے باطن کو سنوارنے اور نکھارنے کے لیے جو کوششیں کی ہیں وہ سب اسی سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں۔ ظاہری علوم کا تعلق انسان کی خارجی دنیا اور اس کی تشکیل و تعمیر سے ہے۔ تاریخ اور فلسفہ، سیاست اور اقتصاد، سماج اور سائنس وغیرہ علم کے ایسے ہی شعبے ہیں۔ علوم داخلی ہوں یا خارجی ان کے تحفظ و ترویج میں بنیادی کردار لفظ نے ادا کیا ہے۔ بولا ہوا لفظ ہو یا لکھا ہوا لفظ، ایک نسل سے دوسری نسل تک علم کی منتقلی کا سب سے موثر وسیلہ رہا ہے۔ لکھے ہوئے لفظ کی عمر بولے ہوئے لفظ سے زیادہ ہوتی ہے۔ اسی لیے انسان نے تحریر کا فن ایجاد کیا اور جب آگے چل کر چھپائی کا فن ایجاد ہوا تو لفظ کی زندگی اور اس کے حلقۂ اثر میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔

کتابیں لفظوں کا ذخیرہ ہیں اور اسی نسبت سے مختلف علوم و فنون کا سرچشمہ۔ قومی کونسل

برائے فروغ اردو زبان کا بنیادی مقصد اردو میں اچھی کتابیں طبع کرنا اور انھیں کم سے کم قیمت پر علم و ادب کے شائقین تک پہنچانا ہے۔ اردو پورے ملک میں سمجھی جانے والی، بولی جانے والی اور پڑھی جانے والی زبان ہے بلکہ اس کے سمجھنے، بولنے اور پڑھنے والے اب ساری دنیا میں پھیل گئے ہیں۔ کونسل کی کوشش ہے کہ عوام اور خواص میں یکساں مقبول اس ہر دلعزیز زبان میں اچھی نصابی اور غیر نصابی کتابیں تیار کرائی جائیں اور انھیں بہتر سے بہتر انداز میں شائع کیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے کونسل نے مختلف النوع موضوعات پر طبع زاد کتابوں کے ساتھ ساتھ تنقیدیں اور دوسری زبانوں کی معیاری کتابوں کے تراجم کی اشاعت پر بھی پوری توجہ صرف کی ہے۔

یہ امر ہمارے لیے موجب اطمینان ہے کہ ترقی اردو بیورو نے اور اپنی تشکیل کے بعد قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے مختلف علوم و فنون کی جو کتابیں شائع کی ہیں، اردو قارئین نے ان کی بھرپور پذیرائی کی ہے۔ کونسل نے ایک مرتب پروگرام کے تحت بنیادی اہمیت کی کتابیں چھاپنے کا سلسلہ شروع کیا ہے، یہ کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو امید ہے کہ ایک اہم علمی ضرورت کو پورا کرے گی۔

اہل علم سے میں یہ گزارش بھی کروں گا کہ اگر کتاب میں انھیں کوئی بات نادرست نظر آئے تو ہمیں لکھیں تاکہ جو خامی رہ گئی ہو وہ اگلی اشاعت میں دور کر دی جائے۔

پروفیسر سید علی کریم
(ارتضیٰ کریم)
ڈائریکٹر

فہرست

●	دیباچہ	قرۃ العین حیدر	vii
●	مقدمہ		ix
1.	لندن لیٹر		1
2.	ستمبر کا چاند		27
3.	پدما ندی کنارے		163
4.	چھٹے اسیر تو بدلا ہوا زمانہ تھا		203
5.	در چمن ہر ورقی دفتر حالِ دگر است		235
6.	گلگشت		325

دیباچہ

رپورتاژ اور سیدھے سادے سفرنامے میں محض اندازِ بیان کا فرق ہے۔ رپورتاژ افسانے کی زبان میں لکھا جاتا ہے، اس میں زیبِ داستاں بھی اسی حد تک ہوتی ہے کہ اس سے حقائق کی پردہ پوشی نہ ہو یا واقعات کو غلط رنگ میں نہ پیش کیا جائے۔ مثال کے طور پر افسانے اور حقیقت کا امتزاج ہمیں یلدرؔم کے مضمون ''سفرِ بغداد'' میں ملتا ہے جو 1904 میں لکھا گیا اور جسے اُردو کا پہلا رپورتاژ کہا جاتا ہے۔ اس روداد میں بغداد جانے والے راوی کو راستے میں سند باد جہازی ملتے ہیں جو حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ کرنے کے بعد عالمِ اسلام کی ابتر حالت پر آنسو بہاتے ہوئے اچانک غائب ہو جاتے ہیں۔

راقم الحروف کا پہلا رپورتاژ ''لندن لیٹر'' 1953 میں لکھا گیا تھا اور اسی زمانے میں ''نقوش'' لاہور میں شائع ہوا۔ اس میں مَیں نے ذکر کیا تھا کہ میں فیروز جبیں اور چند اور دوست فرانسیسی فلم ''لا رونڈ'' دیکھ کر پیکیڈلی کے سینما ہاؤس سے باہر نکل رہے تھے تو ایک اپاہج گورے نے بھیک مانگی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ ''تمھارے بازو کیا ہوئے؟'' مسکرا کر بولا ''میں ڈنکرک فتح کرنے گیا تھا۔'' اب اس جملے میں اس دور کی پوری تصویر سامنے آجاتی ہے جبکہ دوسری جنگِ

عظیم کو ختم ہوئے ابھی صرف چھ سال ہوئے تھے۔ اس کے بعد میں نے مختلف ملکوں کے متعدد رپورتاژ قلم بند کیے پھر جی بھر گیا، سیاحت نامے کوئی کہاں تک لکھے۔ امریکہ کے متعلق میرا رپورتاژ بعنوان ''جہانِ دیگر'' ہفتہ وار اُردو بلٹز بمبئی میں بالاقساط شائع ہوتا رہا۔ اس کے بعد بھی میں امریکہ وغیرہ گئی اور برطانیہ تو تقریباً ہر دوسرے تیسرے سال جاتی ہوں اور خیال آتا ہے کہ اتنے طویل عرصے میں جس طرح مغرب کا رنگ بدلا ہے اس کے بارے میں بھی لکھوں۔ پتہ نہیں یہ ارادہ کب پورا ہوگا۔ چلیے فی الحال اتنا ہی کافی ہے۔

قرۃ العین حیدر

نوئیڈا

15 نومبر 1998

مقدمہ

قرۃ العین حیدر کی کلیات سازی کا کام میں نے ان کی اجازت سے ان کی حیات میں ہی شروع کر دیا تھا۔ افسانوں اور ناولٹ پر مشتمل تین جلدیں اور ایک نیا افسانوی مجموعہ 'قندیل چین' ان کی حیات میں ہی شایع ہو چکا تھا لیکن عینی آپا اس کی خوشی نہ دیکھ سکیں کتاب شایع ہونے کے فوراً بعد خرابیِ صحت کی وجہ سے داخلِ اسپتال ہوئیں اور پھر جاں بر نہ ہو سکیں اور اس دارِ فانی سے کوچ کر گئیں۔ ان کے انتقال کے بعد بھی میں اپنے کام سے کبھی غافل نہیں رہا۔ بلکہ اپنے محدود وسائل میں رہ کر کام کرتا رہا۔ اس لیے کہ کوئی ادارہ پروجیکٹ مکمل ہونے پر کتاب تو شایع کر دیتا ہے لیکن بنیادی مآخذ کی تلاش و جستجو کے لیے جو اصراف خطیر ہوتا ہے اس کا بار اٹھانے کو تیار نہیں ہوتا۔ یہ اردو ادب کی افسوس ناک صورت حال ہے۔ ایسی صورت میں کسی فرد واحد کے محدود وسائل سے کوئی بڑی امید کرنا بعض وقت مایوسی کا سبب ہوتا ہے لیکن کبھی کبھی فرد واحد انجمن اور ادارے سے بڑھ کر ثابت ہوتا ہے اور اس کا یہی نادر کارنامہ فرد کی انفرادیت کو ادب کے افق پر اجاگر کر کے اس کی الگ شناخت کا باعث ہوتا ہے اور ادبی تاریخ ایسے منفرد جیالوں سے جگمگا رہی ہے۔ ورنہ اردو ادب کی دگرگوں صورت حال میں اس کی ساری وراثت تہہ و بالا ہو جاتی اور سارا

سرمایہ تہہ تیغ ہو جاتا۔ لیکن ادبی ذوق وشوق رکھنے والے افراد نے بے سروسامانی کے عالم میں ایسے محیر العقول کارنامے انجام دیے جس کی نظیر کسی اور زبان کے ادب میں مشکل ہی سے ملے گی۔ بار بار مغرب کا حوالہ دینے اور مغرب کی نقالی سے اردو ادب کی اصناف کو مالا مال کرنے والوں نے مغرب کی طرز فکر اور ان کے طرز عمل کو تحقیق وتنقید کے لیے معیار کیوں نہیں بنایا جس سے اردو ادب کی پس ماندگی کو دور کیا جا سکتا اور اعلیٰ ادب اور اعلیٰ تحقیق وتنقید کے لیے فضا سازگار ہوتی۔ گفت وشنید کی حد سے آگے، عملی طور پر یہ معاملہ کبھی جا بھی سکے گا؟ شاید کبھی ایسا ہوا تو وہ اردو ادب کی خوش حالی کا دن ہوگا۔

قرۃ العین حیدر کی وفات کے بعد ان کی کلیات کو مکمل کرنے کا کام چیلنج سے بھرا ہوا ہے۔ عمر بھر اپنی اور ہندستانی وراثت کے بکھرے ہوئے باب کو مجتمع کرنے والی خاتون کی اپنی وراثت کی محافظت خطرے میں ہے۔ اس بے بسی پر ادب کی رکھوالی کرنے والے ادارے و افراد کیا اپنی آنکھیں خشک کر لیں گے۔ چھوڑی ہوئی دولت پر دعویٰ کرنے والے تو پچاسوں رشتہ دار جس کے نہیں بھی ہوں تو بھی نکل آتے ہیں، لیکن ادبی وراثت کو سنبھالنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ حتیٰ کہ اس کی اولاد بھی۔ میں نے یہ صورت حال اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے۔ قرۃ العین حیدر جن کے رشتے دار دنیا کے کئی براعظموں میں پھیلے ہوئے ہیں اور قرۃ العین حیدر کا ادبی سرمایہ بھی دنیا کے کئی ملکوں میں پھیلا ہوا ہے، ہندستان اور پاکستان کی حد تک تو میں جانتا ہوں کہ کسی رشتہ دار میں یہ صلاحیت نہیں ہے کہ وہ اس عظیم کام کو منصوبہ بند طریقے سے کر سکے۔ ہاں دنیاوی دولت پر قبضہ ان کی زندگی میں ہی ان کی خدمت کرنے والوں نے کرنا شروع کر دیا تھا۔ اور ان کے مرنے کے بعد وہ تاریخی مکان جس میں مصنفہ نے آخری سانس لی تھی اور جسے انھوں نے اپنے پیسوں سے خریدا تھا، اسے فوراً ہی بیچ ڈالا۔ اس حادثے پر جتنا بھی غم کریں کم ہے۔ انگلستان میں ادیبوں کے محفوظ مکان کا معائنہ کرنے والی خاتون کی اپنی ذاتی وراثت اتنی جلد بے نام ونمود ہو جائے گی، ایسا انھوں نے کبھی سوچا بھی نہیں ہوگا۔ آج ان کی روح اس واقعہ پر سخت تکلیف محسوس کر رہی ہوگی کہ جس بات کے لیے میں زندگی بھر لڑتی رہی، احتجاج کرتی رہی،

آج وہی بات، وہی حادثہ، تاریخ کی وہی المنا کی میرے ہی ساتھ پیش آئی۔ عبرت ناک... عبرت ناک... سروم دھم دھم...

لوٹ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو

قرۃالعین حیدر اپنے ایک مضمون میں رقمطراز ہیں:

''بانو کے مکان کی تاریخی اہمیت کا مجھ کو بے حد احساس تھا۔ گزشتہ ادوار میں اسی مکان کے آس پاس ان زمانوں کے نامور شعراء کے مکانات بھی موجود تھے۔ وہ کیسا پُرفسوں زمانہ رہا ہوگا۔ انگلستان، فرانس، جرمنی اور روس کے اہلِ نظر نے اپنے عہدِ رفتہ کے مشاہیر کے مکانات کو اسی طرح سجا بنا کے رکھا ہے اور میں یہ رونا ہمیشہ روتی رہتی ہوں کہ مرزا غالب کے مکان میں کوئلے کی دکان کھل گئی۔''

اسی مضمون میں آگے چل کر اس موضوع پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے لکھتی ہیں:

''راجستھان کے دور اندیش چھوٹے بڑے راجاؤں نے اپنے محلات اور حویلیاں ٹورسٹ انڈسٹری میں شامل کر دی ہیں لیکن لکھنؤ کا قدیم تعمیراتی سرمایہ غائب ہوتا جا رہا ہے۔ میں پہلے بھی یہ نوحہ گری کر چکی ہوں کہ علی گڑھ کے وہ پھوس والے بنگلے جو جان کمپنی نے بنوائے تھے اور انگریزی سرکار نے کالج کے لیے سرسید کی نذر کر دیے تھے، ان کے موجودہ وارثوں کے خاندانی جھگڑوں کی وجہ سے ان کو نذرِ آتش کر دیا۔

لندن کے ایک میوزیم میں ایک بہت بڑا کمرہ ستر ہویں صدی کے ساز و سامان سے اس طرح سجایا گیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے مکین ابھی ابھی اٹھ کر باہر گئے ہیں۔ یہ کمرا نشیب میں ہے اور اس پر چھت سے ذرا نیچے چاروں طرف گیلری ہے۔ تماشائی اس گیلری میں کھڑے ہو کر نیچے اس کمرے کی ایک ایک چیز کو بغور دیکھ سکتے ہیں۔

اسی طرح میں نے امریکہ کے ایک عجائب خانے میں گزشتہ کسی صدی کا کمرہ ایسا پایا جس میں ایک متوسط الحال خاندان کا Living Room کے طور پر سجایا گیا تھا جس میں آتش دان کے پاس دادی اماں کی

آرام کرسی اور اس کے برابر میز پر ان کی عینک اور سینے پرونے کی ٹوکری
بھی موجود تھی۔ انگلستان اور یورپ میں گزشتہ صدیوں کے شاعروں اور
ادیبوں کے مکان ان ہی کے ذاتی سامان یا اس کی ہو بہو نقل سے آراستہ
کیے گئے ہیں۔ میں یہ بھی لکھ چکی ہوں کہ روس میں پشکن کے گھوڑے کی
ایال کو جس چوبی کنگھے سے سنوارا جاتا تھا وہ کنگھا بھی محفوظ ہے۔ جس
زمانے میں ہمارے ترقی پسندوں نے ہر پرانی چیز کو منسوب کیا، اس وقت
تک شاید ان میں سے کوئی بندہ روس نہیں گیا تھا۔

چنانچہ عزیز بانو کا مکان بھی لکھنؤ کے چند اور مکانات کی طرح
National Heritage میں شامل کرنا چاہیے تھا۔ میں تو ان کو ضرور یہ
رائے دیتی مگر وہ خود ہی غائب ہوگئیں۔"

قرۃ العین حیدر کا مکان بھی نیشنل ہیریٹج میں شامل ہونا چاہیے تھا لیکن ایسا نہیں ہو سکا۔
تاریخ کی یہ دردناکی شاید انسان کا مقدر ہے۔ تاریخ کے بہاؤ اور وقت کی جبریت کا قہر جب
سونامی کی صورت میں نازل ہوتا ہے تو سب کچھ تاخت و تاراج کر دیتا ہے اور انسان محض ایک
بے بس تماشائی کی طرح حیرت و استعجاب سے آنکھیں پھاڑے سب کچھ دیکھتا رہتا ہے۔ کبھی تو
اس عبرت ناک منظر پر چند آنسو نکل بھی آتے ہیں اور کبھی استعجابی شدت سے آنسو خشک ہو
جاتے ہیں۔ تاریخ کی اس بے بسی اور دردناکی کی گہرائیوں میں بار بار ڈوب کر حقیقت کا
ادراک کرانے والی خاتون کو کیا پتہ تھا کہ صدیوں سے دہرائی جانے والی اس کہانی کا انجام اتنا
دردناک ہوگا۔

لے گئے تثلیث کے فرزند میراث خلیل

آج قرۃ العین حیدر کی برسی پر چراغاں کرنے والے بھی نہیں رہے۔ عقیدت کے دو
پھول چڑھانا تو دور کی بات ہے۔

مونس ہے بعد مرگ کسی کا جہاں میں کون
دو پھول بھی لحد پہ کوئی دھر نہ جائے گا

کیا قبرستان کا یہ سناٹا کبھی ادبی سرگوشیوں میں تبدیل ہو کر انھیں خراج عقیدت پیش کر سکے گا۔

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد
روئے گل سیر نہ دیدم کہ بہار آخر شد

اردو ادب کی جلیل القدر اور عظیم المرتبت مصنفہ لحد میں ضرور خوابیدہ ہے لیکن ان کے چاہنے والے انھیں اتنی جلد فراموش کر دیں گے، اس کا گمان بھی نہ تھا۔ لیکن حقیقت اور سچائی بڑی جابر چیز ہے۔ جب سامنے آتی ہے تو بھرم تار تار کر دیتی ہے۔ آج وہ بھرم تار تار ہو گیا جو داستان طراز تھی۔ وہ خود داستانِ عہد گل ہو گئی۔ تاریخی بصیرت کا رفیع الشان احساس دلانے والی تخلیقی ہستی کا اس طرح ناپید ہونا دوسروں کے لیے زبردست عبرت کا مقام ہے۔ کیا وقت اس حیرت و استعجاب کو کم کر سکے گا؟ ہمیں اس لمحے کا انتظار رہے گا۔

آج قرۃ العین حیدر دانش گاہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اس تاریخی قبرستان میں جہاں انھوں نے علم و ادب کی عظیم المرتبت ہستیوں، دانشورانِ ملت اور بانیانِ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے درمیان پناہ لی ہے، سے باہم مشاورت ضرور کر رہی ہوں گی کہ آخر یہ ستم ظریفی ہماری قوم میں ہی کیوں ہے۔ تاریخی حامل کی عظیم المرتبت ہستیوں کے درمیان رہ کر بھی اس قدر بے بسی کا احساس کیوں ہو رہا ہے۔ یہ قوم اپنے لعل و گہر کی عظمت کو کب پہچانے گی؟ کب انھیں عزت و توقیر ملے گی؟ میں تو یہاں اس لیے آئی تھی کہ ان لوگوں کے درمیان میں کبھی فراموش نہیں کی جاؤں گی۔ میں نے اپنا سارا ادبی سرمایہ اس دانش گاہ کو اس لیے بخش دیا تھا کہ کم از کم ہر برس یہ لوگ میری لحد پر عقیدت کے دو پھول ہی ڈال کر میری عزت افزائی کریں گے۔ لیکن یہ تو میرا میوزیم (آرکائیو) بنا کر بیٹھ گئے۔ میرے نام کا گیٹ بھی وہاں بنایا جہاں علم و ادب کی ہستیوں کا گزر ہی نہ ہو۔ بھلا اسٹیڈیم سے متصل گیٹ سے میرے نام کی کیا نسبت؟ دانش گاہ کا مین گیٹ جہاں غالب غزل سرا ہیں اگر میرے نام کا ہوتا تو شاید کچھ مناسبت بھی معلومات ہوتی کہ میں وہاں سے شعبۂ اردو پر بھی نظر رکھ سکتی اور وہاں کی ادبی سرگرمیوں پر بھی، پھر تو میری روح بھی خوش ہوتی اور میری ہستی کا وجود اس

طرح ریزہ ریزہ نہیں ہوتا۔

تاریخی بصیرت کی حامل ہستیوں کا یہ حشر عبرت ناک ہے۔ غالب کی حویلی کی باریابی کے لیے صدیوں تک تحریک چلی پھر حکومت نے موقع پرستی کی سیاست سے فائدہ اٹھانے کے لیے واگذاری کی بھی، وہاں تو معاملہ غاصبانہ قبضے کا تھا اس لیے واگذاری ہوگئی۔ یہاں تو مکان فروخت کر دیا گیا ہے جس کی واگذاری ممکن ہی نہیں۔ تاریخ کی بوالعجیاں بھی عجیب و غریب ہیں۔ عظمت رفتہ پر تاسف کرنے اور آنسو بہانے والی ادیبہ ڈھائی ہزار سالہ ہندستانی تاریخ کے وقوع کو کھنگالنے کے بعد کف افسوس ملنے کے سوا کچھ ہاتھ نہ لگا تو میرا ماضی، میرا عظیم الشان ماضی، میری عظیم الشان روایات کی یاد کر کے اس پر آنسو بہا کر دل کو مطمئن کر لیا۔ یہاں تو ماضی کی عظیم الشان روایات سے حال کا عظیم الشان رشتہ باقی رکھا جا سکتا تھا۔ لیکن زر پرستی کی حوس میں، ہندستانی تہذیب وثقافت کی بقا و تحفظ کے لیے اپنی ساری زندگی وقف کر دینے کے صلے میں انھیں انعام بھی کیا دیا کسی دوسرے نے نہیں خود ان کے اپنوں نے جو ان کے جذبات اور ان کی عظیم الشان تخلیقی وراثت کی قدر و قیمت کو پہچان نہ سکے جو کل تک ہماری عظمتوں کی پہچان تھے اور جس پر انعام و اکرام کی بارش ہو رہی تھی اور آج خود ان کے اپنوں نے ان کی وراثت کی پامالی کر کے ان کی عظمتوں کو داغ دار کر دیا ہے۔ اب تو لعنتوں کی بارش ہوگی، مگر کس پر۔ یہ وہ مقام عبرت ہے جس سے ہر کسی کو سبق لینا چاہیے۔

قرۃ العین حیدر پر میں جب بھی قلم اٹھاتا ہوں تو زندگی کے ان کے مشن کے تحت میں بے حد جذباتی ہو جاتا ہوں۔ اور میں قطعاً یہ پسند نہیں کرتا کہ کسی کی عظمت کو خواہ اس کا اپنا ہی کیوں نہ ہو داغ دار کرے۔ دنیا ان کو عزت کے منڈولے میں بٹھانا چاہتی ہے اور اپنے ہیں کہ قدر کرنا ہی نہیں جانتے۔ ہاں تو بات کلیات سازی کی چل رہی تھی اور موضوع بہک کر کہاں سے کہاں چلا گیا۔ سوال وراثت کی حفاظت کا تھا۔ میں نے اپنے ناتواں کندھوں پر اس بارگراں کو اٹھا تو لیا ہے لیکن کیا وسائل کے بغیر کئی ملکوں میں بکھری ان کی تحریری وراثت کو مکمل طور پر سمیٹنا ممکن بھی ہو سکے گا۔ میرے خیال میں اس کا سیدھا سچا جواب نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی میں یہ

کوشش کیوں کر رہا ہوں۔ صرف اس لیے کہ زندگی میں کسی پر اتنا اعتماد آپا نے نہیں کیا جتنا مجھ پر کیا۔ یہی وجہ ہے کہ کلیات کی تدوین جیسے مشکل کام کے لیے خود سے میرا انتخاب کیا اور میں نے ان کی زندگی میں اس اعتماد کو وقار بھی عطا کیا۔ اور کلیات کی تین جلدیں سجا سنوار کے انھیں پیش بھی کر دیں۔ اب سوال آگے کا ہے۔ مجھے اکثر ایسا لگتا ہے کہ وہ مختلف صورتوں میں اپنی تحریروں میں جلوہ گر ہو کر مجھ سے سوال کرتی ہیں کہ باقی بچا کام کب ہوگا؟ بس یہی بات مجھے کچوکے لگاتی ہے۔ میں نے آپا سے وعدہ کر لیا ہے کہ مجھ سے جہاں تک بن پڑے گا میں اس کام کو ضرور انجام دوں گا۔

ان کے انتقال کو آٹھ سال بیت گئے۔ اس بیچ میں تنکا تنکا جمع کرتا رہا۔ اب جا کر اتنا کچھ جمع ہو سکا کہ آپا کو خراج عقیدت کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ شاید میری یہ کاوش علم وادب کے قدر دانوں میں ان کا اعتماد مضبوط کر سکے گی۔ یہ کوشش فرد واحد کی ضرور ہے لیکن یہ کام انسان کو ایک انجمن، ایک ادارہ بنا دیتا ہے۔ خدا کرے میری یہ سعی جمیلہ انھیں شہرت دوام عطا کر سکے اور علم وادب کے سرمایۂ افتخار میں بیش قیمت اضافہ ثابت ہو۔

کلیات کی پہلی چار جلدیں افسانے، ناولٹ اور ایک نیا افسانوی مجموعہ قندیل چین پر محیط ہیں۔ اب کلیات کی پانچویں جلد سے تقسیم کچھ اس طرح ہے۔

Vol. - 5 : رپورتاژ	Vol. - 9 : خاکے
Vol. - 6 : رپورتاژ	Vol. - 10 : انٹرویوز
Vol. - 7 : مضامین	Vol. - 11 : انٹرویوز
Vol. - 8 : مضامین	

اس کے علاوہ ان کے تراجم، بچوں کی کہانیاں، صحافتی مضامین، فلم ریویو، کتابوں پر تبصرے، خطوط اور دیگر دوسری چیزیں۔ یہ سب قصہ اگلے پڑاؤ کا ہے۔ سلسلہ تلاش وجستجو جاری ہے۔ تحقیق اپنی منزل طے کر رہی ہے۔ فی الوقت درج بالا سات جلدیں پیش خدمت ہیں۔

پانچویں اور چھٹی جلد میں قرۃ العین حیدر کے گیارہ رپورتاژ ہیں۔ اس کی ترتیب بھی

تقویت ہے۔ اردو میں اس صنف کو بھی اپنے منفرد انداز میں عظمتوں سے ہم کنار کرنے کا سہرا بالآخر قرۃ العین حیدر کے سر جاتا ہے۔ ان سے پہلے جو رپورتاژ لکھے گئے ان میں یہ خوبیاں نہیں ہیں۔ قرۃ العین حیدر نے جہاں کا بھی (ملک یا شہر) رپورتاژ لکھا ہے اس ملک کی تاریخ و تہذیب وتمدن کو بھرپور طریقے سے اجاگر کیا ہے۔ تاریخ وتہذیب کا یہ رچاؤ و بساؤ، تمدن کی یہ جلوہ سامانیاں اس دروبست کے ساتھ ان سے قبل کے لکھے ہوئے رپورتاژ میں نہیں پائے جاتے۔ انسانویت سچائی پر غالب نہیں آئی ہے۔ ان کی زبان تخلیقی ہے اس لیے اس میں تازگی اور شگفتگی کا احساس ہوتا ہے۔ رپورتاژ اور سیدھے سادھے سفرنامے کے بیچ جو معمولی سا فرق ہے اس فرق کو وہ اول تا آخر باقی رکھتی ہیں۔ ان دو جلدوں میں کل گیارہ رپورتاژ ہیں۔ دس تو پہلے مختلف صورتوں میں موجود تھے، گیارہواں گم تھا۔ یہ میری تحقیق ہے۔ یہ اضافہ اہم ہے۔ یہ رپورتاژ 'پدما ندی کنارے ہے' جو بنگلہ دیش کے بارے میں ہے۔ بقیہ رپورتاژ کی تفصیل درج ذیل ہے۔

(کون سا رپورتاژ کس ملک کے بارے میں ہے)

1. 'لندن لیٹر' میں لندن کا ذکر ہے۔
2. 'ستمبر کا چاند' میں سفر جاپان کے بارے میں ہے۔
3. 'پدما ندی کنارے' بنگلہ دیش کے بارے میں ہے
4. 'چھٹے اسیر تو بدلا ہوا زمانہ تھا' میں پورٹ بلیئر، جزائر انڈمان نکوبار کا ذکر ہے۔ پہلے یہ کالا پانی بھی کہلاتا تھا۔ اس زمانے میں عموماً آزادی کے متوالوں کو یہاں کی سیلولر جیل میں رکھا جاتا تھا اور عمر قید کی سزا کے لیے بھی یہیں بھیجا جاتا تھا۔
5. 'در چمن ہر ورقی دفتر حال دگر ست' میں مصر کے سفر کا حال بیان کیا ہے۔
6. 'گلگشت' میں سفر روس کا تذکرہ ہے۔

ان تمام رپورتاژ میں قرۃ العین حیدر کی انفرادیت دوسری اور صنفوں کی طرح نمایاں ہے۔ انھوں نے رپورتاژ نگاری کے فن اور اصول وضوابط پر بحث کرتے ہوئے رپورتاژ نگاری

کی تعریف وضع کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔اور اردو میں رپورتاژ نگاری کے فن کو بھی نئی جہت عطا کی ہے۔ان کے تمام رپورتاژ الگ الگ تکنیک میں لکھے ہوئے ہیں اور اپنے ناولوں کی طرح وسیع کینوس کا احاطہ کرتے ہیں۔تاریخ وتہذیب اور ثقافت کو یہاں بھی وہی اہمیت دیتی ہیں جو انھوں نے اپنے ناولوں اور افسانوں میں دی ہے۔ ہر واقعہ ہر بات کو اس کے وسیع تناظر میں دیکھنا اور برتنا اور وہ بھی اس طرح کہ اصل مقصد مرکز میں رہے اور تحریر بوجھل نہ ہو، یہ ان کا وصف خاص ہے۔خوب صورت اور دل پذیر انداز بیان میں لکھی گئیں تحریریں دور بینی اور فکر انگیزی کی دعوت دیتی ہیں۔قرۃ العین حیدر کے یہ تمام رپورتاژ، رپورتاژ نگاری کے نئے اسٹائل سے اردو کے قاری کو متعارف کراتے ہیں۔ یہ تمام رپورتاژ مقلدین کے لیے چراغ راہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

قرۃ العین کی ان بکھری ہوئی تحریروں کو مجتمع کرنے میں بہت سے افراد اور اداروں نے میری معاونت کی ہے جن کا شکریہ ادا کرنا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ میں اپنے بڑے بھائی ڈاکٹر نجیب اختر، برادر عزیز کفیل اختر، ڈاکٹر ارشد رضا بھاگلپور، عزیزی جاوید اختر، بزرگ محترم مہر الٰہی ندیم صاحب، برادر مکرم ڈاکٹر عطا خورشید، پروفیسر شافع قدوائی، پروفیسر تحسین فراقی (لاہور)، ڈاکٹر آصف فرخی (کراچی)، صبا اکرام (کراچی)، علی حیدر ملک (کراچی)، پروفیسر مرزا حامد بیگ (لاہور)، پروفیسر غلام حسین ساجد (لاہور)، پروفیسر علی احمد فاطمی، چودھری ابن النصیر (ایڈیٹر 'پہچان')، شمع افروز زیدی (ایڈیٹر 'بیسویں صدی')، ڈاکٹر اطہر مسعود خاں (رام پور) کا جتنا بھی شکریہ ادا کروں کم ہے۔تحقیق کے مشکل مرحلے میں ان تمام لوگوں کا پرخلوص تعاون مجھے ملتا رہا ہے تبھی تنکا تنکا جمع ہو سکا، اور جو رہ گیا ہے وہ بھی انشاءاللہ حاصل ہو جائے گا۔

اداروں میں مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ، خدا بخش لائبریری پٹنہ، انصاری لائبریری جامعہ ملیہ اسلامیہ، قرۃ العین حیدر آرکائیو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے افراد کا بھی شکریہ لازم ہے جن کی پرخلوص معاونت نے تحقیق کے مرحلے کو آسان بنا دیا فرداً فرداً سب کا نام گنوانا ممکن نہیں۔لیکن

ان کے کرم خاص کا شکریہ ادا کرنا ضروری ہے۔

قومی اردو کونسل کا شکریہ بھی ضروری ہے اس لیے کہ ان کے تعاون کے بغیر کلیات کی طباعت کا خواب ادھورا رہتا۔ لہٰذا میں قومی کونسل کے تمام افراد کا جنھوں نے کلیات کی طباعت و اشاعت کے کسی بھی مرحلے میں مدد کی میں فرداً فرداً سبھوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اب آخری شکریہ نوجوان دوست تنویر احمد کا جن کی محنت شاقہ سے کلیات کمپوزنگ کے دشوار گزار مرحلے سے گزر کر مکمل ہوئی اور طباعت تک پہنچی۔

بیوی اور بچوں کا شکریہ کیا ادا کروں، ان کی حق تلفی کا مجھے شدید احساس ہے لیکن ملول خاطر نہیں ہوتے۔

جمیل اختر

موبائل:9818318512

ای میل:jameelakhtar786@yahoo.com

جنوری 2015

نئی دہلی

لندن لیٹر

معزز ناظرین! لندن لیٹر کی بہت سی اقسام ہیں۔ پہلی قسم وہ ہے جو ایک زمانے میں ہمارے ملک کے زنانہ رسالوں میں چھپا کرتی تھی۔ عزیزہ سعید بانو سلمہا اپنی باجی جان کو لکھتی تھیں۔ آپا بیگم میں خیریت سے ہوں بمبئی سے دُلہن بھابی نے جو آم کا اچار میرے ساتھ کر دیا تھا وہ ختم ہو گیا۔ یہاں ہندستانی دوکان میں مرچ اور مسالہ بہت مہنگا ملتا ہے۔ ایک شلنگ کی ایک پڑیا دھنیے کی سمجھ لیجیے۔ گرم پانی کے پائپ کے ذریعے میرا کمرہ گرم رہتا ہے۔ (پھر کچھ لینڈ لیڈی کا ذکرِ خیر ہوتا تھا) یہاں آپا جانی زمین دوز ریلیں چلتی ہیں (لندن ٹرانسپورٹ کا مُفصل بیان) میں نے کل یہاں پلاؤ تیار کیا جو بہت پسند کیا گیا۔ (ہندستانی اور انگریزی کھانوں کا موازنہ اور آپا بیگم کے لیے انگریزی کھانوں کی چند آسان ترکیبیں) آپ کا زُکام اب کیسا ہے؟ اگلے خط میں مَیں برائٹن اور بلیک پُول کا حال لکھوں گی۔ آپ کی پیاری دُور افتادہ بہن "سعیدہ"۔

جب پیاری سعیدہ بانو واپس جاتی تھیں تو دُور نزدیک سے رشتے دار عزیز دوست اور محلے والے ان سے ملنے کے لیے آتے تھے۔ وہ ایک خاص دیکھنے اور سننے کی چیز خیال کی جاتی تھیں اور اپنی باقی عمر وہ وطن کے کسی گم نام مدرسے میں ہیڈ مسٹرس یا پھر اسکول انسپکٹرس بن کر گذار

دیتی تھیں۔

حضرات! اب میں لندن لیٹر کی دُوسری اقسام کا بیان کروں گی۔ ایک آغا اشرف کا "بی بی سی سے آداب عرض" تھا کہ کس طرح انگریز نازی بمباری کا بہادری سے مقابلہ کر رہے ہیں اور فتح انشاءاللہ اتحادیوں کی ہوگی۔

اتحادیوں کی فتح کے بعد سے جو لندن لیٹر السٹریٹیڈ ویکلی آف انڈیا میں چھپتا ہے وہ اس طرح شروع ہوتا ہے۔ کل ہاؤس آف لارڈز میں جب بحث چلی اور جب فلاں ہائی کمشنر سے میں ملا اور دیگر یہ کہ میرے باغ میں کیسا خوب پھول رہا ہے اور فوڈ منسٹری نے انڈوں کا کوٹا بڑھا دیا ہے۔ آئندہ اگلے ہفتے۔

لندن لیٹر کی آخری قسم وہ ہے جبکہ "تماشائی" اور "آئینے" کا نامہ نگار خصوصی ان حسین و جمیل رسالوں کے کالموں میں یوں رقم طراز ہوتا ہے۔ "پچھلے اتوار کو میں نے بیگم فلاں کو لیڈی فلاں کی گارڈن پارٹی میں اس حسین نیلی ساری میں ملبوس دیکھا جو انھوں نے مجھے بتایا کہ جنیوا میں خریدی ہے۔ کمانڈر فلاں بھی پارٹی میں موجود تھے جنھیں میں نے بریگیڈیر فلاں کی دلکش بیوی کو ایک لطیفہ سناتے پایا۔ کمانڈر فلاں کل لاسکٹ میں بھی موجود تھے۔ انھوں نے بتایا کہ اتفاق سے ان کو برسلز کی ایک گم نام دکان میں ایک بہت ہی عمدہ کیمرہ دستیاب ہوگیا۔ صاحب فلاں نگر کی بے حد خوش پوش صاحبزادی ہیں، کمانڈر صاحب کے کیمرہ میں بہت دلچسپی کا اظہار کر رہی تھیں۔ اُن کو بھی فوٹو گرافی کا بہت شوق ہے اس مرتبہ ASCOT میں وغیرہ وغیرہ۔ اور یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ ہر مہینے یہی گوسپ ہوتی ہے یہی خبریں، یہی لوگ۔

ان بین الاقوامی طیارہ گاہوں، ان کلبوں اور ریس کورسوں کی رونق دیکھنے ہزاروں کی تعداد میں یہ لوگ روزانہ اِدھر اُدھر آ جا رہے ہیں۔ بغداد، بیروت، استنبول، روم، پیرس، جنیوا، نیویارک کیا گہما گہمی ہے۔ کیا کانفرنسیں اور گارڈن پارٹیاں ہیں، اللہ اکبر!

آیئے۔ کیوں نہ "لندن لیٹر" کے ایک اور نامہ نگار یعنی اس خاکسار کے ہمراہ اس منظر کو ذرا قریب سے دیکھئے۔

ملاحظہ فرمائیے۔ ہارون الرشید کا عراق جہاں چاروں طرف بے کراں ریگستان ہیں اور جھلسی ہوئی زندگی ہے۔ کہیں کوئی پائپ لائن دور سے نظر آ جاتی ہے یا کوئی بدو خچر پر بیٹھا سر جھکائے آہستہ آہستہ اپنی راہ چلا جاتا ہے یا کبھی ٹھٹھک کر آسمان کو دیکھ لیتا ہے جس پر اُڑن قلعے پرواز کر رہے ہیں۔ کیا وقت آن لگا ہے! کیا کبھی وہ سوچتا ہے کہ اس کے نگڑ داداؤں نے اسی ریگستان سے نکل کر بحر ظلمات میں کیا سرپٹ گھوڑے دوڑائے تھے؟ مشرق وسطیٰ کے شہروں میں اب آپ کو صرف اطلانٹک کے اس پار رہنے والے گھومتے نظر آئیں گے۔ بدو اسی طرح باہر راستے کے کنارے کنارے چلا جا رہا ہے۔

اس ریستوران میں ایک اور خاصا بین الاقوامی مجمع موجود ہے۔ دیواروں پر کوکا کولا کے اشتہار لگے ہیں، ایک آدھ عراقی ماڈرن موڈیل اونچی سینڈل پہنے سرعت سے گیلری میں سے نکل جاتی ہے۔ کس قدر گرمی ہے! اطلانٹک پار والے پسینہ پسینہ ہوئے جا رہے ہیں۔ یو این او نے اُنھیں یہاں عربوں کو تہذیب و تمدن سکھانے بھیجا ہے۔ یہ دور افتادہ قصبوں اور کچی مٹی کی بستیوں میں جا کر دوائیں تقسیم کرتے ہیں اور اپنے کیمروں سے تصویریں اُتارتے ہیں۔ صلیبی جنگوں کے زمانے سے مشرق وسطیٰ کی زمین نے ان سفید فام قوموں کے وجود کو اپنے اوپر اسی طرح صبر اور قناعت سے سہا ہے جو انگریز یا ڈچ یا فرانسیسی اس وقت جیپ پر جا رہا ہے جس کے پیچھے پیچھے عرب بدو کا اونٹ بھی ہے (تصویر اونٹ کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔ کیا رومانٹک پس منظر ہے) اس کے نگڑ دادا رچرڈ شیر دل کے ساتھ مسلمانوں کا قلع قمع کرنے آتے تھے۔ اب وہ انھیں تہذیب سکھانے آیا ہے۔ اگر یہ لوگ اڑ کر وہ صلیبی جنگیں نہ کرتے اور کبھی یورپ کا لوہا مان لیتے اور ساتھ ساتھ عیسائی بھی ہو جاتے تو انھیں کاہے کو یہ بُرے دن دیکھنے پڑتے۔ اب بہر حال یہ انڈر ڈیویلپڈ ممالک ہیں اور یہ عالمگیر ہمدردی اور بھائی چارے کا زمانہ ہے اور اس ایمرجنسی پیریڈ میں تثلیث اور توحید گویا خدا کے سارے ماننے والے ایک محاذ پر اکٹھے ہو رہے ہیں۔

توحید کا پجاری ایک عرب ریستوران کے ایک کونے میں بیٹھا کسی مصری رسالے کی ورق گردانی کر رہا ہے جس میں مووی ایکٹرسوں کی تصویریں ہیں (مصری فلم انڈسٹری نے اتنی

ترقی کر لی ہے۔ مادموزیل اُم ریحان اور شرلے ونٹرز میں ذرا بھی کوئی فرق معلوم نہیں ہوتا اور مادموزیل اُم ریحان۔ بلکہ اُن کے ساتھ خود ہماری نرگس اور ثریا اور مدھوبالا اپنے اسٹریم لائینڈ شام کے لباس میں سب ایک ساتھ آوا گارڈنز کے ساتھ فخر سے سر اونچا کر کے کھڑی ہو سکتی ہیں)

بہرکیف تو یہ بوڑھا عرب چپ چاپ بیٹھا رسالہ پڑھ رہا ہے۔ اس عرب کو دیکھ کر میرے دل میں محبت اور یگانگت کا جذبہ بے دار ہوتا ہے۔ یہ میرے رسول اللہؐ اور میرے ائمہ کی قوم کا ایک فرد ہے۔ وہ لوگ بھی اسی شکل و صورت کے رہے ہوں گے یہی لباس پہنتے ہوں گے۔ دریچے کے باہر فرات بہہ رہا ہے۔ جہاں پر میرے امامؑ مظلوم کو پیاسا مارا گیا تھا میرے اوپر کافی جذباتیت کا موڈ طاری ہو رہا ہے۔ عرب نے کولڈ ڈرنک کا گلاس ہاتھ میں اُٹھایا۔ میں اس سے کہنا چاہتی ہوں میرے پیارے عرب بھائی— کوکا کولا پیو تو یاد کرو پیاس حسینؑ کی۔

وقت اپنی جگہ پر ٹھہر گیا ہے۔ آرکسٹرا نے 'بلیوز' بجانے شروع کر دیے ہیں۔ عرب بڑے سے مشہدی رومال سے اپنی پیشانی صاف کر رہا ہے۔ میرے پیارے بوڑھے عرب! تم جو ایک پوری تاریخ کے ایک عظیم تمدن اور روایت کے بہت پیارے نمائندے ہو اور تمھارے ہاتھوں میں یہ موویز کا رسالہ ہے اور تمھاری آنکھیں زندگی کی روشنی سے عاری ہیں۔ تمھارے پرکھوں نے تو ان بزرگانِ دین کا ساتھ دیا ہوگا۔ تم جو صدیوں کا بہت اذیت ناک اور عبرت انگیز سفر طے کرتے ہوئے اس لمحے تک پہنچے ہو کہ تمھارے رعشہ زدہ ہاتھوں میں کوکا کولا کا گلاس ہے۔ اب تم کدھر جانے والے ہو میرے بھائی! میرے پیارے ساربان......!!

یہ بیروت ہے۔ ایک ترک میرے سامنے بیٹھا ہے۔ مذہبی اور قومی جذباتیت کا ایک اور سمبل، کیا شان دار ترک ہے، پلونہ اور ادرنہ اور سالونیکا سب ایک جھنکار کے ساتھ کانوں میں گونج گئے۔ وہ کوریا سے لوٹ رہا ہے اور وہ بھی یواین او کا ایک اہم رکن ہے۔ کوریا کسی کانفرنس کے سلسلے میں گیا تھا۔ اس نے ترک بریگیڈ کا ذکر کیا اور ترک کی جمہوریت کا۔ میں نے جنرل فخری پاشا کا قصہ اسے سنایا جو میرے والد کے بہت پیارے دوست تھے اور جنرل انور پاشا اور کمال اتاترک وغیرہ وغیرہ۔ اس کے علاوہ ہندوستان کی ساری خلافت تحریک کی داستان میں نے مختصراً

اس کے گوش گذار کر دی۔ اس نے کسی خاص دلچسپی کا اظہار نہ کیا۔ میرے بھائی چارے اور اسلامی دوستی کے جذبے پر کچھ ٹھنڈا پانی سا پڑ گیا وہ اطمینان سے صرف یو این او میں اپنے کام کا تذکرہ کرتا رہا۔ پھر اُس نے قدرے جذباتیت سے اپنی بوڑھی ماں کا ذکر کیا جو بیمار تھی اور جس نے اس کی روانگی کے وقت کہا تھا کہ میرے بیٹے میں تم کو آزادی اور سچائی کی فتح کی خاطر کوریا بھیج رہی ہوں، کامران لوٹنا!! بیٹوں کو لڑائیوں پر بھیجنا ترک ماؤں کی اچھی خاصی ہوبی اور عادت ثانیہ بن چکی ہے۔ میں نے اس کی ماں کی خیریت دریافت کی۔

اُدھر دو برطانوی بیٹھے ہیں۔ ہم فلاں فلاں کو سبق سکھا دیں گے۔ وہ آپس میں کہہ رہے ہیں۔ تذکرہ غالباً تیل کا ہے۔

سڑک پر جنگلے کے سہارے ایک بہت کم سن پنجابی ہندو لڑکا کھڑا ہے جانے وہ یہاں کدھر سے آنکلا۔ وہ انگریزی نہیں جانتا حتیٰ کہ اُردو بھی مطلق نہیں بول سکتا۔

سبز پہاڑیوں کی ڈھلان پر پھیلا ہوا اور سمندر کے کنارے بکھرا ہوا بیروت دھوپ میں جگمگا رہا ہے۔ سمندر نیلا میڈی ٹیرنین! نیلے میڈی ٹیرنین اور لبنان خدا تم دونوں کو اپنے حفظ و امان میں رکھے!! لبنان......! خلیل جبران کے ملک، تم بہت پیارے ملک ہو۔ یہ سب بہت پیارے لوگ ہیں۔ یہ سارے انسان جو خلیل جبران کی کہانیوں کے کردار ہیں۔

لبنان کی کیتھولک لڑکیوں کا ایک گروہ سمندر کے کنارے والی سڑک پر سے ٹہلتا میری سمت آ رہا ہے۔ غالباً وہ لوگ میری ساری کو قریب سے دیکھنا چاہتی ہیں۔ دھوپ میں اُن کے سنہری اور چاکلیٹ بال جھلملا رہے ہیں۔ خوب صورت چہروں والی کیتھولک لڑکیاں عربی میں ایک دوسرے سے آہستہ آہستہ باتیں کر رہی ہیں۔ تذکرہ ساری کا ہے۔ تم انگریزی یا فرنچ بول لیتی ہو؟ میں اُن سے پوچھتی ہوں۔

فرنچ ویری گڈ۔ انگلش نو...... پھر وہ کھلکھلا کر ہنستی ہیں۔ اُن کی راہبہ جو خود بہت کم عمر اور خوب صورت ہے، سکرن سے مسکراتی ہے۔

یہاں دُور دُور انجیر اور زیتون کے درخت ہیں جن کے جھنڈوں میں صدیوں پرانی

کیتھولک خانقاہیں چھپی ہوئی ہیں۔ جن کی سمت جانے والے سایہ دار خوابیدہ راستوں پر سے کبھی کبھی کوئی پیکارڈ یا جیپ تیزی سے اس الوہی سکون کو منتشر کرتی ہوئی گذر جاتی ہے۔

باسفورس پر سورج غروب ہو رہا ہے۔ سارے میں شفق پھیل گئی ہے۔ اس شفق میں اباصوفیہ کے مینار نظروں سے اوجھل ہوتے جا رہے ہیں، مارمورہ کے پانیوں پر روشنیاں ناچتے ناچتے تھک گئی ہیں اور اس شفق کے دھندلکے میں سارا مشرقی یورپ ہماری نظروں سے پوشیدہ ہے لیکن نظروں کے سامنے ہے۔

الپس، جرمنی۔

المانیہ! آہ المانیہ!! (واہ المانیہ!!!)

بون، کولون، فرینک فرٹ۔

ان ناموں میں کتنا سحر ہے۔ لو یہ کا جگمگاتا شہر فرینک فرٹ۔

فراولین کیا چاہیے......؟ ایک ویٹر جھک کر پوچھتا ہے۔

فراولین کے پیارے بھائی فرانز، تم تو ہٹلر یوتھ میں تھے نا؟ اب میں تم سے کیا بتاؤں مجھے کیا چاہیے۔ بڑا کنفیوژن ہے بھائی بڑا کنفیوژن ہے۔

مجھے یہاں سے آگے جانے دو۔

بلجیم۔ کیا خوب صورتی ہے، کیا نفاست ہے۔ برسلز، برسلز، گرجاؤں میں شام کی عبادت کے لیے گھنٹے بج رہے ہیں۔ اُن کی گونج شمال کے کہر آلود سمندروں پر پھیلتی جا رہی ہے۔

حضرات میرے پاس وہ کیمرہ نہیں ہے جو کہ میں نے برسلز میں خریدا، ہوتا تو کمانڈر فلاں کے ساتھ میں اس کے متعلق تبادلۂ خیالات کرتی۔ اوّل تو مجھے فوٹو گرافی اچھی طرح سے نہیں آتی۔ دوسرے یہ کہ اگر اس سے میں تصویریں اُتارتی بھی تو وہ کسی کام کی نہ ہوتیں کیونکہ میرے پاس وہ ٹورسٹ روپیہ نہیں جس کے ساتھ یہ تصویریں کھینچ کر گھر خطوں میں بھیجی جاتی ہیں۔

لہٰذا ناظرین، اب میں بہ اسم سبحانہ بلندن لیٹر بے تصویر کا آغاز کرتی ہوں۔ دیباچہ ختم ہوا۔

حضرات! اس ہوش ربا، دیوزاد پری پیکر عروس البلاد سے ہمارا کتنا صدیوں کا پرانا قلبی و روحانی تعلق ہے۔ ذری آنریبل جان کمپنی کا خیال کیجیے کہ جب سٹی آف لندن کے تاجر مدراس اور بنگالے کے لیے یہاں سے لنگر اُٹھاتے تھے۔ یا جب اوکسفرڈ اور کیمبرج کے ہونہار فرزندوں کو سراج الدولہ اور شجاع الدولہ کے پاس ذرا کام سے بھیجا جاتا تھا۔ کیا کیا معرکے ہوئے ہیں؟ کیا کیا توپیں دغی ہیں؟ اللہ اکبر۔ چپے چپے سے یہاں کے کیسی کیسی داستانیں وابستہ ہیں؟ چارلس ڈکنز کے ناولوں کے علاوہ رڈیارڈ کپلنگ اور ونسٹن چرچل کے اوراق بھی ان گلی کوچوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔

یوں اندازہ لگا لیجیے کہ پچھلے اسّی سال سے ہمارے نوجوان یہاں ادب، قانون اور طب سیکھنے کے لیے آتے رہے ہیں۔ یہاں ہائیڈ پارک میں کھڑے ہو کر انھوں نے شعلہ بار تقریریں کی ہیں۔ لندن مجلس اور قہوہ خانوں اور Embankment پر آزادی کے خواب دیکھے ہیں۔ وائٹ ہال کے دروازوں پر پہنچ کر جدوجہد کی ہے۔ ہمارے نیتاؤں نے گول میز کے گرد بیٹھ کر برطانیہ کی طاقت سے ٹکر لی ہے اور اب خداوند تعالیٰ کی عنایت دیکھیے کہ بالآخر ہم آزاد ہوئے۔ سچ ہے صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔

ہماری آزادی کے ساتھ ہمارے نوجوانوں کے کاندھوں سے گویا ایک بار اُتر گیا۔ اب ہم یہاں ایک ہلکے پھلکے ضمیر کے ساتھ آتے ہیں۔ ہمارے نیتا اب لڑائی لڑنے کے لیے نہیں بلکہ بکنگھم پیلیس کی گارڈن پارٹی میں شریک ہونے کے لیے تشریف لاتے ہیں۔ اب اگر کوئی لینڈ لیڈی ہمارے کالے رنگ پر اعتراض کرتی ہے تو ہم مطلق اس کا نوٹس نہیں لیتے بلکہ جی بھر کے اس کے کمروں کو گندہ کرتے ہیں، اس کے وال پیپرز پر سیاہی کے چھینٹے گراتے ہیں اور کھانا کھانے کے بعد اُس کے پردوں سے اکثر نظر بچا کر اُنگلیاں بھی پونچھ لیتے ہیں۔

یہ سب اِس لیے کہ ہم آزاد ہیں۔ بھلا ہم میں اور مثلاً...... مثلاً کسی اور آزاد قوم میں کیا فرق ہے؟؟

اے مومنین! اس وقت اس ملک میں کفر کی اس آماجگاہ میں چالیس ہزار کلمہ گو رہتا ہے،

کئی مسجدیں ہیں۔ایک آدھ فرزند کلیسا بھی گاہے بہ گاہے اسلام قبول کر لیتا ہے۔ ہمارے ملاح ہیں جو مختلف بندرگاہوں میں رہتے ہیں۔ مزدور ہیں جو شمال کے سارے صنعتی مرکزوں میں موجود ہیں۔صرف شہر لندن میں نوے ہندستانی اور پاکستانی ریستوران ہیں۔ ہمارے ان گنت لڑکے اور لڑکیاں یہاں کے کالج میں تعلیم حاصل کرنے میں مصروف ہیں۔پھر ہماری بیگمات ہیں جب کوئی خاتون زرتار "غرارہ" پہنے سڑک پر سے گذر جاتی ہیں تو واللہ دیکھنے والوں کی طبیعت گلیڈ ہو جاتی ہے۔

میں نے عرض کیا تھا...... بڑی گہما گہمی ہے۔

انڈیا ہاؤس کی عظیم الشان عمارت میں جہاں ہمارے نادر قلمی نسخے، مغل تصویریں اور سارے تہذیبی خزانے محفوظ ہیں۔ جس کی دیواروں پر سے میرے گرو ایل ایم سین کے بنائے ہوئے فریسکوز کی تصویریں خاموشی سے نیچے جھانکتی ہیں۔ مہارانی جھانسی کے جانشین، نئے بھارت کی سر رنگ بالائیں اپنے دیش کی سفارت کے فرائض انجام دیتی ہیں۔تلک جینتی منائی جاتی ہے۔

جی ہاں...... یہ بالکل ایک نئی دنیا ہے۔

لندن کی کلچرل زندگی میں آرٹ کی نمائشوں، تھیٹر، اوپیرا، بیلے اور کونسٹر کے ساتھ ہندستانی رقص کے مظاہرے بھی ایک اہم حیثیت اختیار کر چکے ہیں اور اب غالباً 'اُن' کی کامیابی کے بعد ہندستانی فلموں کو بھی وہی مقبولیت حاصل ہو جائے گی۔نمی جو پچھلے دنوں یہاں آئی ہوئی تھی اسے یہاں کے پریس نے کافی پبلسٹی دی اور برطانوی اور امریکن پروڈیوسروں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔

نمی کے ذکر پر خیال آیا کہ انگریز کی نفسیات کے متعلق کچھ عرض کروں۔

'آن' ایک بوگس فلم ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آن کے مقابلے 'ہم لوگ' یا 'دھرتی کے لال' یہاں ایک روز بھی نہ چل پاتی۔ ہندوستان کے متعلق جو تصور یہاں صدیوں سے موجود ہے یعنی مہاراجہ کے ہاتھی گھوڑے اور تلواروں کی لڑائیاں اور سونے کے محلات وغیرہ وغیرہ، وہ سب اس فلم

میں بخیر وخوبی پیش کیا گیا ہے۔ لہٰذا انا کیسں برج میں کام کرنے والی ٹائپسٹ لڑکی اور سٹی آف لندن کا بنک کلرک خوش خوش گھر لوٹتے ہیں کہ انھوں نے ہندوستان یعنی مشرق کے گلیمر کی ایک جھلک دیکھ لی۔ مجھ سے یہاں کے ایک بہت بڑے انٹلکچوئل اور بڑے مشہور فلم کریٹک نے کہا کہ عالمگیر نمائش کے لیے فلم بنانے سے پہلے آپ کے ڈائرکٹر محبوب کو اطالوی فلم ''بائیسکل چور'' دیکھنی چاہیے تھی یا دو چار فرانسیسی فلمیں۔ میں نے عرض کیا کہ پہلے ہالی دوڈ کے ان سارے ڈائرکٹروں کو بھی ''سائیکل کا چور'' دکھایئے جو ''قسمت'' اور ''دمشق کا چور'' اور ''سیلو گرل'' اور ''بغداد کا چور'' جیسی تصویریں بناتے رہتے ہیں یا جن حضرات نے ''رکم'' تیار کی ہے۔ محض مسٹر محبوب کی ذہنی تربیت کے آپ اتنے خواہاں ہیں۔

انگریزوں کی اس مخصوص نفسیات کا سب سے بڑا عکاس اُن کا پریس ہے سنسنی اور تہلکہ اُن کی مرغوب ذہنی غذا ہے۔ صرف بہت زیادہ پڑھا لکھا طبقہ ٹائمز مانچسٹر گارجین یا نیو اسٹیٹس مین اینڈ نیشن پڑھتا ہے۔ اکثریت کے لیے وہ اخبار نکلتے ہیں جن میں قتل، مار پیٹ، اغوا، ڈکیتی اور اسکنڈلز کا ذکر ہوتا ہے۔ ارسٹو کریسی اب یہاں آخری سانس لے رہی ہیں لیکن اب بھی عوام کو یہ خبر پڑھ کر اچھا معلوم ہوتا ہے کہ ''لارڈ فلاں کے بیٹے آنریبل فلاں نے کل رات مے فیئر میں اپنی پارٹی کے لیے شمپین کی اتنی بوتلیں پیرس سے منگوالیں اور اسپین کی خانہ بدوش رقاصاؤں کو بذریعہ ہوائی جہاز چھ گھنٹے کے لیے میڈرڈ سے بلوایا۔ پارٹی صبح کے پانچ بجے تک جاری رہی یا یہ کہ کاؤنٹس فلاں اتنے منک کوٹ لے کر اطالوی ریویرا تشریف لے گئی ہیں۔''

ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ عوام کو سیاست کی بعض بعض تفصیلات سے جان بوجھ کر لاعلم رکھا جاتا ہے۔ خود یہ طبقہ گھڑ دوڑ، کتوں کی دوڑ اور فٹ بال پُول اور کرکٹ کا اس قدر شیدائی ہے کہ اس کے مقابلے میں بین الاقوامی صورتِ حال کی اسے زیادہ فکر نہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ برطانوی عوام سیاست سے بالکل بے بہرہ ہیں۔ لیکن ڈاربی اُن کے لیے بہرحال چین سے زیادہ دلچسپ ہے۔

ویسے ملایا کی دوسری بات ہے۔

تحریر و تقریر کی آزادی یہاں ایک حد تک ضرور موجود ہے۔ پچھلے دنوں یہاں روسی فلم ''زوال برلن'' دکھلایا جا رہا تھا۔ فلم شروع ہونے سے پہلے یہ الفاظ سامنے آتے تھے۔ برطانیہ ایک آزاد ملک ہے اور ہم اس کے باشندے، اس چیز پر یقین رکھتے ہیں کہ ہمارے علاوہ دوسرے شخص کو بھی اس کا حق ہے کہ وہ اپنا نظریہ اور اپنی رائے آپ کے سامنے پیش کرے۔ ہمیں اس فلم میں پیش کی ہوئی بہت سی باتوں سے اتفاق نہیں اور روسیوں کو فتح اُن کی بے مثال بہادری کے علاوہ برطانوی اور امریکن اسلحہ جات کی وجہ سے بھی ہوئی تھی۔ لیکن بہر حال یہ ایک بہت عظیم فلم ہے......وغیرہ۔

یہ فلم اس طرح کے تعارف کے ساتھ امریکہ میں قطعی نہ دکھلایا جا سکے گا۔

آزادیٔ تقریر کا دوسرا مشہور و معروف مرکز ہائیڈ پارک ہے جہاں لکڑی کے ڈبوں پر کھڑے ہو کر ساری دُنیا کے سیاست دان، احتجاج کرنے والے، مصنف اور ادیب ہر زمانے میں گلا پھاڑ پھاڑ کر چلاتے رہے ہیں۔ ایک طرف کوئی صاحب کیمونسٹ پارٹی کا پوسٹر لگائے جراثیمی جنگ کے متعلق کچھ کہہ رہے ہوں گے، اُن سے چند قدم ہٹ کر ڈین آف کنٹربری کے خلاف چلا چلا کر کچھ ارشاد کیا جا رہا ہوگا۔ دوسری طرف سوشلسٹ پارٹی کے نمائندے اپنا بیان دیتے ہوں گے۔ ایک سمت خداوند تعالٰی کو سخت و سست کہا جاتا ہوگا۔ ان کے ساتھ ہی دوسرے اسٹینڈ پر یسوع مسیح کا پیغام پیش کیا جاتا ہوگا۔ ایک روز ایک نومسلم انگریز اور ایک پاکستانی مولوی صاحب بھی جوش و خروش سے کچھ فرما رہے تھے اور مجمع قہقہے لگا رہا تھا۔

مقرر اور سامعین کے مابین تکرار بھی ہو جاتی ہے۔ مجمع ہر ایک کی سنتا ہے اور اسی طرح قہقہے لگاتا آگے بڑھ جاتا ہے۔

پچھلے دنوں چند اخبار فروخت کرنے والوں نے طے کیا کہ وہ ڈیلی ورکر نہ بیچیں گے ٹائمز نے اس پر بڑا زوردار نوٹ لکھا کہ یہ رویہ غلط ہے۔ اگر وہ ڈیلی ورکر نہ بیچیں گے تو ہم اُن کو ٹائمز بھی بیچنے کے لیے نہ دیں گے کیونکہ یہ رویہ جمہوریت کے اصولوں کے منافی ہے۔ کل کو ٹائمز یا کسی اور اخبار کے لیے بھی یہی فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ آزادیٔ تحریر پائندہ باد۔ چنانچہ اخبار بیچنے والوں کو اپنا

فیصلہ واپس لینا پڑا۔ یہ برطانوی اصول پرستی کی ایک مثال تھی۔ تصویر کا دوسرا رُخ یہ ہے کہ اس کے باوجود پہلے کی طرح اب بھی یہ اخبار ہر نیوز اسٹینڈ پر آپ کو دستیاب نہیں ہوسکتا۔ ایسٹ اینڈ اور چوراہوں پر پارٹی کے افراد اسے فروخت کرتے نظر آجائیں گے۔

ایسٹ اینڈ......!! پکیڈلی سے ٹیوب میں بیٹھ کر آپ وائٹ چیپل یا اسٹیپنی گرین اترئیے۔ بیس پچیس منٹ کے اندر اندر آپ بالکل ایک دوسری دنیا میں موجود ہوں گے جہاں بمباری سے تباہ شدہ محلے موجود ہیں اور دھوئیں سے جلے ہوئے مکانات اور تاریک گلیاں۔ جہاں کی سڑکوں پر سے آپ رات گئے تنہا گذر یئے تو آپ کی جیب ضرور تراش لی جائے گی......نازیوں نے اپنی بمباری کا نشانہ خاص طور پر اس علاقے کو بنایا تھا۔ جہاں لندن کے کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی گنجان آبادی واقع ہے۔ یہاں کوئی کنونشن نہیں ہے۔ ہر شخص دوستی کی موڈ میں رہتا ہے۔ افلاس اور گندگی کے معاملے میں یہ علاقے ہمارے اپنے محلوں سے کچھ کم نہیں ہیں۔ یہاں ان گنت ہندستانی، پاکستانی اور لنکا کے مزدور رہتے ہیں۔ برسوں سے رہتے آئے ہیں اور اس آبادی میں مدغم ہو گئے ہیں۔ اُن کے لباس بھی اتنے ہی بدنما اور شکستہ ہیں جتنے اُن کے سفید فام ہمسایوں کے۔ چھوٹے چھوٹے نیم تاریک ہندستانی طعام خانے ہیں۔ جہاں اتوار کے روز دن بھر جاز کی موسیقی بجتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ نگر ولڑکے اچکتے رہتے ہیں۔ ایک چائے خانے میں ایک روز ہم لوگ گئے۔ اس میں دیوار پر پرانا مسلم لیگ کا کیلنڈر لٹک رہا تھا۔ جس پر قائداعظم کی تصویر تھی۔ بے رنگ کرسیاں اور بھدی میزیں ایک کونے میں ایک افلاس زدہ انگریز دال بھات کھانے میں مصروف تھا۔ کاؤنٹر پر سے سیاہ فام، غالباً سلہٹ کا رہنے والا ویٹر چلایا۔ ''ون ٹی۔ ون رول''۔ عین مین کراچی کے بندر روڈ کا کوئی ریستوران معلوم ہوتا تھا۔ ڈورچسٹر، کلرہجز، سے فیئر؟۔ جی ہاں۔ ان الف لیلوی جگہوں کے علاوہ جن کے اندر داخل ہوکر لوگوں کی عقل چکرا جاتی ہے اور آنکھیں چکا چوند ہو جاتی ہیں۔ ان کے علاوہ یہ چائے خانہ بھی موجود ہے۔ انگلستان محض دریائے ٹیمز کا مغربی کنارہ ہی نہیں ہے۔

اتوار کے روز ایسٹ اینڈ کی مشہور پیٹی کوٹ لین میں ہاٹ لگتی ہے۔ وہی ٹھیلے والوں کی

بھانت بھانت کی صدائیں مونگ پھلی بیچتی ہوئی بڑھیاں، سیکنڈ ہینڈ مال کے انبار دورویہ فٹ پاتھ پر پڑے ہیں۔ وہی رنگ اور ماحول ہے جو اپنے پیارے نخاس کے بازار میں تھا۔

پھر یہ گلیاں ہیں جن کی دونوں طرف شکستہ مکانات کے سلسلے ہیں جن کے دروازوں پر عورتیں بیٹھی دھوپ سینکتی ہیں اور سامنے بچے کھیل رہے ہیں۔ کوڑے کے ڈھیر ملبے کے انبار، غریب یہودیوں کے عبادت خانے، یہاں سے تو کوئی پیکار ڈیا سن بیم بھولے سے بھی نہیں گذرتی۔

یہ منظر آپ کو ہر جگہ ملے گا۔ شمال کے صنعتی مرکزوں میں شیفلڈ میں، گلاسگو میں، ویلز کی آبادیوں میں، سارے آئرلینڈ میں اور پھر چینل عبور کرنے کے بعد اٹلی، اسپین اور یونان میں یہ سارا پچھم ہے جس پر کہرہ چھایا ہوا ہے۔ کہرہ جو پچھم کے سمندروں سے اٹھتا ہے۔

نیچے نیلا میڈی ٹرینین جگمگا رہا ہے۔ جس کی موجوں پر کاؤنٹس آف ٹیڈل ڈو کی یاٹ تیرتی ہے۔ حسین کاؤنٹس آف ٹیڈل ڈوم جو مارکوئس آف ٹو دل ڈو کے ساتھ پندرہ منک کوٹ لے کر اطالوی ریویرا تشریف لے گئی ہیں۔

میری دوست حایا نے مجھ سے کہا۔ اس انٹرنیشنل سلم لینڈ سے کم از کم ہم اپنے یہودیوں کو نکال کر اسرائیل لے گئے ہیں۔ ہمارے اجتماعی فارم دیکھو ہماری نئی موسیقی، ہماری کلچر، ہمارا جذبہ، نیا ملک ہے۔ نئی اجتماعی طاقت جو پرانی تاریکی کی طاقتوں سے ٹکر لے رہی ہے۔ لیکن پھر بھی ہم اور پاکستان ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔ بتاؤ ہم میں اور پاکستان میں اور عربوں میں کیا فرق ہے...... وہ خاموش ہوگئی۔

......ہم نے کئی بار کوشش کی کہ عربوں کے ساتھ مصالحت کرلیں۔ لیکن ہمیشہ کوئی نہ کوئی شاخسانہ کھڑا کردیا گیا تا کہ مشرق وسطیٰ میں عربوں اور یہودیوں میں باہمی مفاہمت سمجھوتہ اور امن نہ پیدا ہو جائے۔

......وہی ہندو مسلم مسئلہ تھا۔ حایا نے پھر کہا۔

اب وہ چپ چاپ بیٹھی ہے۔ حایا کاف من، روسی نژاد ہے۔ یوکرین میں پیدا ہوئی تھی۔

بارہ سال کی عمر سے اس نے فلسطین کی انڈر گراؤنڈ تحریک میں کام کرنا شروع کیا۔ اس نے ڈبلن سے انگریزی ادب میں ڈاکٹر لیا ہے۔ حایا بے حد خوب صورت لڑکی ہے۔ ایک تو یہودی ویسے ہی دلکش اور ذہین ہوتے ہیں۔ اس لیے حایا کو کیمبرج میں بہت پسند کیا جاتا ہے۔ حایا یعنی حیا یعنی حیات، عبرانی میں حایا زندگی کو کہتے ہیں۔

لیکن میں بنی اسرائیل کی نئی زندگی کے اس سمبل سے ہر وقت الجھی رہتی ہوں۔ میں حایا کو کبھی معاف نہیں کرسکتی۔ اس نے اپنے دستی بموں سے کتنے عربوں کی جان لی ہوگی یہ سوچ کر مجھے اس کے وجود سے نفرت ہو جاتی ہے۔ وہ اطمینان سے بیٹھی پیانو پر کیکووسکی بجاتی رہتی ہے۔ جب وہ جذباتی ہو جاتی ہے تو روسی گانے الاپنے شروع کر دیتی ہے روسی اس کی مادری زبان ہے۔ عبرانی مذہبی اور سیاسی، انگریزی ادبی اور فرنچ اس کی کلچرل زبان ہے۔ وہ بڑی کٹر اینٹی برٹش عورت ہے۔ فلسطین کی جنگ کے زمانے میں کئی دفعہ برطانوی فوج نے اسے جیل میں بند رکھا اور برطانوی پولیس نے اس کی پٹائی بھی کی۔ سیاسی طور پر وہ اشتراکی ہے۔ اس کا باپ اسرائیلی حکومت کا ایک اہم رکن ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ ان سرد مزاج انگریزوں کو وہ بحیثیت مجموعی کافی پراسرار اور پرکشش نظر آتی ہے۔ پائندہ باد حایا یعنی حیات۔

اس وقت حایا ڈاکٹر الٹ طر سے ایلیٹ کے معاملے میں الجھ رہی ہے۔ ڈاکٹر الٹ طر ہمبرگ کا انٹیلکچوئل ہے۔ مجھے وہ ہمیشہ نمستے کہتا ہے اور کماری کہہ کر پکارتا ہے کیونکہ سنسکرت اور کالی داس کا وہ بہت بڑا عالم فاضل ہے۔ سات سال تک وہ مشرقی محاذ پر روسیوں سے لڑتا رہا۔ روس میں نظر بندی کے زمانے میں اس نے پہلی بار ''جرم سزا'' کو پڑھا۔ اب وہ ہمبرگ میں ادب کا پروفیسر ہے۔ یروشلم کی انٹلکچوئل حایا کی ہمبرگ کے اس انٹلکچوئل سے بالکل نہیں بنتی۔ کیونکہ حایا کو جرمنوں سے نفرت ہے۔ ڈاکٹر الٹ طر کی عدم موجودگی میں وہ اکثر مجھ سے کہتی ہے ذرا دیکھو تو اس منحوس مہاکوی کالی داس کے بچے کو۔ یوکرین میں اس نے کتنے روسی یہودیوں کو موت کے گھاٹ اُتارا ہوگا...... یوکرین جو میرا وطن ہے۔

یوکرین تمھارا وطن کہاں سے آیا؟ تم اسرائیلی ہو؟ میں اس سے بگڑ کر کہتی ہوں۔

......اب ہم خطرناک پانیوں کی طرف سفر کر رہے ہیں......!! رونلڈ دوسرا سگریٹ رول کرتے ہوئے آہستہ سے کہتا ہے۔ رونلڈ برطانوی ہے، نسلاً اینگلو سیکسن اس گروہ کا ایک اور انٹلکچوئل، سارے جدید انگریزی ادب پر وہ بھی ہم سب کی طرح بے تحاشا حاوی ہے اور اپنے آپ کو ڈاکٹر لیوس سے زیادہ سمجھدار نقاد خیال کرتا ہے۔ ڈاکٹر لیوس سے جو کیمبرج کے بڑے گروؤں میں سے ہیں۔ وہ اکثر الجھتا رہتا ہے۔ تم برصغیر ہند کی ساری خرافات سیاست کا ذمہ دار محض مجھے ٹھہراتی ہو۔ یہ تمھاری بھول ہے۔ وہ انگلی اٹھا کر پیغمبرانہ انداز میں مجھ سے مخاطب ہوتا ہے۔

ڈاکٹر الٹ طر کو سیاست کی خرافات سے چنداں دلچسپی نہیں۔ وہ ٹیگور کے فلسفے کے متعلق کرسلفر لی سے کچھ فرما رہے ہیں۔ کرسلفر لی لوئی مک نیس کے رفقا میں سے ہیں اور جدید شاعروں اور نقادوں کے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

ٹیگور ٹیگور چلاتے ہیں۔ آپ نے کبھی ابن خلدون کا مقدمہ پڑھا ہے؟ میں غصے سے اُن دونوں سے کہتی ہوں......مشرق کا سارا ذہن و فلسفہ محض ٹیگور ہی نہیں ہے۔ حضرت علیؓ اور امام غزالیؒ اور ابن خلدون اور اقبال کا بھی تو مطالعہ کیجیے......لیکن بھلا آپ عیسائیوں کا تعصب کب مٹے گا......؟

ہم خطرناک پانیوں کی طرف...... رونلڈ آہستگی سے تیسرا سگریٹ جلا رہا ہے۔ چنانچہ چاروں اور یہ خطرناک پانی ہیں اور ہم سب ایک ناؤ میں سوار ہیں۔

کیم آہستہ آہستہ بہتا جا رہا ہے۔ تیرھویں اور چودھویں صدی کے کالجوں کے پیچھے سے یہ سینکڑوں برس سے یونہی بہتا آیا ہے۔ اس کے دونوں طرف پرم روز کھلے ہیں اور بے انتہا سرسبز درخت ہیں۔ موسم بہار کے سارے پھول امنڈ رہے ہیں وپنگ ونور کی شاخیں پانی کی سطح پر جھکی رہتی ہیں۔ صدیوں سے یہ پھول اور یہ پرانی دیواریں اور یہ پل، یہ انڈر گریجویٹ بحثیں سنتے آئے ہیں۔ بے حد پرسکون اور بے تحاشا خوب صورت منظر ہے جو کرسمس کارڈوں اور کیلنڈروں پر منتقل ہو کر دنیا بھر میں فروخت ہوتا ہے۔ چیری کے درخت ہیں اور ان میں چھپے ہوئے کالج اور ٹی

گارڈن گرانچسٹر ہے جہاں ریوپرٹ بروک رہتا تھا۔ گرانچسٹر گرجا کے قبرستان میں ریوپرٹ بروک کے میموریل پرایک اکیلی ریتھ مرجھائی پڑی ہے۔

ایک تیز رفتار موٹر لانچ یونین جیک لہراتی زناٹے سے سطح پر سے نکل جاتی ہے۔ گڈ اولڈ یونین جیک......!! کوئی آہستہ سے کہتا ہے...... ہولی ڈے میکرز اور انڈر گریجویٹس کناروں پر دُور دُور تک ٹولیوں میں منتشر ویک اینڈ منا رہے ہیں۔ پانی کی لہروں پر اَن گنت ڈونگیاں تیر رہی ہیں۔ ابھی قریب سے جو پنٹ گذری ہے۔ اس کے سرے پر کھڑی ہوئی حایا نے جوش میں آکر زور زور سے کوئی عبرانی لوک گیت شروع کردیا۔ جو اسرائیل کے کھیتوں میں لڑکیاں گاتی ہیں۔ ڈاکٹر الٹ طرآہستہ آہستہ ایک جرمن نغمہ الاپ رہا ہے۔ ڈاکٹر نینسی روحانی گیت، گنگنانے لگتی ہے۔ انٹرنیشنل سمفنی شروع ہوجاتی ہے۔

نینسی آنکھیں نیم وا کیے اپنے وطن جنوب کے Plantation کے گیت گا رہی ہے۔

ڈاکٹر نینسی کارلن۔ یہ میری دوسری پیاری دوست ہے۔ اس کی دادی حبشی سیلوگرل تھی۔ جسے نیواورلینز میں فروخت کیا گیا تھا۔ اس کا باپ ورجینیا میں پادری ہے۔ نینسی کو ورجینیا کے کسی کالج میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ لہٰذا اُس نے شمال کی کسی یونیورسٹی میں جا کر پڑھا اور امریکن ناول میں نیگرو پادری کے کردار پر مقالہ لکھ کر اس نے کولمبیا سے ڈاکٹریٹ لیا۔ اب وہ جنوب کی کسی بہت بڑی نیگرو یونیورسٹی میں ادبیات کی پروفیسر ہے۔ نینسی ہر وقت بشاش رہتی ہے اور بات بات پر زور زور سے قہقہے لگاتی ہے۔

''دیکھو...... تم لوگ ہمیشہ اپنی مظلومیت پر بسورتے ہو اور زندگی سے بیزار نظر آتے ہو لیکن نینسی کو دیکھو۔ اس کی قوم نے کتنے ظلم سہے ہیں اور یہ کس طرح ہر سمے ہنستی اور دوسروں کو ہنساتی رہتی ہے۔ حالانکہ یہ بھی اپنی سیاسیات اور اپنے کلر پروبلم کے بارے میں تمہاری ہی طرح حساس ہے...... بلکہ اس نے تم سے زیادہ دکھ سہے ہیں......'' رونلڈ مجھ سے کہتا ہے۔

نینسی واقعی بہت عظیم ہے۔ ہمارے ساتھ تین چار امریکن اور ہیں جو سب کے سب کسی نہ کسی مشہور یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کر چکے ہیں یا کر رہے ہیں۔ سب بڑے ذہن پرست ہیں مثلاً

یہ لڑکا کارسل فریزر جو نیویارک کے ایک مشہور ادبی رسالے کا جوائنٹ ایڈیٹر ہے اور امریکہ کے نئے نقادوں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ لیکن ہم کبھی ایک دوسرے سے سیاست کی بات نہیں کرتے۔ صرف ایذرا پاؤنڈ کا تذکرہ ہوتا ہے نینسی ان سب کی دوست ہے کیونکہ بہرحال وہ بھی امریکن ہے اور بڑی پکی امریکن لیکن اُن سب سے مختلف ہے۔ ایک بات آپ کو اور بتادوں۔ نینسی، حایا اور رونلڈ کی طرح اشتراکی خیالات کی حامی نہیں ہے۔ امریکی طرز جمہوریت کی پرستار ہے۔ پھر بھی اس سے کتنی گمبھیرتا اور کتنے دُکھ سے وہ نیگرو روحانی نغمہ الاپ رہی ہے۔

نینسی کارلن بہت عظیم عورت ہے۔

کل ایک انگریز لڑکی نے بریک فاسٹ کی میز پر اس سے بہت بشاشت سے کہہ دیا ''ہلو ٹوپسی......!!''

نینسی نے اس سے کہا: ''دیکھو ڈارلنگ، مجھے معلوم ہے کہ تم نے کسی بری نیت سے نہیں بلکہ محض خوش دلی سے ٹوپسی کہہ کر پکارا ہے لیکن آئندہ کسی نیگرو کو اس نام سے مخاطب نہ کرنا۔''

''اوہ......آئی ایم سو سوری ڈیئر......'' انگریز لڑکی نے جواب دیا اور خاموشی سے پارج میں مصروف ہوگئی۔

''تم نے دیکھا......'' بعد میں نینسی نے مجھ سے مخاطب ہو کر آہستہ سے کہا ''یہ بالکل اسی طرح ہے جب یہ لوگ نیگرو عورتوں کو ٹوپسی یا نیگرس کے الفاظ سے یاد کرتے ہیں تم سمجھتی ہونا......میرا مطلب ہے کہ......''

''الفاظ میں کیا رکھا ہے......!!'' رونلڈ نے ایک اور سگریٹ رول کرتے ہوئے کاہلی کا سوال کیا۔

''الفاظ......؟ آپ کسی چینی کو چائنا مین کیوں کہتے ہیں اور کیا تم کو پتہ ہے کہ لفظ ''ایشیاٹک'' کے پیچھے کتنی حقارت چھپی ہوئی ہے......؟؟'' میں نے جواب دیا۔

''اوہو......!!اسی لیے اب تم لوگ اپنے آپ کو ایشیاٹک کے بجائے ایشین کے نام سے یاد کرتے ہو......!!'' رونلڈ نے کہا۔

''جی ہاں جناب......'' میں شیشے سے کود کر دریچے میں جا بیٹھی۔

''اچھا چھا۔ ایشین، ایشین......!! ٹھیک ہے؟'' رونلڈ نے کہا۔

''ٹھیک ہائے......'' میں نے نقل اتارتے ہوئے جواب دیا۔

سورج کنگز کالج کے پیچھے غروب ہوتا جارہا ہے۔ کورٹ یارڈ پر سائے طویل ہونے لگے ہیں۔ پیٹر ہاؤس کوئنز کالج۔ ایموئیل سڈنی سسکس۔ ان ساری سحر انگیز عمارتوں پر تاریکی چھارہی ہے۔ تاریکی میں ایسا لگتا ہے کہ ابھی ان صدیوں پرانے گھسے پتھروں والے کوریڈورز میں سے قرونِ وسطیٰ کے راہب اور اسکالر کالے گاؤن پہنے شمعیں لیے ادھر سے اُدھر گذر جائیں گے۔ ان کمروں میں، ان سیڑھیوں پر اور اُن کورٹ یارڈز کے درختوں کے نیچے کرسٹفر مارلو، روجر بیکن، اولیور کروم ویل اور اُن کے بعد کیٹس، بائرن اور جانے کس کس نے اپنے طالب علمی کے زمانے بتائے ہیں۔ اس پراسرار نیم تاریک ماحول میں اب تک ذرا سی بھی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی۔

کیمبرج اسی طرح بہتا رہے گا۔

اب ہم اپنے گرینڈ کونسرٹ کی ریہرسل کر رہے ہیں۔ بارش ابھی تھمی ہے فضا میں پھولوں کی دھیمی دھیمی خوشبو بہہ رہی ہے۔ تیز سبز گھاس نم ہے اور پتوں پر سے بارش کے قطرے نیچے گر رہے ہیں۔ پورب کے کھیتوں اور کنجوں پر بھی یونہی بارش اسی طرح ہوتی ہے۔ پھلیند سے اور کھرنی کے درختوں پر بخشی کا تالاب اس وقت پانی سے بالکل لبریز ہو جاتا ہے اور پیلے کنول وہاں تیرتے ہیں۔ گومتی کے کاٹھ کے پل سے لوگ چولائی اور بھوئے کے جھوئے اٹھائے گذرتے رہتے ہیں، ساون الاپا جاتا ہے کیونکہ اگست کا مہینہ ہے۔

نوسٹلجیا......!!؟ نینسی آہستہ سے دریافت کرتی ہے۔ لان پر ہمارے ساتھی اِدھر اُدھر گروہ بنائے گھاس پر بیٹھے پروگرام کے مختلف حصوں پر نظر ثانی کر رہے ہیں۔ شاہ بلوط کی لکڑی کی دیواروں والے نیم روشن کمرے میں اس اسکٹ کی مشق کی جارہی ہے جو ہم نے ایلیٹ کے

''سونی اینجلسٹیں'' کی پیروڈی میں لکھا ہے۔ ہم ایک ایک جملے اور سین پر قہقہے لگاتے ہوئے جارہے ہیں۔ ایک امریکن لڑکی وائلن پر ویبر بجارہی ہے۔ اس کے ساتھ انٹرنیشنل لا کا اطالوی طالب علم گٹار بجانے میں مصروف ہے۔ آتش دان کے اوپر سے لیڈی سڈنی کی روغنی تصویر کا بلی سے جھانک رہی ہے۔ جنھوں نے پندرھویں صدی میں یہ کالج قائم کیا تھا۔

رسل فریزر فرش پر پڑے ہوئے گھنگھروؤں کو بڑے غور اور دھیان سے الٹ پلٹ کر دیکھ رہا ہے۔ نینسی کارلن پیانو پر تن دہی سے وہ دُھن بجانے کی کوشش کر رہی ہے جو میں نے ناچ کی لے کے لیے اسے سکھائی ہے..... رے واگے بندرابن مابانسریا کھوب کھوب بجا دینا...... رے واگے۔

دھیم تانا دھیری نا، تانا دھی ری نا دھیم..... سب مل کر الاپنے لگتے ہیں۔

ٹیرفک.....!! رسل فریزر چلا کر خوشی سے کہتا ہے۔

ان سفید قوموں کا آرکسٹرا اب بندرابن کا گیت بجارہا ہے۔ یہ دھنیں انھوں نے آج تک نہ سنی تھیں جو میں نے ابھی انھیں سکھلائی ہیں سب کے سب بچوں کی طرح اکسائیٹڈ ہیں۔

اوہ بوائے.....!! نینسی چلا کر کہتی ہے۔

کیا کلچرل ہارمنی پیدا ہوئی ہے، واللہ.....!! میں سوچتی ہوں۔

شام کو ای ایم فاسٹر مجھ سے کہتے ہیں..... میں ہندوستان کو بھلا کس طرح بھول سکتا ہوں؟..... کبھی نہیں.....!

یس سر۔ میں کہتی ہوں۔

خصوصاً تمھارا لکھنؤ۔

یس سر۔

تمھاری تہذیب۔

یس سر۔

تمھاری ساری جدوجہد۔

یس سر......نو چیرز فارڈیموکریسی۔[1]

فارسٹر کھلکھلا کر ہنس پڑتے ہیں۔

سارے ایسٹ انگلیا پر جنوبی انگلستان پر موسم گرما کے خوشگوار بادل چھائے ہوئے ہیں۔ پھر دھوپ نکلتی ہے۔ سیزن اپنے عروج پر ہے۔ ویسٹ اینڈ میں پیٹر اسٹو ف، ایڈتھا یوانز اور میری مارٹن کے کھیل بے پناہ ہجوم اپنی اور کھینچ رہے ہیں۔ شہزادی مارگریٹ نے نئے فیشن ایجاد کیے ہیں۔ کورٹ آف سینٹ جیمز سے ذرا پرے اور سیز لیگ کی بھوری مہیب عمارت ہے جس میں بوڑھے آئی سی ایس اور نو آبادیات کے سابق گورنر دن بھر چپ چاپ وہسکی پیتے اور ٹائمز پڑھتے رہتے ہیں یا کبھی کبھی اخبار پر سے سر اُٹھا کر گڈ اولڈ جے پور ریذیڈنسی یا ڈیر اولڈ چھتر منزل کلب کا تذکرہ کر لیتے ہیں۔ جہاں 1920 میں یا 1930 میں کتنی دلچسپ برج پارٹیاں ہوتی تھیں۔

ایک روز ایک پارٹی کے دوران میں مَیں نے ایک بہت بوڑھے انگریز کو نوٹ کیا جو سب سے الگ تھلگ خاموش بیٹھا چائے پی رہا تھا، اس کے ہاتھوں میں رعشہ تھا۔ میں نے پیالی اُسے اٹھا کر دی۔

آپ کبھی برصغیر جا چکے ہیں......؟ میں نے پوچھا۔

ہاں! جا چکا ہوں......جا چکا ہوں......اس نے پیالی کانپتے ہوئے ہاتھوں سے سنبھال کر اُٹھائی۔

کسی خاص جگہ......؟

بمبئی!

اچھا......کسی ملازمت وغیرہ کے سلسلے میں یا ایسے ہی......؟ میں نے اخلاقاً مکالمہ جاری رکھنے کی غرض سے دوبارہ بات کی۔

نہیں......ملازمت کے سلسلے میں۔

اوہ......آرمی......؟؟

نہیں، آرمی نہیں۔

تو کافی عرصہ رہے آپ ہندوستان؟

ہاں، ہاں کئی سال، کئی سال۔

کیا کرتے رہے اتنے دنوں آپ وہاں...... میرا مطلب ہے، بمبئی میں......؟

او...... میں بمبئی پریذیڈنسی کا گورنر تھا۔

اوہ......

ان انگریزوں کی تنہائی اب قابلِ رحم ہے۔ اُن کے دوسرے ہم مرتبہ ساتھیوں پر بھی زوال آچکا ہے۔ بڑے بڑے لارڈ اور کاؤنٹ جن کے پاس لمبے چوڑے خطابات، طویل و عریض ریاستیں اور عظیم الشان محلات اور قلعے تھے، اب نوکریاں کر رہے ہیں یا اپنے جواہرات اور بیش قیمت کتب خانے فروخت کر رہے ہیں۔ بہت سوں نے اپنے محلوں کی نمائش شروع کر دی ہے جن پر ٹکٹ لگا کر وہ تماشائیوں کو اپنے کتب خانے اپنے نفیس بیڈروم اور ڈرائنگ رُوم ایک مستعد گائیڈ کی طرح دکھلاتے پھرتے ہیں اور اس سے جو آمدنی ہوتی ہے، اس سے گھر کے خرچ میں مدد لیتے ہیں۔ ''موت کے محصول'' نے ارسٹوکریسی کو اقتصادی طور پر بالکل تباہ کر دیا ہے۔ انگلستان کے لارڈ اور لیڈیز کا زمانہ ختم ہوا۔

لہٰذا اے مومنو! لازم آیا تم پر کہ عبرت پکڑو۔

اب آخر میں خاں صاحب سے بھی مل لیجیے جو پچھلے تیس سال سے لندن میں رہتے ہیں۔ جوش کے قریبی عزیز ہیں جو اپنی ذات سے انجمن ہیں۔ بی بی سی کے اُردو سیکشن میں اُن کی وجہ سے بڑی رونق رہتی ہے۔ اتنے طویل عرصے کے ولایت کے قیام کے باوجود اُن کا لب ولہجہ اب تک ٹھیٹھ اور خالص اودھ والوں کا سا ہے۔ اُردو بولتے ہیں تو ہمیشہ تھیٹر کو ٹھیٹر اور ویسٹ منسٹر کو ویسٹ مینسٹر کہتے ہیں۔ سینما کو انھوں نے ہمیشہ بائیسکوپ ہی کہا۔ لکھنؤ کے پرانے داستان گویوں کے انداز میں قصے سناتے ہیں۔ تیس سال گزرے، ہندوستان کی آزادی کی لڑائی لڑنے یہاں آئے

تھے اور پھر کبھی واپس نہ گئے۔ ہائیڈ پارک میں انھوں نے بھی بغاوت کا علم بلند کیا۔ خلافت تحریک آرگنائز کی۔ اخبار نکالے۔ لائیڈ جارج کے پاس پہنچ جاتے تھے اور اس سے بگڑ کر کہتے تھے کیا معنی کہ آپ نہایت بے ایمان آدمی ہیں۔ ہند کو ابھی فوراً آزاد کیجیے۔

اب بوڑھے ہو گئے ہیں اور دل شکستہ ہیں کہ جو سوچا تھا وہ نہ ہوا۔ پچھلے دنوں پاکستان گئے تھے۔ لیکن پرمٹ نہ مل سکنے کی وجہ سے وطن مرحوم ملیح آباد نہ پہنچ سکے اور پھر لندن لوٹ آئے۔ ہر شخص کے دکھ درد میں کام آنے کو تیار رہتے ہیں۔ کوئی خاندان نہیں ہے، اکیلے رہتے ہیں اور اپنے محلے بھر کے گورو اور جگت چچا ہیں۔ ایسے لوگ اب صرف قصے کہانیوں میں ملتے ہیں یا چودھری محمد علی رودولوی کی حکایتوں میں اور چودھری محمد علی کے قصوں کو بھی سمجھ کر پڑھنے اور سر دھننے والے اب کم رہ گئے ہیں۔

موسم گرما بھی گذرتا جا رہا ہے۔ سیاح ٹریفلگر اسکوائر میں کبوتروں کو دانے کھلا رہے ہیں۔ ٹیٹ گیلری میں پکاسو اور رائل اکیڈمی میں ڈاونچی کی نمائش ہو رہی ہے۔ پکیڈلی سرکس میں وہاں کی مشہور عالم ''اسٹریٹ واکر''، لڑکیاں حسین کپڑوں میں ملبوس، اونچی ایڑی کے جوتے پہنے گہرا میک اپ کیے کونوں کھدروں یا فٹ پاتھ کے کناروں پر کھڑی راہ چلنے والوں خصوصاً غیر ملکیوں کو ''ہلو ہینڈسم'' کہہ کر اپنی اور متوجہ کرنے میں مصروف ہیں۔

پکیڈلی...... ہارٹ آف دی ورلڈ......!! مجمع بڑھتا جا رہا ہے۔ سنیما گھروں کی کھڑکیوں کے سامنے کیو لگے ہیں۔ ایک خوب صورت جوان آدمی جس کی ایک ٹانگ اوپر سے کٹی ہوئی ہے، بھیک مانگتا مانگتا کیو کے ہر فرد کے سامنے جاتا ہے اور ٹوپی اُتار کر سلام کرتا ہے۔ بہت کم لوگ اس کی طرف توجہ دیتے ہیں۔ پیسے اس کے بکس میں کوئی بھی نہیں ڈالتا۔

''سلام میم صاحب......!!'' وہ ہمارے سامنے آکر کہتا ہے۔

میری دوست فیروز جبیں اس سے پوچھتی ہے۔ ''کیا تم کبھی ہندوستان میں رہے ہو؟''

''نہیں...... میں ڈنکرک فتح کرنے میں مصروف تھا اس لیے ہندوستان نہ جا سکا!'' وہ مسکرا کر کہتا ہے۔

''اچھا......!'' فیروز اس کے ڈبے میں پیسے ڈال دیتی ہے۔ وہ اسی طرح مسکرا کر تھینک یو کہتا آگے بڑھ جاتا ہے۔

''ڈنکرک فتح کرنے میں مصروف تھا''...... فیروز دہراتی ہے اور اب ویسٹ اینڈ کے تھیٹروں کے آگے بھیک مانگتا ہے اور ابھی ایک جنگ اور ہوگی؟''

سامنے سے اطلانٹک پار والے سپاہیوں کا ایک غول گذر جاتا ہے۔ میں اور فیروز سنیما کے اندر جا کر لا رونڈ دیکھنے میں مشغول ہو جاتے ہیں۔

لا رونڈ......زندگی کا میری گو رونڈ......؟!!

تو بھائی فیروز یہ سلسلے ہیں۔ رات کو میں آگ کے سامنے اطمینان سے بیٹھ کر فیروز سے کہتی ہوں۔ یہ ہمارا پرانا لطیفہ ہے۔ یونیورسٹی میں ہم جب اکٹھے پڑھتے تھے تو شام کو ہوسٹل کی ڈائننگ ٹیبل پر دن بھر کے سارے ضروری واقعات، یونیورسٹی پالیٹکس اور اسکنڈلز ایک سانس میں گوش گذار کرنے کے بعد میں فیروز سے کہتی تھی۔ تو یہ سلسلے ہیں بھائی صاحب......!!

اور یہ کھلا ہے یہ صاحب ہندوستان کی فارن سروس کی ایک بڑی ذمہ دار رکن ہے پر اب تک لگتا ہے کہ ابھی ابھی اپنی کلاس کا کوئی پیریڈ گول کر کے کالج سے بھاگی چلی آرہی ہے۔ اس کا فلیٹ چیلسی میں ہے۔ لہٰذا آرٹ وارٹ کا چکر اس کے یہاں بہت رہتا ہے۔

کینیڈا کا انٹلکچوئل تاریخ اور پولیٹکل سائنس کا ماہر برنی بلیٹن برگ جامنی رائے کی ایک تصویر کو بے دھیانی سے الٹ پلٹ رہا ہے۔ برنی آج کل بیک وقت دو کتابیں لکھنے میں مصروف ہے۔ ایک کینیڈا کی اقتصادی تاریخ اور دوسری کچھ اور اسی قسم کی چیز ہے۔ دونوں کتابیں بڑے پروگریسو نظریے سے لکھی جا رہی ہیں۔ اپنی کم عمری کو چھپانے کے لیے ہر وقت بے حد سنجیدہ رہنے کی کوشش کرتا ہے۔

پروگریسو......؟ افوہ......افسوس یہ ہے کہ تم تو پچھم کے زوال پرست انٹلکچوئل بھی نہیں

ہو۔ کولونیل انٹلکچوئل ہو...... میں اسے جلانے کے لیے کہتی ہوں۔

دراصل مجھے اس لفظ انٹلکچوئل ہی سے وحشت ہوتی ہے اور پھر کینیڈا کی یہ مخلوق......؟

افوہ...... یہ کولونیل لوگ بھلا کیا کھا کر انٹلکچوئل بنیں گے۔ بھائی جو تمھارے باپ کے چین اسٹورز ہیں کینیڈا میں انہی میں مگن رہو (برنی جب اپنی بے تحاشا طویل و عریض امریکن کار میں سڑکوں پر سے گذرتا ہے۔ خصوصاً کنٹری سائڈ کے قصبوں کی پتلی پتلی سڑکوں پر سے تو راہگیر رک کر کار کو غور سے دیکھنے لگتے ہیں۔ امریکن کاریں انگلستان میں بہت کم نظر آتی ہیں۔ انگلش کاریں جو اُن کے سامنے بالکل کھلونا دکھلائی دیتی ہیں۔ راہ گیر حیرت سے امریکن کاروں کو کبھی کبھی چھو کر بھی دیکھ لیتے ہیں......)

اور پھر کینیڈا کی اقتصادی تاریخ پر ترقی پسند نظریہ...... (جھگڑا جاری رہتا ہے) برطانیہ عظمیٰ کے انقلابات......!! میاں انقلاب تو ایشیا میں آتے ہیں۔ دو سال میں ساری کایا پلٹ جاتی ہے۔ مہینوں اور ہفتوں میں دنیا اِدھر سے اُدھر کر دی جاتی ہے۔ یہ تھوڑا ہی ہے کہ پہلے دو سو سال تک انڈسٹریل ریولیوشن گھسٹا۔ پھر اسٹیم انجن چلے۔ پھر کوئلے کی کانوں کا سلسلہ رہا۔ بھائی دنیا کی تاریخ تو ایشیا میں بن رہی ہے۔ آیا خیال میں؟ میں کہتی ہوں۔

کیا میلوڈر یمٹک اپروچ ہے آپ کی......!! جم کہتا ہے۔

ابھی ابھی جم اپنے ایسوی ایشن کے دفتر سے واپس آیا ہے۔ جم بھی رونلڈ کی طرح انگریز ہے۔ جدید سنگ تراشی اس کا مشغلہ ہے اور چونکہ وہ بھی چیلسی میں رہتا ہے لہٰذا اسے بھی اپنے آپ کو فن کار سمجھنے پر مجبور کیا جاتا رہتا ہے، حالانکہ وہ مُصِر ہے کہ وہ بے حد پریکٹیکل آدمی ہے۔ وہ بھی ہمیشہ نمستے کرتا ہے اور سارے قدیم ہندو فلسفے اس نے گھول کر پی رکھے ہیں۔ گاندھین طرزِ زندگی کا سخت قائل۔ دنیا کے سارے پروبلمز کا حل صرف اس نے دریافت کر لیا ہے۔ وہ یہ کہ ہم سب کو شخصی Cells بنانے چاہئیں اُن میں رہتے ہوئے اور اُن سے آگے بڑھ کر ہم سوسائٹی کی اصلاح کریں گے اور زندگی لامحالہ نہایت سیدھی سادی اور پُرسکون ہو جائے گی۔ اسی شخصی درجہ معرفت کی آئیڈیلزم کے چکر میں اِس کی غیر سیاسی انسانیت پرست ایسوی ایشن کی طرف سے

پچھلے دنوں چند اللہ والے مہاجرش کراچی گئے تھے۔ اُن میں فرانسیسی، سوئس، ڈچ اور غالباً انگریز مرد اور عورتیں تھیں۔ یہ لوگ لالوکھیت میں کئی مہینے مہاجرین کے ساتھ رہے۔ دن رات لگ کر انھوں نے مکان تعمیر کیے۔ دن بھر وہ اینٹ اور گارا ڈھوتے تھے اور رات کو چٹائیوں پر پڑ کر سو رہتے تھے۔ کیا روحانی بلندی ہے، واللہ......!! میں جم سے کہتی ہوں۔

مصیبت یہ ہے کہ جم مذہبی بھی نہیں ہے لیکن انقلاب کا قائل نہیں۔ بڑا سخت Pacifist اس کے خیال میں سوویت یونین اور مغربی ممالک دونوں تباہی کے راستے پر جا رہے ہیں۔ اچھا خاسا جین مت کا پیرو معلوم ہوتا ہے۔ بس ہر ایک کو مکمل شخصی آزادی اور امن حاصل ہونا چاہیے اور سب کو چھوٹے چھوٹے دیہاتوں میں رہنا چاہیے۔

جم اگر خدا پرست، ہوتا تو بڑا عمدہ رومن کیتھولک فادر ثابت ہوتا گڈ اولڈ جم......

کرشنا مینن رٹائر ہو گئے ہیں۔ جب تک وہ ہائی کمشنر رہے پرانی انڈیا لیگ ہاؤس میں انھوں نے اپنی رہائش کے لیے ایک کمرہ لے رکھا تھا۔ جس میں ایک طرف چائے بنانے کا سامان رکھا تھا اور باقی سارے کمرے میں کتابوں اور اخباروں کے انبار بکھرے رہتے تھے۔

اور اب رات ہو رہی ہے۔ سڑک کے کنارے کنارے گھومنے والی لڑکیاں اور وہ بوڑھے بھکاری جو فٹ پاتھ پر رنگین چاک سے تصویریں بنا کر خاموشی سے ایک طرف دیوار کے سہارے دن دن بھر بیٹھے رہتے ہیں اور راہ گیر کو دھندلی، پُرامید آنکھوں سے دیکھتے ہیں، فٹ پاتھ کی ان تصویروں کے نیچے لکھا ہوتا ہے...... یہ میں نے جھیل اور چاندنی رات کی تصویر بنائی ہے، لیکن چونکہ چاک سے سارے رنگ اجاگر نہیں ہو سکتے اور کاغذ یا کینوس کے بجائے میرے پاس صرف یہ فٹ پاتھ کی زمین ہے۔ اس لیے تصویر ایسی نہ بن سکی جیسا میں چاہتا تھا۔ اگر آپ کچھ دیتے جائیں تو میں رات کو کھانا کھا کر سو سکوں گا۔ گو میرے پاس رات گذارنے کے لیے کوئی جگہ یا سونے کے لیے کوئی پلنگ نہیں ہے......وغیرہ وغیرہ۔

سڑکیں سنسان ہو چکی ہیں۔ زمین دوز ریلیں اپنی آخری مسافتیں طے کر رہی ہیں۔ متوسط طبقے کے باولر ہیٹ اور چھتریوں والے انگریز اپنے اپنے گھروں میں قلعہ بند ہو چکے ہیں۔

کوئی سیاح اپنے دوست سے کہہ رہا ہے۔ کیا بدمذاق شہر ہے جہاں اتنی جلدی رات ہو جاتی ہے۔ اسی لیے میں کل پیرس جا رہا ہوں...... شب بخیر لندن۔

لندن سو رہا ہے۔ لندن جاگ رہا ہے۔ کھڑکیوں کے پردے گرا دیے گئے ہیں باہر خنک ہوا چل رہی ہے کل سردی ہوگی۔ نیچے سڑک پر شام کا اخبار بیچنے والے آخری بچے کھچے پرچے سمیٹ رہے ہیں۔ جن کی سرخیاں تاریکی میں مدھم ہوتی جا رہی ہیں۔ ایوا پیروں مر گئی۔ شاہ فاروق کو نکال باہر کیا گیا۔ ڈاکٹر مصدق رونے لگے۔ روسیوں نے ایک اور گولڈ میڈل جیت لیا۔

اب سب سو رہے ہیں گے۔ میں اور فیروز اور کملا اور حایا اور نینسی اور اُن کے علاوہ رونلڈ اور الٹ طرا اور برنی اور جم سب سو جائیں گے۔ کیونکہ یہ آج کا دن بھی ختم ہوا۔

کل کیا ہوگا۔ یہی سوال 1938ء میں بھی سب کے سامنے تھا۔

لیکن سامنے دیکھو۔ اب دیوار پر کیا لکھا ہے...... دیکھو......!

اب تمھاری خاطر کوئی ڈینیل فیصلے کے لیے نہ آئے گا۔

نوٹ: بقول مصنف یہ رپورتاژ 1953 میں لکھا گیا تھا اور 'نقوش' میں شائع ہوا تھا۔ لیکن مجھے تلاش کرنے پر 'نقوش' لاہور، اپریل 1960 میں ملا۔ لہٰذا اب درست یہی مانا جائے گا۔ شاید قبل لکھ لیا گیا ہو لیکن شائع بعد میں ہوا ہو۔

(مرتب)

('نقوش' لاہور، اپریل 1960)

حواشی:

1. فارسٹر کی نئی کتاب کا نام۔

ستمبر کا چاند

اور کونگ نے کہا
مجھے اب تک وہ زمانہ یاد ہے
جب مورخوں نے ان باتوں کے لیے
تاریخ کے صفحات خالی چھوڑ دیے تھے
جنھیں وہ نہ جانتے تھے
خوبانی کے شگوفے ہواؤں کے ساتھ
مشرق سے مغرب کی طرف اُڑ رہے تھے
اور میں اُن کو گرنے سے بچانے کی کوشش کر رہا ہوں

ایذرا پاؤنڈ (تیرھواں کنٹو)

"میں نے ایک روز ایک لڑکی کو دیکھا"
جو ایک چٹان پر اُ گی ہوئی گھاس پر جھکی رو رہی تھی
خزاں کی ایک خاموش شام

وہ گھاس تنہائی میں چپکے سے مرجھا گئی۔[1]

میں نے کتاب گھاس پر رکھ دی۔

''آزاد دنیا کے ہی مصنفین''۔۔۔۔ فرانسیسی ادیب نے کہنا شروع کیا۔

''ہم نے طے کیا تھا کہ کم از کم آج کی شام سیاست کی بات نہیں کریں گے۔ دیکھو یہ ادیبوں کا اجتماع ہے اور پولیٹیکل پلیٹ فارم بنتا جا رہا ہے۔'' میں نے اکتا کر جواب دیا۔

''پولیٹیکل۔۔۔۔؟ کل ہی تو میں نے بہت دیر تک جن تکامی سے جاپانی ناول میں خود وجودیت کی تحریک کے متعلق تبادلہ خیال کیا۔'' پھر دفعتاً وہ رُک گیا۔ سامنے سے چیکوسلواکیہ والا ٹہلتا ہوا آ رہا تھا۔ وہ مصور بھی تھا اور ہر سے خاموشی سے اسکیچ بنایا کرتا تھا۔

قریب کی ایک لاؤنج میں سے قہقہوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ شیشوں کے طویل برآمدے کے سامنے فوارے چل رہے تھے۔ دو امریکن مصنف بید مجنوں کے راستے پر سے گزر گئے۔

''اشٹین بک بے چارے اب تک زکام میں مبتلا اپنے کمرے میں بند پڑے ہیں۔ ژاں نے اظہارِ خیال کیا۔

'زکام وکام نہیں'۔ میں نے جواب دیا۔ وہ نکلنا نہیں چاہتے، ورنہ یہ جاپانی مارے عقیدت کے اُن کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالیں گے۔ تم کو کچھ اندازہ ہوا انگریزی زبان کے ادیبوں کی مقبولیت کا، یہاں کیا عالم ہے۔۔۔۔؟''

''واقعی ہر پڑھے لکھے جاپانی نے سارا مغربی ادب گھول کر پی رکھا ہے۔ تین تین یورپین زبانیں جانتا ہے مگر انکسار کا یہ عالم کہ بس بچھے جا رہے ہیں۔''

عین اسی لمحے ایک جید جاپانی ناول نگار آن موجود ہوئے۔ وہ سامنے کھڑے جھک جھک کر کہہ رہے تھے ''اگر آپ کو زحمت نہ ہو خاتون! تو اندر چلیے لاؤنج میں آپ کا انتظار ہو رہا ہے۔ اس کے بعد میرے نہایت ادنیٰ جھونپڑے میں قدم رنجہ فرما کر چا۔۔۔۔''

میں نے کتاب گھاس پر سے اُٹھالی۔ ارادہ یہ تھا کہ اگر چند منٹ کی مہلت ملے تو کسی

کونے میں بیٹھ کر پڑھوں گی مگر یہ جاپان ہے جہاں ادیبوں کی بین الاقوامی کانگریس کا انتیسواں سالانہ اجلاس ہونے والا ہے اور ہر جاپانی کا فرض ہے کہ وہ خاطروں کے مارے مہمانوں کی جان نکال لے۔ صبح جان اسٹین بک سے جب شکریے کے کوئی الفاظ نہ بن پڑے تو انھوں نے عاجز آ کر کہا کہ تعذیب کا سب سے خوب صورت طریقہ یہ ہے کہ اتنی تواضع کرو کہ مہمان آدھ موا ہو کر رہ جائے۔

امپیریل ہوٹل کی سُرخ قالینوں والی فرلانگوں لمبی گیلریوں میں رپ رپ کرتی خادمائیں سفید فراکوں میں ملبوس سائے کی طرح گزر رہی ہیں، کسی ایک گیلری میں سے مادام صوفیہ وادیا مدراسی ساری پہنے بالوں میں پھول لگائے باہر نکلتی ہیں اور کیمرہ مین ان کی طرف دوڑ پڑتے ہیں— گرل روم میں بیٹھے ہوئے ایلمر رائس یا آندرے شاؤزون کوئی دلچسپ سا جملہ کہتے ہیں اور وہ شام کے سارے اخباروں میں چھپ جاتا ہے کانگریس کے سکریٹریٹ میں رات رات بھر کام ہو رہا ہے۔ خداوندا! یہ تم نے ایک کانگریس اپنے ملک میں بلائی ہے یا اپنے شہنشاہ کی تاج پوشی منعقد کر رہے ہو۔ یہ جوش و خروش تو ہم نے ملکہ ایلزبتھ کے کارونیشن کے وقت انگلستان میں نہیں دیکھا تھا مگر جاپانی جو کام کریں گے اس میں تن من دھن سے لگ جائیں گے جان دے کر اسے مکمل ترین بنا ڈالیں گے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ اپنے شہنشاہ کو دیوتا سمجھ کر اس کی خاطر جنگ میں نہ کود پڑتے۔ اور پھر اپنی شکست کے بعد اسی ملک کی تعمیر نو چند سال میں ایسی نہ کرتے کہ آج وہ مغربی جرمنی کی طرح فری ورلڈ میں دوبارہ سب سے آگے نکل گیا ہے۔

یہ آدمیوں کی نہیں جناتوں کی قوم ہے۔

ہر اَن دیکھے ملک کے متعلق ایک بے تکا سا تصور ذہن میں موجود ہوتا ہے۔ جاپان کے متعلق بچپن میں مندرجہ ذیل تصورات تھے۔ ہیرا کیری گیشا گرلز، چیری کے شگوفے، فیوجی یاما، کیمونو سستا مال یعنی کہ علی گڑھ اور پنجاب کے میٹرک کو ہائی اسکول کے زمانے میں جاپانی میٹرک کہا کرتے تھے اس کے علاوہ ہر سستی چیز جاپانی کہلاتی تھی۔ پرل ہاربر کے بعد معلوم ہوا کہ درختوں اور پھولوں کی عاشق قوم فاشسٹ درندوں میں تبدیل ہو گئی ہے جس کا قلع قمع کرنا برطانوی

ہند کے ہر سپاہی کا فرض تھا۔ لاکھوں سپاہی ان پیلے وحشیوں سے لڑتے مشرق بعید اور برما کے محاذوں پر امر رہے۔ پھر یہ اطلاع ملی کہ یہ لوگ تو دراصل ایشیائی حریت کے علمبردار ہیں اور ایشیا کو مغربی شہنشاہیت سے نجات دلانے کے لیے جہاد کر رہے ہیں آئی این کے سورما سبھاش بوس کی قیادت میں ہندوستان کی آزادی حاصل کرنے کے لیے ان ایشیائی جانبازوں سے جا ملے۔ نتیجہ بہر حال یہ رہا کہ سارا مشرق بعید اور جنوب مشرقی ایشیا خون اور آگ کے سمندر میں ڈوب گیا۔

پھر ہیروشیما نے دفعتاً ہوا کا رُخ بدل دیا۔ ساری مہذب دنیا کی ہمدردی جاپان کو حاصل ہوگئی۔ ہیروشیما ایک عظیم لرزہ خیز سمبل قرار پایا۔

امریکہ کا قبضہ ہوا۔ میک آرتھر آیا۔ جاپانی معاشرے کی کایا پلٹی۔ وہ فیوڈل جنگ پرست رومینٹک سماج خواب و خیال بنا۔ شہنشاہ نے سوٹ پہنا اور وہ سورج دیوی کی اولاد کے درجے سے اُتر کر انسان بنا۔ جی آئی سپاہیوں نے جاپانی لڑکیوں سے شادیاں رچائیں۔ مارشل ایڈ آئی جاپان امریکہ کا اتحادی بنا اور اس وقت وہ ایک زبردست تجارتی اور صنعتی طاقت میں تبدیل ہو چکا ہے۔ دس سال کے ہیر پھیر میں کیا ہو گیا۔ (بہت سے ملکوں میں دس سال کے ہیر پھیر میں کچھ بھی نہیں ہوتا۔)

صرف تین دن قبل میں یہاں پہنچی تھی۔ اس وقت بحرالکاہل کی شمالی وسعتوں پر ہلکے پھلکے بادل تیر رہے تھے۔ افق کے قریب سمندر میں سے نکلے ہوئے پہاڑی سلسلے پر دھند جمع ہو رہی تھی۔ نیچے حدِ نظر تک سبز جزیرے تھے اور پائن کے درخت اور گاؤں اور ان پر تیرتے ہوئے بادلوں کو ہوائی جہاز کی کھڑکی میں سے مجھے دیکھ کر دفعتاً معلوم ہوا کہ جاپانی تصاویر کے ہلکے خطوط، ادب لطیف اور مدھم رنگوں کے کیا معنی ہیں۔

ہوائی جہاز سمندر پر اترتا دفعتاً رن وے پر آ گیا جو پانی سے ملی ہوئی تھی۔ فوٹوگرافروں اور مووی کیمرہ مین کی ایک فوج اپنے فلیش گنز سنبھال کر ہوائی جہاز کی طرف لپکی میرے ساتھ مشہور امریکن ڈرامہ نگار ایلمر رائس بھی ہانگ کانگ سے سوار ہوئے تھے جو جاپان میں بے حد مقبول ہیں۔ مختلف اوقات پر مختلف طیاروں سے دور دور کے ملکوں کے ڈیلی گیشن ایرپورٹ

پر اُتر رہے تھے اور بڑی زبردست چہل پہل تھی ٹوکیو کا عظیم الشان ایر پورٹ امریکنوں سے بھرا ہوا تھا۔ باہر امریکن فوجی گاڑیوں اور طیاروں کی قطاریں کھڑی تھیں۔ بے چارے جاپانی میں نے دل میں کہا۔

باہر آ کر ہم ٹوکیو کی طرف روانہ ہوئے۔ ''چند سال قبل یہ سارا شہر راکھ اور ملبے کا ڈھیر تھا دو تہائی ٹوکیو امریکن بمباروں نے تباہ کر دیا تھا۔ اس وقت یہ دُنیا کا سب سے بڑا شہر ہے'' جاپانی منتظم نے کار کی اگلی سیٹ پر سے مُڑ کر مجھے خطاب کیا۔

میں کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی تھی۔ شام کا اندھیرا گرتا آ رہا تھا اور دور سے ٹوکیو کی اسکائی لائن جگمگا اُٹھی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ کسی جگہ کا اوّلین امپریشن سب سے حقیقی اور دیرپا ہوتا ہے۔ سڑکوں پر موٹروں اور بسوں کی ریل پیل تھی۔ مغربی لباس پہنے عورتیں اور مرد نہایت سکون سے ٹرام کاروں کے انتظار میں قطاریں بنائے کھڑے تھے ہلڑ نہیں تھا خوانچے والے آوازیں نہیں لگا رہے تھے لاؤڈ اسپیکر سے فلمی گانے نشر نہیں ہو رہے تھے۔ کوڑے کے ڈھیر نہیں تھے۔ مگر۔ میں نے سوچا ویسٹ اینڈ تو دنیا کے ہر بڑے شہر کا مرعوب کن ہوتا ہے۔ یہاں سلمز بھی تو ہوں گے فقیر بھک منگی عورتیں ننگے پیر پھرنے والے آوارہ گرد بچے۔ میں ان سب کو ڈھونڈ نکالوں گی۔ موٹر انتہائی شاندار عمارتوں کے سامنے سے بے حد چوڑی سڑکوں پر سے گزرتی ایک پگوڈا کی وضع کی عمارت کی برساتی میں داخل ہوئی جس کے سامنے تالاب میں کنول کھلے تھے۔

یہ امپیریل ہے یہاں کا سب سے پرانا اور مشہور ہوٹل اور دُنیا کی گراں ترین قیام گاہوں میں سے ایک۔ اسے عظیم امریکن معمار فرینک لائیڈ رائٹ نے بنایا تھا یہ زلزلوں اور بمباری سے بچا رہا ہے۔ لوبی میں کانگریس کے مندوبین آ کر اتر رہے ہیں۔

''اے لو وہ ایلمر ٹو مرا دیا آئے۔''

''یہ اپنا بیگ سنبھالے جارج ایکشن اترے۔''

''ارے ڈوس پیسو بھی ہیں۔''

''او ہو ڈاکٹر سری نواس آئنگر بھی آن پہنچے۔''

''رادھا کرشنن نہیں آئے؟''

''نہیں۔ بلایا تو مولانا ابوالکلام آزاد کو بھی گیا تھا۔ مگر حکومت کی مصروفیات کی وجہ سے دونوں صاحبان نہیں آسکے۔''

''ہاں! ہاں! اور وہ کون ہیں؟''

''ارے یہی تو جان اسٹین بک ہیں!''

یہ بڑا زبردست اجتماع ہے اٹھائیس ممالک سے دو سو کے قریب مصنفین نے دنیا کے چاروں کھونٹ سے شرکت کی ہے۔ دور دراز آئس لینڈ اور برازیل سے لے کر آسٹریلیا اور لبنان تک سبھی موجود ہیں۔ مشرقی یورپ سے بلغاریہ، چیکوسلواکیہ، پولینڈ اور مشرقی جرمنی کے کمیونسٹ ادبا آئے ہیں مگر عوامی جمہوریہ چین یہاں موجود نہیں۔ کیونکہ آج جاپان اس ملک کے وجود سے ہی منکر ہے جس سے اس نے اپنی تہذیب مستعار لی۔

''سیاست تم ایشیائیوں کے اعصاب پر کیوں سوار رہتی ہے؟'' مصنوعی چٹان پر بیٹھے بیٹھے ژاں نے مڑ کر مجھ سے کہا۔

''یہ سوال تو آپ اسٹیون اسپنڈر سے کیجیے۔ آخر وہ شاعری پر اکتفا نہیں کرتے جس کی وجہ سے وہ مشہور ہوئے۔ سیاست تو میرے اعصاب پر اس لیے سوار ہے کہ اس کی وجہ سے ہم نے بڑے بھیانک دُکھ اٹھائے ہیں اور اس وقت بھی اٹھا رہے ہیں۔''

''اچھا تو آؤ زین فلسفہ پڑھیں۔ یہ جاپان ہے اور پائن کے درختوں پر خزاں کے بادل چھائے ہیں وغیرہ۔''

''زین کا مطلب تمھیں معلوم ہے؟'' میں نے پیشانی پر بل ڈال کر پوچھا۔

''نہیں۔''

''زین سنسکرت کے لفظ دھیان کی جاپانی شکل ہے اور چین سے یہاں آیا۔ اب آگے پڑھو۔''

اُس نے دوبارہ کتاب کھولی۔

''بیل تو کبھی نہ گما تھا پھر اسے ڈھونڈھنے سے کیا فائدہ۔ چرواہا خود اپنے کو کھوئے بیٹھا ہے۔ جنگل کی تنہائی میں چرواہا اپنے بیل ڈھونڈھ رہا ہے۔ چاروں اور پانی کے جھرنے ہیں اور پہاڑیاں اور پگڈنڈیاں تھکا ہارا وہ نہیں جانتا کدھر جائے۔ اسے تو صرف میپل کے جنگل میں ٹڈوں کے گانے کی آواز سنائی دے رہی ہے۔''

''سامنے سے مسٹر اسپنڈر گذرے وہ خاموشی سے باغ عبور کر کے اپنے کمرے کی اور جا رہے تھے۔

میں نے پھر کتاب اٹھالی۔

سُتروں کی مدد سے اس بیل کے نقش پا تو مل گئے ہیں۔ اسے معلوم ہے کہ گو برتنوں کی شکلیں مختلف ہیں مگر سونا ایک ہی ہے اور خارجی دنیا دراصل پرم آتما کی مظہر ہے لیکن ابھی تک وہ نیکی اور بدی میں تمیز نہیں کر پایا۔ ندی کے کنارے درختوں کے نیچے بیل کے قدموں کے نشان بکھرے ہوئے ہیں مگر خوشبودار گھاس اتنی گھنی ہے کہ چرواہا اس میں اپنا راستہ تلاش نہیں کر پایا۔''

جھیل کے کنارے ٹہلتے ہوئے چند فرانسیسیوں نے نیچی آواز میں گنگنانا شروع کر دیا۔ ایک جاپانی وائلن نواز درختوں کے جھنڈ میں دیبر بجا رہا تھا۔ فرانس نے سب سے پہلے بڑا وفد بھیجا ہے جس میں پچاس سے زیادہ خواتین اور حضرات شامل ہیں۔ فرانسیسی مقبوضہ الجزائر سے ایک مسلمان خاتون مادموزیل جمیلہ دربیش تشریف لائی ہیں مگر وہ غالباً خود کو مسلمان یا عرب کہلوانا پسند نہیں کرتیں لہٰذا میں عرصے تک انھیں فرنچ ہی سمجھا کی اکادمی فرانس کے رکن موسیو آندرے شازوں جو تنظیم کے بین الاقوامی پریذیڈنٹ ہیں یہاں بھی صدارت کریں گے۔ مصر سے سابق وزیر تعلیم ڈاکٹر محمد عوض تشریف لائے ہیں جو اسکندریہ یونیورسٹی کے ریکٹر ہیں۔ انگلستان سے اسٹیون اسپنڈر، اینگس ولسن ایلکس واہ اور مشہور ہنگرین نژاد مزاح نگار جارج مکیش کے علاوہ دس بارہ اور لیکھک بھی ہیں۔ ان میں سے ایک جے ایل کرینمر بنگ کیمبرج کا تاریخ اور چینی ادب کا اسکالر ہے WISDOM OF THE EAST کے سلسلے کی کتابوں کا ایڈیٹر اور پبلشر بھی آج کل ہانگ کانگ یونیورسٹی میں مشرق بعید کی تاریخ کا استاد ہے۔ یہ اور امریکہ کا ڈونلڈ کین کیمبرج میں

ہم جماعت تھے۔ ڈونلڈ کین جاپان کا مشہور مترجم اور اسکالر ہے اور کولمبیا یونیورسٹی میں جاپانی پڑھاتا ہے۔

مشرقی جرمنی کے ناول نگار بوڈو یوزے بنے بھائی کے دوست ہیں۔ پچھلے دنوں بنے بھائی جب مشرقی جرمنی گئے تھے تو انہی کے یہاں ٹھہرے تھے۔ اُن کی پہلی امریکن بیوی موجودہ مسز ایم این رائے ہیں۔ دوسری بیوی امریکن ہیں۔ یہ پچھلے سال ایشیائی ادیبوں کی کانفرنس میں دلّی گئے تھے۔

مغربی جرمنی کے نمائندوں میں ایک بوڑھے پھوس انڈولوجسٹ اور مستشرق ڈاکٹر ہیلمتھ فان گلیسپ شامل ہیں۔ یہ مغربی جرمنی کی ٹیوبنگین یونیورسٹی میں انڈولوجی اور فلسفہ مذہب کے اُستاد ہیں کانٹ اور مشرق کے مذاہب اور غیر مسیحی مذاہب اُن کی تازہ ترین تصانیف ہیں۔

ہندوستان سے ڈاکٹر سری نواس آئنگر آئے ہیں جو آج کل آندھرا یونیورسٹی میں انگریزی کے استاد ہیں۔ ترچنا پلی کے تامل ادیب اور فلسفی بہت بوڑھے ایم آر جمو ناتھن جن کے ہاتھوں میں رعشہ ہے اور جو پہلی بار اپنے وطن سے دُور طویل سفر پر آئے ہیں۔ مرہٹی ادیب دنا ئیک کرشنا گوکک جو عثمانیہ یونیورسٹی میں انگریزی کے پروفیسر رہ چکے ہیں۔ احمد آباد کے اسکول آف گجراتی لنگویج اینڈ لٹریچر کے ڈائریکٹر اوما شنکر جوشی بنگال کے مسٹر رائے مرہٹی ادیب پربھاکر۔ پدھیے بمبئی کی فرانسیسی نژاد مادام صوفیہ واڈیا نیویارک لندن اور پیرس کی یونیورسٹیوں میں انھوں نے سنسکرت پالی اور قدیم فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ ان پچھلے تیس سال سے بہت شدید قسم کی ہندستانی ہیں۔ ان کے علاوہ شریمتی کملا ڈونگر کیری ہیں جو کونکنی اور انگریزی کی مصنفہ ہیں اُن کے میاں بمبئی یونیورسٹی کے ریکٹر ہیں اور یہ خود انڈین ویمنز یونیورسٹی کی فیلو۔ الٰہ آباد کے شری واتسائن ہندی کے مشہور ادیب۔

انڈونیشیا سے علی سجان سلطان تقدیر تشریف لائے ہیں۔ جدید انڈونیشی ادب کے پیش رو اور فلسفی اور جکارتا کی قومی یونیورسٹی کے نائب صدر ہیں۔ اُن کے ایک ناول کا نام ''بتارن میگھ'' ہے۔ یعنی بکھرے ہوئے بادل۔ ایک ڈچ انڈونیشین ناولسٹ بھی آئی ہیں جو خود کو خالص

انڈونیشین کہلانا پسند کرتی ہیں اور بڑی زبردست قوم پرست ہیں۔

جنوبی کوریا سے خواتین و حضرات کی ایک کھیپ آئی ہے جن کو سیاسی پروپیگنڈہ ہی سے فرصت نہیں۔ ان سب کو خاصا کوڑ مغز سمجھا جاتا ہے۔

امریکہ سے اسٹین بک ڈوس پیسس، ہلمر رائس، جان ہرسی، ایلزبتھ وائننگ (جو چند سال پہلے جاپانی شہزادوں کی اتالیق بھی تھیں) اور ڈونلڈ کین یونیسکو کی نمائندگی فرانس کا روجر کیلودا کررہا ہے جو تنقید کی بہت سی کتابوں کا مصنف ہونے کے علاوہ پابلو نیرودا کے مترجم کی حیثیت سے بھی مشہور ہے۔ برازیل کا شاعر فاؤستینو نامسیتو نشاۃ ثانیہ کی ادبیات کا پروفیسر ہونے کے ساتھ ساتھ قانون داں بھی ہے اور برازیل کے سپریم کورٹ کا جج ہے۔ اسرائیل کا ادیب مصر والے سے نہیں بولتا۔ قوم پرست چینی کیمونسٹ ادیبوں سے کتراتے ہیں۔

ایک گروہ اور ہے یہ لوگ ''جلاوطن'' ادیب کہلاتے ہیں۔ یہ مشرقی یورپ کے لوگ ہیں جو زیادہ تر لندن، پیرس اور نیویارک میں رہتے ہیں۔ پولش جلاوطن الگونڈر جنٹا جس کی ایک کتاب غلامی کے صحن 1947 میں مہاتما گاندھی کے لکھے ہوئے دیباچے کے ساتھ چھپی تھی۔ اس گروپ میں ہنگرین جلاوطن پال تبوری سب سے زیادہ مشہور ہے۔ ان کی بی بی مادام تبوری جو کیٹ ہارلے کے نام سے لکھتی ہیں کسی زمانے میں پری رہی ہوں گی چالیس کے پیٹے میں ہیں مگر اب بھی بے حد خوب صورت نظر آتی ہیں۔ یہ بھی ہنگرین نژاد ہیں۔

فرانسیسی بہت زندہ دل، انگریز بے حد خاموش۔ اسٹین بک اپنی کتابوں کی مانند نکلے۔ چہرے پر ایسا ایکسپریشن رہتا ہے جیسے بے حد محظوظ ہو رہے ہوں۔ ایک مرتبہ کہنے لگے کہ مجھے لکھنے کی اتنی عادت پڑگئی ہے کہ گھر کے سودا سلف کا حساب بھی بیوی کو نہیں لکھنے دیتا خود ہی لکھتا ہوں۔ بلغاریہ کا ادیب معلوم ہوتا ہے کسی سنٹرل یورپین جاسوسی فلم میں ایکٹنگ کرکے چلا آرہا ہے۔ برازیل والا بھی عین مین لیٹن ایکٹر معلوم ہوتا ہے۔ یورپین اور جنوبی امریکن حسب عادت سخت شولرس ہیں۔ اینگلو سکسن ادیب اینگلو سکسن ہیں۔

ایک عظیم الشان دس منزلہ عمارت میں جو ایرکنڈیشنڈ، ساؤنڈ پروف اور الٹرا موڈرن طرز

تعمیر کا اعلیٰ نمونہ ہے اور اس طرح کی عمارات بعد از جنگ سینکڑوں کی تعداد میں تعمیر کر لی گئی ہیں کانگریس کی انٹرنیشنل ایگزیکٹیو کونسل کا پہلا اجلاس ہو رہا ہے۔ پانچویں منزل پر ایک ہال میں جہاں نشستوں کی ترتیب یو این او کے مانند بنائی گئی ہے۔ چھت میں چھپی ہوئی روشنیاں ستاروں کی مانند جھلملا رہی ہیں۔ چاروں اور کیمرے اور ٹیلی ویژن نصب ہیں۔ ایک دیوار پر لکڑی کی لمبی چوڑی ساؤنڈ پروف بالکنی میں مترجم لڑکے اور لڑکیاں ہیڈ فون لگائے مائیکروفون لیے بیٹھے ہیں۔ ساری کارروائی کا بیک وقت انگریزی اور فرانسیسی اور جاپانی میں فوری ترجمہ ہوتا جا رہا ہے۔ اس وقت کونسل کے سامنے ہنگرین ادبا کا مسئلہ ہے۔ بند کمرے کا اجلاس ہے لوگوں پر سخت سنجیدگی طاری ہے۔

سوال یہ ہے کہ ہنگری میں پچھلے دنوں لکھنے والوں پر جو ظلم توڑے گئے ہیں اُن کی تحقیقات کون کرے اور کس طرح۔ یہ بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔ بلی کے گلے میں گھنٹی باندھنے کون جائے اور سوال یہ ہے کہ بلی کون ہے۔

بڑا زبردست کھنچاؤ فضا میں پیدا ہو گیا۔ مشرقی یورپ کے نمائندے جو انگریزی نہیں سمجھتے اپنے اپنے ہیڈ فون پہن کر انہماک سے فرانسیسی ترجمہ سننے میں مصروف ہو گئے۔

موسیو پال تبوری نے جوش و خروش سے بولنا شروع کیا۔ یہ پچھلے بیس سال سے لندن میں رہتے ہیں پھر دوسرے ہنگرین پال اگنوٹس نے کہا "میرے وطن کے بہت سے ادیب پاگل ہو گئے ہیں جیلوں میں بند ہیں۔ ان کو تھرڈ ڈگری کیا گیا۔"

کیمونسٹ لکھک آرام سے بیٹھے سگریٹ پی رہے ہیں۔ پال تبوری کی تقریر کے بعد بڑے زور شور کی تالیاں بجیں۔ کیمونسٹ سگریٹ پیتے رہے۔ ہندوستان اور مصر کے نمائندوں نے بھی کسی جوش و خروش کا اظہار نہیں کیا۔ ہندوستان نے حسب معمول مصالحت کی پیش کش کی۔ ہنگری کے مسئلہ پر ووٹ لینے کے سلسلے میں ڈیڈ لاک پیدا ہو گیا۔

تب صدر آندرے شاڑوں نے ایک نہایت شاعرانہ تقریر کی۔

چونکہ یہ یو این او نہیں اور پیشہ ور سیاست والوں کے بجائے ادیبوں اور شاعروں کا اجتماع

ہے لہٰذا اس خالص سیاسی مباحثے میں بھی فصاحت و بلاغت تشبیہوں اور استعاروں کے ہر طرف سے دریا بہائے جا رہے ہیں۔

آندرے شازوں نے کندھے اچکا کر بڑی بے کسی سے کہا "میں اس وقت تنہا ہوں۔ میرے سامنے بڑا زبردست فیصلہ ہے میں کیا کروں کدھر جاؤں۔۔۔؟"

جنوبی کوریا کے نمائندے نے چلا کر کہا "ہنگری کو پی ای این کی تنظیم سے فوراً نکال باہر کیجیے۔ اصل ہنگرین ادیب وہ ہیں جو اس وقت جلاوطن ہیں کیمونسٹ ہنگری کا کوئی وجود ہم مانتے نہیں۔ جس طرح اصل چینی ادیب قوم پرست چینی ہیں کیمونسٹ چین مجرم ملک ہے۔"

اتنے میں کسی دل جلے نے ہال کے دوسرے کونے سے سوال اُٹھایا: "کیا میں پوچھ سکتا ہوں عوامی چین یہاں کیوں نہیں ہے؟" پھر ہنگامہ شروع ہوا۔

دوسری طرف ہنگرین جلاوطن بولے چلے جا رہے تھے۔ "میں کہتا ہوں ادیبوں کو جیل بھیجنا غلط ہے۔" وہ گرجے۔

ادیبوں کو برین واش کرنے کی کوشش کرنا بھی غلط ہے کسی اور بگڑے دل نے چپکے سے کہا۔

انطونی سلونی مسکی کے پہلو میں بیٹھا ہوا دوسرا پولش ادیب اب باقاعدہ سو رہا ہے۔

ہال کی ایک سمت سے کسی نے کہنا شروع کیا۔ "یہ کیسا رائٹرز کلب ہے جس میں عوامی چین سوویت یونین اور شمالی کوریا نہیں۔ یہ امپریلسٹوں کا کلب ہے۔"

پھر ہلہ ہوا ہر ایک نمائندے نے اپنے اپنے سامنے رکھے ہوئے مائیکروفون اپنی طرف کھینچے۔

جنوبی کوریا والا پھر چلایا۔ "ہنگرین پی این سی سنٹر ختم کر دینا چاہیے۔"

مصر نے کہا "اگر ایسا کیا گیا تو آپ کے لیے یہ تحقیقات کرنے کون جائے گا کہ وہاں ادیبوں پر کیا مظالم ہوئے۔ اس وقت تک وہاں کے ادیب اس سنٹر کے ذریعے بین الاقوامی تنظیم سے منسلک ہیں۔"

آزاد دنیا اور آزادی کا لفظ بار بار اِدھر اُدھر سے لڑھکایا جا رہا تھا۔

آزادی کیا شے ہے۔ میں نے سوچا۔ یہ بڑا مابعد الطبیعاتی سوال بن جاتا ہے۔ لکھنے والوں کی آزادی، سیاسی آزادی، ذاتی آزادی۔ فری ورلڈ کے لکھنے والے آزاد ہیں۔ جنوبی کوریا نے کڑک کر کہا۔

جبھی تو ہر وقت سیاسی پروپیگنڈہ کرتے رہتے ہیں۔ اسی بگڑے دل نے دوسرے سرے سے جواب دیا۔

''آزادی سے لکھنا میرا مقصد ہے۔ ایک بلجین ادیب نے کہنا شروع کیا۔ ہم کس طرح ہنگری کے متعلق فیصلہ کر سکتے ہیں۔'' میں نے فوراً ہیڈ فون پہنا۔ اس سے صرف ایک آدمی نے پال بتوری کی طرف اشارہ کر کے کہا'' وہاں کے گواہ اور پراسیکیوٹر اور جج کے فرائض انجام دیے ہیں۔ ہم محض اس ایک آدمی کی گواہی پر بھروسہ کر لیں گے؟ امریکن فرانسیسی اور برطانوی انصاف کے تصوّرات سے یہ رویہ مطابقت نہیں رکھتا۔''

میں نے جھک کر بائیں طرف جھانکا جدھر امریکن بیٹھے تھے۔ اب ایلمر رائس کے سونے کی باری تھی۔

اب مشرقی جرمنی کا نمائندہ کہہ رہا تھا۔ ہنگرین جلاوطن ادیب نے ہمیں جو کچھ بتلایا اس سے بالکل متضاد خبریں ہمیں بوڈاپسٹ سے موصول ہوئی ہیں۔

دوسری طرف سے ویت نام کے نمائندے نے فرانسیسی میں کہا۔ ہم امن کے نام پر یہاں جمع ہوئے ہیں اور ہم ویت نام کے ادیب چاہتے ہیں کہ امن کے لیے لکھیں۔

''امن''۔ میں نے دل میں سوچا۔ آزادی کی طرح آج کل کی اصطلاحات میں یہ ایک اور عجیب و غریب لفظ ہے۔

''یہ سب کیا ہو رہا ہے؟'' شام کو میں نے مسٹر رائے سے کہا ہم لوگ ایک شاہی محل کے ایسے عظیم الشان ایوان ضیافت میں ایک میز کے کنارے کھڑے کچی مچھلی نگلنے کی کوشش میں مصروف تھے۔

''ہمیشہ یہی ہوتا ہے۔'' انھوں نے کہا'' پچھلے دن میں جو کانفرنس ہوئی تھی اس میں بھی کیمونسٹ اور غیر کیمونسٹ کا جھگڑا شروع ہو گیا۔ تم اس میں کیوں نہیں آئیں؟''

''مجھے بلایا تو گیا تھا'' میں نے مچھلی کے کانٹے نکالتے ہوئے جواب دیا'' مگر میں اپنے آپ کو ایمان دار سمجھتی ہوں اور ایمان داری کا تقاضا یہ تھا کہ میں پاکستان کی نمائندگی دِتی میں نہیں کر سکتی تھی یہ ایک تیسرا ملک ہے۔ غیر جانب دار زمین۔''

''میں تمھارا مطلب سمجھتا ہوں۔'' انھوں نے کہا'' مجھے ڈھاکے میں بنگالی ادباء کی کانفرنس کے لیے بلایا گیا تھا۔ لیکن مجھ میں جانے کی ہمت نہ ہوئی۔''

ایک امریکن ادیب نے قریب آ کر کھانے پر اظہار خیال شروع کیا۔'' میں آپ لوگوں کی باتوں میں مخل تو نہیں ہوا؟'' اس نے کہا۔

''نہیں تو۔'' مسٹر رائے نے جواب دیا۔'' ہم لوگ اپنے خاندانی جھگڑے کی باتیں کر رہے تھے۔ جب ایک خاندان میں پھوٹ پڑ جائے اور دو سگے بھائی اپنے آبائی مکان کا بٹوارہ کر کے علاحدہ ہو جائیں تو ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ ان میں دوبارہ اتفاق پیدا ہو سکے۔

مسٹر رائے آئی سی ایس سے ریٹائر ہونے کے بعد شانتی نکیتن میں رہتے ہیں۔

''میری آخری پوسٹنگ مرشد آباد میں تھی۔'' انھوں نے کہا'' درمیان میں گنگا ہے دوسرے کنارے پر راج شاہی ہے گنگا میں کشتی کی اگر چند لہریں اُدھر ہو گئیں تو پاکستان میں پہنچ جاتی ہے۔ وہاں خوب اسمگلنگ ہوتی تھی اور واقعات جو نئی انڈو پاکستان اصطلاح میں سرحد کے تنازعات کہلاتے ہیں۔ دونوں طرف سے گولیاں چلتی تھیں اور لوگ مارے جاتے تھے گنگا کے ہندستانی کنارے پر کھڑے ہو کر دیکھو تو راج شاہی کی سول لائنز کی کوٹھیاں نظر آتی ہیں جہاں پاکستان سول سروس کا حاکم رہتا تھا اور وہ بھی اس طرح اسمگلنگ کی روک تھام اور بارڈر کے جھگڑوں کے سلسلے میں گولیاں چلواتا تھا۔ راج شاہی بھی ایک زمانے میں میرا وطن تھا۔''

اور ممکن ہے کہ راج شاہی کے اس حاکم ضلع کا وطن مرشد آباد رہا ہو۔

''بالکل ایسا ہو سکتا ہے۔''

یہ ٹوکیو کے ایک عظیم الشان کلب کا جگمگاتا ہوا ہال نہیں تھا جس میں سینکڑوں اجنبی غیر ملکی ڈنر سوٹ اور ایوننگ گاؤن پہنے ہاتھوں میں شمپین کے گلاس لیے کلچر اور امن کی باتیں کر رہے تھے۔ ہم تو اس وقت گنگا کے اندھیرے ساحل پر کھڑے تھے دکھیاری گنگا جس کی لہروں پر کشتیاں چل رہی تھیں جن میں چراغ ٹمٹماتے تھے اور ملاح بھٹیاری گاتے ہوئے سامنے سے گزر رہے تھے۔ اس اندھیرے میں دونوں ساحلوں پر آمنے سامنے بندوقیں تانے سپاہی ایک دوسرے کی طرف رُخ کیے بیٹھے تھے۔ یہ بڑا ہولناک منظر تھا۔ یہ میرے لیے ہیروشیما کے تصور سے زیادہ لرزہ خیز تھا۔ میں ہال کے دوسرے سرے جہاں ایک امریکن بڑھیا، ایک نامور امریکن شاعر کی بیوہ ایک کونے میں چپکی کھڑی تھی۔

''کہیے کیا حال چال ہیں؟'' میں نے اس سے کہا۔

''سنو! امریکن بڑھیا نے اچانک اس طرح مجھے مخاطب کیا گویا کوئی بے حد اہم بات بتانے والی ہو۔'' سنو۔ مدتیں گزریں۔ اس نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔ جب میں ایک نوجوان لڑکی تھی اور پیرس میں پڑھتی تھی ایک جاپانی طالب علم سے مجھے عشق ہو گیا جو وہاں آرٹ سیکھ رہا تھا ہم دونوں شادی کرنا چاہتے تھے مگر کچھ ایسا ہوا کہ اس نے جاپان واپس آ کر ہم وطن لڑکی سے شادی کر لی اور میں امریکہ لوٹی اور میری بھی شادی ہو گئی۔ اس کے بعد سے میں نہیں جانتی وہ کہاں ہے اور کیا کرتا ہے۔ ابھی میں نے سنا کہ وہ زندہ ہے اور یہیں موجود ہیں۔ تمھارا کیا خیال ہے۔ مجھے اس سے ملنا چاہیے یا میں خواب کو خواب ہی رہنے دوں؟''

''خواب کو''۔ میں نے اس سے کہا ''خواب ہی رہنے دیجیے۔''

تو گویا تمھارا خیال ہے کہ مجھے اس سے نہیں ملنا چاہیے۔

''نہیں۔''

''تم ٹھیک کہتی ہو۔'' وہ خاموش ہو گئی اور اُدھر دیکھنے لگی جدھر جان اسٹین بک چند جاپانی نوجوانوں کے مجمع میں گھرے کھڑے تھے ہال کی سنہری اور روپہلی منقش چھت اور دیواروں پر ان گنت جھاڑ فانوس جھلملا رہے تھے۔ بالکنی میں آرکسٹرا اب ایک بہت پرانی دھن بجا رہا تھا شاید

یہی دُھن اس بے چاری بڑھیا نے چالیس سال پہلے 13 عیسوی کے پیرس میں سنی ہو۔ جب وہ ایک نو جوان لڑکی تھی اگر وہ مصور اس سے اس سے ملے تو اسے ایک حسین امریکی بلونڈ کی جگہ ایک بوڑھی عورت نظر آئے گی، موتیوں اور زیوروں سے لدی ڈھیروں پوڈر اور سرخی منہ پر لگائے خشک بالوں پر مضحکہ خیز ہیٹ پہنے ہوئے، موٹی بے ہنگم امریکن بڑھیا اور وہ خود بلا عینک لگائے سفید بالوں، سوکھے مرجھائے چہرے اور اداس چندھی آنکھوں والا ایک جاپانی بوڑھا ہوگا وہ ناگاساکی میں ختم ہو چکا اور اس بڑھیا کو غلط اطلاع ملی ہو کہ وہ زندہ ہے اور اس وقت اسی دعوت میں موجود ہے۔

دوسری صبح کانگریس کا کھلا افتتاحی اجلاس تھا جو ایک بہت بڑے ہال میں منعقد کیا گیا۔ اس روز اٹھارہ سو ملکی اور غیر ملکی ادیبوں کا مجمع تھا۔ ٹیلی ویژن، کیمرے، آرک لائٹس مختلف اقوام کے جھنڈے پریس کے نمائندے۔

اونچے پریزیڈیم جاپان کے سب سے پہلے ناولسٹ نے استقبالیہ تقریر کی جس کو ایک چینی فلسفی کے مقولے پر ختم کیا۔ ''بھائیو! کیا یہی کم خوشی کی بات ہے اتنی دور دور سے ملنے کے لیے آئے ہیں۔''

ان کے بعد جاپانی وزیر خارجہ بولے جو مصور بھی ہیں۔ آندرے شازوں نے ان کو جواب دیا۔ پچھلی جنگ میں ہم میں سے بہت سے ایک دوسرے کے دُشمن تھے یا دوست تھے جنگ کی قبریں ہمارا مشترکہ ماضی ہیں اور اُن کے سامنے جھکے ہم پوچھ رہے ہیں کہ ہمارا مستقبل کیا ہوگا۔ جنگ کے بعد بہت سے جاپانی نوجوانوں کو وار ٹریبونل کی طرف سے سزائے موت ملی تھی۔ مرنے سے پہلے ان لڑکوں نے جو خط لکھے۔ اُن میں سے ایک بیس سالہ نوجوان نے ماں کو صرف اتنا لکھا تھا۔

''میں نے لفظ کل کاغذ پر لکھا ہے اور میں اسے دیکھ رہا ہوں۔''

یہ بیس سالہ لڑکا جو مرنے کے لیے جا رہا تھا انسانیت کے اس پورے ڈرامے کو اس نے اس مختصر سے جملے میں قلم بند کر دیا۔

دنیا کے ادیبو! کیا یہ ہمارا فرض نہیں کہ ہم بیس سالہ لڑکوں کو موت کے سائے سے آزاد ہو کر زندگی کی روشنی میں کلی کا نظارہ کرنے کا موقع دیں۔"

اب جان اسٹین بک آئے اور ایسا لگا جیسے سوتے سوتے جاگے ہوں اور اُنھوں نے ہچکیوں کی سی آواز میں کہا۔

"خواتین و حضرات۔ میں بے حد خوش ہوں اور بے حد میری عزت افزائی ہوئی لیکن یہاں میں بالکل بھونچکا کھڑا ہوں۔ مجھے آج صبح تک نہ معلوم تھا کہ مجھے بھی بولنا ہوگا میں بہت مختصر تقریر کروں گا۔ میرا اس کانگریس سے بہت قریبی تعلق ہے یہ ایشیا میں پہلی کانگریس ہے اور اصلیت یہ ہے کہ میری بھی پہلی کانگریس ہے۔

جب میں نیویارک سے چل رہا تھا تو ایک دوست نے کہا تھا فکر نہ کرنا۔ بس سنتے رہنا۔ میں جاپان پن کلب کا شکر گزار ہوں۔ یہاں آ کر مجھے معلوم ہوا کہ صرف سننا ہی کافی نہیں، غور سے سننا ضروری ہے۔ اب میں بیٹھ کر غور سے سنوں گا اور وہ واپس جا کر بیٹھ گئے۔

ابوالمنصور احمد جو پاکستان کے اس وقت کے وزیر تجارت تھے بنگالی کے صحافی اور طنز نگار کی حیثیت سے اس کانفرنس میں آنے والے تھے مگر کراچی سے روانہ ہونے سے ایک روز قبل مرکزی حکومت میں کرائسیس آ گئی لہٰذا انھوں نے سفر منسوخ کر دیا۔ ان کی جگہ پاکستان کے سفیر ڈاکٹر عمر حیات ملک مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے کانفرنس میں شامل ہوئے۔

دوپہر کو انڈسٹریل کلب میں لنچ تھا یہ کلب بھی اس ملک کی صنعتی ترقی اور دولت کا مظہر تھا۔

لنچ کے دوران میری میز پر ایک صاحب آن بیٹھے۔ ایک جاپانی نے جو برابر کی کرسی پر بیٹھا تھا اُن سے کہا "میں اس قدر خوش قسمت ہوں کہ ٹیگور سے ملاقات کا شرف حاصل کر چکا ہوں عرصہ ہوا جب وہ جاپان آئے تھے۔"

پاکستانی مہمان نے اس بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ جاپانی نے گھبرا کر ان کو دیکھا اور پھر خود بھی چپکا ہو رہا۔ شاید اسے احساس ہوا کہ اس نے غلط بات کہہ دی ہے۔ اس کے برابر میں

دوسری طرف مشرقی پاکستان کے ایک ادیب بیٹھے تھے اور شاید اب تک وہ دونوں ٹیگور ہی کی باتیں کر رہے تھے۔ مشرقی پاکستان کے یہ ادیب بھی ہر بنگالی کی مانند خواہ وہ پاکستانی ہو یا ہندستانی ٹیگور کے پرستار تھے۔ مغربی پاکستان کے مہمان کی معنی خیز خاموشی پر وہ چپ ہو گئے۔ چند لمحوں بعد مقابل میں بیٹھے ہوئے ایک یورپین نے دوسرا موضوع چھیڑ کر موقع کو سنبھالا۔

میں نے مغربی پاکستان کے ان مہمان سے آہستہ سے کہا ''ٹیگور کے مسئلے پر آپ کی کیا رائے ہے؟''

''جی؟''

''میرا مطلب ہے کہ ٹیگور بنگالی کا عظیم ترین شاعر ہے اور بنگالی پاکستان کی ایک سرکاری زبان ہے تو اس حساب سے ٹیگور بھی پاکستانی شاعر ہوا۔''

''دیکھیے میں عرض کروں۔'' میں نے گلا صاف کیا۔ ''آپ نذرالاسلام کو بڑا زبردست پاکستانی شاعر مانتے ہیں جس غریب کو پاکستان کے وجود کی بھی خبر نہیں اور وہ کلکتے میں پڑا زندگی کے دن پورے کر رہا ہے تو پھر ٹیگور کو آپ پاکستان کا شاعر کیوں نہیں مانتے جب کہ آپ کو مشرقی پاکستان کے ہر گھر میں قائداعظم کی تصویر کے ساتھ ساتھ رابندر ناتھ ٹیگور کی تصویر بھی دیواروں پر آویزاں نظر آتی ہے مطلب یہ کہ اس بے چارے جاپانی نے مارے اخلاق ٹیگور کے متعلق آپ سے بات کی تو آپ خاموش ہو گئے اور وہ بے حد کھسیانا ہوا۔ سوال یہ ہے کہ کلچر کی تقسیم کے بعد ٹیگور اور اقبال جیسی عظیم بین الاقوامی ہستیوں کو کس طرح تقسیم کیا جائے۔''

انھوں نے اس کا بھی کوئی جواب نہ دیا۔ میں ناچار پھر کھانے کی طرف متوجہ ہو گئی۔

شام کو ہم سب ٹوکیو سے باہر ایک پرستان کے ایسے باغ میں عصرانے کے لیے جاتے ہیں جہاں سبزے پر لکڑی کے ٹی ہاؤس میں کاغذی قندیلیں روشن ہیں۔ پائن کے درختوں کے پیچھے سے پورنماشی کا چاند طلوع ہو رہا ہے جس کی روشنی میں باغ کے جھرنے جھلمل کر رہے ہیں۔ سبزے پر گڑیوں کی طرح سجی ہوئی گیشا لڑکیاں مہمانوں کی تواضع کر رہی ہیں۔ سامنے ان کا ایک اور گروہ اپنے کلاسیکل رقص دکھا رہا ہے (جو بے حد معمولی اور بے جان ہیں) ٹی ہاؤس کی سیڑھیوں

پر جاپانی سازوں کا آرکسٹرا بے سری موسیقی بجا رہا ہے۔

ایک خوش شکل جرمن کیتھولک فادر جو یہاں کسی یونیورسٹی میں ادبیات کا استاد ہے (ٹوکیو میں 79 یونیورسٹیاں ہیں علاوہ ڈگری کالجوں کے یہ ناقابل یقین بات ہے لیکن صحیح ہے) کرسی قریب کھینچ کر مجھے اس رقص کے معنی سمجھا رہا ہے۔

فادر ایکس "بیس سال سے جاپان میں ہے رومن کیتھولک راہب ہے مگر خاصا رنگین مزاج معلوم ہوتا ہے۔" جانے اس کی کیا کم بختی آئی تھی کہ راہب بن گیا۔" ایک فرنچ لڑکی مجھ سے چپکے سے کہہ رہی تھی۔ "اب پچھتاتا ہوگا۔"

"عجیب بات ہے۔" میں اس سے کہتی ہوں۔ "جاپانی اس قدر شاعرانہ مزاج کے مالک ہوتے ہوئے بھی میٹافزیکل بالکل نہیں۔"

"ہاں! ژاں نے نزدیک آتے ہوئے کہا۔" حالانکہ زین فلسفہ۔"

چاند اب تیرتا تیرتا ٹی ہاؤس کے اوپر پہنچ چکا ہے۔

"افسوس کہ یہ اگست کا نہیں ستمبر کا چاند ہے۔" فادر ایکس ہنس کر کہتا ہے۔

اسٹیون اسپنڈر قریب ایک مونڈھے پر بیٹھے سوچ میں ڈوبے گھاس کو دیکھ رہے ہیں۔ کبھی کبھی گیشا لڑکیوں کے ناچ پر بھی اچٹتی سی نظر ڈال دیتے ہیں۔ باغ میں جھرنے کے گانے کی آواز دفعتاً تیز ہوگئی ہے۔ پائن کے درختوں کے پرے سے بانسری کی آواز بلند ہو رہی ہے۔

"چرواہے نے آواز سن کر راستے کا پتا لگا لیا۔ اس کے ذریعے اس نے چیزوں کی ابتدا پر نظر ڈالی اور اس کے حواس میں سرگم کی سی ہم آہنگی پیدا ہوئی۔

اس نے دیکھا کہ جب آنکھ کو صحیح اشارہ ملا تو اسے خود اپنا پتہ بھی مل جائے گا شاخ پر کوئل گا رہی ہے۔ سہانی ہوائیں چل رہی ہیں اور ندی کے کنارے بید مجنوں سبز ہیں بیل تو وہاں خود ہی موجود ہے وہ کہاں چھپ سکتا ہے۔ اس کا خوب صورت سر شاندار سینگوں سے مزین ہے کون مصور اس کی تصویر کھینچے گا؟

لڑکے نے بیل کو مضبوطی سے پکڑ لیا مگر اے لو! بیل تو رسہ تڑا کر پھر گہر آلود پہاڑیوں میں

جا چھپا۔

چرواہے کو اپنا سونٹا اور رستہ کبھی نہ کھولنا چاہیے تا کہ بیل دُنیا کی ناپاکیوں میں گم نہ ہو جائے لیکن اگر بیل کی رکھوالی کی گئی تو وہ خود ہی شدھ ہو جائے گا اور آپ سے آپ چرواہے کے پیچھے چلنے لگے گا۔

کشمکش ختم ہوئی۔ اب لڑکا اپنے بیل پر بیٹھا شام کے دھندلکے میں بانسری بجاتا گھر جا رہا ہے۔ اس کا دل خوشی سے معمور ہے۔

کیا اب یہ بھی بتانے کی ضرورت ہے کہ اسے گیان مل گیا ہے؟"

صبح ہوئی۔ معزز غیر ملکی مہمان سائکی کا ئیکان جانے کے لیے امپیریل سے نکلے۔

صبح۔ ٹوکیو اپنے کام پر جا رہا ہے۔ یونیورسٹیاں، دفاتر اور کارخانے جاگ اُٹھے ہیں چوراہوں پر ٹریفک کے حادثات سے مارے جانے والوں کے اعداد و شمار کرکٹ کے اسکور کی طرح بورڈز پر بدلتے جا رہے ہیں۔ اس وقت تک پندرہ مارے گئے، ستائیس زخمی ہوئے بائیس مارے گئے پچاس زخمی ہوئے تیس مارے گئے۔

زندگی کے اس ہنگامے سے بے نیاز امپیریل محلات کے گرداگرد خندق میں راج ہنس گردنیں اٹھائے سکون سے پانی کی نیلی لہروں پر تیر رہے ہیں۔

شہر کے وسط میں شاہی محلات ہیں جن کے چاروں اور کئی میل کی وسعت میں پائن کے جھنڈ پھیلے ہیں۔ ان باغوں کو فصیل نے گھیر رکھا ہے اور اس فصیل کے گرداگرد بے حد خوب صورت پچاس فٹ گہری خندق ہے جس کے کنارے پر بید مجنوں جھکے ہوئے ہیں۔

اس خندق کے چاروں اور ٹوکیو آباد ہے۔

محل کے صدر دروازے کے پل پر کھڑے ہو کر دیکھئے تو پارک کے اُدھر وہ عمارت نظر آتی ہے جہاں مک آرتھر رہتا تھا۔

راج ہنس تاریخ کے ان بھونچالوں سے بے نیاز پانی پر تیر رہے ہیں۔ روز صبح خندق کے کنارے کنارے چوڑے ایونیو پر سے گزرتے ہوئے ہم ان راج ہنسوں کو دیکھتے ہیں۔

بسیں آگے پیچھے سانکی کا یکان پہنچ گئیں ہلکی ہلکی بارش ہو چکی ہے۔ فل بوٹ اور برساتیوں میں ملبوس ٹوکیو کے شہر انگریزوں کی سی سنجیدہ شکلیں بنائے سڑک پر سے گزر رہے ہیں۔

چاروں اور بے حد دلچسپ گفتگو ہو رہی ہے۔

مغربی ادیب شرم سے پانی پانی ہے اور اپنے ماضی کے جرائم کا کفارہ ادا کرنے کی خاطر بیٹھا زین فلسفہ پڑھنے کی کوشش کر رہا ہے یا دانتوں تلے اُنگلی دبائے اس دنیا کے نظارے میں مصروف ہے۔ ٹیلی ویژن اسٹیشن بیلے انڈر گراؤنڈ ٹرینیں تھیٹر فلم اسٹوڈیو ڈیپارٹمینٹل اسٹور، اداکار مصور ادیب سائنسداں مندروں کے راہب یونیورسٹیوں کے پروفیسر۔ یہ کیسے عجیب و غریب لوگ ہیں۔ یہ کون انوکھی نسل ہے کہاں سے آئی ہے ایشیائی ماضی میں اس کی داستان کا پہلا باب کہاں سے شروع ہوتا ہے۔

لوبی کے دریچوں کے باہر بارش شروع ہو گئی ہے۔ رفتہ رفتہ دھند بڑھتی جا رہی ہے۔ سنہرا کہرہ آسمانوں پر سے اتر رہا ہے وہ سر بہ فلک عمارتوں پر چھا گیا ہے باغوں پر برس رہا ہے۔ لاؤنج کے ایک کونے میں اٹلی کا ایک کیتھولک دانشور خاموش بیٹھا ہے۔ اس کی روح اس دھندلکے کو چیر کر گیان پا سکتی ہے؟

پتہ نہیں ہم میں سے کس کو یہ حق ہے کہ دوسرے کے گیان کے متعلق فیصلہ کریں۔

پہاڑیوں پر چرواہا بانسری بجاتا اپنے گھر کی اور جا رہا ہے۔ باغوں میں سانچی کے پھاٹکوں کے نیچے سے لڑکیاں پھول اٹھائے گزر رہی ہیں شنتو معبدوں میں چراغ روشن کر دیے گئے ہیں دھند بڑھتی جا رہی ہے۔

اب سب چیزیں دھندلکے میں ڈوب گئیں۔ سوریہ دیوی کے بیٹے ہیرو ہیٹو کا محل اسی الوہی کہرے میں چھپ گیا۔ خندق کا نیلگوں پانی آسمان کی سیال روشنی سے جا ملا۔ اب زمین اور آسمان ایک ہے۔ وجود اس روشن خلا میں سما گیا (یہ زمین نروان کا احساس ہے؟)

وقت کا شنتو کاہن اپنی قندیل لیے راستے پر پیچھے کی اور پلٹا۔ قندیل کی لو اونچی کر کے اسے تیز ہواؤں کے تھپیڑوں سے بچاتا پہاڑی پر چڑھا اور بانس اور پائن کے تاریک جنگلوں میں

جا گھسا۔

جنگل میں جگہ جگہ سرخ رنگ کے چھوٹے چھوٹے ستون تھے جن کی کھڑکیوں میں چراغ جل رہے تھے جنگل کے چاروں طرف ٹھاٹھیں مارتا شمالی سمندر تھا اور خالص وسعت کا احساس۔

شنتو کاہن نے قندیل اونچی کر کے کہا۔

''ابتدا میں آسمان اور زمین ایک تھے اور محض انتشار تھا۔ اس انتشار میں سے لطیف حصہ اوپر اُٹھا اور آسمان بنا ٹھوس حصہ نیچے گرا اور زمین کی تشکیل ہوئی۔ ان دونوں کے درمیان سے معاً ایک شے برآمد ہوئی۔

جو خدا تھا۔

پھر چار دیوتا اور پیدا ہوئے اور انھوں نے سات مزید دیوتاؤں کو جنم دیا۔ اُن کی آخری اولاد ازانگی دیوتا اور ازانامی دیوی تھے۔

ازانگی اور ازانامی کی اولاد جاپان ہے۔

جاپان دیوتاؤں کے حکم سے پیدا ہوا۔ سمندروں پر تیرتا ہوا ملک ازانگی اور ازانامی زمین کے درمیان معلق پل پر کھڑے تھے۔ انھوں نے دیوتاؤں کا دیا ہوا ہیرے جواہرات کا نیزہ سمندر میں ڈبویا اور سمندر کا جھاگ جو اس کی نوک پر لگا اس کے گرنے سے یاماٹو کے آٹھ جزیروں کی تخلیق ہوئی اس کے بعد ازانگی دیوتا اور ازانامی دیوی کے یہاں جاپانی نسل پیدا ہوئی۔

ازانگی اور ازانامی کی پہلی اولاد سوریہ دیوی اور چاند دیوتا تھے ان دونوں کے یہاں وہ سارے دیوتا پیدا ہوئے جو کائنات پر حکمرانی کرتے ہیں۔ اگنی دیوی کو جنم دیتے وقت دیوی ازانامی مرگئی اور اس کا آسمانی شوہر غم و غصّے کے عالم میں اس کے پیچھے پیچھے موت کی دُنیا تک جا پہنچا۔ لیکن ازانامی اب پاتال کی دیوی بن چکی تھی۔ دیوتا واپس لوٹا اور سورج کے محل میں رہنے لگا۔ اس وقت زمین اور آسمان سے دور چلی گئی تو سوریہ دیوی نے اپنے پوتے جموتینو کو جاپان کا پہلا شہنشاہ بنا کر دُنیا میں بھیجا۔

جاپانی دیوتاؤں کی اولاد ہیں۔ جاپان کا شہنشاہ سوریہ دیوی کا بیٹا ہے۔ یہ جزیرے مقدس

ہیں۔ ہماری قوم مقدس ہے ہمارے آباؤ اجداد مقدس ہیں۔ کاہن قندیل سمیت اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

دھند چھٹی۔

نکلتے سورج کی روشنی میں نظر آیا کہ ان جزیروں پر واقعی ایک عجیب و غریب دُنیا آباد ہے۔ خوب صورت گاؤں، جھرنے، لکڑی کے پل، چھوٹے چھوٹے قدوں والی خوب صورت عورتیں سر پر سفید رومال باندھے چاول کے کھیتوں میں جھکی تھیں۔ ان جزیروں کے سلسلے میں ایک نسل بستی تھی جس کے ٹھورٹھکانے کا کسی کو پتہ معلوم نہ تھا۔ اُن کی زبان اُن کی دیومالا۔ اُن کی روایات ساری دُنیا سے بالکل مختلف اور علاحدہ تھیں۔

یہ قدیم یاماٹو قوم ہے۔

اُن کی زبان کا دُنیا کی کسی دُوسری زبان سے کوئی تعلق نہیں۔ ماہر لسانیات۔ نے کہا۔

یہ لوگ بحرالکاہل کی دور افتادہ پولی نیزین نسل کی اولاد ہیں۔ ان میں سے بہت سے افریقہ کے سفید فام تورانی ہیں جو لاکھوں برس قبل جنوبی ہند، جنوبی ایشیا اور چین سے گزرتے یہاں پہنچے۔ اینتھر وپولوجسٹ نے کہا۔

عیسیٰؑ کی پیدائش کے پانچ سو سال بعد ہندوستان سے ایک عظیم لہر اُٹھی اور چین اور کوریا کے راستے ان جزیروں تک پہنچی 522 عیسوی کے بعد سے چین کے رسم الخط اور ہند کے مہایان فلسفے نے اس ملک کی موجودہ تہذیب کی تشکیل کی۔ مورّخ نے کہا۔

شنتو کاہن ان سارے فیصلوں سے بے نیاز مندر میں آ بیٹھا۔ آبا کی پوجا میں مشغول ہے۔ لکڑی کے مکانوں کے آنگنوں میں ننھے ننھے معبدوں کے سامنے لوبان جل رہا ہے۔ ایٹمی سائنسدان اپنے دارالتجربے سے گھر لوٹنے کے بعد چپل اُتار کر اپنے کمرے میں شنتو معبد کے آگے سر جھکا دیتا ہے اور بدھ کی مورتی پر پھول چڑھاتا ہے۔

چنانچہ جاپان کی اصل تاریخ 522 عیسوی سے شروع ہوتی ہے۔

مصر، چین، ہندوستان، ایران اور عراق کے برعکس یہ تو بے حد مختصر سا تاریخی وقفہ ہے

صرف سوا تیرہ سو سال مشرق کے ماضی کے اتھاہ سمندر میں تو یہ کچھ بھی نہیں۔

جاپانی ادب کی تاریخ بھی اسی وقت سے شروع ہوتی ہے۔

جاپانی ادب بھی سوا تیرہ سو سال پرانا ہے۔

آٹھویں صدی عیسوی میں نارہ میں دارالسلطنت قائم ہوا۔ اس وقت جاپان میں چینی زبان اور ادب کو وہی اہمیت حاصل تھی جو ہم عصر ہندوستان اور یورپ میں سنسکرت اور لاطینی کو ملی ہوئی تھی۔ ہندوستان سے بہت سے سنسکرت کے الفاظ اور حروف فلسفے اور فن سنگ تراشی کے ساتھ یہاں پہنچے۔ علم حسب معمول پروہتوں اور سرکاری افسروں کی ملکیت رہا۔ کوجیکی نثر میں پہلی کتاب ہے جو شاہی فرمان کے بموجب 1972 میں لکھی گئی 700 سے 800 تک دارالسلطنت میں تاریخ قانون طب قدیم چینی ادب اور جمالیات کی تعلیم کے لیے اسکول قائم کیے گئے خوبصورت مندر تعمیر ہوئے باغات لگائے گئے۔ چین کا ثقافتی اثر گہرا ہوتا گیا۔

جاپان کا شاعر مناظر فطرت کا عاشق تھا۔ اس نے اپنے اشعار میں گرتی برف کا ذکر کیا اور ندیوں میں کھلتے پھولوں کا اور خزاں میں مرجھاتی گھاس کا۔ اس کے یہاں گہرا فلسفہ نہیں تھا (آج تک نہیں) جاپان کی ساری شاعری اور مصوری امپریشنسٹ رہی ہے کھیتوں پر تیرتے ہلکے پھلکے بادلوں اور نازک رنگوں کا فن جاپان کی ان چھوٹی چھوٹی نظموں نے مغرب کی امیجسٹ شاعری کو متاثر کیا۔ یہاں کی مصوری نے انیسویں صدی کے آخر میں یورپ میں امپریشنسٹ مصوری کی پوری تحریک کو آگے بڑھایا اور اُن کو تاثرات کی ایک نئی دنیا دریافت کر کے دی۔ اس مصوری نے بنگالی اُستاد کو متاثر کیا اور رابندر ناتھ ٹیگور، نند لال بوس نے آبی رنگوں کے واش کی تکنیک کو بنگالی اسکول میں رائج کیا (عبدالرحمٰن چغتائی بھی بنگالی اسکول کے شاگرد تھے)

نارا کے شاہی دربار میں شاعروں کا اجتماع ہوا۔ خود شہنشاہ شاعری کرتے تھے ساتویں صدی کے ایک شہنشاہ کے اشعار ہیں۔

خزاں زدہ کھیتوں پر برستی بارش رات کے سمے
چٹائی کے چھت والے عارضی جھونپڑوں میں سے ٹپکتی

سوتے ہوئے کسانوں کی آستینوں کو بھگوئے ڈال رہی ہے۔
اسی شہنشاہ کی بیٹی کی نظم ہے۔
موسم بہار گزر چکا
کاگو کی پہاڑی ڈھلوان پر
نئے دُھلے ہوئے کپڑے
سفید بادلوں کی طرح پھیلے ہیں۔
ایک اور شہنشاہ نے لکھا۔
ہزاروں جھونپڑوں میں سے دُھواں
بل کھاتا اُٹھ رہا ہے
سمندر پر سفید مرغابیاں اڑتی ہیں۔
دھان کے کھیتوں کی سرزمین! جس کے لیے ہم جیتے اور مرتے ہیں۔
یاماتو۔ متبرک ملک۔!!
اسی صدی میں شہزادی نوکاتا نے لکھا۔
موسم سرما میں سے بہار برآمد ہوئی۔
پرندوں کی چہکار سے جنگل گونج اُٹھے
ان گھنے کنجوں میں سے گزرنا آسان نہیں
جہاں پگڈنڈیوں پر گلیوں کے انبار لگے ہیں
لیکن پت جھڑ کے مہینے میں
میں ان وادیوں میں سرخ پتے چنتی ہوں
میرے لیے خزاں کی پہاڑیاں کافی ہیں
ایک اور شاعر نے کہا:
سرخ پتوں پر چلتے ہوئے

میں اکیلے ہرن کی پکار سنتا ہوں
پت جھڑ کا موسم کتنا اداس ہے!

آٹھویں صدی عیسوی کے اواخر میں دارالسلطنت کیوٹو میں منتقل ہو گیا۔ اب ادب کا ہین دور شروع ہوا جو چار سو سال تک قائم رہا۔ یہ زمانہ انتہائی عیش و عشرت کا تھا۔ دربار میں ایک مصنوعی اور پُر تکلف تہذیب پروان چڑھ رہی تھی۔ محل میں باضابطہ محکمہ شاعری قائم کیا جا چکا تھا۔ مشاعرے ہوتے تھے۔ امرا اور شہزادیاں اور بیگمات سب شاعری کرتی تھیں۔ چینی زبان اور ادب کو اب بھی فوقیت حاصل تھی۔ بدھ مت کے زیر اثر دنیا کے فانی ہونے کا احساس شدید تر ہو چکا تھا سوسائٹی میں خواتین کی اہمیت اور اُن کا اعلیٰ درجہ اس عہد کی خصوصیت ہے۔ اس زمانے کا سب سے بڑا شاہکار چار ہزار صفحات کا ایک ناول "گنجی کی کہانی" جو 1000 عیسوی کے لگ بھگ فوجی دارا خاندان کی ایک خاتون نے تصنیف کیا۔ اس ناول کو جاپانی ادب میں وہی اہمیت حاصل ہے جو انگریزی میں سڈنی کے آرکیڈیا اور فیلڈنگ کے ناولوں کی ہے۔ اس عہد کی شاعری نے بھی اپنی قدیم قومی روایات برقرار رکھیں۔

بطخیں گھر کی طرف پرواز کر رہی ہیں۔
خزاں کے چاند کی روشنی میں اُن کے پر چمکتے ہیں۔
جہاں پر اکیلی کوئل چلا رہی تھی
میں بھی اکیلا تھا
میں نے اس کی آواز کی طرف نظر اُٹھائی
مگر مجھے صبح کے پھیکے چاند کے علاوہ اور کچھ نظر نہ آیا۔

جب میں اپنے گھر کو خدا حافظ کہہ کر چلا جاؤں
اور میرا گھر سنسان پڑا رہ جائے۔
میرے چھپرے کے قریب اُگے ہوئے آلوچے کے درخت!

بہار کے موسم میں اپنی کلیاں کھلانا نہ بھولنا!

اور مسرور قہقہے لگاتی موسم گل کی بے کراں دھوپ!
اتنی بے صبری سے چیری کے شگوفے کیوں گرا رہی ہے؟

پیارے پہاڑی چیری کے درخت
آؤ ہم تم دونوں خوش ہو لیں
کیونکہ ہمارا اور کوئی دوست نہیں ہے۔
میرے بھائی!

بارہویں سے لے کر سولھویں صدی تک جاپان مستقل خانہ جنگی کا شکار رہا۔ بدامنی اور سیاسی انتشار سے پناہ لے کر علم و ادب خانقاہوں میں جا چھپا۔ اداسی کا رنگ گہرا ہو گیا۔ خواتین بھی ادبی افق سے غائب ہو گئیں۔ ادب میں سیاسی اور جنگجو عناصر آ گھسے۔ تاریخ پر کتابیں لکھی گئیں۔ اسی زمانے میں جاپان کا مشہور نوہ ڈرامہ پیدا ہوا جس کی بنیاد ہم عصر انگلستان MIRACLE AND MORALITY PLAYS کی طرح مذہبی تھی۔ شنتو مندروں کا ڈانس ڈرامہ اس کا پس منظر تھا جس میں دیوداسیاں ڈھول اور منجری کی تال پر ناچتی تھیں (آج بھی اسی طرح ناچتی ہیں) سینکڑوں نوہ ڈرامے لکھے گئے شوگن جنگجو جاگیردار سماج نے اُن کی سرپرستی کی۔ ان ڈراموں کا ہیرو عموماً ایک راہب ہوتا تھا۔ پھر اس میں مزاحیہ عنصر بھی شامل کر دیا گیا۔ آج تک نوہ کو جاپان میں وہی مقبولیت حاصل ہے۔

چاروں سمندروں پر موجیں ساکت ہیں۔
دنیا پر سکوت طاری ہے۔
وقت کی ہوائیں آہستہ آہستہ چلتی ہیں۔

ایسے زمانے میں وہ صنوبر بھی مبارک ہو۔
جو اکٹھے بوڑھے ہوتے ہیں۔
ہم خوش قسمت ہیں جو اپنے قابلِ قدر آقا کے اس عہد میں پیدا ہوئے۔
سحر قریب ہے۔
اور کہرہ صنوبر کے درختوں پر گر رہا ہے۔
سدا بہار درخت بنے کھڑے ہیں۔
وقت کے اختتام کی علامت
درخت جو اکٹھے بوڑھے ہوتے ہیں۔

1600 عیسوی سے 1868 عیسوی تک فیوڈل ادب کا زمانہ ہے۔ توکوگاوا شوگن خاندان کے دورِ حکومت میں ملک میں امن پھیلا اور تہذیبی اداروں کو دوبارہ فروغ حاصل ہوا۔ چینی کلاسیکس اور کنفیوشس کا فلسفہ ایک بار پھر سے رائج ہوا۔ یدو (موجودہ ٹوکیو) کا نیا شوگن دارالحکومت اپنی شان و شوکت اور تہذیبی سرگرمیوں میں ٹوکیو کے شاہی دارالسلطنت سے بازی لے گیا بدھ مت کا اثر ختم ہوتا یا اور قدیم شنتو مذہب کے زیرِ اثر شدید قسم کی نیشنلزم آگے بڑھی۔ ادب کو بہت زیادہ ترقی حاصل ہوئی ہر موضوع پر اَن گنت کتابیں لکھی جانے لگیں۔ قدیم چین کے یانگ اور ینگ کا فلسفہ (جو ہندو الٰہیات کے برہما اور شکتی کے نظریے کی مانند ہے، یہاں بھی بے حد مقبول ہو گیا۔ یانگ مثبت مذکر اور متحرک ہے ینگ منفی مونث اور غیر متحرک ہے۔ یہ قدرت کی دو قوتیں ہیں جن کی کارفرمائی سے دُنیا کی تشکیل ہوئی ہے۔ اس فلسفے کے سوشل اخلاقیات اس شوگن سماج کے لیے بے حد کارآمد ثابت ہوئے جس میں فرض کو بڑی زبردست اہمیت حاصل تھی۔ نچلے طبقے کے انسانوں کا فرض تھا کہ اونچے طبقے کے انسانوں کی اطاعت کریں۔ اونچا طبقہ صرف حقوق کا مالک تھا فرائض نچلے طبقے کو سونپ دیے گئے تھے۔ اس زمانے کے ادب کا ہیرو سمورائی ہے۔ سمورائی جنگجو اس سماج کا آئیڈیل انسان تھا۔ بات بات پر لڑ مرنے والا اعلیٰ خاندان آن پر جان دینے والا بانکا سورما۔ اسی فیڈل عہد میں عورت تقریباً پردے میں بٹھلا دی گئی۔

طوائف یا گیشا کا عروج ہوا۔ وہی ناولوں کی ہیروئن بنی۔

اب یدو۔ کیوٹو اور اوساکا میں چھاپہ خانے کھل گئے تھے۔ سماج میں سب سے اونچا درجہ سمورائی کو حاصل تھا۔ اس کے بعد کاری گروں، کسانوں اور تاجروں کی باری آتی تھی۔ یہ گویا جاپان کے چار ورن آشرم تھے۔

فیوڈل عہد ناولوں کا عہد تھا۔ نوہ اب بھی مقبول تھا لیکن پہلے غیر مذہبی تھیٹر یعنی کابکی کی بنیاد سولھویں صدی میں ایک دیوداسی نے ڈالی جو رہبانیت کی زندگی سے بھاگ کر اوساکا آ گئی تھی اور اب گا بجا کر اپنا پیٹ پال رہی تھی۔ کچھ عرصے بعد وہ اپنی ناٹک منڈلی لے کر یدو چلی آئی اور کابکی تھیٹر قائم کیا۔

نوہ اور کابکی کے علاوہ کٹھ پتلیوں کا ڈرامہ بھی اس ملک میں کئی صدیوں سے مقبول ہے۔

فیوڈل عہد کی شاعری —

یہ رہا وہ پرانا تالاب
لو اس میں ایک مینڈک کودا
ذرا پانی کی جھنکار تو سنو!

اگر ہون کی الوہی روح کو دیکھنا چاہتے ہو
تو پہاڑی چیری کے شگوفے پر نظر ڈالو

دنیا جس میں سے ہم گزرتے ہیں
بارش کی پھوار سے بچنے کے لیے ایک سائبان ہے
اور پھر۔ خدا حافظ!

سڑک کے کنارے ایک پھول کھلا تھا

گدھا آیا اور اس کو چر گیا

میرے پلنگ کے قریب کوئی چراغ نہیں سوائے میری کھڑکی کے چاند!

دوستو مجھ سے دور رہو
تا کہ میں تنہائی میں دن بھر پھولوں کی عبادت کر سکوں

پائن کی شاخوں اور آدھی رات کی بارش میں سے جھانکتا
چاند آہستہ آہستہ کراہ رہا ہے!
گو دنیا محض ایک شبنم کے قطرے کی مانند ہے
مگر ہماری ہی دنیا تو ہے!

بے چاری چھوٹی سی یتیم
آ میرے ساتھ کھیل

جدید جاپانی ادب کا زمانہ 1868 عیسوی سے شروع ہوتا ہے۔ شوگن حکومت کے زوال، مغربی اقوام کی آمد اور شہنشاہیت کی تجدید کے ساتھ ساتھ جاپان نے نئے زمانے میں قدم رکھا۔ اب تک ملک کے سارے دروازے غیر اقوام کے لیے سختی سے بند تھے۔ پچھلی صدیوں میں ڈچ تاجروں نے آمدورفت شروع کی تھی۔ کیتھولک مشنری یہاں پہنچے تھے مگر اُن سب کو نکال باہر کیا تھا جاپان مکمل طور پر باقی دنیا سے الگ تھلگ اپنی کائنات میں بند بیٹھا تھا 1868 عیسوی میں یدو میں نیا شاہی دار السلطنت قائم ہوا جس کا نام ٹوکیو رکھا گیا۔ اب دفعتاً یورپ تہذیب، یورپ کی ادبیات کے مطالعے نے زور پکڑا۔ شہنشاہ نے ایک دستور یہ اور ایک پارلیمنٹ قائم کرنے کا

وعدہ کیا۔ تقریباً سارے اہم یورپین امریکن اور انگریزی ادب کا جاپانی میں ترجمہ کر ڈالا گیا۔ جاپانی ادیب مصلح قوم بنے۔ جاپانی زبان جو ایک ہزار سال سے چینی خیالات کی ترجمانی کر رہی تھی اسی آسانی سے مغرب کی ترجمانی میں مصروف ہوگئی۔

لیکن آج کی شاعری میں بھی ایک ہزار سال قبل کی آواز بازگشت سنائی دے رہی ہے—

اب میں لیٹ کر خواب دیکھوں گا۔
اور بارش کی آواز
اور مینڈکوں کا شور مجھے لوریاں دے گا

میرے اوپر ہنسا کرو
مجھے کنویں کا مینڈک کہہ لو
لیکن میرے کنویں کی منڈیر پر پھول جھکے ہیں
اور چاند اس کے پانی میں تیر رہا ہے!
ذرا سوز دموشی کا گیت تو سنو
اگر شبنم گا سکتی تو اس کی آواز ایسی ہی ہوتی
ہاں! میرا مکان پرانا ہے
اس کی چھت پر پودے اُگ رہے ہیں
لیکن سوز دموشی کی آواز تو کبھی بوڑھی نہ ہوگی
میرے بچپن کا گھر بدل چکا
لیکن جھینگروں کی صدائیں وہی ہیں
میرا خیال ہے وہ پرانے اچھے دنوں کی یاد میں
گانے کی کوشش کر رہے ہیں!

جدید جاپانی ادب بے حد ترقی یافتہ ہے۔ لاکھوں کی تعداد میں کتابیں اور رسالے چھپتے

ہیں۔ ہر زندہ قوم کی طرح اُن کا ادیب بھی معاشرے میں بے اندازہ عزت کا مالک ہے وہ بھوکا نہیں مرتا نہ وہ سڑکوں کی نالیوں میں بے ہوش پایا جاتا ہے۔ جاپان کے بڑے ایکٹر اور بڑے مصنف اپنی قوم کے لیے ہیرو کا درجہ رکھتے ہیں۔ یہ قوم فن کار کی عزت کرنا جانتی ہے۔

لاؤڈ اسپیکر پر ایک لڑکی کی شیریں آواز آئی۔ ''ادبی سیشن کے لیے اندر تشریف لے چلیے۔''

نائب صدر موسیو روجر کیلو نے کہا ''یونیسکو کی طرف سے میں اس گول میز کانفرنس کے اراکین کا سواگت کرتا ہوں۔ مغرب کے اسکالر قدیم مشرق سے واقف ہیں۔ انھیں ہم عصر مشرق کے ذہن کا کوئی علم نہیں۔ اہلِ مشرق مغرب کو محض ایک فاتح اور کولونیل طاقت کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ اُن کی مغرب کے ماضی سے واقفیت نہیں وہ گوتھک آرٹ کے مقابلے میں سرریلزم کو بہتر طور پر جانتے ہیں۔ علاوہ ازیں سوال یہ ہے کہ مشرق آخر کہاں سے شروع ہوتا ہے اور کہاں ختم ہوتا ہے اور زیادہ اہم سوال یہ ہے کہ اورینٹ کا وجود در حقیقت کہیں ہے بھی یا نہیں۔ عربی، ہندی اور چینی رسم الخط ایک سے نہیں ہیں۔ قاہرہ سے کراچی تک کا رسم الخط ایک سا ہے مگر بہر حال ایک یورپین طرزِ تحریر ہی نے ساری دنیا کو یکجا کر رکھا ہے۔ میرے پاس اورینٹ اور مغرب کے اختلافات کی بہت سی مثالیں موجود نہیں مگر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اورینٹ میں حقیقی اتحاد موجود ہے۔ مجھے یہ شبہ ہے کہ کہیں مغرب کی مخالفت ہی تو سارے مشرق کے اتحاد کی بنیاد تو نہیں۔ علاوہ ازیں مشرق کا اسکالر اپنے ہمسایہ ممالک کے ماضی کا پتہ چلانے کے لیے پیرس لندن اور برلن کا رخ کرتا ہے۔ مشرق کے سیاست دان نے نہ صرف مغرب کی یونیورسٹیوں میں بلکہ مغرب کے بنائے ہوئے جیل خانوں میں اپنی تربیت حاصل کی ہے۔ اب یہ راستہ یک طرفہ رہا ہے۔''

مصر کے ڈاکٹر محمد عوض نے کہا ''مختلف ملکوں کے مصور، موسیقار اور سائنس دان ایک دوسرے کے کام سے واقف ہو جاتے ہیں لیکن دوسری زبانوں کے ادب کے سلسلے میں کمیونیکیشن کا معاملہ آڑے آ جاتا ہے۔ بیتھوون کے سوناٹا کا عربی یا ہندی میں ترجمہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں لیکن ہم لکھنے والوں کا فن ہی ایک ایسی چیز ہے جس کے لیے ایک مترجم کی حاجت ہے۔

بڑی قابلِ غور بات یہ ہے اہلِ مغرب نے آج تک مشرق کے ادب کو قابلِ اعتنا نہ سمجھا۔ سوا چند مستشرقین کے جنھوں نے اس خزانے کا کھوج لگایا اور اس میں جرمن دانشور سب سے آگے تھے۔ گوئٹے تھا جس نے اپنی عمر کے ساٹھویں سال میں عربی اور فارسی پڑھی۔ اس نے اپنا دیوان اس وقت لکھا جب اس کے وطن میں انتہا پسند اور جنگجو قوم پرستی کی لہر اپنے عروج پر تھی۔ اس شاعر نے اپنے آپ کو ہندستانی اور ایرانی اور عربی تہذیبوں کے دھارے میں بہایا مگر اس کی تخلیقات سے کسی قسم کی دوسرے درجے کی دوغلے پن کی جھلک نظر نہیں آتی جس کا خطرہ عموماً لوگوں کو اس قسم کا اثر قبول کرنے کے سلسلے میں محسوس ہوتا ہے۔

پچھلی صدی کے اواخر میں یورپ کے رابطے سے عرب ممالک میں تھیٹر اور ناول اور مختصر افسانے کی تحریک چلی۔ سیاست دان عرب دنیا میں تفرقہ اندازی کے لیے جو کچھ کر رہے ہیں اس کے باوجود ان تہذیبی کوششوں کے ذریعے مشرق اور مغرب اس خطے میں ایک دوسرے کے ہمدرد کی حیثیت سے قریب تر آسکتے ہیں۔"

آندرے شازوں نے کہا "میں یہ بات واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اس محفل میں ہم میں سے کوئی بھی اپنی حکومت کے ترجمان کی حیثیت سے نہیں بول رہا ہے۔ ڈاکٹر عوض نے جو کچھ کہا وہ اپنی تہذیب کی نمائندگی کرتے ہوئے کہا۔ آپ سے درخواست ہے کہ اپنی حکومت کے بجائے اپنے ملک کی طرف سے تقریر فرمائیں۔"

برطانیہ کے اینگس ولسن نے کہا "میں آپ سے ایک ناولسٹ اور افسانہ نگار کی حیثیت سے مخاطب ہوں۔ تخیلی ادب سے باہر جانے کی مجھ میں صلاحیت نہیں لیکن اگر میں صرف لکھنے کے فن ہی کی بات کردوں تو فرار پسند ادیب نہ سمجھئے گا۔ کوئی ناولسٹ اس معاشرے کی طرف سے آنکھیں نہیں بند کر سکتا جس میں وہ زندہ ہے۔ آخر یہ معاشرہ ہی تو وہ مادہ ہے جس کو ٹھونک پیٹ کر اپنے اطمینان کے مطابق ایک شکل میں ڈھالتے ہوئے اس کی ساری زندگی بیت جاتی ہے لیکن ہمارے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ ہم سیاسی اور عمرانی نظریات پر بحث کریں اور اگر میں نے ایسا کیا بھی تو ان برطانوی ادبا کے ساتھ ناانصافی ہوگی جن کی میں یہاں نمائندگی کر رہا ہوں اور کسی

تھیوری کے ماتحت رہتے بغیر اپنے فوری اور بلاواسطہ تجربے کی ترجمانی کرتے ہیں۔

میں نے اب تک صرف پانچ چھ جاپانی ناولوں کے ترجمے پڑھے ہیں اور اگر میرے میزبان برا نہ مانیں تو میں کہوں کہ انھوں نے مغربی فارم کو اس سے پوری طرح کیوں قبول کرلیا اور کس خوب صورتی سے قبول کیا۔

اس سلسلے میں چند باتیں کہنا چاہتا ہوں۔

ایک لکھنے والے کو کبھی یہ نہ بھولنا چاہیے کہ اس کی اپنی جڑیں اس کے تخیل اور اس کے فن کی اصل بنیاد ہیں یہ جڑیں کاٹ کر وہ بڑا خطرہ مول لے سکتا ہے اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم کو صرف اپنے بچنے کے متعلق ہی لکھتے رہنا چاہیے! مگر چند تمثیلیں اور سانحے جو ہماری کہانیوں کے پس منظر میں رہتے ہیں شروع ہی سے ہماری زندگیوں میں داخل ہو چکتے ہیں۔ گو اس کے بعد ہم اپنا مواد بہت سی مختلف دنیاؤں سے بھی حاصل کرتے رہتے ہیں۔ کپلنگ ای ایم فارسٹر اور سمرسٹ ماہم نے ایشیا سے یہ مواد حاصل کیا۔

لیکن چند بنیادی سوال ہیں جن کی شخصیت لکھنے والے کے نقطۂ نظر سے بین الاقوامی ہے گو ان کا حل قومی بنیاد پر کیا جاسکتا ہے۔ وہ بنیادی مسائل میرے نزدیک یہ ہیں۔

ایک انسان کے اندر وقت اور انسانی شخصیت کا باہم رشتہ کیا ہے؟

مختلف شخصیتوں کے وجود کا اظہار کس طرح کیا جاسکتا ہے اور اُن کا ایکا کس طرح دکھایا جاسکتا ہے؟

کیا انسان کی سماجی اور پبلک شخصیت اور اس کی نجی شخصیت ایک ہی ہے اگر نہیں تو کون سی زیادہ اہم ہے؟

کیا ہم لکھنے والے زندہ مواد کو اپنی کتابوں میں ٹھونس کر اور اُن کو پلاٹ میں جکڑ کر اور ان پر اپنے فیصلے صادر کر کے اسے قتل تو نہیں کر دیتے؟

طرزِ بیان کیسا ہو۔

اس سال موسمِ گرما میں جب میں نے جاپانی ناول نگاروں تانی زاکی کو ابا تا اور می شی ما

کے ناول پڑھے تو ان بنیادی سوالوں کے متعلق میرے دماغ میں ایک تعطل سا پیدا ہو گیا گویا میں ایک اندھی گلی میں پہنچ گیا تھا۔ لیکن جہاں جہاں ان ناول نگاروں کا رویہ شخصیت وقت اور اظہار رساں کے سلسلے میں مغربی فن کاروں کا ساز تھا وہاں ان کا خالص جاپانی فارم ہر اس چیز سے اس قدر مختلف تھا جو میں نے آج تک سوچی کہ مجھے فوراً LIBERATION حاصل ہو گیا۔ ظاہر ہے میں ان کی تقلید میں نہیں لکھ سکتا۔ لیکن یہ بذات خود ایک بڑی ہمت افزائی تھی کہ چند بڑے فن کار شخصیت اور زندگی کے بنیادی مسائل کے متعلق ایسے خطوط پر سوچ رہے ہیں جن سے میں بالکل واقف نہیں اور اس بات نے مجھے اپنی جڑوں میں اور گہرا کھودنے پر آمادہ کیا۔

چنانچہ مغرب اور مشرق کے فن کار کو ایک دوسرے کے اختلاف میں بڑی تخلیقی تحریک مل سکتی ہے دوسرے ممالک کے رسم و رواج کے متعلق تو آپ عام کتابوں سے بھی معلومات حاصل کر سکتے ہیں مگر لکھک کے لیے اصل محرک وہ اچانک جھلک ہے جو ایک ایسے آئینے میں نظر آ جائے جس میں ساری دنیا ایک دوسرے زاویے سے منعکس ہے۔ مقامی رنگ یا عالمگیر اپروچ کے بجائے یہ اصل چیز ہے۔"

جاپانی پی این کی طرف سے سوئے کی چی آدنو نے کہا۔

''جاپان کلچر کے معاملے میں شروع سے درآمد کا قائل ہے چونکہ یہ ملک ہمیشہ خودمختار رہا لہٰذا اس کے باشندوں کو انتخاب کرنے کی آزادی میسر تھی۔ انھوں نے جو پسند کیا اختیار کیا جو ناپسند کیا چھوڑ دیا۔ یورپ سے ہم نے حسن کا مصنوعی ذہنی اور غیر شخصی احساس حاصل کیا جس کے مقابلے میں ہمارے یہاں حسن کا قدرتی جذباتی اور شخصی احساس موجود تھا۔ نثر میں ہم یورپ کی معقولیت اور تناسب سے متاثر ہوئے لیکن جدید جاپانی ادیب محض مغرب کا نقال نہیں ہے۔ قدرت سے مطابقت پیدا کرنے کی کوشش ہر جاپانی فن کار کی سب سے بڑی خواہش ہوتی ہے۔ یہی جاپانی طرز زندگی اور طریقۂ فکر کی جڑ ہے۔ گویا جڑ ایک مغربیت پسند اور صنعتی سماج میں بہت حد تک مل چکی ہے۔

آج کے لکھنے والوں کو ایسی زبردست مذہبی اور سماجی آزادی ہے جو ہمارے غیر ملکی

ادیبوں کو بھی چونکا دے گی۔ اس آزادی کی وجہ ہمارے لکھنے والوں اور عوام کے درمیان بڑی خلیج پیدا ہو گئی ہے۔ عوام کے نزدیک لکھنے والوں کا ایک اونچا طبقہ پیدا ہو گیا ہے۔

اس آزادی میں مغربی معدومیت اور انکار کائنات اور مشرق فنا کے احساس کا رنگ شامل ہے اور خطرہ ہے کہ ادیبوں کا گروہ اینٹی سوشل نہ بن جائے۔''

ہندوستان کے ڈاکٹر سری نواس آئنگر نے کہا:

''کیا مشرق کلرڈ اقوام کے ادب کا رنگ بھی مختلف ہے؟ موسیو تین نے ایک جگہ پوچھا ہے۔ ادب کی علت و معلول کیا ہے؟ ان کا جواب ہے نسل معاشرتی ماحول اور لمحہ۔ ایک خاص قوم اور ایک خاص ملک کے ایک خاص وقت میں یکجا ہونے سے لٹریچر وقوع پذیر ہوتا ہے۔ دلاوری کے عہد نے رزمیہ کی تخلیق کی۔ شہروں کے پُر تکلف تمدن نے ڈرامے کو جنم دیا۔ انیسویں صدی کے صنعتی دور نے ناول اور آج کی ٹیکنالوجیکل تہذیب نے جاسوسی افسانہ فلم اسکرپٹ اور ٹیلی ویژن پروگرام پیدا کیا لیکن ان سب چیزوں کے علاوہ کیا شخصی تجربہ اس تخلیق میں شامل نہیں؟ تیراک خواہ وہ دھارے کے ساتھ یا اس کی مخالف سمت میں تیرے گو دھارا اس کے بہنے یا اس کی جدوجہد میں شامل ہے۔ لیکن تیراک بذاتِ خود تیرنے کی مہم کا مرکز ہے۔ والمیکی اور ہومر سوفوکلز، کالی داس، بھبھوتی اور شیکسپئر اور مولیئر کی اپنی مستقل شخصیتیں تھیں۔ فردوسی گم شدہ، گنجی کی کہانی یا کرامزاف برادران لوگوں کا جاری کردہ مینیفسٹو یا کسی کمیٹی کی رپورٹ نہیں تھے۔ چارلس لیمب کے مضامین اس کے علاوہ اور کوئی نہ لکھ سکتا تھا۔

چنانچہ ادب کیا سوشل نسلی یا علاقائی تخلیق ہے۔ وقت کی روح میں شرکت یا مختلف مردوں اور عورتوں کے دکھ، خوف، خواب اور وژن اس کی تخلیق کی اصل وجہ ہیں۔ تیرنے کی مہم کی اصل حقیقت کیا ہے۔ دھارا یا تیراک؟ غالباً انسان اور ادب میں بیک وقت دو خصوصیات موجود ہیں۔ اگر ایک طرف سے دیکھا جائے تو انسان دیواروں میں محصور ہے تنہا اور منفرد۔ دوسری طرف وہ آدم کی ساری نسلوں سے مماثلت رکھتا ہے کائنات میں ذرے کی حیثیت سے شامل ہوتا ہے۔ اسی طرح کوئی ایک شعر کوئی ایک جملہ بذاتِ خود ایک ستارہ ہے جس کے اپنے قوانین ہیں لیکن اس

کے ساتھ ہی وہ ستارہ ایک پورے نظام شمسی میں شامل ہے جسے ادب کہتے ہیں۔

مشرقی اور مغربی ادب کی تخصیص اپنی جگہ ٹھیک ہے لیکن ان دونوں میں ادب کی پھر مزید علاقائی تقسیم بھی موجود ہے لہٰذا ہم مشرق اور مغرب کے ادب کو کسی مشترک پیمانے سے جانچیں؟ ہندستانی چینی اور جاپانی ادبیات میں کون سی قدر مشترک ہے؟ عربی، فارسی، بنگالی، مرہٹی، تامل اور برمی ادبیات کی کون سی خصوصیات ہیں جن کی بنا پر ان کو ایشیائی کہا جاتا ہے؟ کیا امریکن آسٹریلین، جنوبی افریقی ادب انگریزی لٹریچر کی مانند ہے؟ کیا مشرق و مغرب کی تخصیص اینگلو انڈین (یا ہندستانیوں کے لکھے ہوئے انگریزی ادب) لٹریچر کو اینگلو امریکن، آسٹریلین لٹریچر سے جدا کر دیتی ہے؟ روسی ادب کو مشرقی سمجھا جائے یا مغربی؟ کیا ہسپانوی ادب ہیرودین کے بہ نسبت پرتگالی سے زیادہ نزدیک ہے؟ بالفظ دیگر جغرافیائی قربت اور اتحاد یا مشترک زبان ادبیات کے رشتوں کی تشریح کرتی ہیں؟ پھر قومیت کا مسئلہ بھی اردو اور بنگالی ادب اس وقت ہندوستان اور پاکستان دونوں جگہوں میں تخلیق کیا جارہا ہے۔

لیکن اس تخلیق کے پیچھے کون سی چیز زیادہ طاقت سے کارفرما ہے۔ ایک مشترک زبان یا ایک مشترکہ مذہب اور قومیت؟

زندگی میں ظاہری تغیر اور حقیقی تسلسل میں برابر تصادم رہتا ہے۔ ادب اس تصادم کا عکاس ہے وہ کیا شے ہے جو فن کار کو اس کے مرنے کے بعد بھی زندہ رکھتی ہے۔ ادب کی آفاقیت وقت اور جغرافیائی حد بندیوں سے ماورا ہے۔ سچ عالمگیر ہے۔ حقیقی ادب میں انسان انسان سے بات کرتا ہے مشرق مغرب سے ماضی حال مستقبل سے نہیں۔ اعلیٰ ادب کے سامنے زبان و مکان کی کوئی حیثیت نہیں۔

ظاہری طور پر انسان، ادوار، ممالک ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ لیکن ہمارا محنت اور غم اور روح کا تجربہ ساری دنیا میں یکساں ہے۔ سیاست اقتصادیات منظم مذہب اور متضاد فلسفوں نے انسانوں میں افتراق پیدا کر دیا ہے لیکن بڑا ادب خصوصاً شاعری بجلی کی خیرہ کن لپک کی طرح ہمیں یک لخت اس اندھیرے میں راستہ دکھادیتی ہے۔

مشرقی ادب نے روح کی گہرائیوں میں اترنے کی کوشش کی ہے UNKNOWN کے سمندر کو کھنگالا ہے لامکاں کو ناپنے کی سعی کی ہے۔ رشیوں اور صوفیوں نے اس ادب کی آب یاری کی ہے اس کے برعکس مغرب کا ادیب زیادہ تر خارجی دنیا اور انسان کی جذباتی اور ذہنی زندگی کا عکاس ہے اس کا مطلب یہ نہیں کہ مشرق کے لیکھک زندگی کے مادی تقاضوں سے بالکل بے نیاز ہیں۔ افلاس اس وقت ایشیا کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ مغرب کے لکھنے والے تحفظ اور شخصی یا اجتماعی مسرت کے متعلق لکھتے ہیں۔ ہمارے یہاں افلاس سے چھٹکارا ملنے ہی پر شخصی یا اجتماعی مسرت حاصل ہو سکتی ہے۔

اس وقت مشرقی یا مغربی ادبیات کا روایتی رول بدل گیا ہے۔ مشرق میں مادیت کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے۔ مغرب کے لکھنے والے روحانیت کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں۔

لیکن اس کے باوجود مشرق کے ادب کی اصل خصوصیات برقرار ہیں۔ یہاں جارج اورویل کے جانور خانے کی طرز کی طنز نہیں لکھی جا سکتی نہ مغرب میں جاپانی شاہکار ''بگلا اور غروب آفتاب'' پیدا ہو سکتا ہے۔

ایک بڑی عجیب بات ہے کہ سوفوکلیز اور شیکسپیئر کی قسم کی ٹریجڈی کی تخلیق سے مشرق نے ہمیشہ انکار کیا۔ ہندوستان میں ایک سو سال سے شیکسپیئر پڑھا جا رہا ہے لیکن عوام (ذہن پرستوں کے علاوہ) ہیملٹ یا لیئر کے دوست نہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ مشرق طبعی موت کو آخری خاتمہ سمجھنے سے منکر رہا ہے۔ عیسیٰؑ کا مصلوب ہونا کوئی ٹریجڈی نہیں۔ آپ اگر ان کے دوبارہ جی اُٹھنے پر یقین رکھتے ہوں۔

یقین اصلی چیز ہے۔

''دُنیا ایٹمی تباہی کے دروازے پر کھڑی ہے اور اس وقت مشرق اور مغرب کے درمیان جو رشتہ قائم ہے وہ محض بازار کے شور و غل اور بیوپاریوں کی چیخ و پکار کی حیثیت رکھتا ہے۔''

فرانس کے ژاں ہے ہی نو نے کہا۔

''ایک چینی حکیم چانگ سین کا مقولہ ہے ہوا فطرت کی بانسری درختوں اور پانیوں پر سے

بجتی ہوئی میرے نغمے بجاتی ہے اسی طرح تاؤ میرا فلسفہ مختلف زبانوں میں میرا اظہار کرتا ہے اور اپنی جگہ قائم ہے۔"

1916 میں اپنی مرضی کے خلاف جنگ میں لڑ رہا تھا۔ میرے سارے دوست ختم ہو چکے تھے۔ یورپ خودکشی میں مصروف تھا۔ میرے سامنے صرف تاریکی تھی۔ اس وقت میں نے رابندر ناتھ ٹیگور کا وہ پیغام سنا جو انھوں نے جاپان کو دیا تھا ٹیگور کے الفاظ کے ذریعے مشرق کی آواز پہلی بار میرے کانوں تک پہنچی۔ انھوں نے یورپ کو انسان کشی کا تذکرہ کرتے ہوئے ایشیا کی نشاۃ ثانیہ کی پیش گوئی کی تھی اور جاپان کو خالی نقالی کے خطرے سے آگاہ کیا تھا وہ قوم پرستی کے مخالف تھے۔ انھوں نے کہا "ہمارے افلاس کے وسیع صحرا پر تخت خداوندی قائم کرو۔ اور یاد رکھو کہ وہ جو بڑے ہیں لازمی طور پر عظیم نہیں اور غرور ہمیشہ فنا ہوتا ہے۔"

لنچ کے بعد تیسرے پہر کو کانگریس کے اراکین دو گروہوں میں تقسیم ہوئے۔ ایک گروہ مادام صوفیہ دادیا کی صدارت میں طرز زندگی پر مشرق و مغرب کے اثر پر تبادلۂ خیالات کے لیے جمع ہوا۔ دوسرا گروہ امریکن ڈرامہ نگار ایلمر رائس کی زیر صدارت جمالیاتی اقدار پر مشرق و مغرب کے اثر پر گفتگو کرنے والا تھا۔

• طرز زندگی پر اظہار خیال کرتے ہوئے عظیم جاپانی ناولسٹ جون تکامی نے کہا——

میں ایک جاپانی لیکھک ہوں اور اس سے جب کہ میں آپ کے سامنے بیٹھا ہوں میرے چہرے پر وہ مسکراہٹ ہے جسے جاپانی پراسرار مسکراہٹ کہا جاتا ہے۔ بہت سے غیر ملکی اس جاپانی تبسم کو غلامی اور کاسہ لیسی کی علامت سمجھتے ہیں۔ غیر ملکیوں کا یہ رویہ اس جذبۂ حقارت پر مبنی ہے جو اُن کے دلوں میں جاپان کے لیے ہے۔

لیکن اس تبسم کی اصل وجہ یہ ہے کہ ہم ایک عرصہ دراز تک فیوڈل غلامی کے عالم میں رہے۔ جب ایک جاپانی کسی اور سے ملتا تھا تو اسے فوراً مسکرا کر یہ ظاہر کرنا پڑتا تھا کہ اس کے دل میں کوئی دشمنی نہیں ہے۔ رفتہ رفتہ یہ مسکراہٹ عادت میں شامل ہوئی اور پھر اس عارفانہ تبسم میں تبدیل ہوگئی۔ میں بھی عادتاً مسکراتا ہوں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس وقت میری شعوری کوشش یہ

ہے کہ میں اس تبسّم کے ذریعے آپ لوگوں کے لیے اپنے جذبہ خیر سگالی کا اظہار کر کے آپ کا خیر مقدم کروں۔

جاپانی تبسّم بندگی کے علاوہ امن اور مہربانی کا تبسّم بھی ہے۔ یہ نرمی اور ملائمت نہ صرف جاپان بلکہ سارے ایشیائیوں کا شیوہ ہے۔ میرے ملک کی طرح تقریباً سارا ایشیا صدیوں تک ظلم اور تشدد کا شکار رہا ہے جس کی وجہ سے ایشیائیوں کو ایسا مسکین اور متحمل بننا پڑا لیکن ایشیائی علم کی محض یہی ایک وجہ نہیں۔ ٹیگور نے کہا ہے کہ ایشیا کے لوگ فطرت کے ساتھ بڑے سکون اور ہم آہنگی سے رہنا چاہتے ہیں۔ اہلِ مغرب فطرت سے لڑتے اور اس کے خلاف جدوجہد کر کے اس پر قابو پانا چاہتے ہیں اسی جدوجہد کے نتیجے میں ان کے یہاں ایک سائنٹفک کلچر پیدا ہوا اور اس جدوجہد کی عدم موجودگی کی وجہ سے ایشیا سائنس کی دوڑ میں بہت پیچھے رہ گیا۔

ٹوکیو میں آپ نے مشرق اور مغرب کی تہذیبوں کا عجیب و غریب امتزاج دیکھا۔ میں آپ کے سامنے مغربی سوٹ بوٹ پہنے بیٹھا ہوں مگر میرے ہونٹوں پر ابھی تک وہ عارفانہ مسکراہٹ ہے، ہم نے اپنی جاپانی مسکراہٹ ابھی تک نہیں کھوئی۔

''میں آپ سے اور بہت کچھ کہتا مگر میری انگریزی بے حد کمزور ہے۔''

ہندوستان کے آنند شنکر رائے نے کہا——

''قدیم ہندوستان نے روم کے ساتھ تجارت کی اور یونان سے لڑا لیکن قرونِ وسطیٰ میں ہندوستان باہر کے ممالک سے کٹ گیا۔ اس لیے جب یورپین ہمارے یہاں پہلے تاجر اور پھر حاکم کی حیثیت سے پہنچے تو ہم کو بے حد حیرت ہوئی وہ اپنے نشاۃ ثانیہ کے کیل کانٹے سے لیس ہو کر عہدِ جدید کے نقیب کی حیثیت سے آئے تھے۔ ہم ابھی قرونِ وسطیٰ ہی میں پڑے تھے۔ پہلے مشرق و مغرب کے درمیان جغرافیائی فاصلہ تھا اب یہ فاصلہ وقت کا ہو گیا۔ اب ہمارے اور ان کے درمیان غیر متوازن ارتقا کے تین سو سال حائل تھے سوال یہ تھا کہ ہم اس تین سو سال کے فرق کو کس طرح پُر کریں اور ترقی کی اسٹیج تک جا پہنچیں جہاں وہ اب موجود تھے۔ مگر دوسرا سوال یہ تھا کہ کہیں اس دوڑ میں ہم اپنا پرانا راستہ نہ بھول جائیں اور مغرب کی جس منزل پر پہنچیں تو معلوم ہو

کہ شاید مغرب بھی غلط راستے پر چلتا ہوا یہاں تک پہنچا ہے۔ انیسویں صدی میں راجہ رام موہن رائے نے سوچا کہ ہر مغربی چیز مشرق کے لیے اچھی نہیں لیکن موڈرن ہونا سب کے لیے اچھا ہے۔ لہٰذا ہندستانی نشاۃ ثانیہ مغربی اصلاحات اور اپنے ماضی کے ورثے کو ساتھ لے کر آگے بڑھا۔ ہمارے علاقائی ادب اپنی روایات کو چھوڑے بغیر عہدِ نو میں داخل ہوئے۔ برطانوی آزاد خیالی اور فرانسیسی انقلاب اور اُپنشدوں کا مطالعہ بیک وقت کیا جانے لگا لیکن بعد میں قوم پرستی کی تحریک کے زیرِ اثر مغرب کو بالکل مسترد کر دیا گیا۔ یورپ کے خلاف غم و غصّے کا جذبہ شدید ہوا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اُنیسویں صدی کے اواخر میں ریفارمیشن کی مخالفت اور ماضی کی تجدید اپنے عروج پر پہنچ گئی۔

اس زمانے میں آرٹ اور ادب میں بڑی اچھی اچھی چیزیں تخلیق کی گئیں لیکن رفتہ رفتہ یہ محسوس کیا جانے لگا کہ ہم اپنے ماضی میں محدود ہو کر موڈرن زمانے سے کٹتے جا رہے ہیں تب راجہ رام موہن رائے کے سو سال بعد مہاتما گاندھی نے کہا کہ وہ مغرب کے خلاف نہیں لیکن اس موڈرن تہذیب کے مخالف ہیں جو مغرب کو گھن کی طرح کھا رہی ہے اور اس کی مدافعت مشرق کو اپنی اہنسا کی پوری طاقت سے کرنا چاہیے۔ انھوں نے ہم سے کہا کہ ہم اپنے اندر ستیہ اور اہنسا تلاش کریں اور اپنے باہر غریبوں، مظلوموں پر نظر ڈالیں۔ مہاتما گاندھی قرونِ اولیٰ کے کسی عیسائی سینٹ کی مانند رہتے تھے۔ جسمانی اور روحانی محنت کرتے تھے جمالیاتی اور ذہنی اقدار سے بے نیاز فطرت خدا اور عوام کی قربت میں وہ اس طرح زندہ رہے جس طرح آج کل کی دنیا میں اور کوئی انسان نہیں رہا ہے۔ اپنے اس جادو کے ذریعے وہ کروڑوں عوام سے جو چاہتے تھے منوا لیتے تھے۔ محبت ان کی جادو کی چھڑی تھی۔

ایسی معجز نما بحث کون کر سکتا ہے؟ یا آپ ان کو مانیے یا ان کو مسترد کر دیجیے ہم سے گاندھی کے راستے کو مسترد کرنا ناممکن تھا۔ لیکن ہم جدید یا مغربی راستے کو بھی ترک نہیں کر سکتے تھے۔ کیا اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم جس چیز کو نامنظور کر سکتے تھے اسے قبول کر لیا؟ یہ بھی ممکن نہیں تھا۔ دراصل جدید مغرب کا سحر ہمارے لیے خود ہی زائل ہو گیا۔ پہلی جنگِ عظیم کے بعد ہم جدید مغرب

سے مایوس ہوئے دوسری جنگ کے بعد ہم کو اس سے کراہت آنے لگی۔ لیکن ہم کو یہ بھی یقین نہ تھا کہ گاندھی کا راستہ اختیار کر کے ہم کہیں ڈیڑھ سو سال کی ایک ترقی کو رد کرتے ہوئے پھر قرونِ وسطیٰ میں تو واپس نہ پہنچ جائیں گے۔ ہندوستان میں ایسے خطرناک لوگ موجود ہیں جن کو اہنسا اور ستیہ کی قطعی پروا نہیں اور جو ہزاروں سال پرانا سماج اور برہموں کی طبقاتی برتری کا نظام واپس لانا چاہتے ہیں لیکن خوش قسمتی سے ہمارے یہاں نہرو جیسے موڈرن انسان بھی موجود ہیں لیکن یہ موڈرن انسان بغیر ایک فوج کے اپنا کام نہیں چلا سکتے اور یہ گاندھی کی اہنسا کی تعلیم کا بالکل الٹ ہے۔ گاندھی 47 عیسوی کے بعد کے آزاد ہندوستان کا سب سے دکھی انسان تھا۔ نہ صرف اس لیے کہ ہمارا گھر تقسیم ہو چکا تھا بلکہ اس لیے بھی کہ ہم نے قرونِ وسطیٰ کی ذہنیت والے ان خطرناک لوگوں پر جنھوں نے ملک میں قتل و غارت کا بازار گرم کیا، قابو پانے کے لیے تشدد کا آزادی سے استعمال کرتے ہوئے مہاتما گاندھی کو دھوکا دیا۔

ہم عدم تشدد کے پابند نہیں رہ سکتے۔ لیکن ان کے سکھلائے ہوئے دوسرے اصول حق پرستی پر قائم ہیں۔ حق کے ساتھ بھی سمجھوتہ کرنا پڑا ہے اور اس کی بنا پر ہم بے حد دکھی ہیں۔ ہم ان کے بتائے ہوئے راستہ پر پوری طرح نہیں چل سکتے۔ ہندوستان کو سب سے پہلے اس تیزی سے جدید بنانا ہے کہ رجعت پسند عناصر تشدد یا فریب کے ذریعے گھڑی کی سوئی کو صدیوں تک واپس نہ پہنچا دیں۔ ہمارے عوام اس قدر بھولے ہیں کہ بڑی آسانی سے مذہب کے نام پر بھڑکایا جا سکتا ہے لیکن ہم کو معلوم ہے کہ ہم زمانہ حال کو اپناتے ہوئے اپنی دشمن یعنی قرونِ وسطیٰ کی ذہنیت سے تو دور ہوتے جا رہے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ ہمارے دوست مہاتما گاندھی کے اور ہمارے درمیان کا فاصلہ بھی بڑھتا جا رہا ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ مستقبل قریب میں تلوار کی جگہ محبت نہیں لے گی۔ شہروں کی جگہ گاؤں اور مرکزی نظامِ حکومت کی جگہ لامرکزیت نظر نہیں آئے گی۔ آج ہمارے یہاں کروڑوں عوام ووٹ دینے جاتے ہیں اگر بے صبری میں انھوں نے ستیہ اور اہنسا کا سہارا چھوڑ دیا تو ملک ایک اور تباہی کی طرف جائے گا لیکن اس کے ساتھ ہی ترقی میں ہم زیادہ دیر نہیں لگا سکتے۔ تیز رفتار ترقی ہی انقلاب کا نعم البدل ہے۔

اس وقت ہندوستان کے لکھنے والوں کے سامنے یہ سارے مسائل ہیں۔ دماغوں میں جدیدیت روایت پرستی اور گاندھین فلسفے کے درمیان کشمکش جاری ہے اور جب تک ایک محبت اور ستیہ پرمبنی ٹھوس بنیاد کا فیصلہ نہ کیا جائے عظیم آرٹ یا لٹریچر کی تخلیق نہیں ہوسکتی۔ یہی وجہ ہے کہ مجموعی طور پر اس وقت حالانکہ ان گنت کتابیں اور رسالے چھپ رہے ہیں کوئی غیر معمولی تخلیقات پیش نہیں کی جارہی ہیں۔ یورپین تراجم میں روز افزوں اضافہ ہورہا ہے۔ اب مغرب اور موڈرن ہم معنی سمجھے جارہے ہیں۔ مغرب کو اجنبی نہیں سمجھا جاتا۔ کسی قسم کا احساسِ کمتری یا برتری یا اختلاف اس لفظ کے ساتھ نہیں۔ مغرب کی موجودہ اقدار ہندوستان میں بھی رائج ہیں۔ اپنے سیاسی جھگڑے کے باوجود ہم ان کو منظور کر چکے ہیں۔ ہم میں سے بیشتر کو انگلستان یا مغرب سے کوئی عناد نہیں۔ ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ ایک قوم کی حیثیت سے اپنا کام کرنے کے لیے اور اپنے مسائل حل کرنے کے لیے ہمیں تنہا چھوڑ دیا جائے۔

ہم آرٹ اور خیالات کی عالمگیر قدروں میں یقین رکھتے ہیں لیکن ہم اپنی قومی انفرادیت کے بھی قائل ہیں۔ ہندستانیت کو جدیدیت یا عالمگیریت کی لاٹھی سے نہیں ہانکا جاسکتا۔ صدیوں سے ہندوستان کی تشریح کی جارہی ہے۔ پچھلی نسل کے لیے ہندوستان غیر مغربی یا غیر جدید کے مترادف تھا۔ آج ہندوستان میں سب کچھ شامل ہے لیکن اس کی روح منفرد ہے۔

ہمارے لکھنے والوں کا مستقبل کیا ہے؟ غالباً بہت جلد موڈرن اور گاندھین راستوں میں سے ایک انتخاب کرنا ہوگا اور یہ فیصلہ بڑا تکلیف دہ ہوگا۔ مغربی لکھکوں کے سامنے اس قسم کا کوئی اذیت دہ فیصلہ نہیں ہے۔"

بلغاریہ کے کیمونسٹ ادیب بویاں بولغر نے کہا ـــــ

"آج کی دنیا بے حد مختصر ہوگئی ہے لیکن زبانوں کے اختلاف کی وجہ سے دنیا کا ادب ابھی تک قومی ہے اور اس وجہ سے بھی کہ ادب اپنی مخصوص قوم کے اعلان کی ترجمانی کرتا ہے۔ بالزاک کے ذریعے ہم انیسویں صدی کے فرانس کی روح میں اتر جاتے ہیں۔

لیکن اکثر ہوتا ہے؟ قومیں جو صدیوں سے ایک دوسرے کی ہمسایہ ہیں (مثال کے طور پر

بلغاریہ اور یونان کو ہی لیجیے) ایک دوسرے کے مصنفین کے بجائے فرانسیسی مصنفوں کو زیادہ بہتر جانتی ہیں (میں نے بالزاک کا حوالہ دیا) اور فرانس بلغاریہ سے بہت دور ہے!

چھوٹی زبانوں میں لکھے جانے والے ادب کی یہ بدقسمتی ہے کہ فن لینڈ اور پنجاب اور بلغاریہ اور ایران کے ادب نے ایک دوسرے کو کتنا متاثر کیا ہے؟ آپ کسی چیز کو جانے بغیر اس سے محبت نہیں کر سکتے۔ ادب کے ذریعے آپ ان قوموں کو جان سکتے ہیں اور ان سے محبت کر سکتے ہیں۔ محبت کے بغیر امن کی باتیں کرنا بے کار ہے۔

میں ایک چھوٹی قوم بلغاریہ کے ادبی نمائندے کی حیثیت سے آپ لوگوں کو سلام کرتا ہوں تا کہ اس عالمگیر کونسرٹ میں میری آواز بھی سنائی دے جائے۔

فرانس کے آرماں پیئر ال نے کہا۔ میں اپنے چند پسندیدہ جاپانی اشعار دہراؤں گا——

اگر چاند کے کنارے پر ایک لکڑی لگا دوں
تو یہ کیسی خوب صورت پنکھیا بن جائے۔

ایک گرتی پنکھڑی
میں نے شاخ کی طرف واپس جاتی دیکھی
یہ تو تیتری تھی!

وہ لڑکی جو کبھی نہیں آتی!
پرسکون شام میں جلتی ہوئی سمندری گھاس کی مانند

ساحل پر اس کا انتظار کرتے کرتے
میں بھی جل کر راکھ ہو گیا

آہستہ خرام سنہری مور
کی لمبی دم کی طرح طویل رات میں
میں کہاں تک اس کی راہ دیکھوں؟

میری زندگی
پہاڑی ندی پر تیرتے بلبلوں کی مانند نازک ہے۔

ان خیالات کی صدائے بازگشت دوسرے پیرایے میں آپ کو دوسرے ملکوں کی شاعری میں ملے گی" شروع میں۔ جب زمین و آسمان جدا ہوئے۔ فیوجی یاما کے متعلق ایک مشہور پرانی نظم ہے۔ یہی الفاظ انجیل مقدس میں موجود ہیں۔ ساری دنیا کی لوک کہانیاں معلوم ہوتا ہے۔ شروع میں ایک خاندان میں سنائی گئی تھیں۔ کارمن میرے ایک ہم وطن کی تخلیق ہے لیکن اسے اہل اسپین نے خالص ہسپانوی سمجھا۔ ایک چینی اوپیرا اور چند فرانسیسی لوک گیتوں میں مَیں نے عجیب و غریب مماثلت پائی۔ آج کل میں ایک جاپانی ناول کا ترجمہ کر رہا ہوں اس میں پروونشل زندگی کا جو نقشہ ہے وہ کسی بھی فرانسیسی صوبے کے شہر کا ہو سکتا ہے۔"

جاپان کے تاکیو کوابار نے کہا ـــــ

"پچھلی صدی میں اپنی تنہائی سے نکل کر دفعتاً ہمیں معلوم ہوا کہ اہل مغرب ہمارے سروں پر آن پہنچے ہیں۔ برطانیہ ہندوستان کو فتح کر چکا تھا اور اب ہمارے پاس سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہ تھا کہ ہم خود مغرب کے ہتھیاروں سے لیس ہو کر مغرب کی مدافعت کریں۔ یہی عہد میں ہمارے یہاں روس بھی آیا اور سوشلزم بھی روایت پرستی بھی موجود رہی۔

جاپان اور نیپال کے علاوہ دنیا کی اور کوئی قوم ہزاروں سال تک متواتر اور مکمل طور پر آزاد نہیں رہی۔ یہ ایک اہم تاریخی حقیقت ہے یہ حقیقت ہماری بہت سی اچھائیوں اور کمزوریوں کی ذمہ دار ہے۔

ہماری زبان میں اختلاف یا غیر ملکی عناصر زیادہ نہیں تھے لہٰذا ہم منطق اور فن خطابت کو ترقی نہ دے سکے لیکن اُن کے بجائے رعنائی اور نزاکت خیال کو خوب جلا ملی۔ فیوڈل عہد میں فلسفہ اور مذہب مرکزی حکومت کے ماتحت تھا لہٰذا جبھی سے قوم پرستی کی داغ بیل پڑنا شروع ہوگئی۔ جدید ادب خالص مغربی ادب کے زیر اثر پیدا ہوا۔ انیسویں صدی کے لکھنے والے اپنی بہت سی روایات کے لیے نادم تھے۔ آج جاپان میں موپساں، استندال، ٹالسٹائی اور دوستووسکی کو قومی کلاسیک سمجھا جاتا ہے۔ ساتھ ہی آپ یہ نہ بھولیے کہ جاپان میں تعلیم عام ہے اور عوام کتابیں پڑھنے کے شائق ہیں۔

میں یہ بھی بتادوں کہ ہم نے مغرب کے ہاتھ اپنی روح کو نہیں بیچا ہے۔ ہم مغربی لباس پہنتے ہیں مگر ہماری کھال کا رنگ زرد ہے۔ ہم اس زرد رنگ کے لیے نہ شرمندہ ہیں نہ اس کی وجہ سے مغرور۔ ہمارا تقلید کا دور ختم ہوکر تخلیق کا دور شروع ہورہا ہے اور ظاہر ہے کہ ہم ایٹمی عہد کی نفسیات کی عکاسی فیوڈل عہد کے ادبی طرز بیان کے ذریعے نہیں کر سکتے۔"

پولینڈ کے انطونی سلونیمسکی نے کہا — "کیا یہاں پہنچ کر چند پٹے ہوئے فقرے دہرا دینے سے وار سا سے ٹوکیو تک کے سفر کا مقصد پورا ہوگیا۔ کیا میں یہاں محض اسی لیے آیا تھا؟

کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ ذہنی تخیل کے کارناموں کی جس بلندی پر پہنچو وہاں جاکر معلوم ہوگا کہ یہاں چین کا تیر پہلے ہی سے گڑا ہوا ہے جو کئی ہزار سال قبل پھینکا گیا تھا اور ہند کا تیر اور جاپان کا تیر — اور جاپان نے تو اس زمانے میں بھی جبکہ سارا مشرق کولونیل غلامی کی تاریکی میں ڈبو دیا گیا تھا ایسی ٹکنالوجیکل برتری حاصل کی کہ زار شاہی روس جیسی زبردست طاقت کو شکست دینے میں کامیاب ہوگیا۔

ترجمے کی دقت بہت حد تک مشرق اور مغرب کی ادبیات کو قریب لانے میں حائل رہی ہے خصوصاً شاعری جس کا ترجمہ بہت مشکل ہے۔ طاقتور سمندری یورپین طاقتیں صدیوں سے اہل ایشیا سے واقف ہیں لیکن پولینڈ جیسے چھوٹے چھوٹے یورپین ممالک بہت سکینڈ ہینڈ طریقے پر واقف ہوسکے ہیں۔ ہم کو ہندو چینی اور جاپانی شاعری کے ترجمے انگریزی سے پولش میں کرنا

پڑے۔

اس سلسلے میں آپ خود ایک دلچسپ تجربہ کر کے دیکھئے۔ ایک گم نام پولش نظم پن کلب کے برطانوی سنٹر کو بھیجیے جہاں سے اس کا انگریزی ترجمہ ہنگرین، پرتگالی اور جاپانی سنٹرز میں بھیجا جائے۔ ان ساری زبانوں میں ترجمہ ہونے کے بعد اس کا آخری ترجمہ دوبارہ پولش میں کر کے دیکھیے معلوم ہوگا یہ تو کوئی دوسری نظم ہے۔

ترجمے کی دقت اس کے علاوہ دوسری چیز قوموں کی ایک دوسرے سے مکمل ناواقفیت ہے۔ اس کی ایک معمولی سی مثال میں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ یوروگے میں جب یونیسکو کانفرنس منعقد ہوئی تو وہاں میں نے یہ تجویز پیش کی کہ یونیسکو کو پولینڈ کے قومی شاعر آدم مکی ویز کے متعلق ایک کتاب شائع کرنا چاہیے۔ میں نے اس بات پر زور دیا کہ مغرب اس عظیم ترین سلاد شاعری سے کس حد تک ناواقف ہے۔ ایک مشہور ترین انسائیکلوپیڈیا میں مَیں نے اس کا نام ڈھونڈھنا شروع کیا۔ "M" کے خانے میں مکی ماؤس تو تھا لیکن مکی ویز کا کہیں پتہ نہ تھا۔

ابھی کہانی یہیں ختم نہیں ہوتی۔ اپنے وطن پانچ کر وارسا میں اپنے یونیورسٹی طالب علموں کو میں نے مکی ماؤس اور مکی ویز کا یہ قصہ سنایا۔ ان کو ہنسی نہیں آئی۔ نہ اس بات میں کوئی لطیفہ انھیں نظر آیا۔

کیونکہ وارسا کے کسی ایک طالب علم نے کبھی مکی ماؤس کا نام تک نہیں سنا تھا!

اس محفل میں جمالیاتی اقدار اور طرز زندگی پر مشرق و مغرب کا باہم اثر زیر بحث ہے۔ میں اس مسئلے کے ایک ضروری پہلو کا تذکرہ کروں گا جو میرے ملک کے لیے بڑی خاص اور ڈرامائی حیثیت رکھتا ہے۔ میرا اشارہ روسی کمیونزم کے چین پر اور چینی فلسفیانہ روایات کے کمیونزم پر اثر کی طرف ہے۔ اسٹالن عہد کی کمیونزم نے بہت سی حکایات اور دیو مالائیں گڑھ لی تھیں۔ گزشتہ سالوں میں ہم نے دیکھا ہے کہ ایک طاقتور دیوتا اور کینہ پرور راکھشسوں کی ایک ٹولی کی ذاتی مرضی اور من کی موجی پر زندگی اور شخصی آزادی کا تمام تر انحصار ہوتا ہے ہمیں یقین نہیں کہ وہ عہد دوبارہ دہرایا نہیں جائے گا۔ سوال یہ ہے کہ ہم ان راکھشسوں سے کس طرح لڑیں؟ یہاں پر

کنفیوشس کا وہ جواب سنیے جو انھوں نے اپنے چیلوں کے اس سوال پر دیا تھا کہ دیوتاؤں اور راکھشسوں کا ردِ عمل کیا ہونا چاہیے۔

''جہاں تک ہو سکے ان سے کم سے کم سروکار رکھو۔ پہلے یہ دیکھو کہ اپنے ہم جنسوں کے ساتھ امن انصاف اور محبت سے رہتے ہو یا نہیں۔'' جب کنفیوشس سے پوچھا گیا کہ ان ہم جنسوں کے لیے سب سے پہلے کیا کیا جائے۔

''انھیں روٹی مہیا کرو۔''

اور اس کے بعد؟

''انھیں تعلیم دو۔''

اس عقلیت پرست پروگرام نے اٹھارھویں صدی کے یورپ کو متاثر کیا تھا۔ یہ پروگرام اب ایک نئی حقیقت میں تبدیل ہو رہا ہے۔ آیا مطلق العنان دیوتا اور راکھشس آخر میں فتح مند رہتے ہیں یا عقلیت پرست آزاد انسانی خیالات اس بات پر نہ صرف بہت سے چینی اور پولش دانشوروں کی قسمتوں کا انحصار ہے بلکہ سوشلسٹ ہیومنزم کی آئیڈیالوجی کا دارومدار بھی اسی پر ہے۔

اس وقت ہم لکھنے والوں کو کیا کرنا چاہیے۔ یہ علم معیشت حیوانات کا مسئلہ ہے۔ پوری انسانیت زندگی کے تبدیل شدہ حالات سے مطابقت پیدا کرلے گی یا نیست و نابود ہو جائے گی۔''

" Total War " اور " Two Faces of Man " کے مصنف ڈچ ماہر نفسیات میرلوجوسٹ نے کہا ——

''ایک خالص مغربی سائنس کے نمائندے کی حیثیت سے اگر میں بار بار نفسیات کی اصطلاحات استعمال کروں تو مجھے معاف فرمائیے گا۔ مشرق اور مغرب کے انسان نے تجزیۂ نفسی کے کلنک میں اپنے اندرونی اور بیرونی مسائل سے جس طرح مجھے باخبر کیا میں اس سے آپ کو روشناس کرانا چاہتا ہوں۔

میں نے دیکھا کہ دوسروں کی مختلف خصوصیات انسانوں کو ایک دوسرے سے علاحدہ نہیں رکھتیں۔ اس علاحدگی کی اصل وجہ وہ روایتی تصور ہے جو انسانوں نے دوسرے انسانوں پر اپنی

طرف سے چپکا رکھا ہے اور اس تصور کی اصلاح کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ آج یہ اختلافات بے حد شدید ہو چکے ہیں۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد مغربی یورپ پیچھے کو سرک گیا اور روس، امریکہ اور ایشیا اپنی اپنی ذمہ داریوں کے ساتھ سامنے آ گئے۔ مغرب اپنے غرور میں مبتلا یہ بھول جاتا ہے کہ وہ دنیا کو اپنے ہی نقطۂ نظر سے دیکھنے کا عادی ہے۔

اگر میں اپنے مشرقی ماہر نفسیات دوست سے کہوں کہ وہ مغربی اور مشرقی کے روحانی فرق پر روشنی ڈالے تو وہ میری اس جاننے کی سعی پر مسکرائے گا اور کہے گا، خاموش رہنا سیکھو میرے بھائی اور دھیان میں مصروف ہو کر اپنی اندرونی آواز سنو۔

لیکن کیا تم کو دنیا کے اہم ہنگامی مسائل کا احساس نہیں؟ میں بے صبری سے کہوں گا۔ دیکھو کسی لمحے بھی جنگ چھڑ جائے کولونیلزم ایٹمی خطرہ پرشور مڈل ایسٹ کیمونزم۔

کیا تم نے اپنے الجھے ہوئے ہوئے زیادہ گہرے مسائل کی پردہ پوشی کرنے کے لیے یہ سیدھے سادے شفاف پرابلم تخلیق تو نہیں کر لیے ——؟ میرا مشرقی ماہر نفسیات دوست کہے گا۔ اور پھر خاموشی چھا جائے گی۔

ایک ڈاکٹر سے زیادہ بہتر کوئی نہیں جانتا کہ بنیادی طور پر سب انسان ایک ہیں، ان کے دکھ، تکالیف، مسرتیں! انسان محبت کرتا ہے بچے پیدا ہوتے ہیں، انسان مرتا ہے۔

جب میرا پہلا چینی مریض میرے پاس آیا تو مجھے بڑی گھبراہٹ سی ہوئی مجھے دنیا کی ایک قدیم ترین تہذیب کے نمائندے کا علاج کرنا تھا۔ میں ڈر سے تھر تھر کانپا۔ مجھے اینتھروپولوجسٹ حضرات نے خبردار کر رکھا تھا کہ مشرق بعید کا مطالعہ بہت مشکل کام ہے۔

لیکن اس کے پروبلم بھی وہی نکلے جو میرے یورپین مریضوں کے تھے۔ دکھی بچپن، سخت مزاج والدین، جنگ سے تباہ شدہ ملک میں اسکول کی تعلیم، بڑے بھائی سے حسد، چہیتی بیوی کی موت۔

ہم اکثر یہ بھول جاتے ہیں کہ ہم کسی مخصوص نسل یا ملک میں محض اتفاقاً پیدا ہو گئے مگر اسی پیدائش کے لحاظ سے ہمیں اپنی وفاداریاں اختیار کرنا پڑتی ہیں۔

مختلف کلچرل سانچوں کے اندر بے شمار روحانی سانچے موجود ہیں اور جب یہ متضاد کلچرل گروہ ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں تو ان کے ذہنوں کے اندر وہ سارے تعصبات پہلے سے موجود ہوتے ہیں اور کمیونی کیشن علامتوں اور آوازوں اور الفاظ کے مختلف ہونے کی وجہ سے اور زیادہ مشکل ہو جاتا ہے۔ پچھلی نصف صدی کی سیاسی اصطلاحات نسل خون زمین رنگ دراصل غیر شخصی اور سائنٹفک معانی کے بجائے گہرے جارحانہ جذبات کے مظہر ہیں۔

لیکن ہر کلچرل گروہ خوف اور شبے اور تعصب کے پرانے پیٹرن توڑ کر مذہبی علامتوں اور تخلیقی آرٹ کے ذریعے اپنے آپ کو کمیونی کیٹ کر لیتا ہے۔ مشرق ڈائریکٹ تصوراتی اور الہامی ہے مغرب بالواسطہ ہے تجزیے اور تعبیر و تضمین کا قائل۔

لیکن بے صبر سائیکولوجسٹ ان سب باتوں کا جواب انسانی طرزِ عمل کی ٹیکنیکل اصطلاحات کے ذریعے چاہتا ہے۔ وہ پوچھتا ہے کہ کنفیوشس مہاتما بدھ اسلام اور ہندو فلسفے کے نفسیاتی محرکات کیا تھے؟ یا یہ کہ عیسائیت اتنے مختلف کلیساؤں میں کیوں بٹ گئی؟

مشرق اور مغرب میں نفسیاتی فرق نہیں ہے سوائے اس کے کہ محض چند خصوصیات مشرق سے تعلق رکھتی ہیں اور مغرب سے مشرق کا انسان اپنے خاندان اور اپنی کمیونٹی سے زیادہ قریب رہتا ہے اس کا نجی تنہائی کا مطالبہ مغربی انسان کے اس مطالبے سے جداگانہ ہے یہاں یہ تنہائی مذہبی مراقبے کے لیے پسند کی جاتی ہے لیکن اس مراقبے میں بھی مشرقی انسان گروہ کا فرد رہتا ہے گروہ یہاں زندگی کا مرکز ہے یہاں میں مشرقی ندامت کی کلچر اور مغربی احساسِ جرم کی کلچر کا فرق واضح کر دینا چاہتا ہوں۔ انسان کو ندامت اپنے کنبے یا اپنے ہم چشموں سے ہو سکتی ہے اس کا گروہ اس کا طرزِ عمل تیار کر کے دیتا ہے اور انسان اسی گروپ میں رہے جاتا ہے۔ ذاتی احساس جرم اور ذمہ داری کے مغربی تصور کے تحت فرد اور گروہ میں بہت فاصلہ پیدا ہو جاتا ہے یہاں فرد کی کشمکش اس کے گروہ سے نہیں بلکہ خود اس کے اپنے اندرونی وجود سے ہے۔ مشرق میں جرم و سزا کرم کے غیر شخصی قانون کے ماتحت ہے یہاں کسی الوہی مصنف یا ذاتی ضمیر کے فیصلے کی ضرورت نہیں۔ اس کے برعکس مغربی معاشرے نے فرد پر بے شمار پابندیاں عائد کر دی ہیں وہ غیر سماجی طرزِ عمل اختیار

نہیں کرسکتا۔ احساس جرم سے بچنے کے لیے اسے اپنے شعور سے نفرت اور تخریب پسندی کے جذبات کو اس حد تک نکال دینا پڑا ہے کہ اس کی ریاکاری غیر شعوری بن کر رہ گئی ہے لیکن ہے موجودہ ٹیکنالوجیکل تمدن کا مغربی انسان اب مشرق کے گروہ پسند انسان کی طرح روز بروز گروہ کے پیٹرن میں شامل ہوجاتا ہے۔

مغرب کے انسان کو اپنی شدید تنہائی کی وجہ سے نیوروسس کا شکار ہونا پڑا۔ اسی وجہ سے اجنبیوں اور غیر ملکیوں سے اسے دحشت ہوئی۔ اپنے آپ کو اور اپنی قوم کو دوسروں سے برتر سمجھنے کی نرگسیت دراصل احساسِ کمتری اور غیر اطمینانی کو چھپانے کا ایک حربہ ہے۔

مشرقی تہذیبیں دوسری تہذیبوں اور نسلوں کے سلسلے میں ہمیشہ سے بہت مہمان نواز اور آزاد خیال رہی ہیں۔ چین اپنی جنگوں میں ہارا لیکن اپنے فاتحوں کو فتح کرتا رہا۔ منگولیا اور منچوریا کے فاتح خود چینی بن گئے۔ ہندو مذہب کا رویہ سارے مذاہب کے لیے عالمگیر رواداری کا ہے۔ آج سے ہزاروں سال قبل ہندو حکما نے اس نظریے کو (جو آج کل جدید Physical اصول ہے) منظور کرلیا کہ مختلف نظریے بیک وقت صحیح ہوسکتے ہیں۔ ہندوازم دوسروں کے خیالات کے لیے جارحانہ طور پر متعصب کبھی نہ رہی۔ اس کے باوجود یہی ہندوازم روح کے اختلافات کے متعلق روادار رہی اور جس مذہبی انفرادیت کے اصول کی تبلیغ کی۔ یہی ہندوازم اپنے معاشرے کے اچھوت طبقے کے لیے انتہائی تنگ نظر ثابت ہوئی۔ اسی وجہ سے اسلام ہندوستان میں کامیاب ہوا۔ اسلام کا مساوات کا رویہ اور عمل پرستی گروہ پرست انسان کی طبیعت کو زیادہ بھلی معلوم ہوئی۔ مسلم مفکر اقبال مشرقی فلسفے کی انفعالیت اور خیال پرستی سے بہت نالاں تھے۔ گو اسلامی طرزِ تفکر کی یکسانیت اور PARTICIPATION کے نفسیاتی پیٹرن کی وجہ سے مسلمان ممالک آمریت کے بڑی آسانی سے شکار ہوجاتے ہیں۔

بدھ ممالک میں انسان کے اکیلے پر زور دیا گیا ہے۔ انسان اور اس کا خاندان اور اس کا ملک اور سارا انظام کائنات اور نروان۔ یہ سب ایک ہیں۔ اسے ذہنی سکون آفاقی سناٹے میں حاصل ہوتا ہے جس کا وہ ایک حصہ ہے فقیری، سکت کوشی اور غربت اب بھی اورینٹل کلچر کے آدرش ہیں۔

مغرب کا آدرش وہ باغی لوسی فر ہے جو اپنی خودی کے بل پر آفاق سے ٹکر لینے کے لیے تلا رہتا ہے۔ اپنے استادوں سے آگے نکلنا چاہتا ہے۔ مشرق کا انسان اپنے استاد اپنے گرو کے ساتھ ہی رہنے کا متمنی ہے۔

مغرب کا انسان پراسرار اور غیر منطقی چیزوں سے خائف ہے۔ اسے تفریح میں اندرونی مسرت نہیں ملتی۔ وہ خوشی کے متعلق باتیں کرتا ہے مگر خوشی محسوس نہیں کرتا۔

انسان کسی جگہ سے تعلق حاصل کرنے کی، کسی گروہ میں شامل ہونے کی حاجت کو مشرقیوں نے زیادہ آسانی سے حل کرلیا ہے وہ آرام سے اپنے ماحول اپنے خاندان برادری طبقے اور قوم میں شامل رہتے ہیں۔ ہم کو اس شرکت کے لیے ممبر شپ کارڈ ڈپلوما خرچ کی رُکنیت کا لیبل اور شادی کا لائسنس درکار ہے۔ ٹیلی ویژن دیکھتے وقت ہماری تنہائی سب سے زیادہ شدید ہوتی ہے ہمارے اندرونی کھنچاؤ کو کم کرنے کے لیے گروہ کا سہارا ابھی ہمیں میسر نہیں۔

اب ٹیکنالوجی اور انفرادیت پرستی دونوں کی لہر مشرق میں داخل ہو چکی ہے لیکن کیا مشرق اور مغرب قریب آسکیں گے؟ انسان انسان سے مل سکے گا؟ غریب امیر سے مسرت اداسی سے تعلق پیدا کرسکتی ہے؟

مذہب یا فلسفے کے بجائے انسان کی طاقت اور دولت کی تلاش اور حرص نے دنیا کو تقسیم کر رکھا ہے۔

چینیوں، روسیوں، کیمونسٹوں، اہلِ پیرس، عربوں، یہودیوں، ہسپانیوں اور جاپانیوں وغیرہ کے متعلق جو متعصب تصورات ہمارے ذہنوں میں موجود ہیں، ان کے زائل ہونے میں ابھی بہت عرصہ لگے گا۔ موجودہ سرد جنگ اور اس کے پروپیگنڈے نے ان متعصب تصورات کو بے حد ہولناک طور پر بڑھا اور پھیلا دیا ہے۔"

اسی روز لکھنے والوں کے دوسرے گروہ نے امریکن ڈرامہ نگار ایلمر رائس کی زیر صدارت جمالیاتی اقدار پر تبادلۂ خیالات کیا۔ جاپان کے سی ای ای ٹو نے کہا ——

چیکوسلواکیہ کے نمائندے مسٹر اڈولف ہوف میسٹر نے آج ایک اخبار میں لکھا ہے جاپانی

مصوری کے متناسب اور جان دار خطوط دیکھ کر پتہ چلتا ہے کہ تنظیم اور فرماں برادری اس قوم کی فطرت میں داخل ہے۔

یہ صحیح ہے تنظیم کا یہی احساس آپ کو نظموں کی بحر اور ان افسانوں کے اسٹائل میں ملے گا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ہم ایک بے حد کم آمیز اور صابر قوم خیال کیے جاتے ہیں۔

موت کے متعلق ہمارے رویے کو بھی بہت حیرت انگیز سمجھا جاتا ہے کیونکہ جاپانی مرنے کی بالکل پرواہ نہیں کرتے اور خودکشی ہمارے معاشرے کا خاص انسٹیٹیوشن رہا ہے۔ موت سے ہم کنار انسان کو زندگی بے حد صاف نظر آتی ہے۔ اس کا اثر آپ ہماری مصوری میں دیکھئے جہاں سفید پس منظر کے مقابل میں صرف ایک پھول ایک چٹان ایک پہاڑ یا ایک انسانی شکل آپ کو نظر آئے گی۔ یہ سفید گراؤنڈ فنا اور عدم موجودگی کی علامت ہے یہی ہمارا بدھ فلسفہ ہے۔

گو جاپانی گروہ کے احساس سے محروم ہیں لیکن اس کو اپنے خاندانوں اور دوستوں سے بہت انسیت ہے۔ ایک قوم جو ساری دنیا سے الگ تھلگ ایک دور افتادہ جزیرے میں رہتی ہے اسی تنہائی کی وجہ سے وہ اپنا گھر اور اپنے باغات کو سجا کر رکھتی ہے لیکن اجنبیوں سے اسے زیادہ مروّت نہیں۔ دوسری جنگ عظیم میں جاپانی سپاہیوں کے طرز عمل کا پس منظر یہی تھا۔

جاپانی فن کار اسی بدھ فلسفے کے زیر اثر سوسائٹی سے بھاگ کر تنہائی میں پناہ لیتا ہے۔

پال تبوری نے کہا۔

''میں ایک ایسے ملک میں پیدا ہوا جہاں مشرق و مغرب میں سے ایک کا انتخاب ایک ہزار سال سے ایک بنیادی مسئلہ رہا تھا۔ انگریزی کو ایک ہزار سال تک اس سوال کا سامنا کرنا پڑا کہ آیا وہ مشرق و مغرب کے درمیان ایک پُل ہے مشرق کے خلاف ایک فصیل ہے یا دونوں کے لیے اسے ایک پھاٹک کا کام دینا ہے۔

ایک ہنگیار سے اگر یہ کہا جائے کہ اس کا ملک بلقان کا ایک حصہ ہے تو وہ لڑ مرے گا۔ ہمارے لکھنے والوں نے پیرس فلورنس اور میونخ کو اپنا روحانی وطن سمجھا اور اپنی قوم کی مشرقی ذہنیت سے بے حد نالاں رہے۔ اُن کے نزدیک مشرقی ذہنیت کاہلی، بے ایمانی، ناکارہ پن اور جہالت

کے مترادف تھی۔

ان لکھنے والوں کا یہ غم و غصہ بہت حد تک حق بجانب تھا۔ ہم نے بازنطین سے تھوڑا بہت حاصل کیا مگر ہنگری کا صرف ایک بادشاہ صلیبی جنگوں میں لڑنے کے لیے گیا تھا اور وہاں سے مایوسی کے علاوہ اور کچھ ساتھ نہ لایا۔ ہمارے لیے مشرق صرف تباہی کا منبع تھا۔ تاتاریوں کے حملے اور قتل عام ترکوں کا تسلط ہے۔ ہم ڈیڑھ سو سال تک عثمانیوں کے غلام رہے اور اس عرصے میں ہماری تہذیب بالکل برباد ہوگئی۔ ہمارے نشاۃ ثانیہ کو دو سو سال تک انتظار کرنا پڑا۔ ترک تسلط کے دوران میں ان کی کاہل اور ظالمانہ حکومت اور آرٹ اور لٹریچر کی طرف سے ان کی مکمل بے اعتنائی نے ہمارے اندر غیر ملکی اقتدار کا مقابلہ کرنے کی طاقت بھی سلب کر دی۔ ہنگری کی تازہ صورت حال کی جڑیں دراصل اس وقت میں پہنچتی ہیں۔

لیکن اس کے باوجود ہنگرین قوم کے دل میں مشرق کے لیے عجیب قسم کی جاگزیں رہی۔ ساری اقوام اپنی نوجوانی کے عہد کا فردوس گمشدہ تلاش کرتی رہتی ہیں۔ اپنے باغ عدن کے خواب دیکھتی ہیں۔ مگیار وسط ایشیا سے آئے تھے۔ مدتوں ہمارے بہت سے ہم قوم اپنے ایشیائی رشتہ داروں کی تلاش میں سرگرداں چین تبت افغانستان اور ایران میں مارے مارے پھرے اور اب تو پچھلے بارہ سو سال سے ہنگری کی کلچر کا رخ جبری طور پر مشرق کی طرف موڑ دیا گیا ہے۔

مشرق کا خوف ہمیں اپنے پرانے عوامی ادب میں جابجا ملتا ہے۔ کسان گیت کار بھنورے سے کہتا ہے اس سے قبل کہ ترک آ کر اسے مسل ڈالیں اسے یہاں سے اُڑ جانا چاہیے۔ اکثر لوک گیتوں میں ان ہنگرین لڑکیوں کی فریاد ہے جنھیں ترکوں نے اغوا کیا یا مار ڈالا۔ ڈھائی سو سال تک ترکوں کے خلاف جنگ نے کوچہ گرد گویوں کے گیتوں میں رنگ بھرا۔ ایک سولھویں صدی کے شاعر نے کہا ــــــ

ترک کا عقیدہ ہے
کہ کسی عیسائی کو وہ دھوکا دے کر اغوا کر سکے
تو صلے میں اسے جنت ملے گی۔

اس طویل اذیت ناک جدوجہد کے بعد ہنگرین اور ترک نے ایک دوسرے کی عزت کر کے امن کے ساتھ رہنا سیکھا۔ سترھویں صدی کے آخر میں تو ہنگرین میں ترکی کے لیے گہری ہمدردی پیدا ہو چکی تھی اور بہت سے ہنگرین وطن پرستوں کے لیے جو اپنے زیادہ خطرناک دشمن یعنی ہیپس برگ تسلط سے لڑ رہے تھے۔ ترکی اکثر جائے پناہ ثابت ہوا۔

اٹھارھویں صدی کے وسط میں شاعر اور کیتھولک راہب پال ایلیتوس نے مغرب کو مشرق کے جھوٹے اور کھوکھلے سحر سے بچنے کے لیے آگاہ کیا۔ اس وقت والٹیر کے زیر اثر سارا یورپ مشرق کے رومان سے مسحور ہوا جا رہا تھا۔

یہ مت کہو کہ چرواہوں کے جھونپڑوں والا ریگستان بڑا خوب صورت ہے۔ اس نے لکھا——

کیا لندن اور پیرس میں عظیم ترین عقلی شاہکار تخلیق نہیں ہوئے۔
کلیسیت اور کورنیل مغلوں کے
ہندوستان ہرگز نہیں گئے تھے
تم جس نے وی آنا کے محل دیکھے ہیں
تم الجزائر کے وحشیوں کے خیموں کو واقعی پسند کرتے ہو؟

لیکن ایک اور ہنگرین شاعر نے مشرق کی عظمت کے گیت گائے اور اس وقت کی بشارت دی جب مغرب کو زوال اور مشرق کو دوبارہ عروج حاصل ہوگا۔ یہ شاعر سوکونائی حافظ شیراز کا بڑا پرستار تھا۔

ہمارے عظیم ترین جدید شاعر اینڈرا ایدی کے کلام میں اس روحانی رشتہ کشی کی مکمل جھلک نظر آتی ہے۔ وہ اپنے محبوب پیرس کو خدا حافظ کہہ کر اپنے دکھیارے وطن واپس جا رہا ہے——

'گا۔ پیرس۔ گا۔
اجنبی جسے تو نے اپنا لے پالک بنایا تھا۔
اپنے وطن واپس جا رہا ہے جہاں گیت پیدا نہیں ہوتے

اس پر ترس کھا
مجھے تو ہنگری کی آواز ابھی سے سنائی دے رہی ہے
فقیروں کی ٹولی کی صدا
وہاں کے پھولوں کی مہک میں موت ہے
زمین پر ایک لعنت طاری ہے
ان کھیتوں پر جنھوں نے مجھے جنم دیا
سورج کی کرنوں کا گزر نہیں
لیکن اس کے باوجود میں جاتا ہوں
کیوں کہ اپنی قسمت کو کوئی رد نہیں کر سکتا
میں وہیں پر مروں گا
وہ سونے بادل اور وحشت ناک ویرانہ
میری روح میں خنجر کی روح اُتر رہا ہے

دوسری نظم میں وہ شیطان اور شراب کے دیوتا گویا مشرق کے مکمل اوتار سے مخاطب ہے——

اس جدید زمانے میں میرے ساتھ بیٹھنے کے لیے
وہ اودی عبا میں ملبوس گھوڑے کے لیے
ہاتھ میں ستار لیے صبح سویرے
مشرق سے نکل کر میرے پاس آیا
وہ ابدی کلبیت پرست ہے
مشرق مسرور تھا
لیکن موجودہ زمانے............
اب کہرہ مستقبل کو اپنی ٹیڑھی ترچھی لکیروں میں سمیٹے

شراب سے بھیگے میز پوش پر ناچتا ہے
شیطان بحث کیے جا رہا ہے

اس طویل بحث کے دوران شاعر اپنے پھٹے ہوئے کوٹ میں سکڑتا اونگھتا رہتا ہے۔ سرخ شراب بہتی جاتی ہے۔ میز پر ایک صلیب کے سامنے دو موم بتیاں جل رہی ہیں۔

ہم دونوں کے درمیان یہ جھگڑا ابابل کے زمانے سے چل رہا ہے۔
میرے کسی فضول خرچ پُر کرنے
اسے معلق باغات کے نیچے گاتے ہوئے سن لیا ہوگا
اور اس دن سے لے کر آج تک
ابدی کلیت پرست
میرا خدا میرا باپ اور میرا بادشاہ ہے۔

اب شاعر اس سے کہتا ہے خدا کے لیے یہ بحث ختم کرو۔ صلے میں وہ اسے اپنا ٹوٹا ہوا دل پیش کرنے کے لیے تیار رہتا ہے لیکن ابدی کلیت پرست حقارت سے ہنستا ہے۔ شاعر اس سے اپنی زمین اپنی آواز واپس ملنے کی درخواست کرتا ہے وہ شراب اور مشرق کے سحر سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس کے سوچنے کی طاقت بھی سلب کر لینے کے بعد وہ ابلیس صفت اس سے رخصت ہوتا ہے ـــــ

چنانچہ وہ مشرق سے نکل کر
اپنی کافر بے دین تلوار کے ساتھ
مغرب سے نئی لڑائیاں لڑنا چاہتا ہے
میں صلیب کو مضبوطی سے پکڑ کر
گر چکا ہوں، میرے جسم کی گرمی جاتی رہی ہے
ٹوٹے ہوئے گلاسوں کے درمیان
میز کے نیچے پڑے ہوئے

میرے چہرے پر ایک منجمد مسکراہٹ ہے،

یہ نظم محض اشارتی ہی نہیں تھی اس کا ملک جس طرح براؤن جابروں کے قبضے میں آ گیا تھا۔ اسی طرح آج سرخ آمریت کے مظالم سہہ رہا ہے لیکن ہنگری کے روحانی ورثے کو جو شرقی تھا۔ کوئی وطن پرست نظر انداز نہ کرنا چاہتا تھا۔ ایران کے ننھے ترکی کی مزاحیہ کہانیاں ہندوستان کی داستانیں اس کے دروازے سے اندر داخل ہو گئیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ مشرق اور مغرب کا فرق بالکل مصنوعی ہے۔ عربوں کے بغیر اسپین کے آرٹ اور لٹریچر میں کیا باقی رہ جاتا ہے؟ کیا شمالی اقوام نے اسکینڈی نیویا اور قسطنطنیہ کے درمیان ایک تہذیبی شاہراہ قائم نہیں کی کوئی کلچر دوسری تہذیبوں سے کٹ کر الگ تھلگ زندہ نہیں رہ سکتی۔ اگر آپ ایسا کرنا چاہیں تو آپ کی کلچر مرجھا کر ختم ہو جائے گی۔"

بلغاریہ کے کمیونسٹ ادیب بورس ڈیلچیف نے کہا ـــــ

"اس وقت جبکہ ہم سب جاپان میں جمع ہوئے ہیں میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ اس کے ایک شہر کے نام کا تذکرہ کروں۔ ہیروشیما۔

پچھلے بارہ سال سے ہیروشیما محض ایک شہر کا نام نہیں رہا ہے بلکہ انسانی ضمیر کا سمبل بن چکا ہے ـــــ یہ ہمارے عہد کی ایک ایسی روحانی حد فاصل ہے جو تخریب کو تعمیر سے کلچر کو غیر کلچر سے انسانیت کو درندگی سے جدا کرتی ہے۔ ساتھ ہی اس نے اچھے ادیبوں کو برے ادیبوں سے علاحدہ کر کے دکھا دیا ہے ہمارے عہد کا اچھا ادیب وہ ہے جو اس خطرے کی طرف سے بے نیاز نہیں ہے جو ہزاروں انسانوں کے سروں پر ایٹمی طاقت کی وجہ سے منڈلا رہا ہے۔ یہ ادیب اپنے قلم کے ذریعے انسانیت کو ہیروشیما سے بچانے کی کوشش میں مصروف ہے۔ اس کے سیاسی اور مذہبی نظریات چاہے کچھ بھی ہوں۔ یہ ہر انسان، ہر فن کار کا فرض ہے۔ ہمارے عہد کے ادیب کا کام محض جذبات اور واقعات کی داستان گوئی ہی نہیں وہ اپنے لوگوں کی مصیبتوں سے بے نیاز زندگی کا غیر جانب دار تماشائی نہیں رہ سکتا جیسا کہ ڈرائنگ روم کے ادب کے مداحین کا خیال ہے۔"

سیشن کے بعد چند جنوبی کوریا والے میرے پاس آئے۔ "ہمارے ساتھ تصویر کھنچوائیے"

انھوں نے کہا۔ مشرقی جرمنی کے بوڈ ویوزے لیبرے پاس کھڑے تھے ان سے بھی درخواست کی۔ مگر میں تو مشرقی جرمنی کا ہوں۔ انھوں نے مسکرا کر کہا۔ لیکن اب کیا ہو سکتا ہے۔ تصویر کھنچ چکی تھی۔ نہ جانے جنوبی کوریا والے اس گروپ کا اب کیا کریں گے۔

شام کو ایک عصرانے کے دوران میں مَیں نے شری واتسائن سے پوچھا——"آج صبح ڈاکٹر آئنگر نے ہندوستان میں اُردو ادب کی تخلیق کا ذکر کیا تھا۔ کیا یہ تخلیق ان حالات میں پنپ سکتی ہے جو اس وقت وہاں اُردو کے لیے پیدا ہو گئے ہیں؟" یہی سوال میں نے ایک روز ڈاکٹر صاحب سے بھی کیا تھا وہ اس مسئلے پر بہت دُکھی تھے۔ زبان کے معاملے میں لوگ دیوانے ہو گئے ہیں بالکل دیوانے ہو گئے ہیں۔ آج برصغیر میں زبان کے معاملے میں جس قدر نفرت سے کام لیا جا رہا ہے اسے دیکھ کر دل لرزتا ہے۔ ڈاکٹر آئنگر نے اُداسی سے کہا تھا۔

میں پارٹی سے باہر آ رہی تھی کہ لفٹ میں بوڈ ویوزے مل گئے۔ "چلو!" انھوں نے کہا۔ "کسی خاموش جگہ بیٹھ کر کھانا کھائیں۔"

ہم نے چیک ادیب کو ساتھ لیا اور امپیریل واپس آ گئے۔

تہ خانے کے گرم روم میں ابھی سناٹا تھا۔ اکا دُکا امریکن کروڑ پتی اِدھر اُدھر بیٹھے بیئر پی رہے تھے—— ہم تینوں ایک خاموش کونے میں بیٹھ گئے۔ "آج تم نے کس کس کے کارٹون بنائے؟ میں نے چیک ادیب اوڈولف ہوف میسٹر سے اُداسی سے پوچھا۔ وہ چپ چاپ بیٹھا کاغذ کے سرویٹ پر لکیریں کھینچا کیا اوڈولف شاعری ڈرامے اور ناول کی پینتالیس کتابوں کا مصنف پراگ کی چارلس یونیورسٹی کا ڈاکٹر آف لاء بین الاقوامی شہرت کا کارٹونسٹ جس کی تصاویر ماسکو کے علاوہ نیویارک کے میوزیم آف موڈرن آرٹ میں بھی موجود ہیں۔ اس وقت جانے کس گہری سوچ میں مستغرق بیٹھا تھا۔

"مجھ کو کچھ کشمیر کے متعلق تازہ ترین صورتِ حال سے مطلع کرو۔" اس نے اسی طرح منہ لٹکاتے ہوئے کہا۔

"تمھاری کٹھ پتلیوں کی فلموں کا کیا حال ہے؟" میں نے ذرا غصے سے جواب دیا۔

''اچھا۔ اچھا۔ کشمیر نہیں۔ کچھ کلاسیکل رقص پر روشنی ڈالو۔'' اس نے معانقہ کر کہا۔

بوڈویوزے نے بھی بشاش نظر آنے کی کوشش کی۔

اوڈولف جنگ کے زمانے میں گسٹاپو سے بچ کر فرانس پہنچا لیکن وہاں جیل میں بند کر دیا گیا وہاں سے بھاگ کر مراکش اور پرتگال ہوتا ہوا امریکہ پہنچا۔ جنگ کے خاتمے پر پراگ واپس لوٹا اور 48 عیسوی سے 51 عیسوی تک فرانس میں جمہوریہ چیکوسلواکیہ کا سفیر رہا۔ اس کے بعد کئی سال تک اقوام متحدہ میں چیکوسلواکیہ کی نمائندگی کرتا رہا۔ اب پراگ اکیڈمی آف ڈیکوریٹو آرٹس میں متحرک کارٹونوں اور کٹھ پتلیوں کے فلمز کا پروفیسر ہے۔

کل اس نے میرے جانے بغیر میرا کارٹون بنایا تھا جو آج صبح کے اخباروں میں چھپا۔ وہ خاموشی سے بیٹھا کانفرنس کے مندوبین کے کارٹون بنایا کرتا جو روزانہ ٹوکیو کے انگریزی اور جاپانی پریس میں دھوم دھام سے شائع کیے جاتے۔

بوڈویوزے مشرقی برلن میں رہتے ہیں فلم بناتے اور ناول لکھتے ہیں۔ دس بارہ سال میکسیکو اور امریکہ میں رہے ہیں۔ جنگ کے اختتام پر امریکہ رہ جانے کے بجائے مشرقی جرمنی واپس آ گئے۔

'' آپ نے کس قدر اُلٹی بات کی۔ آپ نے آزادی کا انتخاب کیوں نہیں کیا۔ اچھے خاصے امریکہ میں رہتے سہتے اُلٹے آہنی پردے کے پیچھے واپس آ گئے۔ اسے خلل دماغ کہتے ہیں میں پوچھتی ہوں آزادی کا انتخاب کیوں نہ کیا۔ آپ نے جناب والا؟'' میں نے اور زیادہ غصے سے کہا ــــ ''میں نے مستقبل کا انتخاب کیا۔'' اُنھوں نے جواب دیا۔

'' آپ کی امریکن بی بی نے کس طرح اپنے آپ کو کمیونسٹ سوسائٹی کا عادی بنایا۔''؟

''شروع شروع میں تو بہت گھبرائی لیکن اب بے حد خوش ہے۔''

''اجی ہاں! خاک۔ بے حد خوش ہے۔ روتی ہوگی اپنی جان کو''۔ میں نے کہا۔ اب میری بشاشت بھی واپس لوٹ رہی تھی۔

جب میں پہلی بار امریکہ گیا۔ اوڈولف نے کہنا شروع کیا ــــ ''تو مجھے بڑا عجیب لگا۔

مثلاً جب میں نے امریکنوں کو اپنے دوستوں سے کہتے سنا۔ آؤ میں تم کو ایک ڈنر خرید دوں، یا 'میں تمھارے لیے ایک ڈرنک خرید رہا ہوں۔' ہم لوگ کہتے ہیں 'آؤ میرے ساتھ کھانا کھاؤ' یا 'ڈرنک کرو۔ اس میں خرید کر دینے کا کوئی تذکرہ نہیں ہوتا۔ اُن کے یہاں انسان کی قدر و قیمت ڈالر سے لگائی جاتی ہے۔ فلاں پچیس ہزار کا آدمی ہے۔ فلاں ساٹھ ہزار ڈالر کا سوال ہے۔ وغیرہ۔ مگر امریکن در حقیقت بہت اچھے لوگ ہیں، دل کے برے نہیں۔ بس ان میں بچپنا ذرا زیادہ ہے۔ اگر یہ کمیونزم کی دہشت ان کے اعصاب پر اتنی سوار نہ ہوتی تو کیا پیارے انسان ہیں۔ دنیا کے سارے دوسرے انسانوں کی طرح۔

اب برابر کی میز پر ڈوس پسیس جان ہری اور اشین بک آن بیٹھے۔ دوسری طرف ایلمر رائس تنہا بیٹھے تھے۔ اوڈولف ان سب کو منہ لٹکائے دیکھا کیا۔

''پچھلے سال جب میں دہلی گیا اور میں نے ایشیائی کانفرنس دیکھی۔'' بوڈویوزے نے کہا——''تو مجھے اندازہ ہوا کہ سارا ایشیا دراصل ایک ٹھوس حقیقت ہے۔ یہ سارے ادیب جو بحثیں کر رہے تھے مشاعرے سن رہے تھے دراصل ایشیائی انسان تھے گو یہ لوگ انگریزی بول رہے تھے مگر ان کی حرکات و سکنات ردِ عمل ماحول ہر چیز خالص مشرقی تھی۔ میں فیض سے بھی ملا جو پاکستان سے آئے تھے۔''

وہاں سے بات دوبارہ ہٹلر کے زمانے تک پہنچی اور عوام محاذ اور اسپین کی خانہ جنگی۔ پھر اوڈولف اور بوڈویوزے اپنے اپنے لڑکپن کا ذکر کرتے رہے۔

''مزے کی بات یہ ہے کہ میں پرشا کے مشہور فوجی خاندان کا فرزندِ ارجمند تھا——اور ''تم''——بوڈویوزے نے خوش دلی سے پوچھا۔''تمھارے باپ کے یہاں ہاتھی جھومتے ہوں گے؟''

''ہاں!'' میں نے جواب دیا۔ سفید ہاتھی۔ ہماری کلچر کا ایک بڑا سفید ہاتھی تھا جس پر ہم سب سوار تھے ایک روز کرنا خدا کا کیا ہوا کہ اس نے زور سے اپنی سونڈ اُٹھا کر ایسی پٹخنی دی کہ ہمارا سونے کا ہودہ دھڑام سے نیچے آ رہا۔''

میں نے جھک کر دیکھا۔ اوڈولف میز پر رکھے ہوئے سرویٹ پر ہاتھی کے اس منظر کا کارٹون بنا چکے تھے۔

اگلے روز صبح جاپان کے مصنف کوجی رویسری زاداادبی سیشن کی صدارت کر رہے تھے۔ جنوبی کوریا کے ان سوب زونگ نے کہا۔

''کوریا انیسویں صدی کے آخر میں مغربی لٹریچر سے متعارف ہوا۔ اس وقت کورین تین بڑی طاقتوں کے حملے کے خطرے میں تھی۔ چین، روس اور جاپان اور آخرالذکر نے اس کو اپنا غلام بنالیا۔ 1910 میں جاپانی قبضے کے بعد سے حاکم قوم نے کوریا کے نیتاؤں کے علاوہ ہمارے دانشوروں پر بھی انتہادرجے کے ظلم توڑے۔ کورین لیکھکوں کو تحریر و تقریر کی آزادی سے مکمل طور پر محروم کر دیا گیا۔ اس کے باوجود کورین ادیب اپنے قلم کو جاپانی شہنشاہیت کے خلاف استعمال کرتے رہے۔ جدید کورین ادب آزادی کے لیے اسی جدو جہد کی پیداوار ہے۔

کوریا کی تاریخ آج سے ساچار ہزار سال قبل سے شروع ہوتی ہے۔ کورین قوم چینیوں اور جاپانیوں سے بالکل علاحدہ اور مختلف ہے لیکن ان ہی کی مانند روحانیت کی دل دادہ اور رمزیت پرست رہی ہے۔ ہندوستان کی تہذیب کوریا ہی کے راستے جاپان پہنچی۔

جاپانی جابروں نے ہمارے لکھنے والوں پر ایسی ایسی سختیاں کیں جن کے تذکرے سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران ہمارے جاپانی حکمرانوں نے ہمیں اپنی قومی زبان استعمال کرنے کی بھی ممانعت کر دی تا کہ دنیا کی تمدنی تاریخ سے کوریا کے باب کا ایک سرے سے نام و نشان ہی مٹ جائے۔ اہل کوریا کو مغربی زبانیں سیکھنے کی بھی اجازت نہیں رہی۔ لیکن اس کے باوجود کورین ادیبوں نے انڈر گراؤنڈ طور پر اپنی جدو جہد جاری رکھی۔ اسی زمانے میں ایک شاعر نے درد دل کے عنوان سے لکھا۔۔۔

'سمندر کے وسط میں ایک چراغ ٹمٹمار ہا ہے\
رات کے سمندر پر بے کراں تاریکی چھائی ہے\
اور آزادی!

میری زمین پر ابدی الم کا تسلط ہے
او شاعری کے پرند!
تو سمندر پر سے روتا ہوا پرواز کر رہا ہے
آج کی رات
میں نوحہ گر ایک تن بے جان کی مانند
تیرے ساتھ ساحل پر جاؤں گا۔'

چالیس سال کے اس قبضے کے دوران جاپانی غاصب کوریا کے سارے تہذیبی خزانے کو لوٹ کر اپنے یہاں لے آئے اور اپنے ماضی کی وراثت کا مطالعہ کرنے کے لیے ہمارے پاس کچھ نہیں بچا۔ ہمیں یقین ہے کہ اب یہ چیزیں کوریا واپس لوٹا دی جائیں گی۔

جدید کورین ادیب نیو آئیڈیلزم نیچرل ازم، ڈیکیڈنس، رومانیت اور کلاسیکیت کے ادوار سے گذر چکا ہے۔ غلامی کی وجہ سے الم پرستی ہماری خصوصیت رہی۔

پندرہ اگست 45 عیسوی میں کوریا جاپان کی غلامی سے آزاد ہوا مگر کچھ ہی عرصے بعد ہمیں دفعتاً معلوم ہوا کہ ہماری قوم کو اڑتیسویں عرض البلد کے ذریعے تقسیم کر دیا گیا۔ 25/ جون 50 عیسوی کو کیمونسٹوں کے حملے کے بعد سے تاریخ کی ہولناک ترین جنگوں میں سے ایک شروع ہوئی۔ بہت سے ادیب اس جنگ میں مارے گئے۔

کوریا عرصے سے پے در پے غیر ملکی مظالم اور اقتصادی مصائب کا شکار رہا ہے۔ اب کیمونسٹوں کی وجہ سے ہمیں چین نصیب نہیں۔ کیمونزم کے خلاف شدید جدوجہد ہمارے ادب کا نصب العین ہے۔

پاکستان کے ڈاکٹر عمر حیات نے کہا۔۔۔۔

''یہ واقعہ ہے کہ مشرق کی ادبیات کی طرف سوا چند ایک ماہرین کے عام طور پر مغرب نے مطلق کوئی توجہ نہیں دی۔ مشرق کو مغرب نے اپنا غلام بنا رکھا تھا۔ غلامی بڑی آسانی سے روح کی طاقتِ پرواز سلب کر لیتی ہے۔ پچھلے دو سو سال کی بندگی میں ایشیا نے اپنی خود اعتمادی کھو دی

اور عظیم ادب پیدا نہ کر سکا۔ علاوہ ازیں یہ بھی کہا جاتا رہا کہ مشرق مغرب سے بے حد مختلف بالکل ایک علاحدہ دنیا ہے۔

کل ہی کی محفل میں ایک صاحب نے یہاں فرمایا کہ ان کو جاپان میں بالکل ایک نئی کائنات نظر آئی۔

اگر یہ بات کسی عام آدمی نے کہی ہوتی تو بھی ٹھیک تھا مگر ایک مشہور دانشور کا یہ کہنا کہ مشرق مغرب سے بے حد مختلف ہے، بہت عجیب بات ہے! مشرق کی بھی وہی دنیا ہے جو مغرب کی ہے یہاں بھی ویسے ہی سر بلند انسان بستے ہیں جیسے مغرب میں۔ کہا جاتا ہے کہ جاپانی نا قابلِ فہم ہیں۔ میں یہاں ڈھائی سال سے ہوں اُن کو میں نے پاکستان یورپ یا امریکہ کے انسانوں سے مختلف نہ پایا۔

مغرب نے ہمیں انسانی آزادی اور حقوق اور مساوات اور جمہوریت کے تصوّرات سے ایک وسیع پیمانے پر متعارف کرایا لیکن اس کے ساتھ ہی بدقسمتی سے قوم پرستی کا تصوّر بھی آیا۔ اور نیشنلزم خصوصاً انتہا پسند شکل میں انتہائی خطرناک چیز ہے اس کے علاوہ ہماری پرانی روایات اور عقیدے ختم ہو گئے اور ان کی جگہ کوئی نئی روایت یا عقیدے نے نہیں لی جو روح کے اس خلا کو پُر کر سکے۔ کیا ہمیں مغرب کوئی عقیدہ دے سکتا ہے؟ کمیونزم یا جمہوریت ایسی چیز نہیں ہیں جو روح کو گرما سکیں۔ کوئی ادب بغیر عقیدے یا یقین کے پروان نہیں چڑھ سکتا۔ تاریخِ عالم میں صرف اُن ہی ادوار نے اعلیٰ ادب تخلیق کیا ہے جن ادوار میں عقیدے راسخ تھے عقیدے کی تباہی کلچر کی تباہی ہے۔ جو آرٹ یا لٹریچر کسی عقیدے کی بنا پر تخلیق نہیں کیا گیا اس کا حشر اچھا نہیں ہوا۔

لہٰذا وہ عقیدہ اب کہاں سے حاصل کیا جائے۔

وہ عقیدہ یہ ہونا چاہیے کہ انسانیت ایک ہے اور متحد۔ اگر آپ کسی رسم عقیدے میں یقین نہیں رکھتے تو انسانیت کے ایکے میں یقین رکھیے۔ اٹلی کے البرٹو موروایا نے کہا۔

''مشرقِ وسطیٰ روس چین اور اب جاپان کی سیاحت کے بعد مجھے احساس ہوا کہ مشرق و مغرب کی تفریق بہت غیر واضح ہے اور اُن کا اختلاف اقتصادی اور صنعتی ترقی کی مختلف سطحوں کی

وجہ سے ہے۔ ہم لوگ ایک زبردست صنعتی انقلاب میں گھرے ہوئے ہیں۔ مشرق جسے پس ماندہ ممالک کے عجیب و غریب نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ پچھلے پچاس سال سے وہی کچھ کرنے کی کوشش کر رہا ہے جو مغرب اس سے قبل کر چکا ہے یعنی زرعی معاشی نظام کی جگہ صنعتی نظام قائم کرنے کی کوشش۔ اس کوشش نے خوں ریز انقلاب بپا کیے۔ اسٹالنزم بھی دراصل چند سال کے عرصے میں ایک صنعتی روس کے قیام کی تکمیل تھی۔ یہی کام یورپ نے سو سال میں کیا تھا۔ روس دوسری ایشیائی اقوام کو جس انقلاب میں گھسیٹ رہا ہے وہ نظریاتی نہیں صنعتی ہے۔ جاپان اس انقلاب سے مدتیں ہوئیں گذر چکا لہٰذا اس وقت وہ ایشیا کا سب سے ترقی یافتہ اور جدید ترین ملک ہے جب میں بیس سال قبل چین گیا تو مجھے ایسا معلوم ہوا گویا اٹھارھویں صدی کی اٹلی میں واپس آ گیا ہوں۔ ہم لوگ دراصل وسعت کے بجائے وقت میں سفر کر رہے ہیں۔ امریکن مستقبل میں رہتے ہیں (اکثر یہ ماضی زمانہ قبل از تاریخ سے تعلق رکھتا ہے) جاپان میں ہمیں مستقبل اور حال اور ماضی اکٹھے نظر آ رہے ہیں۔

ایشیا صنعتی انقلاب سے دوچار ہے۔ یہاں نئے روس کی تعمیر ہو چکی۔ نئے چین کی تعمیر جاری ہے۔

ہم ایشیا کو کیا پیش کر سکتے ہیں——؟ اٹلی کا نظریۂ کائنات اب بھی نشاۃ ثانیہ کی ہیومنزم پر مبنی ہے۔ اس نظریے کا مرکز ملک یا مذہب یا کوئی آئیڈیالوجی نہیں ہے۔ اس کا مرکز انسان ہے۔ یہ نظریہ آپ کو اٹلی کے شاہکار ادب کے علاوہ اٹلی کے فلموں اور ہم عصر تخلیقات میں بھی ملے گا۔ یہ نظریہ مشرق کے خیالات سے مختلف ہے مگر ہم اپنی طرف سے آپ کی خدمت میں اسے پیش کر سکے ہیں۔"

سیشن کے بعد سانکی کائیان کی اس عمارت کے نویں فلور پر شین ٹوکیو ریسٹوران میں جاپان کے وزیر تعلیم اور یونیسکو کے جاپانی نیشنل کمیشن کے چیئرمین کی طرف سے لنچ تھا۔ ریسٹوران کے وسیع ہال کے دریچوں میں سے ٹوکیو کی فلک بوس عمارات نظر آ رہی تھیں۔ بارش شروع ہو چکی تھی۔

میری میز پر برابر میں ڈاکٹر گلیسپ بیٹھے ہوئے تھے اور فلپائن کا ایک نوجوان صحافی جو اوبزرور کی حیثیت سے آیا تھا۔ میں ڈاکٹر گلیسپ کو دیکھتی رہی۔ یہ اسّی سالہ بوڑھا انسان دوستی اور مشرق پرستی کی خاطر اتنا طویل سفر کر کے یہاں آیا وہ کسی سے بات نہیں کرتے۔ مجھ سے ہمیشہ آرکیالوجی کے موضوعات پر گفتگو کرتے رہتے ہیں۔ کس قدر پیارے اور شفیق بزرگ ہیں۔ فلپائن کا صحافی جس کا کوئی ماضی نہیں کوئی قدیم زبان قدیم تہذیب نہیں چپ چاپ بیٹھا بنارس اور ویدانت پر ہماری باتیں سن رہا ہے اور کھانا کھا رہا ہے۔

سیشن کے بعد ہر شخص یہی کہہ رہا تھا۔ کوریا کا نمائندہ جاپان میں آ کر اپنے میزبانوں کو آدھ گھنٹے تک آج گالیاں دیتا رہا۔ یہ چیز سب کے لیے بے حد خجالت انگیز تھی۔

''کوریا صرف چالیس سال جاپان کے قبضے میں رہا'' فلپائن کے صحافی نے کہا۔ ''مجھے دیکھو میں نے چار سو سال تک اسپین کی بدترین غلامی کا مزا چکھا ہے۔ میں امریکہ کی کالونی رہ چکا ہوں۔''

بوڑھے انڈولوجسٹ خاموش بیٹھے ہماری باتیں سنتے رہے۔

''پروفیسر۔ جنگ کے زمانے میں آپ کہاں تھے؟'' میں نے پوچھا۔

''میں؟ برلن ہی میں تھا۔ لیکن اتحادیوں کی بمباری سے میرا سارا کتب خانہ تباہ ہو گیا۔''

''مشرقی پاکستان میں ابھی بینامتی کی کھدائی جاری ہے۔'' میں نے موضوع بدلا۔

''ہاں؟'' انھوں نے خوش ہو کر پوچھا۔ ''کیا کیا نئے انکشافات ہوئے؟''

لنچ کے بعد ایک صاحب جو پاکستان سے آئے ہوئے تھے مجھ سے آہستہ سے بولے ''دیکھا آپ نے۔ ہمارے نمائندے نے نیشنلزم کے سلسلے میں انڈیا پر کیسی چوٹ کی۔ لطف آ گیا۔!!

باہر کوریڈور میں ایک نسبتاً گمنام فرنچ لیکھک اور اُن کی بیوی میرے پاس آئے۔ ہم یہاں سے واپسی پر کراچی آ رہے ہیں چند روز وہاں قیام کر کے ہمارا ارادہ ہے کہ پاکستان پر ایک کتاب لکھیں۔ ہمیں پاکستان سے شدید محبت اور ہندوستان سے دلی نفرت ہے۔ پنڈت نہرو

ہمارے خیال میں ایک بے حد بے ایمان اور گھٹیا سیاستدان ہے ہمیں پاکستان بے حد پسند ہے۔"

"جی"۔ میں نے جواب دیا۔ "یہ سیاسی جھگڑے ہیں اور ہمیں اُمید کرنا چاہیے کہ بہت جلد ان کا کوئی قابل قبول حل تلاش کرلیا جائے گا۔ آپ تو انٹلکچوئیل ہیں آپ کو نفرت کے مسئلے پر زیادہ سائنٹفک طریقے سے سوچنا چاہیے۔"

وہ خاموش ہوگئے۔ غالباً اُن کی سمجھ میں نہیں آیا کہ میں کیا کہہ رہی ہوں۔ میرے اس رویے سے اُن کو جو مایوسی ہوئی وہ اُن کے چہروں سے عیاں تھی۔ اُنھیں توقع رہی ہوگی کہ میں یہ مژدہ جانفزا سننے کے بعد کہ وہ کراچی میں ایک ہفتہ قیام کے بعد پاکستان پر ایک معرکۃ الآرا کتاب لکھنے والے ہیں خوشی سے بے حال ہوکر انھیں کافی پلانے لے جاؤں گی۔

اب ہم لوگ جاپان کا کلاسیکل ڈرامہ نوہ دیکھ رہے ہیں۔ یہاں بھی حسب معمول ہمیں تھیٹر کے دروازے پر تحفوں کے پلندوں سے لاد دیا گیا ہے۔ ہال میں ہماری آمد کو ٹیلی ویژن پر پیش کیا جارہا ہے۔ ہال دوسرے تھیٹروں کی مانند بے انتہا شاندار اور الٹرا ماڈرن ہے۔ سامنے اسٹیج کی جگہ ایک خوب صورت چوبی مندر اایسا بنا ہے جس کے عقب میں سینری کے پردے کے بجائے ایک بہت بڑا پائن کا سبز درخت لکڑی کی دیوار پر منقش ہے یہ درخت نوہ ڈرامے کا سمبل ہے۔ مندر کے ایک طرف لکڑی کا کوریڈور ونگ کی سمت جاتا ہے۔ ایک پل ایسا آڈینس کی نشستوں کے درمیان سے گزرتا ہے۔ سارا کھیل ان تین راستوں پر پیش کیا جاتا ہے لہٰذا تماشائی گویا کھیل میں شامل رہتے ہیں۔

نوہ پر مغرب میں اب تک بہت سی کتابیں لکھی جاچکی ہیں۔ ایذرا پاؤنڈ نے کئی نوہ تمثیلوں کا ترجمہ کیا ہے مگر ہمارے ملک میں کسی کو اس کے وجود سے بھی واقفیت نہیں۔ یہاں تھیٹر ہی سے دلچسپی ہے۔

یہ ایک ایسا عجیب و غریب تماشا ہے جو واقعی ہماری دُنیا میں شامل نہیں معلوم ہوتا۔ سارا ڈرامہ چین کی طرح سمبلزم پر مبنی ہے سارے وقت سیاہ کپڑوں میں ملبوس کورس پس منظر میں موجود رہتا ہے۔ ایکٹر حلق سے عجیب و غریب آواز نکال کر مکالمہ ادا کرتے ہیں۔ یہ آوازیں بس

سننے سے تعلق رکھتی ہیں۔ مکالمے کے دوران میں کورس کے دو اشخاص تھوڑی دیر بعد انتہائی بے سری بانسری بجاتے اور ڈھولکی پیٹتے جاتے ہیں (معلوم ہوا کہ یہ ڈھولکی بھی نوہ کا ایک بڑا زبردست فن ہے اور اس کے چند مشہور ڈھولکی نواز گویا جاپان کے احمد جان تھر کوا اور انوکھے لال کا درجہ رکھتے ہیں۔)

جاپانی موسیقی کی افسوس میں تعریف نہیں کرسکتی۔ بے سری بے ہنگم آوازوں اور انتہائی غیر ترقی یافتہ سیدھے سادے چند سازوں پر مشتمل گویا جاپان کی قومی اور کلاسیکل موسیقی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ کوئی ایک قوم سارے ہی فنونِ لطیفہ کی استاد ہو جائے۔

نوہ کو اکثر قدیم یونانی ڈرامے سے تشبیہہ دی جاتی ہے۔ یہ ایک حد تک صحیح بھی ہے۔ اکثر ایکٹر ماسک پہنتے ہیں اور مرد عورتوں کا پارٹ ادا کرتے ہیں۔ کورس میں اس ڈرامے کا بڑا نمایاں حصہ ہے جو ایکٹروں کے مکالمے کے ساتھ ساتھ رونا گاتا رہتا ہے۔ پورے ڈرامے کی ایک RITN/ کی سی کیفیت ہے۔

اُن کی کوسٹیومز انتہائی بھڑکیلی اور پچھلی صدیوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ ہیروئن کا پارٹ ادا کرنے والا عظیم ترین نوہ ایکٹر (جو بہت بوڑھا ہے) ماسک پہنے کوریڈور میں سے گذرتا اسٹیج پر آیا۔ ہیروئن ہمیشہ ماسک پہنتی ہے گویا (مکمل سمبلزم) ہیرو ایک پندرہ سالہ ہے جو اپنے فن میں پورا اُستاد معلوم ہوتا ہے۔ کہانی شوگن دہد سے متعلق ہے۔

برابر کی کرسی پر بیٹھے ہوئے ڈوس پیسوسویٹ بوڑھے میاں بڑے غور اور انہماک سے ڈرامہ دیکھ رہے ہیں۔ براڈوے کے ڈرامہ نگار ایلمر رائس بھی مبہوت بیٹھے ہیں۔

" PURE DRAMA " ہے۔ ڈوس پیسو مجھ سے چپکے سے کہتے ہیں "ذرا ان کی اداکاری کی گہرائی تو دیکھو۔" اپنے جذبات چہروں پر منجمد کیے ہوئے خواب کے سے عالم میں ایکٹر اسٹیج پر چل رہے ہیں اور حلق سے لرزہ خیز آوازیں نکال رہے ہیں۔ دوسرے سین میں راکھشس کودتا پھاندتا ناچتا ہوا آیا اور میں دفعتاً اپنی مانوس دنیا میں واپس آ گئی۔ یہ تو بالکل کتھاکلی کی طرح کا ناچ تھا۔ کتھاکلی کے مقابلے میں وحشیانہ لیکن بہت کچھ اس سے ملتا جلتا۔

پچھلی قطار میں بیٹھی ہوئی کملا دیوی نے مجھے چپکے سے ٹہوکا دیا۔ "ارے یہ تو کتھا کلی ہے۔" انھوں نے جھک کر کھس پھس کی۔

"ہاں۔ہاں۔مگر چپکی بیٹھی دیکھتی رہئے ورنہ یہ ڈوس پیسو مجھے مارے گا۔ وہ اس وقت PURE DRAMA میں غوطہ زن ہے۔"

پہلے ایکٹ کے اختتام پر جانے کہاں سے خرگوشوں کی طرح بلوں میں سے نمودار ہو کر ریڈیو کے رپورٹر مائیکروفون سنبھالے ہمارے سامنے آن موجود ہوئے۔ نوہ کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے۔ نوہ کی خصوصیات آپ کو کیسی لگیں۔ ایک رپورٹر نے گینگ وے میں دوزانو بیٹھ کر مائیک ڈوس پیسو کی ناک میں ٹھونس دیا۔

شام کو کیوزومی پارک میں ٹوکیو کے گورنر کی طرف سے عصرانہ، کاغذی قندیلیں اور لکڑی کی خوب صورت تفریح گاہیں جھلملا رہی ہیں ———— دفعتاً باہر اندھیرے باغ پر جھکا ہوا آسمان روشن ہو جاتا ہے۔ بیک وقت تاریک افق پر بجلی کے قمقموں سے ایک عظیم الشان فیوجی یاما کی آؤٹ لائن جگمگا اٹھتی ہے، جس کے آتش فشاں دہانے سے انار چھٹ چھٹ کر سارے آسمان پر پھیل جاتے ہیں۔ رنگ برنگی آتش بازیاں آسمان پر خوش آمدید کے الفاظ لکھتی جا رہی ہیں۔ سبزے پر آرک لائٹس کی زد میں ناچتی ہوئی لڑکیاں سامنے آتی ہیں۔ سبزے کے پرے خوب صورت جھیل ہے جس میں کشتیاں بندھی ہیں اور بطخیں تیر رہی ہیں اور مصنوعی پہاڑی راستے ہیں اور درختوں کے کنج جھیل کے کنارے کنارے لکڑی کے اسٹال نصب ہیں جہاں مہمانوں کو کھانے پینے کی چیزیں سرو کی جا رہی ہیں جھیل کے کنارے سے آسمان کے مقابل میں کھڑا ہوا برقی روشنیوں کا فیوجی یاما اور زیادہ ہوش ربا معلوم ہو رہا ہے۔ آسمان کی آتش بازیوں کی روشنیوں کا عکس جھیل پر پڑ رہا ہے۔

اسی آسمان پر ناگاساکی کا دھواں پھیلا تھا۔

اگلی صبح لٹریری سیشن جاری رہا۔

اسٹیون اسپنڈر نے کہا ———

''مسٹر چیئر مین۔ میں دراصل پاکستان کے سفیر سے مخاطب ہونا چاہتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ کل کی ان کی گفتگو اس سیشن کی دلچسپ ترین تقریروں میں شمار کی جا سکتی ہے۔ یہ تقریر پرسل اور غیر سفارتی تھی۔ اس صورتِ حال کو واضح کرنے میں بہت کامیاب رہی جس کو ہم سب محسوس کرتے ہیں۔ وہ صورتِ حال عقیدے کا فقدان ہے جس کا ذکر سفیر پاکستان نے کیا۔ میں ان کی راست بازی کا بھی مداح ہوں جس سے کام لیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اُن کے ہم مذہب یعنی مسلمان ادیبوں اور دانشوروں کے ایمان ناقص اور اُن کے عقیدے متزلزل ہو چکے ہیں۔

میں اکثر باتوں میں اُن کا ہم خیال اور چند باتوں میں بحیثیت ایک مغربی انسان کے ان سے متفق نہیں ہوں:

ان کا ارشاد ہے کہ جن زمانوں میں عقیدے راسخ تھے تبھی عظیم ادب پیدا ہوا۔ میں اس سے اتفاق نہیں کرتا۔ ممکن ہے یہ بات ہندوستان یا مڈل ایسٹ کے لیے صحیح اور وہاں ایسا ہی ہوا ہو اور اس کے نکتے پر مغرب اور مشرق کے درمیان فرق کرنا نہایت ضروری ہے۔ مغرب میں ایسا نہیں ہوا بلکہ اس کے برعکس عظیم ادب کے عہد یعنی پانچویں صدی قبل مسیح کا یونان ورجل کے عہد، لاطینی لٹریچر اور چودھویں اور پندرھویں صدی کے نشاۃ ثانیہ کا یورپ۔ یہ سب وہ زمانے تھے جب عقیدہ کھویا جا چکا تھا۔ دراصل اس وقت اہلِ یورپ نے اپنے آپ کو اسی حالت میں پایا جو حالت سفیر پاکستان کو اپنی نظر آتی ہے۔ یعنی جب عقیدہ صرف ایک سمبل کے طور پر باقی رہ گیا تھا بلکہ میں تو اطالوی حضرات سے یہ پوچھنا چاہوں گا کیا دانتے واقعی ایک مذہبی شاعر تھا؟ میرا خیال ہے کہ اس نے مذہب کو محض نشاۃ ثانیہ کے مقاصد کے لیے استعمال کیا۔ اس کے علاوہ دو باتیں مغربی نقطۂ نظر سے اور قابلِ ذکر ہیں۔ ایک تو یہ کہ مغرب میں عظیم عہد وہ سمجھے جاتے ہیں جب ایمان ڈگمگا گئے تھے عقیدے محض سمبل تھے اور سیال۔ مذہب منجمد شاعری بن چکا تھا اور شاعری سیال مذہب تھی۔ اگر آپ یہ استعارہ سمجھ سکتے ہوں۔

''شاعری ایک ایسا مذہب ہے جس میں مذہبی دماغ ایک شاعرانہ سمبلزم کو آزادی سے استعمال کر سکتے ہیں لیکن مذہب نے مغرب میں جن شاعروں کو اپنے تسلط میں لیا ہے وہ آرٹ

کے لیے اس سمپلوم کا آزادانہ استعمال نہیں کر سکے۔ یہی حال کمیونسٹ مذہب کا ہے۔"

"دوسری بات جو میں کہنے والا ہوں وہ یہ کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مغرب نے دنیا کی ترقی کے لیے جو کچھ کیا ہم اس کا ذکر کیوں نہ کریں کیونکہ ہم سب اہلِ مغرب کا یہاں پچھلے ایک ہفتے سے جمع ہو کر خاکساری کے مارے بُرا حال ہوا جا رہا ہے۔ ہمارا وقت یہی روتے پیٹتے گذر رہا ہے کہ ہم مشرق کے سامنے کس قدر شرمندہ ہیں ہم بڑے سخت قصوروار ہیں مجرم ہیں —— مشرق ہی سب کچھ ہے ہم کچھ نہیں —— مجھے ڈر ہے کہ آج سے ایک ہزار سال بعد کی نسلیں کہیں گی کہ ان کمبخت اہلِ مغرب میں اتنی بھی ہمت نہیں تھی کہ اپنے کارناموں کی طرف اشارہ بھی کریں لہٰذا انھوں نے اپنے کمالات کو خود نیست و نابود ہو جانے دیا۔ میں نے کبھی لاطینی قوم کو اہلِ روما کو دو سو سال یا ایک ہزار سال تک کے لیے اہلِ یورپ اور اہلِ برطانیہ کے سامنے اس طرح گڑگڑا کر معافی مانگتے نہیں سنا۔ ہمیں معاف کر دو۔ ہم نے تمھارے لیے خوب صورت سڑکیں تعمیر کیں اور گرامر بنائی اور تمھیں اپنی زبان سکھلائی۔ اگر مغرب اس وقت اپنے احساسِ جرم میں گرفتار ہو کر دست بردار ہو گیا تو دنیا ایک ہزار سال پیچھے لوٹ جائے گی۔

"میں مانتا ہوں کہ سیاست میں ہم لوگ خطاوار مجرم ہیں مگر ہم نے اپنے آرٹ اور سائنس کے ذریعے دنیا کو آگے بڑھایا اور اگر اپنے سیاسی جرائم کا کفارہ ادا کرنے کے لیے ہم اپنے انٹلکچوئیل کارناموں سے بھی مستعفی ہو گئے تو یہ ہمارا سب سے بڑا سیاسی جرم ہوگا۔ یورپ کا عظیم ترین احسان یہ ہے کہ اس نے ایسے آرٹ فارم بنائے جو سماجی اور تاریخی ارتقا کا ساتھ دے سکیں۔ یورپین فنون اور ادبیات کی تاریخ تبدیلیوں کے ایک تسلسل پر مشتمل ہے۔ ایسی تبدیلی اور قلب ماہیت جس میں ساری تاریخ یا اتنی تاریخ جو ذہن اور روح قبول کر سکے۔ آرٹ کی علامتی اصطلاحات میں تبدیل ہو گئی لیکن اس کے ساتھ ہی روحِ عصر کو روایتی فارم سے منسلک کرنے میں کامیاب رہی۔ یہ یورپین فن کاروں کا کمال ہے کہ انھوں نے ہم عصر زندگی سے مواد اکٹھا کیا اور اسے آرٹ میں ڈھالا جو ماضی کی روایات سے علاحدہ نہیں اور یہی یورپ کی جدید شاعری کی تحریک کا سارا ماحصل ہے۔ یہی راں بو اور ٹی ایس ایلیٹ کے معانی اور ان کے تنقیدی نظریوں کی

بنیاد ہے۔ مشرق میں مجھے تبدیلی کے بغیر انقلاب کا خطرہ نظر آتا ہے۔ اپنے ماضی کے فارم مسترد کر دینا انتہائی خطرناک قسم کی جدیدیت ہے جس کی تحریک ایک دفعہ یورپ میں بھی فیوچرزم کے نام سے چلی تھی۔

اب میں اس مذہب کا ذکر کرتا ہوں جو سفیر پاکستان چاہتے ہیں۔ موجودہ مذاہب کی جگہ رائج کیا جائے۔

میں سمجھتا ہوں ہم نے یہاں پر عالمگیر برادری سے متعلق ضرورت سے زیادہ باتیں کی ہیں جب میں نے عالمگیر اتحاد، عالمگیر برادری کے متعلق یہ سب گوہر افشانیاں سنیں تو ایک مصنف کی حیثیت سے مجھے بے حد شرم آئی۔ یہ انسانی برادری کا تذکرہ ایک قسم کا شوربا ہے ہمیں شوربے میں رہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس شوربے میں سیاسی خیالات اور گھٹیا آرٹ سب ملا دیا گیا ہے یہ ایک نوع کی کھچڑی ہے جو میرے نزدیک بہت بدذائقہ ہے۔ اہل قلم کی حیثیت سے ہمارا فرض ہے کہ ہم چیزوں میں تفریق کریں چہ جائیکہ گڑھے گڑھائے مفروضے اور کلیات دہرائے چلے جا رہے ہیں۔ ہمیں یہ تفریق لازمی طور پر کرنا چاہیے۔ ہم سب ایک مخصوص جغرافیہ اور مخصوص تاریخ کے پس منظر سے نکل کر یہاں جمع ہوئے ہیں۔ کیا ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم ان مختلف جغرافیائی حدود اور تاریخوں کو آپس میں گڈمڈ کر کے اور اُلجھنیں پیدا کریں ہم سب کو اس چیز کا بڑی شدت سے احساس ہونا چاہیے کہ ہم ایک نہیں بلکہ ایک دوسرے سے بے حد مختلف ہیں۔ یہ حقیقت کہ میں ایک جاپانی سے مختلف ہوں یہ ایک ایسا واقعہ ہے جس کے لیے ہم دونوں کو شکرگزار ہونا چاہیے۔ یہ کہنا کہ میں اور میرے وہ کورین اصحاب یا اس ہال میں جمع دوسری اقوام کے حضرات ایک ہیں بالکل لایعنی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ہم سب کی دو آنکھیں ہیں۔ ایک ناک ہے وغیرہ۔ لیکن ہمارا ایک دوسرے سے مختلف ہونا سب سے اہم چیز ہے اور اگر ہم مذہب پر گفتگو کر رہے ہیں تو کم از کم یہ تو سوچ لیں کہ مذہب سے ہماری کیا مراد ہے۔ مذاہب اور عقائد بھی مختلف اور مخصوص علاقوں سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کے الگ الگ سمبل رسوم اور روایات ہیں۔ میں یہاں آپ کو یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ مغرب میں ہم کو معلوم ہو چکا ہے کہ عالمگیر برادری کا نظریہ اور

شخصیت جغرافیہ اور تاریخ کی تفریق کا ازالہ ادب کے لیے تباہ کن ثابت ہوتا ہے۔ والٹ وٹ مین کی قسم کے جتنے ادبا نے اس نظریے کو فروغ دیا وہ مغرب کے زوال کے باعث ہوئے۔ لہٰذا میں آپ سے دوبارہ درخواست کرتا ہوں کہ یہاں کلیات میں جانے کے بجائے اختلافات پر زور دیجیے۔

اسٹیون اسپنڈر کی اس تقریر سے ہال پر سناٹا چھا گیا۔ ہر ایک کو ان کا لہجہ بہت ناگوار گذرا تھا۔

اوماشنکر جوشی نے پاکستان کے سفیر ڈاکٹر عمر حیات ملک کی تقریر کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ "کل مسٹر البرٹو موراویا نے اطالوی نشاۃ ثانیہ کی انسان پرستی کا تذکرہ کیا تھا جو ان کے ملک میں آج تک زندہ ہے۔ مغربی تہذیب نے انسان کو کائنات کا مرکز بنایا ہے۔ ممکن ہے تین چار صدیوں کے بعد یہ ثابت ہو جائے کہ غالباً اس رویے کی اس وقت بے حد ضرورت تھی۔ یہ رویہ بہت زیادہ خود پرستی پر مبنی تھا۔ لیکن کہا جاتا ہے کہ مشرق میں خدا کو کائنات کا مرکز سمجھا جاتا ہے غالباً اس کی وجہ یہ ہے سارے بڑے مذاہب مشرق ہی میں پیدا ہوئے۔ لیکن اہلِ مشرق روحانیت کے اتنے دل دادہ نہیں ہیں جتنا کہ تصور کیا جاتا ہے یہ کہنا اہلِ مغرب کے مقابلے میں کہیں زیادہ روحانیت پرست ہیں۔ مبالغہ ہے۔

اور چونکہ مذاہب مشرق میں پیدا ہوئے اور مذہبی جنون کو بھی مذہب کا نام دیا جاتا ہے لہٰذا چند مقتدر پروپیگنڈہ باز حضرات کمیونزم کو بھی ایک مشرقی مذہب کا نام دے رہے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کمیونزم کو جو مغرب کے صنعتی انقلاب کی جائز اولاد ہے مشرقی کیوں قرار دیا جا رہا ہے۔ ڈاکٹر ملک نے انسانیت کے اتحاد پر زور دیا ہے۔ ٹیگور نے بھی انسانیت پرستی کے نئے مذہب کا پرچار کیا تھا۔

یہ نیا عقیدہ کہیں باہر سے مستعار نہیں لیا جا سکتا۔ یہ ہمارے اپنے اندر پیدا ہوگا۔

"بہت ممکن ہے کہ مستقبل کے لکھنے والے مشرق و مغرب کے باہم اثرات کی اتنی پروا نہ کریں اور محض فن کے مکمل پن پر زور دیں ممکن ہے وہ کہیں کہ ایک فن پارہ اگر وہ دوسروں کو متاثر نہیں کر سکا پھر بھی فن پارہ ہی رہے گا۔ نیگرو مجسمے موڈرن آرٹ کو متاثر کرنے سے پہلے بھی بڑے

فن پارے تھے لہٰذا اصل چیز یہ ہے ہم کو یہ دیکھنا چاہیے کہ ایک قوم اپنی اندرونی جمالیاتی حس کا کس طرح مظاہرہ کرتی ہے اور اگر ہم میں اتنا ظرف موجود ہے تو ہم دوسروں کی جمالیاتی حس کے مظاہر خود ہی پسند کریں گے۔"

"مسٹر مورادایا نے صحیح کہا تھا کہ مشرق کو اپنی انفرادی جینئس پہچاننے میں ابھی بہت عرصہ لگے گا۔ ہم لوگ ایک ایسی دنیا میں رہ رہے ہیں جو یورپ نے تعمیر کی ہے۔ بحیثیت ایک آرٹسٹ کے مجھے اندازہ ہے کہ ابھی تو مجھے اپنے گھر ہی میں چھپے ہوئے خزانوں کو تلاش کرنا ہے۔ آرٹ کی اپیل عالمگیر ہے مگر فن پارہ ایک ایسی منفرد شے ہے جو اپنے مخصوص زمان و مکان کے سیاق و سباق سے پیدا ہوتا ہے۔ یہی بات ابھی مسٹر اسپنڈر نے کہی مگر سنسکرت کے نقاد صدیوں پہلے یہ نظریہ پیش کر چکے ہیں۔ کروچے کا مطالعہ کرتے وقت مجھے اس کا نظریۂ فن سمجھنے میں دقت ہوئی کروچے کے نزدیک آرٹ روحانی ہے اور آرٹ کے نمونے محض PHYSICAL REMINDERS ہیں۔

لیکن پڑھنے والے اس تجربے میں کس طرح شامل ہو سکتے ہیں جس کے نتیجے میں آرٹسٹ نے اپنا فن پارہ تخلیق کیا؟

سنسکرت کے نقادوں نے ہزاروں سال قبل یہ مسئلہ حل کر لیا تھا اور اس میں کروچے والی اُلجھن شامل نہیں۔"

ابھی برازیل کا نمائندہ تقریر کر رہا تھا جب انگس ولسن، کریز بنگ اور میں اوپر لوبی میں آکر ریزولیوشن کی تیاری میں مصروف ہو گئے کام بہت تھا اور ہمیں جلدی سے چائے پینے کے بعد پھر باہر جانے کے لیے تیار ہونا تھا۔ شام کو گورنر ٹوکیو نے ہم سب کو کابکی تھیٹر کے لیے مدعو کیا تھا۔

جاپان کے ہر چھوٹے اور بڑے شہر میں ان گنت تھیٹر ہیں جہاں جدید ڈرامے اوپیرا، میوزیکل کامیڈیز اور بیلے دکھائے جاتے ہیں۔ اداکاری اور اسٹیج کرافٹ کے لحاظ سے جاپان کا تھیٹر یورپ اور امریکہ کے تھیٹر کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ درحقیقت ایک جاپانی کھیل دیکھتے ہوئے ہم کو یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہم پیرس یا میلان یا لندن کے کسی تھیٹر میں بیٹھے ہیں۔

لیکن کابکی نوہ کی طرح یہاں کا پانچ سو سال پرانا قومی تھیٹر ہے۔ کہانیاں مشرقی انداز کی

ہیں۔ اداکاری کی طرز بھی خالص مشرقی ہے لیکن اسٹیج۔ کابکی کی اسٹیج دیکھ کر ہم سب انگشت بدنداں رہ گئے۔ یہ ریوالونگ اسٹیج مغرب کی اسٹیج سے دوگنی بڑی اور چوڑی تھی اور بیک گراؤنڈ میں جس طرح کی منظر کشی کی جارہی تھی وہ ہم میں سے کسی نے آج تک نہیں دیکھی تھی۔

ایک جگہ ایک جنگل کا سین تھا۔ ایک کونے میں پُل تھا اس کے پیچھے بہت چوڑی پہاڑی ندی بہہ رہی تھی۔ جانے ان لوگوں نے روشنیوں کے استعمال سے کیا ترکیب کی تھی یا کیا کرامت تھی کہ پورے وقت ندی کا پانی بہت فاصلے اور بلندی سے پس منظر کی پہاڑیوں میں سے نکلتا شور کرتا چاند کی روشنی میں جھلملاتا پل کے نیچے سے گذر کر جانے کہاں غائب ہوتا رہا۔ اس میں پانی کی پھواریں اُڑ رہی تھیں۔ جگہ جگہ پس منظر کی وسعت اور گہرائی میں کہرہ اُڑ رہا تھا۔ چاند پر دھند تیر رہی تھی۔

دوسرے مناظر بھی اس طرح حیرت انگیز حد تک حقیقی تھے۔ ایک مرتبہ اسٹیج پر پورا محلہ آباد ہوگیا۔ بارش ہوئی کیچڑ پھیلی پھر جاڑے آئے برف گری۔ بہار آئی۔ گاؤں کی چوپال کے آس پاس درخت چیری کے پھولوں سے لد گئے۔

آخری ایکٹ میں ساری ایکٹریس اور ایکٹر جو پچاس کے قریب تھے، تماشائیوں کے سامنے سجدے میں گر گئے۔ اُن کا چیف ایکٹر اسی طرح سجدے میں گرا گرا سر اُٹھا کر اپنے ساتھیوں کا تعارف کراتا رہا۔ اس نے اپنے بیٹے کا تعارف کرایا جو اس ڈرامے میں سکینڈ ہیرو بنا تھا اور آج پہلی بار اس اسٹیج پر آیا تھا۔ پندرہ منٹ تک سب اسی طرح ساکت وصامت سجدے میں پڑے رہے اس کے بعد اٹھ کر اداکاری میں مشغول ہوگئے۔

کابکی کی کہانیاں بہت لمبی ہوتی ہیں۔ کھیل صبح سے شروع ہوکر رات تک جاری رہتا ہے۔ ہم لوگوں نے شام کو آخر کے ڈرامے دیکھے جن میں سے ایک ٹریجڈی تھی اور دوسری کامیڈی۔ دونوں ڈرامے ایڈو عہد سے متعلق تھے۔ ان کا ماحول اور جذبات خالص مشرقی تھے۔ ہیروئن کا رونا ہنسا ہر چیز اپنے یہاں کے پرانے تھیٹروں کی یاد دلاتی تھی۔ یہاں بھی نوہ اسٹیج کی طرح کا پُل بنا تھا اور اداکار برابر پُل پر آتے جاتے رہتے تھے۔

جاپانیوں نے جدید مغربی تھیٹر کو پوری طرح اپنا لیا لیکن اپنا قومی تھیٹر بھی اسی طرح برقرار رکھا ہے اس کی روایتی اور مصنوعی اداکاری بھی نہیں بدلی۔ کیا ہم کبھی اپنے یہاں طالب بنارسی اور آغا حشر کے ڈرامے اس اعلیٰ پیمانے پر اتنے الٹرا موڈرن اسٹیج کرافٹ کے ساتھ پیش کریں گے؟ کیا ہم کبھی اتنے فخر اور چاؤ کے ساتھ تل وجیتی یا صید ہوس غیر ملکیوں کو دکھا سکتے ہیں؟ ہم تو اپنے پرانے تھیٹر کا مذاق اڑانا اپنا فرض سمجھتے ہیں اور ہمیں اپنے اس تہذیبی ورثے سے شرم آتی ہے۔

نوہ اور کابکی دونوں میں کومک عنصر بھی ہوتا ہے طنز اور مزاح کا نشانہ عموماً مندر کا کاہن ہوتا ہے جو اپنی چار سو بیسیوں سے جاہل اور خوش عقیدہ عوام کو بے وقوف بناتے تھے جس طرح ہمارے یہاں بنارس کے پنڈے اور ملاجی ایک خاص کردار تھے۔

اہلِ جاپان اداکاری میں بڑے ماہر ہیں۔ اُن کے فلم ایکٹنگ اور ٹیکنیک کے لحاظ سے فرنچ اور سوئیڈش فلموں کے مانند ہیں۔ اُن کی میوزیکل کامیڈی امریکہ کی طرح بے حد LAVISH ہے۔ بیلے یہاں کا قومی آرٹ بن گیا ہے (غالباً اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان کا اپنا رقص اس لائق نہیں کہ اسے آگے بڑھایا جا سکتا)۔

اگلی؟ صبح مسٹر اسپنڈر سیشن کی صدارت فرمارہے تھے۔

جاپانی ڈوس پسیس نے بتایا کہ اشٹین بک ابھی تک اپنے کمرے میں مقید ہیں۔ ہوا یہ کہ ان کو مقامی انفلوئنزا ہو گیا تھا۔ مگر ڈاکٹر کوئی اور مرض سمجھ کر علاج کرتا رہا۔ اب اس کا علاج ہو رہا ہے وہ کہتے ہیں کہ وہ بحران میں مبتلا تھے۔ اس وقت انھوں نے یہ چند باتیں لکھی ہیں جو میں اُن کی طرف سے آپ کو سناتا ہوں۔ ''مجھے معلوم نہ تھا کہ میں سیاسی عزائم بھی رکھتا ہوں۔ اب پتا چلا کہ ایسا ضرور ہو گا۔ میں بیمار ہوں۔ مار کھانے کا خطرہ ہی ہمیں تمیز سکھاتا ہے۔ اگر اکثر قوموں کے پاس ہائیڈروجن بم ہو گئے تب وہ لامحالہ امن کے جنٹ کبوتر بن جائیں گے۔ گفتگو سے کنفیوژن پیدا ہوتا ہے۔ خاموشی نے کبھی غلط اطلاعات مہیا نہیں کیں۔ گورنمنٹ اس بات کا آخری ثبوت ہے کہ فرد کامیاب نہیں ہوا، سارے انسانوں میں ایک خصوصیت مشترک ہے یعنی یہ کہ وہ خود بہت اچھے ہیں اُلو کے پٹھے دوسرے ہی ہیں۔ اچھی زندگی گزار چکنے کے لیے لازمی ہے کہ انسان

مر جائے برا آدمی اپنے حق میں اتنا برا نہیں ہوتا جتنا اچھا آدمی اپنے حق میں ہوتا ہے۔ خیالات کی قومیت یا نسل نہیں ہے۔" اسٹین بک کے فقرے سنانے کے بعد ڈوس پیسس نے کہا۔ "اس ریمارک کے سلسلے میں میں اپنے دوست اسٹیون اسپنڈر سے جھگڑنا چاہتا ہوں جن کو عالمگیر برادری پر اعتراض تھا جو شخص بھی ساری دنیا گھوم چکا ہے اسے یہ اندازہ ہوگا کہ کلچر اور زبان سے قطع نظر کوئی چیز ایسی ہے جو بالکل اجنبی جگہوں میں بھی ہم کو موجود ملتی ہے اور جس سے ہم بار بار دوچار ہوتے ہیں۔"

"عرصہ ہوا میں ایک کارواں کے ساتھ شام کا ریگستان عبور کر رہا تھا۔ کارواں میں ایک ایک ترک کے علاوہ سب عرب تھے۔ مجھے ترکی نہ آتی تھی اور ترک انگریزی سے ناواقف تھا۔ ایک روز عربوں کے ایک اور گروہ نے کارواں پر حملہ کر دیا۔ لڑائی شروع ہوئی جو سنجیدہ نہ تھی میں نے اور ترک نے اپنی اپنی جگہ یہ محسوس کیا کہ ہم اس جنگ میں باہر والوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ ہم دونوں ایک طرف کو ہٹ کر بیٹھ گئے اور جبکہ ہمارے سروں پر گولیاں سنسنا رہی تھیں ہم دونوں نے جانے کس طرح ایک دوسرے سے کیمونی کیٹ کیا کہ اس آدھ گھنٹے میں ہم دونوں نے ایک دوسرے کو اپنی سوانح حیات سنا ڈالی اور اپنے خاندانوں اور بیوی بچوں کا ذکر کیا اور کسی نامعلوم طریقے سے ہم کو محسوس ہوا کہ ہم ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ اس طرح کا تجربہ مجھے بار بار ہوا کیونکہ اس کائنات کے باشندوں میں یقیناً کوئی چیز مشترک ہے جو اس خالص ذہن اور خطابت سے مختلف اور بلند تر ہے جس سے اعلیٰ ادب پیدا ہوتا ہے وہ انسانیت کی کوئی خصوصیت ہے یہ خصوصیت ان انسانوں نے پیدا کی ہے جو اس دنیا میں رہتے ہیں۔ جہاں اپنے اختلافات کے باوجود کسی نہ کسی طرح کیمونی کیٹ کر لیتے ہیں۔ اٹھارھویں صدی کے یورپین ادبا کہتے تھے کہ وہ ادب کی ری پبلک کے ممبر ہیں کیا ہم لوگ آج کی دنیا میں ایک ادب کی ری پبلک بھی پیدا نہیں کر سکتے؟"

اس کے بعد سلطان تقریر علی سجان نے کہا۔۔۔

"ہر جگہ مشرق و مغرب اس وقت یکجا موجود ہیں۔ آفاقیت کے رویے نے موڈرن آرٹ

کو تباہ نہیں کیا۔ ہم جدید انڈینشین لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم دنیا کی تہذیب کے قانونی وارث ہیں۔ آج کل دنیا میں جغرافیائی حدود اور مخصوص روایات کے بجائے افراد اور گروہوں کی آزادی اظہار بیان اور انتخاب کی خود مختاری آرٹ کی محرک ہے۔ دوسری جنگِ عظیم تجزیہ نفسی مذہب کے متعلق نیا رویہ پرولتاری ادب موڈرن شاعری۔ یہ ساری چیزیں سارے ممالک کی ادبیات پر یکساں طور پر اثر انداز ہوئی ہیں۔ ادب اب یقیناً پرونشل نہیں رہا۔ ساری دنیا کے مسائل ایک جیسے ہیں۔ لہٰذا میں اسپنڈر کے خیالات سے متفق نہیں۔ آج کے فن کار کو اپنی سادہ لوحی سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہیے جس کی وجہ سے وہ اتنے دنوں تنگ نظر سیاست دانوں کی بازی گری کا شکار رہا۔"

اپنی تقریر میں انھوں نے گوئٹے کا بھی ذکر کیا۔ جس پر مسٹر اسپنڈر نے فرمایا کہ اس کانفرنس میں بار بار گوئٹے کا حوالہ خوب دیا گیا ہے۔ جاپان کے کنزونا کاجی نے کہا۔

"اب تک میں پس منظر میں بیٹھا مترجموں کی ٹولی میں آپ کی تقاریر کا آپ لوگوں کے کانوں کے لیے فوری ترجمہ کرنے میں مصروف تھا۔ اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ ہم لوگوں کے سامنے کمیونی کیشن کا کس قدر زبردست اور دقت طلب مسئلہ ہے۔

اب انھوں نے بھی اسپنڈر کو مخاطب کیا۔ ہنگری کے موسیقار بیلا برتوک کی موسیقی اپنی نسلی اور قومی خصوصیات سے بھرپور ہے۔ لیکن اس سے اس کی عالمگیر اپیل میں کمی نہیں آئی اور اسے امریکہ اور یورپ اور جاپان میں بے انتہا پسند کیا جاتا ہے۔ میرے خیال میں اہلِ ہنگری کو اس بات پر کوئی اعتراض نہیں کہ باہر والے بھی اُن کے قومی موسیقار کی تخلیقات کی اسپرٹ میں شامل ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔"

انگلستان کے کریزینگ نے کہا ——

"پروفیسر کنزونا کاجی اور میں نے کل رات گئے تک کل کی تقاریر کا مطالعہ کیا جو وقت کے ٹائپ رائٹرز پر سے نکل کر ہمیں ملتی رہیں۔ ہم لکھنے والے دوسروں کے لیے کتنے دردِ سر کا موجب بنتے ہیں! مترجموں اور مختصر نویسوں نے کل رات بھر اس طرح کام کیا ہے جس سے کسی بڑے اخبار کے دفتر کی فضا پیدا ہو گئی جہاں صبح کا اڈیشن نکالنے کے لیے رات جگا منایا جاتا ہے۔ اس

پوری کانفرنس کی کارروائی پڑھنے کے بعد ہم جس نتیجے پر پہنچے (جو بے ہمت افزا نتیجہ تھا) اس کی بنیاد پر ہم ایک ریزولیشن آپ کی خدمت میں پیش کرنے والے ہیں۔

ترجمہ کا معاملہ بے حد کنڈھب ہے جس پر ہم لوگ یہاں بہت طویل تبادلۂ خیالات کر چکے ہیں۔ مثال کے طور پر ایذرا پاؤنڈ نے حال میں ایک کتاب شائع کی ہے جس کا عنوان انھوں نے رکھا ہے ANTHOLOGY DEFINED BY CONFUCIUS یہ گویا قدیم چینی کلاسک کتاب نغمات کی تین سو نظموں کا ترجمہ ہے اور ظاہر ہے کہ پاؤنڈ کی قابلیت سے کون منکر ہو سکتا ہے مگر کنفیوشس کے اوریجنل سے اسے دور دور واسطہ نہیں۔ دراصل لگتا ہے جیسے جدید امریکن طرز بیان میں پاؤنڈ نے چینی شاعری کی پیروڈی کی ہے اور جنگِ عظیم کے بعد سے آج تک مزاحیہ شاعری کی اس سے بہتر کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی۔

مترجم کتنا ہی ماہر زبان کیوں نہ ہو اس کے سامنے سب سے بڑا پروبلم یہ ہوگا کہ مثال کے طور پر اردو یا جاپانی روزمرہ کو کس طرح اپنی زبان میں منتقل کرے کیا ٹوکیو کی بولی ٹھولی کو انگریزی میں ترجمہ کرتے وقت لندن کی کوکنی کا لباس پہنایا جائے؟ یا کیا کیا جائے؟

اس کے بعد یونیسکو کے سامنے رکھنے کے لیے انطونی سلونی مسکی اسٹیون اسپنڈر ایجنگس ولسن کریمز بنگ اور میری طرف سے تراجم کے متعلق ریزولیشن پیش کیا گیا جو اسی روز صبح ہم نے فائنل طور پر ڈرافٹ کیا تھا۔ مسٹر اسپنڈر نے تجویز میں ایک جگہ لفظ انڈر ڈیولپڈ ممالک لکھا تھا۔ اس پر میں نے ان سے کہا کہ پس ماندہ سے لامحالہ یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ یہ ممالک تہذیبی طور پر بھی پس ماندہ ہیں۔ اینگس ولسن نے بشاشت سے فوراً اقتصادی طور پر پس ماندہ کا اضافہ کر دیا۔ اسپنڈر تیوری پر بل ڈال کر خاموش ہو گئے۔ مصر کے ڈاکٹر محمد عوض کی اس ترمیم کے ساتھ کہ اس تجویز میں ایشیا کے ساتھ شمالی افریقہ بھی شامل کر لیا جائے۔ ریزولیوشن بالاتفاق رائے منظور کر لیا گیا۔ اس میں ہم نے ایک اہم شرط یہ بھی رکھی تھی کہ مشرقی شاعری کے تراجم کو جو شروع میں آسانی سے فروخت نہیں ہوں گے یونیسکو خود SPONSOR کرے۔

آخر میں میں نے کہا کہ ان ساری تقریروں سے جو مغرب کے مشرق پر اثر کے متعلق

یہاں کی گئی ہیں یہاں یہ امپریشن پیدا ہوا ہے کہ ایشیا نے اپنی ادبی روایات کو بالکل مسترد کر دیا ہے ایسا نہیں ہے، یورپ میں جدید شاعری نے تاریخ احساس کو متعارف کیا۔ ہمارے یہاں ممکن ہے یہ احساس موجود نہ ہو کیونکہ ہمارا نظریہ کائنات تاریخ اور وقت کے بجائے ابدیت پر مبنی ہے مگر بھگتی اور صوفی تحریکوں کے زیر اثر انسان پرستی کی ہمارے یہاں بڑی عظیم روایت موجود ہے۔ برصغیر کی ساری علاقائی زبانوں میں انسان پرستی کی بیک گراؤنڈ موجود ہے۔ پچھلی صدیوں میں شمالی ہند بنگال پنجاب سندھ مہاراشٹر اور جنوبی ہند کے شاعروں، صوفیوں اور سنتوں نے اپنی ہیومنزم کی بنا پر اعلیٰ ترین ادب کی تخلیق کی۔ لہٰذا یہ خیال بھی غلط ہے کہ مشرق انسان پرستی کے خیالات سے نابلد تھا۔ یورپ کی حالیہ خونریز جنگوں کے زمانے میں وہاں کے بیشتر فن کار انسان پرستی وغیرہ کو بھول چکے تھے لیکن ہمارے ادیبوں نے زبردست ترین کرائسس کے موقع پر جبکہ سارا برصغیر آگ و خون اور نفرت کے سمندر میں ڈوب چکا تھا، اس وقت بھی اُردو ادیبوں نے انسان پرستی کی روایت کو زندہ رکھا اور آج بھی ان تاریک سیاسی حالات کے باوجود پاکستان کے ادیبوں کی تخلیقات ہندوستان میں شائع ہوتی ہیں۔ ہندوستان کے اُردو ادیب پاکستان میں مقبول ہیں۔ ان کا فن ان جغرافیائی تاریخی اور قومی خصوصیات سے بالاتر ہے جو مسٹر اسپنڈر کا آئیڈیل ہیں۔

البرٹو راویا سادہ مزاج اور خاموش طبیعت انسان تھے۔ لنگڑا کے چلتے ہوئے ادھر آ کر بیٹھ گئے۔ سیدھے سادے انداز میں کوئی بات کی اور پھر چپ ہو گئے۔ ان کے مقابلے میں اسٹیون اسپنڈر طرح طرح کی ذہنی الجھنوں میں گرفتار معلوم ہوتے تھے۔ اللہ اس شخص کو رات کو نیند کیسے آتی ہوگی۔ ڈوس پیسو جن میں انتہائی انکسار تھا اور شفقت اور نرمی بوڑھے کونرڈ لف میاں بیوی جو کیلیفورنیا سے آئے تھے دونوں محبت اور اخلاق کے پتلے تھے جو ہر ایک کی بات کان لگا کر سنتے چونکہ بے حد بوڑھے تھے لہٰذا عام طور پر ہر جگہ پیچھے رہ جاتے اور خاموش بیٹھے رہتے۔ اینگس ولسن جن میں شدید مزاحی حس موجود تھا۔ موسیو آندرے شازوں فرانسیسی اخلاق کا مجسمہ۔ ڈاکٹر محمد عوض جو بے حد خوش مزاج تھے اور بات بات پر لطیفے سناتے۔ انڈونیزیا کا ایک نوجوان افسانہ نگار لڑکا جس کے چہرے پر بڑی بے کسی برستی اور جو لگتا جیسے یہاں آ کر کھو گیا ہے لبنان کے عیسائی کمیل

ابوصوان جو شکل و صورت اور لب و لہجے سے فرانسیسی معلوم ہوتے "(نہیں میں عرب نہیں ہوں۔ عرب قوم کا کوئی وجود نہیں عربی زبان بولنے والی اقوام کہو) برازیل کا شاعر جس کے خوب صورت چہرے پر خالص لٹن امریکن اداسی برستی ایلیکس واہ (ایولین واہ کے بھائی مگر کیتھولک نہیں) سیدھے سادے اور چپ چاپ الگ تھلگ رہنے والے (سنا ہے بھائی صاحب اتنے ہی مغرور ہیں) جارج مکیشن ان ہی کی طرح سیدھے سادے لیکن بے حد خوش مزاج۔ کامیابی نے ان کا دماغ تو ذرّہ بھر بھی خراب نہیں کیا۔ ان دنوں گپ اس قسم کی ہوتی تھی ـــــ

"گرہم گرین اس قدر مور بڈ کیوں ہیں؟" (میرا سوال)

مذہب تبدیل کیا تھا۔ اس کے بعد شادی کی وہ ہوگئی فیل۔ اب رومن کیتھولک عقیدے کی رو سے طلاق نہیں دے سکتے یہ وجہ ہے۔"

اسپنڈر کیتھولک نہیں مگر اس قدر مور بڈ کیوں ہیں؟" (میرا سوال)

"یہ وجہ ان پریشانیوں کے جوان کے ضمیر کا لاحق ہیں۔ ان کے مارے چین نہیں ملتا ان کو ـــــ"

"تو پھر ضمیر درست کرلیں" (میری رائے)

"یہ بڑا ٹیڑھا سوال ہے۔"

"جی ہاں! اور ذرا ملاحظہ کیجیے گائیں تک کس آرٹسٹک طریقے سے گھاس چر رہی ہیں۔"

"گڈ آفٹرنون ـــــ خواتین و حضرات ـــــ بس کے سرے پر کھڑی ہوئی لڑکی نے مائیک ہاتھ میں لے کر کہنا شروع کیا۔

"میرا نام ـــــ ہے جس کے معنی ہیں بارش کی ہزاروں بوندیں۔" میں آج کی شام آپ کی گائیڈ ہوں۔"

اب ہم لوگ شاہی خندق کی ریلنگ پر جھکے پانی کی شفاف لہروں کو دیکھ رہے ہیں۔ اسکولوں کے صحت مند بچے یونیفارم میں ملبوس بسوں میں سے اتر کر شہنشاہ کے محل کی زیارت کر رہے ہیں (یہ لوگ اپنی قوم پرستی کس حد تک فراموش کرسکیں گے یہ کون کہہ سکتا ہے) ٹوکیو کی سینٹ

صوفیہ یونیورسٹی کا ایک استاد میرے قریب کھڑا ہے۔ وہ آپ سے آپ کہنا شروع کرتا ہے "تم کو معلوم ہے۔ شکست کے بعد ہمارے پاس پہننے کے لیے کپڑے نہیں تھے۔ کھانے کو چاول نہیں تھے۔ ہم گھاس اُبال اُبال کر کھاتے تھے۔ فلپائن کے جنگلوں میں مجھے اطلاع ملی کہ شہنشاہ کو شکست ہوئی ہے۔ میں نے فوراً ہتھیار ڈال دیے۔ ہم نے خوشی سے اپنی ہار کو منظور کر لیا اور اسی وقت سے فوراً تعمیرِ نو میں مصروف ہو گئے۔"

جنرل مک آرتھر نے لکھا ہے کہ شکست کے بعد وہ شہنشاہ کی توہین کے خیال سے معمولی بش شرٹ پہنے اس سے ملنے کے لیے گیا۔ شہنشاہ نے اس سے کہا کہ اصل مجرم میں ہوں۔ جنگ میری وجہ سے ہوئی۔ میں اس ساری تباہی کا ذمہ دار ہوں۔ مجھے پھانسی دے دی جائے۔

دوبارہ جب مک آرتھر اس سے ملنے گیا تو قاعدے کے مطابق درباری لباس میں اسی طرح پہنچا جس طرح ایک شہنشاہ کے سامنے جانا چاہیے۔

یہ پرانا ٹوکیو ہے۔ لکڑی کے چوبی مکان چھوٹی چھوٹی دکانیں بازار مندر کے باہر جمِ غفیر ہمارے منتظر ــــ گیشا لڑکیاں پھولوں کے بڑے بڑے گل دستے لیے کھڑی ہیں۔ ٹیلی ویژن کیمرے چل رہے ہیں۔ مندر میں نوجوان پروہت سیاہ لباس میں ملبوس مائیکروفون پر نہایت فصیح و بلیغ انگریزی میں استقبالیہ تقریر کر رہا ہے۔

چھوٹی چھوٹی کاغذی قندیلوں میں موم بتیاں جلا کر ہم لوگ مندر کے برآمدے میں داخل ہوئے۔ میں اور مادام وادیا اندر چلے گئے جہاں گوتم بدھ کی عظیم الشان مورتی نیم تاریکی میں جگمگا رہی تھی۔

مادام وادیا بدھ کی مورتی کے آگے جھکی آنکھیں بند کیے پالی میں اشلوک پڑھ رہی ہیں۔ میں نے مورتی کے عقب سے ان کو دیکھا ایک عورت جو برازیل کے ایک یہودی خاندان میں پیدا ہوئی۔ پیلی ریشمی ساری پہنے ماتھے پر بڑا سا قم قم کا ٹیکہ لگائے آنکھیں بند کیے پالی میں اشلوک پڑھ رہی تھی۔

جس کو جدھر روشنی مل جائے۔

قندیلیں سنبھالے ہم سب کے سب باہر نکلے اور سیڑھیاں اتر کر آنگن میں آگئے جہاں عود و لوبان سلگ رہا تھا۔ ہم کو تحفے کے طور پر مزید کاغذی قندیلیں اور مذہبی کتابیں دی گئیں۔ ایک کتاب کے سرورق پر بڑا سا اوم اور سنسکرت کے منتر منقش تھے اندر دس ہاتھ والے دیوتاؤں کی تصاویر آویزاں تھیں۔ مہایان اور تانترک بدھ ازم جو بنگال سے چلی چین اور کوریا کے راستے یہاں پہنچی۔ اس دور افتادہ سرزمین میں اوم کا نقش —— بڑا عجیب سا لگا۔

ہزاروں انسان روز اس مندر میں پوجا کے لیے آتے ہیں۔ آس پاس کچھ کچھ بنارس کا سا ماحول ہے سوا اس کے کہ یہاں کے چھتڑوں میں ملبوس فقیر اور غلاظت اور سانڈ اور پان کی پیک اور شور و غل نہیں ہے۔

افسوس کہ فقیر اور بھک منگے بچے مجھے اب تک کہیں نظر نہ آئے (شکست کے عین بعد جب ان کی بے حد خستہ حالت تھی اس وقت بھی کوئی ایک انسان بھیک مانگتا دکھلائی نہ دیا تھا۔ کسی نے مجھے بعد میں بتایا) غالباً 1885 میں ایک امریکن اخبار نویس لڑکی نیلی بلائی بہتر دن میں ساری دنیا کا سفر کرتی یہاں پہنچی تو اُس نے لکھا تھا کہ کوڑھیوں، بھوکوں اور بھک منگوں کی اس سرزمین مشرق میں صرف جاپان ایک ایسا حیرت انگیز ترقی یافتہ ملک ہے جہاں اندھے بھی بھیک نہیں مانگتے۔ سارے اندھوں کو تیل مالش کے کام پر لگا دیا گیا ہے۔

رات۔

گنزا (چاندی کا شہر) حسب معمول روشنیوں میں نہا رہا ہے۔ اندھیرے آسمان کے مقابل میں اشتہار برقی روشنیوں سے طرح طرح کے پیٹرن بنا رہے ہیں۔ گنزا جو پیکڈ لی اور شان زی لی زے اور براڈوے کی مانند ہے جاپان کی موڈرن زندگی کا تاریک ترین رُخ ان روشنیوں کے پیچھے چھپا ہوا ہے۔

سڑکوں پر کھڑی ہوئی اسٹریٹ واکر لڑکیوں کی ٹولیاں۔ پیرس کی طرح کے شاندار نائٹ کلب جہاں اسٹرپ ٹیز ہو رہا ہے۔ الٹرا موڈرن ریسٹوراں امریکن سپاہیوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ ان سپاہیوں کی سرپرستی کی وجہ سے اسٹرپ ٹیز جاپان کی قومی انڈسٹری بنتا جا رہا ہے۔

پھر یہاں کی لرزہ خیز انڈر ورلڈ۔ بوہیمیا ــــ طوائفیں ــــ

"جاپانیوں کا اخلاقیات سے متعلق بڑا عجیب و غریب رویہ ہے۔ رات کو یہ لڑکیاں نائٹ کلبوں میں ناچتی ہیں۔ دن میں یونیورسٹیوں میں پڑھتی ہیں۔ ان کے والدین اسے معیوب نہیں سمجھتے۔" کسی نے مجھے بتایا ــــ

"مشرق کی مشہور و معروف شرم و حیا کہاں گئی۔ یہ جاپانی عورتیں جن کی نسائیت کی تعریف کرتے ہوئے ہم لوگ مرے جارہے ہیں۔ ان کی بہنیں یہاں ناچ رہی ہیں ــــ"؟ میں کہتی ہوں۔

"اسلامی ممالک کی شرم و حیا بھی تو بہت مشہور و معروف ہے۔ لیکن قاہرہ کے نائٹ کلب تم نے نظر انداز کر دیے اور وہ واہیات ترین بیلی ڈانس۔" وہ ترکی بہ ترکی جواب دیتا ہے۔

گنزا کی سڑکوں کے کنارے آرٹ اسکولوں کے طالب علم لڑکے اور لڑکیاں اپنے اپنے ایزل سنبھالے تصویریں بنانے میں مصروف ہیں۔ نیم تاریک گلیوں میں بیٹھے ہوئے مصوران راہ گیروں کے منتظر ہیں۔ صرف ایک سو (100) ین کے بدلے میں ان سے اپنے اسکیچ بنوالیں۔

مصوروں کی برادری عالمگیر ہے!!

ایک روز میں ایک سوہو اور پیکڈلی کی اعلیٰ ترین تفریح گاہوں کی مانند عظیم الشان کئی منزلہ ریسٹوران میں گئی۔ معلوم ہوا کہ یہ تو محض نچلے متوسط طبقے کے لیے ہے، مختلف منزلوں پر نچلے اور مزدور طبقے کی لڑکیاں اور لڑکے چاروں طرف بیٹھے چینی چائے پی رہے تھے۔ دیواروں پر دبیز ریشم منڈھا تھا۔ چھت پر مصنوعی ستارے جگمگا رہے تھے جن کی مدھم سی روشنی میں کہیں نیچے سے گانے کی آواز آرہی تھی۔ اتنے میں ہال کے سرے پر جہاں خلا تھا رفتہ رفتہ آرکسٹرا کے سازوں اور سازندوں کے سر ابھرتے نظر آئے۔ چند لمحوں بعد آرکسٹرا کا تخت اور مائک پر گاتی ہوئی لڑکی فلور کے برابر آ گئی۔ کچھ دیر تک آرکسٹرا کا تخت اس منزل پر رکا رہا۔ اس کے بعد وہ اسی طرح اوپر کی فلور پر چلے گئے اور کچھ دیر بعد آرکسٹرا نیچے اترتا چلا گیا مستقل یہی ہوتا رہا۔

یہ ایک ایسا معمولی درجے کا ریسٹوران تھا جہاں اعلیٰ سوسائٹی نہیں آتی۔

ڈپارٹمنٹ اسٹورز میں بقول شخصے سوئی سے لے کر ہوائی جہاز تک کی خرید وفروخت جاری ہے۔ ان دکانوں میں سلفرجز اور ہیرڈز سے زیادہ سامان موجود ہے۔ ان کے اپنے ریلوے اسٹیشن ہیں۔ دوسری فلور پر ٹرین آکر رکتی ہے لوگ خریداری کرتے ہیں اور سامان لے کر باہر سڑک پر نکل آتے ہیں۔ دروازوں پر ان کے ٹکٹ کی چیکنگ کوئی نہیں کرتا۔ ٹکٹ کے معاملے میں بے ایمانی کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مختلف فلورز پر لفٹ گرلز دروازوں پر کھڑی بار بار تعظیماً جھک رہی ہیں۔ برقی سیڑھیوں کے نیچے استادہ لڑکیاں اناؤنسمنٹ کے ساتھ متواتر جھکتی جارہی ہیں۔ یہ لوگ اس قدر جھکتے جھکتے تھکتے بھی نہیں۔

مائی چی دنیا کا سب سے بڑا اخبار کا دفتر ہے۔ دن بھر میں جس کے ستر جاپانی ایڈیشن نکلتے ہیں۔ اس کا اپنا ٹیلی ویژن اسٹیشن ہے۔ اپنے ہوائی جہاز اور ہیلی کاپٹر اور کبوتر سروس۔ چھت پر کبوتر پلے ہیں جن سے خبر رسانی کا کام لیا جاتا ہے۔ پریس کلب اپنی آرائش کی وجہ سے اچھا خاصا بکنگھم پیلس معلوم ہوتا ہے۔

خلاف توقع اس ملک میں امریکن زدگی نظر نہیں آئی۔ لڑکیاں جینز نہیں پہنتیں۔ مرد نہ رنگ برنگے بش شرٹ پہنتے ہیں نہ چوئنگ گم کھاتے ہیں۔ ان کا معاشرتی ماحول زیادہ تر انگلستان کی طرح کا ہے۔ مجھ سے ایک اخبار نویس نے کہا کہ یہاں کمیونزم کا زبردست انڈر کرنٹ موجود ہے۔ پتہ نہیں یہ کہاں تک صحیح ہے۔

ان لوگوں کے اصل جذبات کا پتہ چلانا بہت مشکل ہے۔

کمیونسٹ لیڈروں سے ملاقات بھی شاذونادر ہی ہوسکتی ہے۔ جارج میکش جاپان کے سب سے بڑے کمیونسٹ لیڈر اور پارٹی سکریٹری کا انٹرویو کرنا چاہتے تھے۔ بڑی دقتوں کے بعد ان سے ملاقات کا وقت طے کیا گیا۔ لیکن ہر مرتبہ وہ کمیونسٹ لیڈر پیغامبروں کے ذریعے اپوائنٹمنٹ ملتوی کرواتے رہے۔ اسی چکر میں جارج میکش ہمارے ساتھ ٹوکیو نہ جاسکے۔ انھوں نے حال ہی میں ہنگرین انقلاب پر کتاب لکھی ہے اور اب مشرق بعید میں کمیونزم پر معلومات حاصل کرنا چاہتے تھے۔ آخر بہت انتظار کے بعد ان کو ایک پارٹی ممبر کے ذریعے اطلاع ملی کہ وہ

لیڈران سے نہیں مل سکتے۔

کہا جاتا ہے کہ جنگ کے خاتمے کے وقت ملک میں کمیونزم زوروں پر تھی اور بہت ممکن تھا کہ انقلاب برپا ہو جاتا مگر عین وقت پر امریکن امداد نے اس نازک صورتِ حال پر قابو پایا۔

کوئی جاپانی اپنے چہروں پر غصّے کے آثار نہیں لاتا۔ کئی دفعہ میں نے دیکھا سڑک پر سائیکل والے کی ٹکر ٹھیلے والے سے ہوگئی (یہ تین پہیوں والے بڑے اور چھوٹے موٹر ٹھیلے ہیں ہاتھ کے ٹھیلے کو نہیں دھکیلتا) ان دونوں نے اتر کر ایک دوسرے کا گریبان نہیں پکڑا، نہ گھونسے تانے نہ گالیاں دیں خاموشی سے افسوس کا اظہار کیا اور اسی سکون کے ساتھ اپنے اپنے راستے چلے گئے۔

ایمانداری کا یہ عالم ہے کہ ساری قوم صدیوں سے لکڑی کے ایسے مکانوں میں رہتی آرہی ہیں جن کی پتلی پتلی کاغذی دیواریں ہوتی ہیں۔ دروازے سرے سے ہوتے ہی نہیں وہی دیواریں اِدھر اُدھر کھسکا کر گھر بند کر لیا جاتا ہے۔ تالوں اور چٹخنیوں کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا مگر نہ چوریاں ہوتی ہیں نہ سیندھ لگتے ہیں جبکہ حالت یہ ہے کہ عام طور پر مکان ایسی نفیس چیزوں سے سجے ہوتے ہیں کہ خواہ مخواہ چوری کرنے کو جی چاہے۔

ٹوکیو کے جھل جھل کرتے ریلوے اسٹیشن کی دیواروں پر چوبی اور روغنی فریسکو بنے ہیں۔ ٹرین کی ساری کوچیں ایئر کنڈیشنڈ ہیں اور پہلو کے بجائے درمیانی کوریڈور کے ذریعے ایک دوسرے سے منسلک ہیں۔ سارے ڈبوں میں قالین بچھے ہیں۔

صبح کے دھندلکے میں دوسو کے قریب کانفرنس کے مہمانوں کو لے کر ٹرین ٹوکیو کی طرف روانہ ہوئی۔ چار کوچیں مہمانوں کے لیے مخصوص ہیں۔ ٹرین کے چلنے کے بعد سب نے اپنی اپنی جگہ سے اُٹھ کر اِدھر اُدھر ٹہلنا شروع کیا۔ لوگ دریچوں کے پاس گروہ بنا بنا کر بیٹھ گئے۔

باہر حدِ نظر تک کارخانے پھیلے ہیں جن کی چمنیوں سے دھواں اُٹھ رہا ہے۔ سبزے پر بارش شروع ہوگئی ہے۔ منظر کے بھورے اور سبز رنگوں کا یہ امتزاج انگلستان کے صنعتی کنٹری سائڈ کی یاد دلا رہا ہے۔ ہر طرف فیکٹریاں ہیں اور آگے نکل کر تیز ہری گھاس کے میدان اور گھاٹیاں

پہاڑیاں اور دیودار اور پائن کے جنگل جن کے درمیان لکڑی کے مکان بنے ہیں۔ یہاں چاروں اور اتنا حسن ہے کہ یقین نہیں آتا کہ یہ اصل مناظر ہیں یا کابکی اسٹیج کی سیٹنگ۔

جگہ جگہ سانچی کے پھاٹک کھڑے ہیں۔ ان کے اندر باغات ہیں اور شراین۔ چھتریاں لگائے عورتیں گڑیوں کی طرح چلتی لکڑی کے پلوں پر سے گزر رہی ہیں۔ پائن سے ڈھکی ہوئی پہاڑیوں پر بادل تیر رہے ہیں۔ بادل جھک کر گاؤں پر چھا گئے ہیں۔ دھان کے کھیتوں پر بھتنے پھر رہے ہیں۔ ٹرین کے شیشوں سے ٹکرا رہے ہیں۔

پائن کا درخت صرف صاف ہوا میں بڑھتا ہے۔ یہ شفاف ہوا ہے جو بانس کے جھنڈوں میں سرسرا رہی ہے۔ اس قبرستان پر سے گزر رہی ہے جہاں چھوٹی چھوٹی قبروں میں مرے ہوئے جاپانیوں کی راکھ دفن ہے۔ چاروں اور پہاڑیوں پر پائن کے سیدھے درخت کہرے میں چھپے کھڑے ہیں۔ کولتار کی سڑکیں بل کھاتی سرسبز گاؤں میں سے گزر رہی ہیں۔ برساتیاں اور فل بوٹ پہنے کسان کھیتوں میں کام کر رہے ہیں۔ برجس نما سفید پائجامے پہنے اور سر پر سفید رومال باندھے کسان عورتیں پگڈنڈیوں پر سے گزر رہی ہیں۔ چھوٹے چھوٹے دیہاتی اسٹیشنوں پر مسافر برساتیاں پہنے چھتریاں سنبھالے مغربی پوشاک میں ملبوس خاموشی سے ٹرین کے منتظر کھڑے ہیں۔ بالکل انگلستان کے دیہاتوں کا سا منظر۔

ٹرین دیودار کے درختوں اور بے تحاشا طویل سرنگوں میں سے گزر رہی ہے۔

''الو——''

''او——ہلوڑاں——''

''وہ منہ لٹکا کر ایک نشست کے ہتھے پر ٹک جاتا ہے میں زین کے مطالعے سے دست بردار ہو چکا ہوں۔''

''بہت اچھی خبر ہے۔''

''وہ دیکھو۔ وہ رہا فیوجی یاما۔''

یہ مانتا ہوں کہ ان لوگوں کا آرگنائزیشن محیر العقول ہے۔''

''درست!''

''تو تم اس طریقے سے تعریفیں قبول کر رہی ہو گویا تمھارا ہی ملک ہے۔''

''ایشیا تو ہے۔''

لبنان کے کیتھولک عرب کمیل ابوصوان سر اٹھا کر مسکرائے۔''ادھر دیکھو''۔ انھوں نے دفعتاً کہا۔

اب ٹرین سمندر کے کنارے کنارے جا رہی ہے۔ ریل کی پٹری اور لہروں کے درمیان صرف چند گز کا فاصلہ ہے دوسری طرف پہاڑیوں پر بانس کے جھنڈ ہیں جن کے ہلکے ہلکے ہرے پتے آبشار کی طرح نیچے گرتے ہیں۔ سمندر کے کنارے کنارے کولتار کی شفاف سڑک پر سے اکا دکا موٹر سائیکل گزر جاتی ہے سمندر پر چھایا ہوا کہرہ پہاڑیوں پر تیرتے بادلوں سے مل جل کر ایک ہو گیا ہے۔

ہاماتسو کے قریب اسکول کے بچوں کا ایک گروہ دھان کے کھیتوں میں سے گزر رہا تھا۔ اسٹیون اسپنڈر نے کہا''ان کو دیکھ کر مجھے اپنا بچپن یاد آ رہا ہے جب میں دکانوں کی کھڑکیوں میں اندر رکھے ہوئے کھلونوں کو حیرت سے دیکھتا تھا۔''

مادام شازوں کہنے لگیں''ان مناظر میں کس قدر نسائیت ہے! پہاڑوں کو دیکھ کر بھی کرختگی کا احساس نہیں ہوتا۔''

اتامی میں گرم پانی کے چشمے ہیں پہاڑوں کی چوٹیوں پر خوب صورت ہوٹل ہر طرف جھرنے گر رہے ہیں۔

آٹھ گھنٹے گزر گئے اب ہم کیوٹو کے قریب پہنچ رہے ہیں۔

اس ٹرین کا نام مسکورا ہے اور یہ بیوا جھیل کے کنارے کنارے تیزی سے کیوٹو کی طرف بڑھ رہی ہے۔

اوساکا یا سرنگ کو عبور کر لیا اور اب کامو دریا کے پل پر سے گزر رہی ہے۔

کیوٹو۔ سرسبز پہاڑیوں پر پھیلا ہوا جاپان کا قدیم دارالسلطنت۔ یہاں بمباری نہیں ہوئی

اس لیے اولڈ اولڈ ماحول اب بھی برقرار ہے۔ ہمارا وکٹورین طرز کا مکایو ہوٹل ایک پہاڑی کی چوٹی پر ایستادہ ہے جس کے دریچوں میں سے سارا شہر نظر آتا ہے۔ کچھ کچھ مسوری کا سا منظر ہے۔ ہوٹل کے عین عقب میں آبشار گر رہے ہیں۔ بارش اب تیزی سے برسنا شروع ہو چکی ہے۔

شام کو ہم لوگ چائے کی رسم کے گرینڈ ماسٹر یوراسینکے کے یہاں مدعو تھے۔ موسلا دھار مینہ میں ہم لوگ مسٹر یوراسینکے کی ولا کی طرف روانہ ہوئے وہاں باغ کے پھاٹک پر چھتریوں کے انبار سنبھالے لڑکیاں ہماری منتظر کھڑی تھیں۔ کیچڑ میں سنبھل سنبھل کر قدم رکھتے بارش کے ریلے میں بہتے ہم اپنے میزبان کی خالص جاپانی وضع کی ولا میں پہنچے حسب دستور اندر پہن کر جانے کے لیے چپلیں پہلے ہی سے برآمدے کے نیچے موجود تھیں۔ اس وقت ان بڑے بڑے دانشوروں کو جاپانی چھتریاں اٹھائے پانی میں شرابور بڑی بے کسی کے عالم میں لڑھکتے پڑھکتے قطار اندر قطار ولا کی طرف بڑھتے دیکھ کر مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔

جاپانی مکانوں میں فرنیچر بالکل نہیں ہوتا۔ صرف چٹائیاں بچھی ہوتی ہیں۔ جا بجا گل دان نظر آتے ہیں۔ دیواروں پر پینٹنگز یا لمبے اسکرول آویزاں ہوتے ہیں۔ مہمانوں کی آمد پر گھر کی بی بی دیوار کے اندر بنی ہوئی نیچی الماریوں کا پٹ کھسکا کر کشن نکالتی ہیں جو چٹائیوں پر رکھ دیے جاتے ہیں۔ چوکی کے گرد فرش پر بیٹھ کر کھانا کھایا جاتا ہے۔

یہ کیوٹو کے قدیم ترین ارسٹوکریٹک خاندان کا مکان تھا مگر اس کی سادگی کا بھی یہی عالم تھا۔

چائے کی رسم کے متعلق ہم کو پہلے سے بہت سے لیکچر پلائے جا چکے تھے۔ ٹرین ہی میں اس کی ہسٹری کے متعلق ایک کتابچہ پڑھا دیا گیا تھا۔ یہ بتلایا گیا تھا کہ یہ ایک ایسا RITUAL ہے جس کی بہت سخت رومانی مذہبی اور تہذیبی اہمیت ہے۔ یہ جاپانی آداب محفل کا نچوڑ ہے۔ یہاں کے معاشرتی اخلاق کا سمبل ہے۔ پھول سجانے کے فن کے اسکولوں کی طرح یہاں چائے بنانے اور پیش کرنے کے فن کے اسکول بھی ہوتے ہیں جہاں جائے بغیر اعلیٰ خاندانوں کی لڑکیوں کی تعلیم مکمل نہیں سمجھی جاتی۔ اس رسم کا باقاعدہ ایک پورا فلسفہ ہے وغیرہ وغیرہ یوراسینکے اس ملک

کے گرینڈ ماسٹر ہیں ایک قسم کے سجادہ نشیں۔

اور اس کی آبائی سنداں کے خاندان میں یہی کوئی آٹھ نو صدیوں سے چلی آرہی ہے۔

ان کی بی بی اور بیٹے اور فرنچ بولتی ہوئی بے حد خوب صورت بہو نے ہم لوگوں کا سواگت کیا اور حسب دستور بات بات پر ہاتھ جوڑ کر سر جھکاتی رہی۔ یہ لوگ سب کیمونو میں ملبوس تھے۔ ہمیں مختلف کمروں میں بٹھلا دیا گیا۔ ایک کمرے میں ڈونگر کیری وادیا اور میں مزے سے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے مگر یورپین خواتین وحضرات کی فرش پر بیٹھنے میں بڑی کم بختی تھی پھر نہایت اہتمام سے کمرے کے سرے پر ایک خاص طرح کی کیتلی میں چائے تیار ہوئی اس کا چولہا فرش کے اندر ایک چھوٹے سے تہ خانے میں بنا تھا۔ ہم سب دم سادھے بیٹھے رہے کہ دیکھئے اب کیا ہوتا ہے فضا پر زبردست تقدس کا ماحول تھا۔ باہر بارش ہورہی تھی۔ میں کمرے کے کونے میں بالکل دیوار سے لگی بیٹھی میں نے ذرا پیچھے مڑ کر دیکھا ــــــ اس کونے کی دیوار ذرا کھسکا دی گئی اور اس میں سے باغ کا ایک گوشہ نظر آرہا تھا۔ درختوں کے پتے، باغ کے فرش کے پتھر اور بارش کی پھواریں اوپر سے نکلتی ہوئی روشنیوں میں جھل مل کررہی تھیں۔

رنگ برنگے کیمونو میں خوب صورت لڑکیاں سخت سنجیدہ شکلیں بنائے آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ہمارے سامنے آئیں۔ دوزانو جھک کر رکوع میں گئیں۔ سامنے ایک پلیٹ رکھی جس میں ایک عدد لڈو بانس کے ٹکڑے پر پتے میں لپٹا ہوا دھرا تھا سجدے میں گریں جواباً ہم بھی تعظیماً جھکے پھر وہ اٹھ کر اسی طرح چلتی ہوئی واپس گئیں۔ لڈو بے حد بدذائقہ تھا لیکن خاموش رہے۔ معاملہ روحانیت اور تہذیب کی اعلیٰ ترین سمبلزم کا تھا۔ دم مارنے کی گنجائش نہ تھی۔

ابھی کلائمکس باقی تھی وہی لڑکیاں دوبارہ نمودار ہوئیں۔ ہمارے سامنے آکر سجدے میں گریں۔ ایک چینی کے پیالے میں ایک ہرے رنگ کا گاڑھا سا جوشاندہ سامنے رکھا۔ دوبارہ سجدہ کیا ہم بھی جھکے وہ واپس گئیں۔ میں نے مادام وادیا سے چپکے سے پوچھا:

''اب کیا ہوگا؟''

''اسے پی جاؤ اور کیا ہوگا۔ منہ ہرگز نہ بنانا۔''

''مگر یہ ہے کیا شے۔ خیر ابھی چائے آتی ہوگی۔ اس سے حلق صاف ہو جائے گا۔''

''ارے یہی تو چائے ہے۔'' کملا نے مری ہوئی آواز میں کہا۔ ''اب کچھ نہیں ہوسکتا۔ پوری پینا پڑے گی۔ ایک بوند پیالے میں نہ چھوڑنا ورنہ انتہائی بداخلاقی سمجھی جائے گی۔''

لہٰذا بہادری سے کام لیتے ہوئے میں نے آنکھیں بند کیں اور انتہائی نفاست سے پیالہ ہاتھ میں اٹھا کر وہ کڑوا ملغوبہ جسے جاپانی ستم ظریفی سے چائے کہتے ہیں میں نے ھوالشافی کہہ کر پی ڈالا۔ کملا اور مادام وادیا بھی اس فرض سے سبکدوش ہو چکی تھیں اور بڑی متانت سے بیٹھی تھیں یقیناً اس وقت ہم تینوں کے چہروں پر کھڑوں نور برس رہا تھا۔

اس کڑوے کسیلے جوشاندے کے لیے اس قدر دھوم دھام جب سے اس ملک میں آئے تھے مارسب جاپانیوں نے مل کر ناک میں دم کر رکھا تھا چائے کی رسم ایسی ——— اور چائے کی رسم ویسی۔

بہت شور سنتے تھے ہاتھی کی دُم کا۔

اس جان لیوا چائے کے بعد چھوٹا سا حقہ پیش کیا گیا۔ سب نے باری باری کش لگائے۔

''اب کیا حقہ بھی پینا ہوگا؟'' میں نے لرز کر مادام وادیا سے پوچھا۔

مگر شکر کہ حقہ آتے آتے کچھ ایسا کنفیوژن ہوا کہ ہم تینوں جلدی سے اٹھ کر جھک جھک کر میزبانوں کو BOW کرتے اوپر کی منزل پر پہنچ گئے جہاں جاپانی طرز کی ضیافت کا انتظام تھا ہم کئی بار خالص جاپانی دعوتیں کھا چکے تھے لہٰذا اس خوف ناک کھانے کی بھی عادت پڑ گئی تھی۔ ایک طرف اسٹیج پر لڑکیوں نے نوہ کا ایک ڈرامہ شروع کر دیا۔ امریکن نے بتایا کہ ہمارے میزبان کا جاپان کی سوسائٹی میں وہی درجہ ہے جو راک فیلر خاندان کو امریکہ میں حاصل ہے۔ ہمارا یہاں مدعو کیا جانا بے حد فخر کی بات ہے یہ عزت کسی کسی کو ہی نصیب ہوتی ہے۔

کھانے کی چوکی پر میرے اور کملا دیوی کے برابر میں چند فرنچ اور ڈینش مصنفین بیٹھے تھے۔ ہمیں دیکھ کر حسب معمول سیاسی گفتگو شروع ہوگئی۔ ایک فرانسیسی نے دوسرے سے کہا ——— ''ہندوستان اور پاکستان والوں کا یہ عقیدہ ہے کہ ایک دوسرے کو قتل کر دیں تو صلے میں

جنت ملتی ہے۔"

"ہاں ـــــ دوسرے نے جواب دیا ـــــ "اسی وجہ سے پاکستان میں اب تک ایک ہندو باقی نہیں سب قتل ہو چکے ہیں اور انڈیا میں چن چن کر مسلمانوں کو بھون ڈالا گیا ہے۔"

وہ لوگ آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ میں نے سنی اَن سنی کرنا چاہی کیونکہ میں ہندوستان اور پاکستان کے درمیان سیاسی گفتگو سے بری طرح عاجز آ چکی تھی مگر کملا دیوی کے آگ ہی تو لگ گئی اپنا غصہ چھپا کر انھوں نے رسان سے فرانسیسیوں سے کہا" آپ تو بڑے دانشمند لوگ ہیں اور یہ آپ کی جہالت کا عالم ہے ہم کو تو آپ کے بھائیوں انگریزوں نے لڑوایا ـــــ وغیرہ وغیرہ ـــــ آپ تو عیسیٰ کو ماننے والے ہیں سارے کے سارے یورپین اور آپ نے کس طرح ایک دوسرے کو تباہ کیا ہے اپنے ہی گرجاؤں پر بمباری کی ہے۔

لاکھوں کو پچھلی جنگ میں موت کے گھاٹ اُتار دیا ـــــ آپ جو بڑے تہذیب اور انسانیت کے ٹھیکہ دار بنتے ہیں۔"

"مگر کیا یہ واقعہ نہیں کہ نہرو پاکستان کو غلام بنانا چاہتے ہیں ـــــ؟" ڈنمارک کے ناولسٹ نے کملا دیوی کو مخاطب کیا ـــــ "نہرو کو کیا حق ہے کہ وہ پاکستان کو غلام رکھے۔

پاکستان صدیوں سے ہندوستان سے علاحدہ قوم ہے جسے انگریزوں نے برٹش انڈیا کے نام سے ہندوؤں کے ملک سے ملا رکھا تھا۔ اب نہرو کو کیا حق ہے کہ وہ پاکستان پر حملہ کرنے کا ارادہ کرے۔ پاکستان کی انڈیا سے بالکل جداگانہ پانچ ہزار سال قدیم تہذیب ہے ـــــ کیا یہ صحیح نہیں ـــــ؟" انھوں نے مجھ سے پوچھا۔

"کملا دیوی" ـــــ میں نے ان سے کہا ـــــ "ان سب باتوں کا جواب آپ ان کو دیجیے میں کھانا کھاتی ہوں۔ چائے نے الگ منہ کا مزہ کرکرا کر دیا۔ جانے اس میں دھتورہ ملا تھا یا کیا ـــــ"

دوسرے روز صبح تین ریوجی مندر میں کانگریس کا آخری سیشن تھا۔ کیوٹو کے اخبارات نے ٹوکیو کے اخباروں کی طرح ہمارے متعلق اسپیشل ایڈیشن نکالے تھے۔ ایک انگریزی میں

HEMING BECK HOAX کے عنوان سے ایک مزاحیہ مضمون چھپا تھا جو کسی نے ''ملٹن براؤن'' کے فرضی نام سے لکھا تھا۔

''ولیم ہیمنگ بک ٹوبلٹزم پرائز ونر ناولسٹ ابھی تک جاپان میں ہیں اس وقت وہ ٹوکیو سے سینڈائی آنے کے لیے ایکسپریس ٹرین میں سوار ہیں۔ سینڈائی میں وہ وہاں کے اتنک کلب کے مہمان ہوں گے حسب معمول اپنے میزبانوں اکیرایونو اور ملٹن براؤن کے ہم راہ ہیں۔ ٹرین کے دریچوں سے بارش کی پھواریں ٹکرا رہی ہیں۔

ہیمنگ بک:- جون اور جولائی کی بارش کے بعد آپ کے یہاں اگست کا مہینہ بھی ہوتا ہے؟

یونو:- آیئے بشاشت کی باتیں کریں۔

ہیمنگ بک:- اچھا! جاپان میں فاکنر کی مقبولیت کی کوئی ایک قابل قبول وجہ بتاؤ۔

براؤن:- ایک وجہ میں بتاتا ہوں جو یونہی سی ہے۔ فاکنر مشکل بہت ہے۔

یونو:- موصوف مشہور ہیں۔ جنس اور قتل کی اُن کے یہاں فراوانی ہے اور مشکل ہیں۔

ہیمنگ:- مشکل ـــــ!!

براؤن:- کیا آپ کو یہ معلوم نہ تھا؟

ہیمنگ بک:- خداوندا! فاکنر کی شرابی تحریر سے تیر کر سونا باہر نکل آتا ہو تو بڑا شکر ادا کرتا ہوں۔ کیا جاپانیوں کو اس قسم کی نشہ آور عبارت پسند ہے۔ انگریزی ایسے ہی بہت مشکل سے ان کی سمجھ میں آتی ہوگی تمھارا مطلب ہے کہ جاپانی طالب علم جو چیز ان کے پلّے بالکل نہیں پڑسکتی اسے بھی ایڈ مائر کرتے ہیں ـــــ؟''

یونو:- اکثر۔

براؤن:- اور اکثر اس لیے زیادہ ایڈ مائر کرتے ہیں کہ ان کے پلّے کچھ نہیں پڑتا۔

ہیمنگ بک:- میں یہ بات نہ سمجھ سکتا ہوں اور نہ ایڈ مائر کرتا ہوں۔

یونو:- آہ ـــــ پُراسرار مغرب!

ہیمنگ بک:- جاپان میں مقبول ترین ناولسٹ کون کون ہیں ـــــ آج کل؟

یونو:- فاکنر، ہیمنگ وے، اسٹین بک اور آپ۔

براؤن:- ڈوس پیسو۔

یونو: ارسکن کاڈ ریل اور پرل بک۔

براؤن:- اور آپ کی مقبولیت کی چند معقول وجوہات ہیں چند نامعقول۔

ہیمنگ بک:- لیکن ہم سب تو مشکل ادیب نہیں ہیں۔ ہیمنگ وے اور اسٹین بک اوسط فاکنر کی مانند دقیق نہیں ہیں نہ کمتر ہیمنگ بک کی مانند۔

براؤن:- ''مشکل'' ہونا یہاں مقبولیت کے لیے لازمی نہیں لیکن ایک حد تک فائدہ مند ضرور ہے گو چند طالب علم اور اسکالر چھچھورے بھی ہیں کہ جو چیز آسانی سے سمجھ میں آجائے اسی کو پسند کر لیتے ہیں۔

ہیمنگ بک:- (بڑبڑاتے ہوئے) مشرق کی طرح مغرب میں بھی۔

یونو:- آہ پُراسرار ـــــ ایں ـــــ آپ کا کمتر ہیمنگ بک سے کیا مطلب تھا؟

ہیمنگ بک:- میری تحریریں جب بہت زیادہ فاکنر کی طرح ہوں تب بے حد معمولی اور جب زیادہ مشکل پسندی پر نہ اتریں تو بہتر ہوتی ہیں۔ یہ ایک مشہور نقاد کے الفاظ میں۔

براؤن:- بالکل صحیح۔

یونو:- لیکن ہم جاپانی آپ کی ادق تحریروں پر عاشق ہیں خصوصاً FOR WHOM -ABSOLOM, FOR WHOM

ہیمنگ بک:- غضب خدا کا ـــــ اب ایک راز سنو ـــــ جب میں یہ راز لوگوں پر منکشف کرنا چاہتا ہوں تو لوگ مانتے ہی نہیں ـــــ (وہ باہر لینڈ اسکیپ پر برستی ہوئی بارش کو دیکھتے ہیں) جاپان میں ایسی کیا چیز ہے جو مجھے اپنی تحریروں کے متعلق راز عیاں کر دینے پر آمادہ

کیسے ڈال رہی ہے؟

براؤن:- ایک غیر قوم کو اپنی فطرت کی عادتوں کے لیے موردِ الزام نہ ٹھہرایئے۔ اپنی ماسٹر پیس چیزوں کے متعلق اعتراضات کرنے میں آپ کو کب تکلف ہوا۔۔۔۔؟

ہیمنگ بک:- لیکن اب کے سے تو میں اپنے MINOR PIECE کے متعلق اعتراضات کرنا چاہتا ہوں؟

یونو:- یاالٰہی ABSOLOM کو آپ مائنر پیس کہتے ہیں تو پھر ماسٹر پیس کون سے ہیں؟

ہیمنگ بک:- DUST ALSO RISES

FAREWELL TO

GRAPES, OF MICE AND WOMEN

یونو:- لیکن ہم جاپانی تو محض اسی لیے آپ کی دوسری کتابیں بھی پڑھ لیں گے کہ آپ نے ABSOLOM لکھا ہے۔

ہیمنگ بک:- ایک تو یہ کہ مجھے کچھ پتہ نہیں اس کا مطلب کیا ہے۔

یونو:- آپ ہی نے لکھا تھا اسے۔

ہیمنگ بک:- میں مانتا ہوں کہ یہ کتاب میری سمجھ سے بالاتر ہے میں نے اسے مذاقاً لکھا تھا لیکن لوگ اس کے متعلق سنجیدہ ہو گئے۔ میں نے محض یہ دیکھنا چاہا تھا کہ جس طرح کالٹریچر میرے دوست اور دشمن لکھنے میں جتے ہیں اور اس کی بدولت شہرت اور دولت حاصل کر رہے ہیں ایسا میں بھی لکھ سکتا ہوں یا نہیں۔ چنانچہ میں بھی ٹائپ رائٹر پر بیٹھ کر جو الفاظ دماغ میں آئے لکھتا چلا گیا۔

BESTIAL ABSOLOM BEATING BUSHES
ABOUT DAVID WITH & FOUNTAIN
PAN STOCKINGS IN THE DARK RUNS OF FISH-NETS
SWEN WITH TINY HAIRS, CURLY INTESTINAL FLOPPING.

یہ تو گویا اسٹائل ہو گیا اور جو پرانی ناکارہ ادھوری کہانیاں درازوں میں پڑی تھیں ان میں

سے چھان پھٹک کر پلاٹ نکال لیا۔ABSOLOM تیار تھا۔ میں تم سے کہتا ہوں یہ سب مذاق تھا پیروڈی ہوکس۔

براؤن:۔یعنی نثر کی پیروڈی HOAX A MATER میں۔

یونو:۔ اس اطلاع سے جاپان کی ادبی دنیا میں زلزلہ آجائے گا۔

ہیمنگ بک:۔اگر تم لوگوں نے میرا یقین کیا جبھی مغرب میں تو سمجھا جاتا ہے کہ میں تہلکہ خیزی کے لیے سب کہہ رہا ہوں تا کہ کتاب زیادہ بکے (وہاں بالکل نہیں بکتی)۔

براؤن:۔یہاں بھی مشکل ہی ہے کہ آپ کی بات مان لی جائے کیونکہ یہاں کے ریسرچ اسکالرز پر بڑی ایکیٹوٹی ہو جائے گی آدھا درجن کے قریب اسکالرز کو میں جانتا ہوں جو ABSOLOM پر ریسرچ کر رہے ہیں۔

یونو:۔ آہ ــــ پُر اسرار مغرب ــــ جاپانی اسکالرز پر یہ ستم نہ ڈھایئے۔

براؤن:۔غم نہ کرو۔ کتاب میں اگر کوئی معنی ہیں تو یہاں کے اسکالرز ضرور ڈھونڈ نکالیں گے اس سے مصنف کو بھی فائدہ ہوگا۔

یونو:۔(چہرہ زرد ہو جاتا ہے) مگر وہ تو معنی پہلے ڈھونڈ چکے ہیں۔

ہیمنگ بک:۔ یہ بڑی زیادتی ہے میرے ریسرچ اسکالر مجھ سے زیادہ چار سو بیس نکلے ــــ عظیم تر ہوکس ــــ کیا تمھیں معلوم تھا کہ میں ہوکس ہوں ــــ؟

براؤن:۔اب تک نہیں ــــ دیکھو ٹوکیو کے ایک بڑے بھاری نقاد نے اس مضمون میں تحقیق کر کے ثابت کیا ہے کہ آپ مندرجہ ذیل ــــ مصنفین سے متاثر ہوئے ہیں۔

تھیوڈور یڈیس جان ہے ووڈ مسز افرا بن جیک لنڈن فیودوتیو چیف، پرنسٹن کے طلبائے قدیم کا میگزین کیوسورایو کی ایڈمنڈ بلنڈن اور رودلف ایم فان انحن باخ۔

یونو:۔ (میرے سر میں درد ہو رہا ہے) ــــ آہ ــــ پراسرار مغرب کس کے لیے سنڈائی ــــ ABSOLOM کس کے لیے یونو ــــ

(لڑکی اناؤنسمنٹ لاؤڈ اسپیکر پر، ہم تہذیبی شہر سینڈائی پہنچنے والے ہیں۔)

ہیمنگ بک:۔ یونو کو اسپرین دو۔

براؤن:۔ بے کار ہے بے ہوش ہو چکا ہے غریب۔ آیئے۔ سینڈائی آگیا۔ اِنک کانفرنس میں آپ کا انتظار ہوگا۔

میں نے اخبار تہہ کر کے اینگلس ولسن کو دے دیا۔

ہم لوگ تین ریوجی مندر کی سمت رواں تھے جہاں کانگریس کا آخری سیشن ہونے والا تھا۔ اس جگہ روشومون کی شوٹنگ ہوئی تھی۔ گائیڈ لڑکا ڈرائیور کی سیٹ کے قریب کھڑا مائیک میں کہہ رہا تھا۔۔۔ ہوئی ہوگی بھئی میں کیا کروں۔۔۔ میں نے دل میں کہا۔

''ہاں تو پھر کیا ہوا؟'' اینگس ولسن نے بات جاری رکھی۔

''ہوتا کیا میں نے ناول ختم کر لیا مگر وہ مسئلہ پھر بھی حل نہ کر پائی۔ کیا لکھنے سے حل ہل جاتا ہے۔۔۔؟ پتہ نہیں۔۔۔ دراصل۔۔۔''

میں اور اینگس ولسن حسب معمول ایک اور بحث میں اُلجھے ہوئے تھے۔

''نفرت کا مسئلہ میری تمام تر توجہ کا مرکز ہے۔ میں نے امریکن ناولسٹ جیمز فریل سے بھی ایک مرتبہ اس کے متعلق سوال کیا تھا۔ جاپان آنے سے چھ روز قبل میں نے ایک طویل ناول بعنوان ''آگ کا دریا'' لکھ کر ختم کیا تھا جس میں میں نے نفرت کا مسئلہ سلجھانے کی کوشش کی ہے مگر محض حل تلاش کرنے سے حالات تو نہیں بدل جاتے۔۔۔

اب بارش ختم ہو چکی تھی مگر آسمان ابر آلود تھا۔

کتنی خوب صورتی ہے یہاں پر۔۔۔ اینگس ولسن نے کہا۔

''ایسے پیارے ملک میں رہنے والے حسن کار تو لامحالہ ہونے چاہئیں مگر ساتھ ساتھ اتنے ظالم بھی ہو سکتے ہیں، یہ سمجھ میں نہیں آتا''۔ میں نے کہا۔۔۔

''اُن لوگوں میں بڑی سادگی ہے۔'' اینگس ولسن نے جواب دیا۔

''مگر تمھیں معلوم ہے سادہ طبیعتیں بڑی ظالم ہو سکتی ہیں۔ اُن کے آرٹ میں اُن کی شاعری میں کسی چیز میں گہرائی یا مابعد الطبیعات کا دخل نہیں۔ یہ چین یا ہندوستان کی طرح گمبھیر

لوگ نہیں ہیں۔"

"جرمن تو بڑے گمبھیر لوگ ہیں فلسفہ اور موسیقی اور مابعد الطبیعات۔ اور انھوں نے انسانیت کے ساتھ کیا کیا—— شدید طور پر مہذب اور متمدن انسان اتنی ہی شدت سے وحشی بھی ہو سکتا ہے۔" میں نے جواب دیا—— اس کی کیا وجہ ہے——

"میں بھی یہی معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ انسانوں نے ظلم اور آرٹ کو کس طرح ملایا ہے۔ میں جرمنی میں بھی یہی جاننے کا متمنی تھا۔ لیکن وہاں کنسنٹریشن کیمپوں کے متعلق کوئی کچھ نہیں بتاتا—— یہ کیا اسرار ہے——"

"مجھے جاپان سے آئے اتنے دن ہوگئے مگر یہ لوگ کھل کر بات کرنا ہی نہیں چاہتے——" میں نے کہا—— "یہ عظیم الشان کانگریس میرے لیے بہت ڈراؤنی ثابت ہوئی ہے۔ اس میں میں نے نفرت کے بڑے زبردست انڈر کرنٹ محسوس کیے ہیں—— بہت سے دھارے جو سطح کے نیچے متواتر رواں تھے۔" اینگس ولسن نے کہا——

"بنیادی مسائل کے متعلق کوئی بات نہیں کرتا—— کل میں نے اسرائیل اور لبنان اور مصر کے نمائندوں سے علاحدہ علاحدہ بات کرنے کی کوشش کی مگر اس کے بجائے وہ مجھے اپنی کھینچی ہوئی تصویریں دکھانے لگے۔" میں نے جواب دیا۔

ہم لوگ خاموشی سے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگے۔

"پتہ نہیں"۔ میں نے دوبارہ کہا—— "انسان کی فطرت کے راز سمجھنا بہت مشکل ہے۔ کل ہمیں یہ معلوم ہوا کہ اس کانگریس کی مہمان داری کے لیے جس پر لاکھوں روپیہ خرچ ہوا۔ اس میں امیروں، وزیروں، تجارتی اداروں اور یونیورسٹیوں کے عطیات کے علاوہ اسکولوں کے بچوں کسانوں اور ہسپتالوں میں لیٹے ہوئے مریضوں کا چندہ بھی شامل ہے—— یہاں ہر واقعی یہ محسوس کر کے خوش ہو رہا ہے کہ دنیا کے ادیب اس کے ملک میں جمع ہوئے ہیں—— ا۔ ایک انتہائی اکتا دینے والا نعرہ سمجھا جاتا ہے مگر یہ واقعہ کہ دنیا کے عوام امن چاہتے ہیں "

"یہ ہمارا سب سے بڑا ڈپارٹمنٹ اسٹور ہے——" ڈاؤن ٹاؤن کیوٹو میں

ہوئے گائیڈ نے فخریہ اطلاع دی ـــــ ''نہ جانے یہ لوگ اپنے ڈپارٹمنٹ اسٹورز دکھانے پر اس قدر مصر کیوں ہیں ـــــ؟' اینگس ولسن نے اُداسی سے کہا ـــــ

''غالباً اس لیے کہ اس وقت ہمیں مندروں سے زیادہ بجلی کے کارخانوں اور ڈپارٹمنٹ اسٹورز کی ضرورت ہے۔ آپ ایشیا کو اب تک ٹورسٹ رویے سے دیکھنا چاہ رہے ہیں۔ میں نے کہا۔

''یہ ٹورسٹ رویہ نہیں۔'' اینگس ولسن نے جواب دیا۔ ''مگر قسمیہ یہاں گھر گھر ٹیلی ویژن دیکھ کر مجھے بے انتہا کوفت ہوئی کہ یہاں بھی روحانی بے اطمینانی اور ذہنی تنہائی کا وہی عالم ہو جائے گا جو ہمارے مغرب میں ہے۔''

''جی! لہٰذا ہم لوگوں کو موم بتیوں کی روشنی میں بانسریاں بجانی چاہئیں ـــــ آخر ہمیں اس پرانی رومینٹک دنیا کو تباہ کرنے کا کیا حق ہے!! باقی یہ کہ SUBSIDISED انٹلکچوئیلز۔''

''ٹھیک۔ بہت اچھی ترکیب استعمال کی تم نے۔'' انھوں نے میری بات کاٹی۔ مگر بتاؤ ''آج کل انٹلکچوئیلز کو ایک حد تک SUBSIDISED ہوئے بغیر کام چل سکتا ہے؟''

''میں پچیسویں بار آپ سے یہ معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ آج کے برطانوی ادیب کا مقصد کیا ہے ـــــ احساسِ جرم ـــــ؟ یہ پچھتاوا کہ آپ نے ٹیلی ویژن جاپان میں متعارف کر کے یہاں کا روحانی سکون تباہ کر دیا؟ اس کا پرایسچت کہ آپ نے اسپین کی خانہ جنگی میں حصّہ لیا؟ مغربی یورپ کی مسیحی تہذیب اور بازنطین کی روایات کی تجدید؟ کیتھولک عقیدہ؟ ہیومنزم؟ ہیومنزم آج کی دنیا کے CONTEXT میں سخت بوگس لفظ ہے ـــــ لہٰذا جناب والا آپ اس سوال کا آج قطعی طور پر اطمینان بخش جواب عنایت فرمائیے اس لیے کہ آپ پوسٹ وار انگلستان کے ان دو یا تین نئے ادیبوں میں سے ہیں جن کو میں اہم سمجھتی ہوں۔ گراہم گرین کو مذہب ہی سے فرصت نہیں۔ ڈیلن طامس مر گئے مسٹر اسپنڈر کو ان کے جہاد نے کہیں کا نہ رکھا ـــــ آخر جہاد کاہے کے لیے کیا جا رہا ہے۔ کمیونزم سے ایشیا کو بچانا چاہتے ہیں ـــــ آپ ایشیائی ادیبوں کو اپنے مسائل سے آپ ہی نپٹنے دیجیے ـــــ ادب میں آزادی کے قائل ہیں ـــــ؟ برطانیہ آزادی کا ہمیشہ سے زبردست علم بردار رہا ہے مگر ایک امریکن رسالہ انگلستان سے چھپتا ہے تو اس پر اصرار کیا جاتا ہے

کہ اسے انگریزی رسالہ سمجھو —— میں یہی تو معلوم کرنا چاہتی ہوں آپ آزادیٔ افکار کے حامی کس حد تک SUBSIDISED ہونا پسند کریں گے۔

اب بادل بہت نیچے جھک آئے تھے ہم پیچ دار راستوں سے نکلتے مندر کے باغات میں داخل ہوئے جن کو سرسبز پہاڑیوں نے گھیر رکھا تھا۔ چاروں اور بالکل آسام کے ایسے مناظر بکھرے ہوئے تھے۔ فرنچ اور جاپانی ادیب اٹھ کر پیچھے چلے گئے۔

"جاپانی"۔ اینگس ولسن نے اصل موضوع پر پلٹتے ہوئے کہا "فرانس کو اپنا کلچرل اور ذہنی گرو مانتے ہیں حالانکہ فرانس آج کی دنیا میں بے انتہا غیر حقیقت پسندی کا ثبوت دے رہا ہے۔"

ہم مندر کے نزدیک پہنچ گئے۔ باغ کی سیڑھیوں پر کیوٹو کے باشندوں کا ہجوم کیمرے کے لیے منتظر تھا۔ اس ملک کے ہر ذی ہوش کے ہاتھ میں ایک کیمرہ ہوتا ہے۔ مندر کے برابر میں ایک اور باغ تھا۔ ہم میں سے چند لوگ ٹہلتے ہوئے اس کے پھاٹک کے اندر چلے گئے۔

"جاپانی خانقاہ کے باغ ہیں۔ یہ تو کسی سمفنی کا نام ہوسکتا ہے——" میں نے کہا۔ پلٹ کر دیکھا تو اسپنڈر واقعی دیواروں کے نیچے فکر شعر میں مبتلا ٹہل رہے تھے۔ دوسری طرف ڈونلڈ کین ایک پتھر پر بیٹھا جاپانی میں نظم لکھنے میں جٹا تھا۔

اسپنڈر نے لکھا:

GRAY TEMPLE IN GREEN MOSE
NATURE PURE YET DESIGNED,
THE WELL UNDER THE ROCK
SPRING RENEWING THE MIND.

اب دھوپ نکل آئی ہے۔ تین ریوجی مندر سے چند گز کے فاصلے پر فر کے درختوں سے ڈھکی ہوئی پہاڑیاں کھڑی ہیں۔ مندر کے عقب میں پہاڑیوں کے کنارے کنارے نوّے ایکڑ پر پھیلی ہوئی جھیل کنول کے پھولوں سے پٹی پڑی ہے۔ صاف شفاف لکڑی کا بنا ہوا یہ مندر دھوپ میں جگر جگر کر رہا ہے۔ اس کے باغات کی صناعی زین فلسفے کی سمبل ہے۔ پہاڑی کے دامن میں

درختوں اور پھولوں میں چھپے ہوئے چھوٹے چھوٹے معبد خوب صورت چوبی کوریڈورز کے ذریعے بڑے مندر سے ملحق ہیں۔اس کے فرش آئینے کی طرح شفاف ہیں۔درختوں اور پھولوں اور جھیل کی لہروں کے رنگوں نے منظر کے حسن کو خالص لرزہ خیز بنادیا ہے۔باغ کی مصنوعی چٹانیں اور جھرنے سونگ عہد کی چینی پینٹنگز کی یاد دلاتے ہیں۔سونگ عہد کے زین مذہب کی بنیاد پر مندر ایک جاپانی وارلارڈ کے حکم سے 1339 عیسوی میں تعمیر کیا گیا تھا۔

مندر کے برآمدے کی دیواریں تیرھویں اور چودھویں صدی کے چینی پروہتوں کے ہاتھ کے لکھے ہوئے خطاطی کے نمونوں اور پرانے شہنشاہوں کی تصویروں سے مزین ہیں۔کچھ لوگ برآمدے کے باہر لکڑی کے جنگلے پر ٹک گئے ہیں کچھ پہاڑیوں کے دامن میں گھوم رہے ہیں۔ چاروں طرف ٹیلی ویژن کیمرے چل رہے ہیں۔

اب کانگریس کا آخری سشن شروع ہو چکا ہے سب لوگ بڑے ہال میں فرش پر بیٹھ گئے ہیں۔پہلو میں برآمدے کے باہر پہاڑیاں اور جھیل ایک عظیم الشان پینٹنگ کی طرح نظر آرہی ہیں۔

اینگس ولسن مائیک پر جاکر کہہ رہے ہیں——

یہ بڑی امپریشنسٹک دنیا ہے۔منظر بدلتے ہیں۔ایک ایک درخت ایک بادل کی جھلک دکھلائی دیتا ہے پھر دفعتاً منظر بدل جاتا ہے۔ماحول کے ماورائی رنگ تبدیل ہوجاتے ہیں کیوٹو سے یہاں آتے ہوئے مسٹر اسپنڈر اور مسٹر موراویا نے کہا کہ یہ جگہ سوئٹزرلینڈ کی ایسی ہے۔مس حیدر نے کہا ان مناظر میں آسام کی جھلک ہے مگر ان باغوں کو دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ یہ جاپان اور صرف جاپان ہے۔اس کانفرنس میں بڑی اونچی اونچی باتیں طے کی گئی ہیں مجھے اب صرف اتنا کہنا ہے کہ حس مزاح ایک قوم کی ذہنی اور جذباتی پختگی کی سب سے بڑی علامت ہے۔کل شام جب ہم چائے کی رسم کے لیے جارہے تھے اس وقت بڑے بڑے بین الاقوامی شہرت کے لوگ پانی میں بھیگتے عجب مسخرے لگے۔ایک بے حد مشہور شخصیت کو میں نے عجب کومک حالت میں :فتاں وخیزاں ولا کی طرف بڑھتے دیکھا اور مجھے ہنسی آگئی۔اس کی توقیر اور عزت کو قائم رکھنے کے

لیے میں نے اپنی ہنسی روکی اور آگے بڑھ گئی۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ وہ مجھ پر ہنس رہا تھا۔ میری توقیر برقرار رکھنے کی خاطر اپنی بے تحاشا ہنسی چھپانے کی کوشش کرتا کیچڑ میں چھپ چھپ کرتا بھاگا چلا جا رہا تھا۔

''یہ اپنے اوپر اور دوسروں کے اوپر ہنس لینا بہت بڑا وصف ہے حالات میں مضحکہ کی صورت پہچان کر اس سے محظوظ ہونے، اپنا مذاق آپ اڑانے اور اپنا مذاق اڑائے جانے پر برا نہ ماننے کی اہلیت سب سے بڑی نعمت ہے۔'' مندر کے بڑے ہال میں بھکشوؤں کے ہاتھ کا تیار کیا ہوا کھانا کھانے کے بعد ہم نے بسوں میں لد پھند کر شاہی محلات کا رُخ کیا۔

جاپانی ذہن میں اختراع کا مادہ بہت ہی کم ہے یہاں کی ہر چیز چین اور ہندوستان کی تقلید میں بنائی گئی۔ کیوٹو کا لے آؤٹ بالکل چینی شہروں کا ایسا ہے جن لوگوں نے پیکنگ کے شاہی محلات دیکھے ہیں ان کا کہنا ہے کہ کیوٹو کے یہ امپریل مکانات ان کے پاسنگ بھی نہیں۔ یہاں کے شہنشاہ بھی کس قدر سادگی سے رہتے تھے۔ ساری شاہی عمارتیں لکڑی کی ہیں اور کارونیشن ہال کے درزوں پر چقیں پڑی ہیں۔ معمولی سا ایک ایوان جسے دیوانِ خاص یا دیوانِ عام جو چاہیے کہہ لیجیے اس کی ساری آرائش چینی فلسفیوں کی قدِ آدم تصویروں پر مشتمل ہے جو دیوار منقش ہیں۔ بادشاہ سلامت کے معمولی سے تخت کے دونوں طرف دو شیر بنے ہیں جن کو یہاں چینی کتے کہا جاتا تھا۔ کیونکہ جاپانیوں کو معلوم ہی نہ تھا کہ شیر کس جانور کا نام ہے۔ شیروں کے یہ مجسمے بھی چین سے آئے تھے۔ محلات کی ان گنت ڈیوڑھیاں، صحن اور چہار دیواری ہمیں بے حد مانوس معلوم ہوئی۔ ہم واقعی مشرق میں ہیں۔

کیوٹو میں مہاتما بدھ کے چودہ سو (1400) مندر اور باغ——جاپان کے لینڈ اسکیپ باغات کی خوب صورتی کو آسانی سے بیان نہیں کیا جاسکتا۔

یہ کستورا محل ہے۔ سولھویں صدی کے شہزادے تُوشی ہی ٹو کی ولا جس کے خوب صورت باغ کے وسط میں بہت بڑی جھیل جس کے چاروں اور پہاڑی راستے ہیں۔ پہاڑیوں پر پائن کے درختوں میں ٹی ہاؤس چھپے ہیں جہاں یہ شہزادگان عالی مرتب سر پر چٹیاں رکھائے دوزانو بیٹھے وہ

کڑوا جوشاندہ پی پی کر خوش ہوتے ہوں گے پگڈنڈیوں کے کنارے پتھر کی چھوٹی چھوٹی خوب صورت لالٹینیں نصب ہیں جو جاپان کی خاص چیز ہے۔ چھوٹی چھوٹی مصنوعی ندیوں پر پل بنے ہیں۔ معطر کنجوں میں آبشار گر رہے ہیں۔ کیمرہ مین کی پوری پلٹن حسب معمول ہمارے ساتھ ساتھ چل رہی ہے (ہم سے مراد ہم تین ساڑی پوش خواتین ہیں) اب تک ہمیں یہ معلوم ہو چکا تھا کانگریس کی مندوبین مغربی خواتین کو ہماری پبلسٹی مطلق پسند نہیں آئی مگر دراصل ہماری وجہ سے نہیں ہماری ساڑیوں کی وجہ سے یہ سارا ہنگامہ تھا۔ اس میں ہمارا کوئی قصور نہ تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ہم تینوں نے ساڑیوں کے بجائے خدانخواستہ فراک پہنے ہوتے تو ہرگز اتنا نوٹس نہ لیا جاتا۔ ان تصویروں ہی کے سلسلے میں ہم تینوں مرتے مرتے بچے۔

کستورا محل کے باغات کا چکر لگاتے ہوئے ہم جھیل کے ایک بہت اونچے پُل پر چڑھے جو دو چھوٹی پہاڑیوں کو ایک دوسری سے ملاتا تھا بغیر جنگلے کا یہ پل اتنا تنگ تھا کہ بہ مشکل دو آدمی اس پر سے ساتھ ساتھ گزر سکتے تھے۔ بہت احتیاط سے قدم رکھتے باتوں میں مصروف میں اور مادام وادیا آگے آگے جا رہے تھے۔ کملا چند حضرات کے ساتھ ذرا پیچھے تھیں۔ یک لخت دائیں طرف ہماری نظر پڑی اور نیچے پانی کے کنارے کوئی پچیس کیمرہ مین اور فوٹو گرافر اپنے کیمروں کا رخ ہماری طرف کیے ڈٹے ہوئے تھے۔ ''ذرا رکیے گا۔'' انھوں نے چلا کر کہا۔ شکریہ۔ ہم لوگوں نے دوسرا قدم آگے بڑھایا ہی تھا کہ اسی لمحے دوسری طرف سے آواز آئی۔ صرف ایک منٹ۔ ہم نے چونک کر ادھر دیکھا۔ پل کے بائیں طرف جھیل کے دوسرے کنارے پر ایک اور پلٹن اسی طرح مستعد کھڑی تھی (یہ لوگ غالباً مخالف ٹیلی ویژن اور اخباروں کے نمائندے تھے) آواز پر چونک کر دوسری طرف مڑنے میں ہم تینوں گرنے سے بال بال بچے ورنہ غڑاپ سے جاتے نیچے جھیل میں سارا آرٹ وارٹ کلچر ولچر دھرا رہ جاتا۔

شام کو بہت امیر کبیر آدمی کے گھر میں ضیافت ہے جو کیوٹو کا بہت بڑا ٹائیکون ہے بہت ساری چہار دیواریوں اور ڈیوڑھیوں کو طے کرنے کے بعد ہم ایک اور وسیع لینڈ اسکیپ گارڈن میں پہنچے ہیں جو ہمارے میزبان کے گھر کا پائیں باغ ہے۔ پھاٹک پر گیشا لڑکیاں استقبال کے

لیے موجود ہیں۔ گھر کی بیبیاں مکان کے اندر ہیں (جاپان میں الٹرا موڈرن اور فیوڈل تہذیبوں کا یہ امتزاج عجیب و غریب ہے۔)

گھر کے اندر جا کر میں نے اور مادام وادیا نے کڑوا جوشاندہ پیا۔ پھر باہر آ کر ٹہلنا شروع کیا۔ سارا باغ گھوم ڈالا۔ نیم تاریک راستے جھیل کے کنارے خوب صورت پویلین سارے پویلین چھان مارے مگر کھانے کے لیے کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ دفعتاً میں نے مادام وادیا سے کہا "بڑا سناٹا ہے سب لوگ کہاں غائب ہو گئے؟"

"اتنا بڑا باغ ہے۔ اِدھر اُدھر ہو گئے ہوں گے۔" انھوں نے جواب دیا۔

"چلو اس طرف چلیں شاید کچھ ٹھکانے کی چیز کھانے کو مل جائے۔ پُل عبور کر کے ہم اس پویلین پر پہنچے جہاں بہت بڑا مجمع تھا مگر وہاں شراب کا دور چل رہا تھا۔ قریب ہی کشتیاں بندھی تھیں۔ چاند بہت نیچے جھک آیا تھا۔"

"کتنا دل فریب منظر ہے۔" کسی نے کہا ——

"بے حد۔ مگر مجھے سخت بھوک لگی ہے"۔ میں نے جواب دیا۔ "یہاں کیا چیزیں ہیں کھانے کی۔"

مگر وہاں عالم ہی دوسرا تھا۔ لوگ باگ غیر معمولی طور پر خوش نظر آ رہے تھے۔ بھائی اسٹیون اسپنڈر ینک کی شکل پر شگفتگی برس رہی تھی۔ ایک تخت پر کاک ٹیل ڈریس میں ملبوس بے حد خوب صورت جاپانی لڑکیوں کا ایک پرا بیٹھا تھا۔ دوسرا پرا مجمع میں رل مل کر مہمانوں سے مصروف گفتگو تھا۔ دفعتاً ہم نے محسوس کیا کہ یہ گفتگو ذرا زیادہ بے تکلف قسم کی تھی جو عام طور پر پارٹیوں میں نہیں کی جاتی۔ ذرا آگے جو بڑھے تو دیکھا بڑا ابڑا بین الاقوامی شہرت کا مغربی دانشور اس وقت تخت پر راجہ اندر بنا بیٹھا ہے اور گیشا لڑکیاں اسے پنکھیاں جھل رہی ہیں۔

مادام وادیا نے چپکے سے مجھ سے کہا "یہاں سے چلو۔ یہاں ہم لوگوں کا کوئی کام نہیں۔"

ہم لوگ سارا فاصلہ عبور کر کے پھر جھیل کے دوسرے کنارے پر آ گئے۔ درختوں کے نیچے پھل اور کافی کے اسٹال تھے اور سناٹا —— صرف ایک درخت کے نیچے بوڑھے جمبو ناتھن اکیلے بیٹھے

ناشپاتی کھا رہے تھے۔

''آپ لوگ کچھ کھا پی آئیں؟''

''جی نہیں ہم آپ کے ساتھ یہیں بیٹھیں گے۔'' ہم نے جواب دیا اور صبر کر کے چند پھل کھائے پانی کا گلاس پیا اور خدا کا شکر ادا کیا۔

''کملا کو ڈھونڈ یئے جانے غریب کہاں بور ہو رہی ہوگی۔'' میں نے کہا۔ لہٰذا بے چارے شری جمبو ناتھن کو اندھیرے میں اکیلا بیٹھے چھوڑ کر ہم نے کملا کی تلاش شروع کی۔ اس وقت ہمیں پلوں اور پگڈنڈیوں پر جھیل کے کنارے درختوں کے کنجوں میں مصنوعی پہاڑیوں کے نیچے بہت سے جانے پہچانے حضرات نظر آئے جو کاک ٹیل لباس والی لڑکیوں کے ساتھ ٹہل رہے تھے۔ کملا کو ڈھونڈ لینے کے بعد ہم ابھی یہی طے کر رہے تھے کہ اب کیا کیا جائے، اتنے میں کانگریس کی سکریٹری ہمیں تلاش کرتی ہوئی مل گئیں۔ باغ کے ایک حصے میں پرانا مندر تھا۔ اس میں اس پارٹی میں آئے ہوئے چند مہمانوں کو ٹیلی وائز کرنا تھا۔ وہاں سے بھی چند منٹ بعد فراغت ہوگئی۔ اب پھر بوریت شروع ہوئی کیونکہ بھوک کے مارے الگ حالت خراب۔ اسٹالز پر یہ گائے کا گوشت تھا یا پورک یا کچی مچھلی یا شراب ہم تینوں دقیانوسی اولڈ فیشن مذہبی پابند صوم وصلوٰۃ بیبیاں کریں تو کیا کریں۔ پھل کھانے سے کہیں بھوک بھرتی ہے۔

جھیل کے کنارے والی اسٹال پر حسب معمول ہجوم تھا۔ ''یہ لوگ مسرت کی تلاش میں جتے ہیں ہم کلچر کی۔ آیئے اس میوزک پویلین ہی کو ایڈ مائر کریں۔ لگے ہاتھوں میں نے منہ لٹکا کر تجویز کیا۔ وہاں ملک کی بڑی مشہور رقاصہ مادام یاچیوانا اپنے حساب سے ناچ رہی تھی۔ یہ انوڈانس کہلاتا ہے۔ بتایا کہ موسیقی چین، ہندوستان، منچوریا اور کوریا سے یہاں پہنچی (خدا نہ کرے جو یہ موسیقی ہندوستان سے یہاں پہنچی ہو۔ ہندوستان غریب کو کیوں بدنام کر رکھا ہے خواہ مخواہ)''

''ڈانس بھی دیکھ لیا۔ اب کیا کریں۔'' ہم نے کہا۔ پھر میوزک پویلین کی سیڑھیوں سے اتر کر گھاس کی ڈھال پر آن بیٹھے۔ ہمارے وہاں بیٹھنے کے چند لمحوں بعد دفعتاً ایک درخت میں چھپی ہوئی آرک لائٹ کا رخ ہماری طرف کر دیا گیا۔

''اب بتایئے اگر یہ میم لوگ کہتی ہیں ہم تینوں کی حد سے زیادہ پبلسٹی کی جارہی ہے تو کیا غلط ہے۔''میں نے کہا۔''چلیے یہاں سے بھی اٹھیں۔''

ہم وہاں سے اٹھ کر ایک درخت کے نیچے نسبتاً تاریکی میں جابیٹھے۔سامنے کچھ فاصلے پر نشیب میں اسٹال تھی جہاں مہمانوں کا مجمع تھا۔خوب شور مچ رہا تھا۔پانی پر سے گٹار کی آواز آرہی تھی۔بارہ دری میں رقصاں لڑکیوں کا عکس پانی میں جھلملا رہا تھا۔

''بے شمار لاشیں اب پانی میں تیر رہی تھیں۔گیند کی طرح پھولی ہوئی اور سفید۔بڑی عجیب بات کہ مردوں کی لاشیں منہ کے بل تیر رہی تھیں اور عورتوں کے چہرے اوپر تھے۔عرصہ ہوا میں نے ہیلمٹ میں مری ہوئی اوفیلیا کو اس طرح تیرتے ہوئے دیکھا تھا۔وہ کس قدر صحیح تھا۔

پویلین میں گٹار زور زور سے بجنا شروع ہوگیا جس وقت بجلی کا کوندا لپکا دفعتاً گھٹاٹوپ اندھیرا چھایا۔میرے چہرے کی کھال جدا ہونے لگی اور دھجیاں بن کر چہرے سے لٹک گئی سامنے ہسپتال تھا۔یک لخت اس کی ہر کھڑکی سے سفید دھواں باہر نکلنا شروع ہوا اور دوسری اور تیسری منزلوں سے مریض اور سفید پوش نرسیں کود کود کر دھوئیں میں گرنے لگیں وہ سب سے نیچے سیمنٹ کی سڑک پر گرتے ہی ختم ہوگئے ہوں گے ہم سب نے بے تحاشا دوڑنا شروع کیا اور دریا تک پہنچے۔وہاں سینکڑوں زخمی اور جلے ہوئے آدمی پانی میں اپنے چیتھڑے بھگونے کی کوشش کر رہے تھے ایک شخص پانی پانی چلا رہا تھا اس کا چہرہ جل کر سیاہ کوئلہ ہو چکا تھا صرف دانتوں کی سفیدی نظر آرہی تھی۔

جھیل کے کنارے ایک برطانوی ادیب گلاس اٹھا کر امریکن ادیب کے گلاس سے ٹکرا رہا تھا۔باغ کا منظر کسی تصویر کے مانند مکمل تھا جس وقت بجلی کا سا کوندا لپکا میں باورچی خانے میں کھڑی برتن دھو رہی تھی میری بہن کالج گئی ہوئی تھی۔جب دوسرے لمحے مکان کے پرخچے اڑنے سے آگ لگی یہ سب ایسا معلوم ہوا جیسے کسی خاموش فلم میں ہو رہا ہے میرے کانوں میں کوئی آواز نہیں آئی میں سماعت سے مکمل طور پر محروم ہو چکی تھی۔اگلے سال جب ہم نے اس کالج کے کھنڈر میں میموریل سروس منعقد کی تو ہمیں ملبے میں صرف چاکلیٹ کا ڈبہ ملا جس پر میری بہن کا نام لکھا

تھا۔ جس میں وہ لنچ لے جایا کرتی تھی۔ اس کالج میں تین سو لڑکیاں تھیں سب کی سب اسی لمحے ختم ہو گئیں۔ متعدد نرسنگ اسکولوں، ہائی اسکولوں اور میڈیکل اسکولوں کا ایسا صفایا ہوا کہ ان کا ایک طالب علم زندہ نہیں بچا۔ سب آن واحد میں ختم ہو گئے——''

چاند پائن کے درختوں پر تیر رہا تھا۔ پتوں میں چھپے ہوئے لاؤڈ اسپیکرز میں سے مدھم موسیقی نشر ہونے لگی۔ سانحہ کے دوسرے روز ہمارے ہسپتال کے آنگن میں ایک اندھا گھوڑا بھٹکتا ہوا آنکلا۔ اس کا چہرہ جل چکا تھا اور آنکھیں پگھل گئی تھیں وہ آنگن میں چکر کاٹتا رہا اور سامنے کی دیوار سے جا ٹکراتا۔ دریچوں میں سے ہم اسے دیکھ کر اپنی تکالیف بھول کر اس کے لیے بہت دکھی ہوئے گویا وہ گھوڑا اور ہم ایک دوسرے کے غم گسار تھے۔

کتوں کی حالت کتنی تکلیف دہ تھی وہ RADIATION SICKNESS کے شکار ہو چکے تھے۔

موسیقی رات کی ہوا میں پھیلنے لگی۔

میں نے بوڑھی عورتیں دیکھیں جن کے چہروں کی چمک دار نیلی رنگت تھی اور ان کے چہروں بھوؤں سے لے کر ہونٹوں تک درمیان سے آدھے پھٹ گئے تھے۔ نوجوان عورتیں جن کے بازو ان کے جسموں سے علاحدہ ہو کر لٹک رہے تھے۔ ایک موٹا فوجی کرنل جو پاگل ہو گیا تھا اور اسے ایک بچہ گاڑی میں ٹھونس کر کہیں لے جا رہا تھا۔

لاؤڈ اسپیکر پر کسی نے ایک جذباتی فرنچ گیت شروع کر دیا ''پیرس کے پلوں کے نیچے تمھارے ہمراہ۔''

''دریا کے اوپر سے شعلے بھڑکتے ہوئے اُڑتے رہے۔ جب پائن کے درختوں میں آگ لگ جاتی تو کنارے پر پڑے ہوئے زخمیوں کی فلک شگاف چیخیں بلند ہوتیں میں اور میرے والد کسی نہ کسی طرح شعلوں سے بچتے پانی میں پہنچ گئے برابر میں کچلے ہوئے لوگ مرے پڑے تھے۔ طرح طرح کی چیزیں پانی میں بہتی آ رہی تھیں۔ گھاٹ پر کسی نے کہا تھا کہ پیاز کھانے سے طاقت آتی ہے پانی میں گلی سڑی پیاز نما چیز بہتی آ رہی تھی میں نے وہ اٹھا کر منہ میں رکھ لی۔ دفعتا

آسمان پر سیاہ بادل چھا گئے۔ ایک بے حد خوفناک جھکڑ اٹھا اور سیاہ تیل کی مانند بارش برسنا شروع ہو گئی۔ دریا میں طوفان سا آیا اور پائن کے درخت جڑ سے اکھڑ کر آسمان پر اڑتے چلے گئے جب طوفان اور بارش کا قہر ختم ہوا تو میں نے دیکھا جتنے لوگ آگ سے پناہ لینے کے لیے گھاٹ پر بیٹھے تھے وہ غائب ہو چکے تھے موجیں اور آندھی ان کو اپنے ساتھ بہا لے گئی۔

رنگ برنگے فراک پہنے لڑکیوں کا ایک گروہ پل پر سے گزر رہا تھا ان کے ساتھ تین چار حضرات بھی تھے۔ وہ سب قہقہے لگا رہے تھے۔ مرد سارے یورپین اور امریکن تھے وہ سب گیت میں شامل ہو گئے تھے۔

''میں حسب معمول لیبر سروس کے لیے ڈیوٹی پر گئی تھی جب دفعتاً بجلی کوندی اور بڑی سخت بدبو سارے میں پھیل گئی جب مجھے ہوش آیا تو میں ملبے میں دبی ہوئی تھی۔ میرے ساتھی چاروں طرف دبے ہوئے چلا رہے تھے ——اماں—— ابا—— خداوند—— ایک چھوٹی بچی جو عفریت معلوم ہو رہی تھی مجھے دیکھ کر چیخی—— میں میا کے ہوں مس مورائے—— میں میاں کے ہوں—— مجھے بچائیے—— مس مورائے میں نے اسے کھینچنا چاہا لیکن وہ میرے ہاتھوں سے پھسل گئی وہ چیختی رہ گئی—— مس مورائے—— مس مورائے—— مجھے یقین ہے کہ وہ خوب صورت لڑکی مس میا کے جس کا عفریت میں بچانہ سکی وہیں ختم ہو گئی ہو گی ہم لوگ بہ مشکل آلو کے کھیت تک پہنچ سکے۔ ہوا میں آگ کے شعلے اڑتے ہوئے آتے اور ہمارے بال جل جاتے۔ ہم سب نے بارہ مربع فٹ کی پانی کی ٹنکی میں گھسنا چاہا جو کھیت کے وسط میں تھی۔ چند لمحوں میں ہمارے خون کی وجہ سے پانی سرخ ہو گیا۔ فوراً لوگوں نے اسی میں الٹیاں کرنی شروع کر دی۔ پانی کی تہہ میں سے غلیظ کیڑے ابھر کر اوپر آ گئے اور ہمارے جسموں پر رینگنے لگے۔ پیاس سے بیتاب ہو کر ہم نے وہی غلیظ پانی جس میں ہمارا خون اور کیڑے اور قے شامل تھے بے تحاشا پینا شروع کر دیا۔ آسمان انگارے کی طرح سرخ تھا اور ہر شے آگ کی ایسی جل رہی تھی۔ ہمیں معلوم نہ تھا کہ یہ دن ہے یا رات—— میں پوری طاقت سے اپنا نام چلائی—— اور پھر بے ہوش رقاصہ نے ہاتھ میں گھنگھرو اٹھا کر تیزی سے چکر کاٹنے شروع کر دیے۔ بے سری بانسریوں کا شور اونچا ہو گیا۔

پس منظر میں ڈھولکی یکسانیت سے بجے جا رہی تھی۔ میوزک پویلین کی سیڑھیوں پر بیٹھے بیٹھے کسی نے ایک طویل جمائی لی۔"

"میں اپنی بہن کی تلاش میں سڑکوں پر دیوانہ وار بھاگی بھاگی پھر رہی تھی۔ جب ایک سڑک پر میں نے بہت سی کھپریلیں ایک قطار میں رکھی دیکھیں ہر کھپریل پر ایک انسانی ہڈی دھری تھی۔ چند پر سے ہڈیاں غائب تھیں۔ غالباً لوگ اپنے اپنے عزیزوں کی ہڈیاں سمجھ کر اُٹھا لے گئے تھے۔ چند ہڈیاں ابھی تک اس قدر گرم تھیں کہ ان میں سے بھاپ نکل رہی تھی۔ سارے میں نا قابل برداشت بدبو پھیلی تھی۔"

"قریب ایک پگڈنڈی پر چلتے ہوئے فادر ایکس نے جھک کر چند خوشبودار پھول توڑے اور میری دوست یوکو مارا کو پیش کیے۔ اس وقت آسمان پر ایک بے انتہا خوب صورت روشنی پھیلی اس کے بعد گرد کا طوفان اٹھا اور سب اس میں اڑ گئے۔ اس سے درد یا تکلیف کے بجائے بڑا سکون سا محسوس ہو رہا تھا۔ ایک عجیب و غریب قسم کی ہمت سی ہم میں آ گئی اور ہم نے قومی اور فوجی گیت بھی گانے شروع کر دیے۔ لیکن اس کے بعد ہماری کھال جھڑنے لگی اور تکلیف سے بیتاب ہو کر چوہوں کی طرح چکر لگانے اور کودنے لگے پھر رفتہ رفتہ ہم نے اندھا ہونا شروع کیا۔ مجھے اور میرے ہم جماعتوں کو ایک ٹرک میں بھر کر اوجینا بھیج دیا گیا جہاں ہسپتال میں پڑے پڑے ہم چیخا کرتے۔ خدا کے لیے مجھے مار دو کسی نے میری ماں کو بتا دیا تھا کہ ککڑی کی پھانک زخموں پر ملنے سے فائدہ ہوگا۔ لہٰذا وہ بے چاری ککڑیوں کی ٹوکری اٹھائے سارے میں مجھے ڈھونڈتی پھر رہی تھی۔ بارہ دن کے بعد اس نے مجھے تلاش کر لیا۔ میرے ساتھ کے طالب علم اس وقت تک ایک ایک کر کے مر چکے تھے۔ لیکن میں زندہ رہا۔ گو میرے زخموں میں کیڑے پڑ گئے تھے اور میں تڑپ تڑپ کر مرنے کی دُعائیں مانگتا تھا۔ اب میں یونیورسٹی میں اکنومکس پڑھ رہا ہوں۔ لیکن میری اصل زندگی تو چھ اگست کو ختم ہو چکی۔

اب مجھے محض یہ محسوس ہوتا ہے کہ میں ایک مہیب سائے کے نیچے زندہ ہوں اور روز بروز وہ سایہ بڑا ہوتا جا رہا ہے۔ اکثر ٹراموں میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو جن کے چہرے بگڑ چکے ہیں

دوسرے لوگ گھورتے ہیں تو مجھے بڑی شرمندگی ہوتی ہے کیونکہ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں خود ان لوگوں میں شامل ہوں۔ دنیا کو ابھی تک اس کا احساس نہیں ہوا کہ جنگ کی ایٹم بم کی تباہ کاری کے کیا معنی ہیں۔ میرا وجود اب محض ایک پرچھائیں کی حیثیت میں باقی ہے۔ اکثر سوچتا ہوں کہ اگر دنیا کی بڑی طاقتوں نے یہ وعدہ کرلیا کہ وہ آئندہ یہ قہر نہ برسائیں گے تو میری یہ دوسری سائے کی ایسی زندگی سکون سے ختم ہوسکے گی کیونکہ مجھے اب موت کا واقعتاً کوئی خوف نہیں ہے۔

ہوا درختوں سے معلق قندیلوں کو جھلکورے دیتی رہی۔ اب باغ کو نیند سی آچکی تھی۔

''جب میں خود بھاگنے کی کوشش کر رہی تھی میں نے چار اسکول کے لڑکوں کو دیکھا جو سڑک کے کنارے گھیرا بنائے بیٹھے تھے۔ چاروں بری طرح جل چکے تھے۔'' اُن میں سے ایک نے کہا——

''——خاتون—— شاید میری ماں اور بہن بھی اسی طرف سے ہیں۔ اگر آپ کو وہ ملیں تو ان سے کہیے کہ فوراً آئیں کیونکہ ہم چند منٹ میں دم توڑنے والے ہیں۔''

''ہم چاروں اکٹھے مریں گے۔'' دوسرے نے کہا ''ہمارے اوپر تھوڑا سا سایہ کر دیجیے بڑی سخت گرمی ہے۔''

میں نے چند لکڑیاں اور کاٹھ کباڑ ان کے چاروں اور کھڑا کر دیا اور ان سے پوچھا کہ اُن کو کسی اور چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ ''نہیں۔'' انھوں نے جواب دیا۔ ہم تو مرنے والے ہیں ہمیں کا ہے کی ضرورت ہوسکتی ہے۔ میرے پاس دو ٹماٹر تھے۔ میں نے ان کے چار ٹکڑے کر کے ان کے حلق میں تھوڑا تھوڑا سا عرق نچوڑا اور ان سے پوچھا—— کیسا لگا—— بے حد مزے دار—— شکریہ انھوں نے کہا۔ ایک بچے نے کہا۔ ''اگر ذرا سا پانی مل جاتا——'' میں نے ان کو پانی پلایا اور دعا مانگی کہ کوئی امدادی پارٹی اِدھر آنکلے۔

دوسرے روز صبح جب میں اپنے شوہر کو لے کر وہاں پہنچی تو میں نے چاروں کو اسی طرح سر جھکائے گھیرے میں بیٹھے پایا۔ چاروں کب کے ختم ہو چکے تھے۔''

اب باغ پر رفتہ رفتہ سناٹا اتر رہا تھا۔ پھول سو چکے تھے۔ پانی پر برستی ہوئی موسیقی اونگھ رہی

تھی، مہمانوں کے قہقہے مدھم ہو چکے تھے۔ شراب کا اثر تیز ہو رہا تھا۔ گیشا لڑکیاں کھلکھلا کر ہنس پڑتی تھیں میں اور سادام وادیا گھاس کی ڈھلوان پر بیٹھے رہے۔ ہم دونوں ایک گھنٹے سے بالکل خاموش بیٹھے تھے۔ اب خنکی بڑھتی جا رہی ہے۔ دفعتاً بوڑدیوزے کی آواز نے ہمیں چونکا دیا۔

''ہلو'' کھلکھلا

میں نے سر اٹھا کر سامنے دیکھا۔ کامریڈ بوڑدیوزے ہاتھ میں گلاس لیے کھڑے تھے۔

''بے حد اورینٹل پارٹی ہے ـــــ ایسی اورینٹل ـــــ'' اورینٹل نہیں ـــــ فیوڈل ـــــ'' میں نے جواب دیا۔'' پچاس سال پہلے ہمارے یہاں بھی طوائفیں امرا کی دعوتوں میں مہمانوں کو گا بجا کر اور باتیں کر کے محظوظ کرتی تھیں لیکن پچاس سال پہلے ـــــ'' میں نے انگلی ہوا میں لہرائی۔'' یہ اورینٹل تہذیب نہیں ہے۔''

''فیوڈل ـــــ فیوڈل ـــــ'' ہٹاؤ اب کون بحث کرے۔ میں نے مزید اکتا کر سوچا۔ وہ گلاس لیے لیے پھر ڈھال سے اتر کر اسٹال کی سمت لوٹ گئے۔

کچھ دیر بعد یہ سب لوگ یہاں سے چلے جائیں گے مکمل خاموشی اور مکمل تنہائی یہاں چھا جائے گی۔ رات کو اس باغ میں کیا ہوگا۔

دنیا بھر کے باغوں میں جب سب چلے جاتے ہیں تو کیا ہوتا ہے کیسا سناٹا چھا جاتا ہے۔ جھیل، کشتیاں، پھول، مندر، سامنے کچھ فاصلے پر پہاڑ ہے جس کی چوٹی پر مندر میں روشنی جل رہی ہے۔ یہاں ہون ہوتا ہے تانترک منتر دہرائے جاتے ہیں۔

باغوں اور پہاڑوں کے اسرار ـــــ چلو ہم لوگ ہوٹل واپس چلیں۔ یہاں تو آدھی رات تک شرابیں پی جائیں گی ـــــ میں نے دفعتاً بشاشت سے تجویز کیا۔

کملا کو ساتھ لے کر ہم ڈھال سے اُترنے لگے۔ جھیل کے کنارے پل پر انڈونیشیا کے سلطان نقد یرمل گئے۔ وہ بھی بے حد پریشان نظر آ رہے تھے ـــــ بے چارے شریف مسلمان حاجی آدمی ـــــ پھاٹک پر آ کر ہم نے میزبان کا شکریہ ادا کیا اور ہم کاروں کی طرف بڑھے عین اس وقت ایک مشہور یورپین مصنف کی بے حد خوب صورت بیوی ہمارا تعاقب کرتی بھاگتی ہوئی

آئی۔" آپ تینوں کہاں جارہی ہیں۔" اس نے پھولے ہوئے سانس کے ساتھ کہا۔

"واپس ــــ؟"

"میں ساتھ چل سکتی ہوں ــــ؟"

"ضرور ــــ مگر کیوں ــــ؟"

"میرے شوہر نے ساری شام مجھ سے بات تک نہیں کی۔ بس ان کمبخت لڑکیوں میں گھرا بیٹھا ہے ریشہ خطمی ہوا جارہا ہے۔ میں ساری شام بھن کر کباب ہوا کی۔ مجھے اپنے ہمراہ یہاں سے لے چلو۔"

"ابھی نو بجا ہے۔" میں نے کہا۔" ہم لوگ ذرا ڈاؤن ٹاؤن جا کر شاپنگ کرنے کی فکر میں ہیں۔"

"بس میں تمھارے ساتھ گھوموں گی۔ میں اسے سزا دینا چاہتی ہوں۔ وہ یہاں سے ہوٹل واپس جا کر سر پٹکے گا۔ کمرے کی کنجی میرے پاس ہے۔" وہ ٹیکسی بلانے کے لیے آگے بڑھ گئی۔ ایک بس کے پاس آنند شنکر رے کھڑے تھے۔ وہ بھی بڑے خاموش تھے۔

"اس ملک میں عورتوں کی آبادی بہت زیادہ ہے۔ جنگ میں لاکھوں مرد کام آچکے ہیں۔ فالتو عورتیں کہاں جائیں ــــ" کسی نے کہا۔ عموماً ہر متمول جاپانی ایک مسٹریس رکھتا ہے۔

یہ کاک ٹیل فراک والی بے حد دلکش اور اسمارٹ لڑکیاں پوسٹ وار زمانے کی گیشا گرلز تھیں ان کو امریکہ میں آداب محفل کی ٹریننگ دی جاتی ہے تاکہ غیر ملکی مہمانوں کو ان کے قاعدے کے مطابق محظوظ کرسکیں۔

شاپنگ کر کے کیوٹو کے بازار سے جب ہم چاروں ہوسٹل واپس لوٹے تو وہاں آفت مچی ہوئی تھی۔ برساتی میں بہت سے لوگ پریشان کھڑے تھے۔ ٹیلی فون دوڑائے جارہے تھے لوگ پارٹی سے واپس آچکے تھے اور ایک کرائسس کا عالم نظر آرہا تھا۔ جیسے ہی ہماری ٹیکسی برآمدے کے سامنے جا کر رکی بہت سے افراد ہماری طرف دوڑ پڑے۔ فرانسیسی اور سنٹرل یورپین حضرات نے انتہائی ڈرامائی انداز سے ہاتھ ہوا میں پھیلا دیے۔ اوماموزیل ــــ اور مادام ــــ انھوں نے

جھک کر کہا۔۔۔ آپ نے مادام فلاں کو دیکھا ہے۔۔۔ اوہ۔۔۔ مادام۔۔۔ آپ آ گئیں۔۔۔ آپ کہاں چلی گئی تھیں، کدھر غائب ہو گئی تھیں۔۔۔ آپ کا شوہر رو رو کر برا حال کیے دے رہا ہے۔۔۔ اپنے کمرے کے دروازے پر بیٹھے واقعی موسیو فلاں۔۔۔ اپنی بی بی کی پراسرار گم شدگی کے غم میں زار و قطار رو رہے تھے۔

دوسری صبح بے حد خوش گوار تھی۔ ہلکی ہلکی بارش شروع ہو چکی تھی۔ ہم لوگ بسوں میں بیٹھ کر نارا جا رہے تھے جو جاپان کی قدیم ترین راجدھانی ہے۔ راستے میں چائے کے باغ تھے اور تنکوں سے بنی ہوئی نوکیلی بڑے چھجے والی ٹوپیاں اوڑھے کسان کھیتوں میں کام کر رہے تھے۔ بالکل مشرقی بنگال کا ایسا منظر۔

نارا آٹھویں صدی کے بنے ہوئے مندر الوکی تیشور کے مجسّے پگوڈا بوڑھے ایبٹ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ہمارا سواگت کر رہے ہیں۔

مانوس فضائیں سارناتھ اور ٹکسشلا اور اجنتا کی صدائے بازگشت بیل، ہاتھی، کنول کے پھول، فریسکو کی تصاویر، اجنتا اور باغ کی تقلید میں بنائے گئے ہیں۔ پگوڈا استوپوں سے مستعار لیے گئے ہیں۔

بارش کا ریلا بڑے زور سے آ گیا۔ بوڑھے پروفیسر لوگوں کی گفتگو اور تبادلۂ خیالات سے بے نیاز آہستہ آہستہ چل رہے ہیں۔ مشرقی جرمنی کا ایک شاعر دبی تار اقدموں میں بیٹھا نظم لکھ رہا ہے یہ بدھ کا عظیم مجسمہ ہے کئی سو فٹ اونچا۔ اس کے نیچے کھڑے ہوئے انسان دراصل کتنے حقیر اور غیر ضروری معلوم ہو رہے ہیں۔ مندر کے باہر رنگ برنگی چھتریوں کا ایک بڑا زبردست سیلاب امنڈتا آ رہا ہے۔ بارش میں اخباروں کے نمائندوں نے ڈاکٹر گلینسپ کو گھیر لیا۔

یہ برصغیر کی ایک نوجوان آرکیالوجسٹ خاتون ہیں۔ یہ بات تو ان سے پوچھو۔

ڈاکٹر میری طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ ان سے بارش میں نہیں چلا جا رہا مگر ہمارے ساتھ گھسٹتے ہوئے آ رہے ہیں۔

ڈاکٹر گلینسپ جیسے لوگوں نے انسانی تہذیب کو زندہ رکھا ہے یہی ہمارے لیے قطب اور

ابدال ہیں۔

بارش تیز ہوگئی۔

اس کنول والے تالاب کے اس سرے پر جو سنہرا پانچ منزلہ پگوڈا ہے اسے چند سال ہوئے ایک دیوانے راہب نے آگ لگادی تھی۔

ایک بھکشو جس کی ٹانگ کٹی ہوئی ہے۔ خاموشی سے درخت کے نیچے کھڑا این بٹور رہا ہے۔ جنگل کی ڈھال پر سے سادھو نیچے اتر رہے ہیں۔ کنجوں میں کیسا امٹ سکون ہے۔

اب ہم لوگ ایک شنتو مندر میں پہنچے جہاں چاروں اور سرخ ستون ہیں۔ چڑھائی پر دونوں طرف پتھر کے چھوٹے چھوٹے سرخ ستونوں کا ایک جنگل سا کھڑا ہے ان ستونوں میں چراغ جلائے جاتے ہیں۔ چاروں اور اونچے نیچے عجیب وغریب ہیبت ناک شکلوں کے درخت بارش میں جھوم رہے ہیں۔ واقعی پرکھوں کی ارواح ان درختوں میں تبدیل ہوگئی ہیں۔ بڑا عجیب لرزہ خیز ماحول ہے۔

بدھ کے مندر ہماری اپنی دنیا میں موجود ہیں۔ شنتو معبد کسی خوف ناک پراسرار انجانی کائنات سے تعلق رکھتے ہیں۔ جس سے ہمارا کوئی رشتہ نہیں PAGAN, PRIMITIVE نہ جانے کیا قدیم مصر اور قدیم میکسیکو اور قدیم عراق کے ہیکلوں میں شاید ایسا ہی ماحول ہوتا ہوگا یا شاید یہ بحرالکاہل کے اجنبی جزیروں کا مذہب ہے جو روحوں کے کہرے سے نکلا ہے اور اسی کہرے میں موجود ہے۔ شنتو دنیا کا عجیب ترین مذہب ہے۔

برآمدے میں دیوداسیاں رقصاں ہیں۔ سنجیدہ چہرے گریس فل انداز سفید عجیب وغریب لباس، ہاتھوں میں گھنگھرو لیے جن کو وہ کھڑتال کی طرح بجاتی ہیں۔ برآمدے کے سرے پر چھتوں کے پیچھے دو شنتو راہب کالی گول ٹوپیاں اور کالے چوغوں میں ملبوس ڈھول اور بانسری بجا رہے ہیں۔ بارش تیزی سے برس رہی ہے۔ چاروں اور اونچے اونچے راستے ہیں اور سیڑھیاں اور گلیارے اور بے شمار چراغوں کے ستون، ایک پتلی گلی میں سے گزرتے ہوئے اسٹیون اسپنڈر ڈاکٹر عوض سے پوچھ رہے ہیں 'آپ کو یہ سب کیسا معلوم ہوتا ہے؟'

''یہ سب؟ یہ سب تو ہمارے خون میں شامل ہے۔ ہزاروں برس تک PAGAN رہے ہیں۔ ہم ان علامتوں کی اہمیت سمجھ سکتے ہیں۔''

اسٹیون اسپنڈر اس جواب پر خاموش ہو جاتے ہیں تو گویا جاپانی اور مصری تک ایک نکلے۔ اب غالباً انھیں مغربی تہذیب مغربی روح کے جداگانہ ہونے کا احساس زیادہ شدید ہو گیا ہے۔

مندر کی پہاڑی کے نیچے بارہ سو سال پرانا وسیع ڈیر پارک ہے جہاں سینکڑوں ہرن چلے ہیں (بنارس میں ایک ڈیر پارک تھا جہاں مہاتما بدھ گھوما کرتے تھے) ہمارے بلانے پر ہرن بھاگے بھاگے ہمارے ساتھ آتے ہیں۔ ڈوس پیسو دکان سے بسکٹ خرید کر مجھے دیتے جا رہے ہیں جو ہرن نہایت ندیدے پن سے کھائے چلے جا رہے ہیں۔ باغوں میں بگل بج رہا ہے۔ بگل کی آواز پر ہرنوں کی ڈاریں کلیلیں بھرتی بھاگی جا رہی ہیں۔ یہ ان کا لنچ ٹائم ہے۔ کتنے چٹورے ہرن ہیں۔

''جل پریوں کی جھیل'' پر بارش ہو رہی ہے۔

نارا ہوٹل عقبی باغ میں بارش سے پناہ لے کر ایک سنہرا ہرن جھاڑی کے اندر مزے سے پڑا سو رہا ہے۔

واپسی۔

نارا اور اوسا کا اور ہیروشیما کا چکر لگا کر اب لوگ باگ مختلف سمتوں میں جا رہے ہیں۔ اسباب بندھ گئے ہیں۔ خدا حافظ کہے جا چکے۔ ڈوس پیسو اور صوفیہ وادیا اور بوڑھے ڈاکٹر گلینپ سب اپنے اپنے راستے لوٹ گئے بوڈویوزے ملک راج آنند کی دعوت پر بچوں کی فلم بنانے بمبئی گئے۔ باقی سب لوگ اپنی اپنی دنیاؤں کو لوٹ رہے ہیں۔ پیرس اور بیروت اور نیویارک اور کلکتہ اور دار سا اور لندن۔

بادل مکایو کے ڈائننگ ہال کی کھڑکیوں سے ٹکرا رہے ہیں عقب کے دریچوں سے چند فیٹ کے فاصلے پر آبشار گر رہے ہیں۔ ان کے پانی کی پھواروں سے دریچوں کے شیشے

دھندلا گئے ۔ ڈائننگ ہال میں خاموشی ہے۔صرف ایک میز کے چاروں طرف کملا دیوی اور اوماشنکر جوشی اورآنند شنکر رے اور سیرنواس آئنگراور جبوتا تھن خاموش بیٹھے ہیں۔

میں ان پانچوں کو وہیں بیٹھا چھوڑ کر باہر آجاتی ہوں۔

باہر جہاں ایک عظیم خلا ہے جس میں دھند تیر رہی ہے۔

بیل پر بیٹھا چرواہا بالآخر گھر واپس پہنچ گیا۔اے لو۔بیل تو غائب ہے لڑکا قناعت سے اکیلا بیٹھا ہے۔اس کا سونٹا اور رسہ پھونس کے چھپر تلے دھرا ہے۔

صرف خلا ہے نہ سونٹا ہے نہ رسی نہ چرواہا نہ بیل فضائے بسیط کو کون ماپ سکتا ہے؟

چرواہا بابا کے تغیر اور تبدیلیوں کو دیکھتا ہے۔ندیاں بہہ رہی ہیں ان کا رُخ کدھر ہے؟ سرخ پھول کس کے لیے کھلے ہیں؟ اس کے جھونپڑے کا پھاٹک بند ہے۔بڑے بڑے گن وان بھی اس کو نہیں جان سکتے۔اپنا ڈنڈا سنبھالے وہ بازار میں داخل ہوتا ہے۔اپنے عصا پر جھکا وہ گھر واپس لوٹتا ہے۔

بیل جو نتھنوں سے چنگاریاں نکالتا پہاڑیوں پر دیوانہ وار پھر رہا تھا۔لڑکے نے بالآخر اسے قابو میں کر لیا۔اب بیل ندی کے کنارے گھاس چر رہا ہے۔سورج ڈوبنے والا ہے اور دھندلکا چھا رہا ہے۔سفید بیل اب سفید بادلوں میں گھر گیا ہے۔چاندنی ابر میں سے چھنتی ہے۔بیل غائب ہو چکا ہے اب چرواہا اپنے وقت کا مالک ہے۔وہ اس بادل کی مانند ہے جو پہاڑوں کی چوٹیوں پر تیرتا نظر آتا ہے۔

اب چرواہا اور بیل دونوں غائب ہو گئے۔روشن چاندنی خالی ہے اس کا کوئی سایہ نہیں۔ صرف ایک خلا ہے۔اگر اس کا مطلب جاننا چاہو تو ان سفید کلیوں کو دیکھو جو معطر گھاس میں کھل رہی ہیں۔(ایک جاپانی زین نظم)

بحرالکاہل پر پھیلے ہوئے بادل گہرے ہو گئے۔خوفناک سمندری طوفان پر سے گزرتا ہوا طیارہ اس وسیع دھندلکے سے نکل کر منیلا کے ایئرپورٹ پر اترا۔

میں باہر آئی۔ پھٹے پرانے کپڑے پہنے خستہ حال بچوں نے بخشش مانگی۔ٹیکسی ڈرائیور

نے بے ایمانی کر کے زیادہ پیسے وصول کرنے کی کوشش کی مچھروں نے کانوں میں بھنبھنا شروع کیا۔

میں جنوب مشرقی ایشیا واپس پہنچ چکی تھی۔ سرسبز ٹروپیکل جنگل کھمبوں پر ایستادہ لکڑی کے جھونپڑے، کیلے اور انناس کے باغ خستہ حال انسان شاندار عمارات، خلیج منیلا جہاں کا غروب آفتاب کا منظر دنیا کا بہترین غروب آفتاب کا منظر کہلاتا ہے فلپینو لوگوں کی بے مثال سادگی اور خوش خلقی۔

یہ ایشیا کا واحد عیسائی ملک ہے گرجاؤں میں ماس ہو رہا ہے۔ جگہ جگہ صدیقہ مریم کے مجسمے نصب ہیں۔ اتوار کے روز میں اپنی چند دوستوں کے ہمراہ ماس میں شامل ہوئی جہاں سیاہ اسکارف اوڑھے سرخ گلاب کے پھول لگائے لڑکیاں اور ہسپانوی گاؤن میں ملبوس فلپینو خواتین دوزانو جھکی تسبیح پھیر رہی تھیں۔ ہسپانیہ کی تہذیب جنوبی ایشیا میں فرانس کی تہذیب انڈوچائنا میں برطانیہ کی تہذیب ہانگ کانگ ملایا اور برصغیر ہندو پاکستان میں مغرب کے اس بے پایاں تسلط کا ذرا اندازہ تو کیجیے۔

اب میں نے حسب معمول جنوب مشرقی ایشیا اور پس ماندہ ممالک کے مسائل کے سمندر میں تیرنا شروع کیا۔ وہی ساری باتیں جوان ممالک کے جرنلسٹ، سیاست داں اور سرکاری پبلسٹی کے ماہرین کرتے ہیں۔

افلاس، کاہلی، گندگی، وبائی مرض نوجوان ذہن پرستوں کا فرسٹریشن کیمونزم کا خطرہ آزاد دنیا کا اتحاد امریکن امداد غیر جانب دار ممالک کی سیاست۔

منیلا کی گلیوں میں اندلس طرز کے مکان ہیں۔ لوہے کی جالی دار بالکنیاں مورش محرابیں سڑکوں پر ٹوٹی پھوٹی بسیں چل رہی ہیں۔ اکاذکا قدیم ہسپانوی وضع کی گھوڑا گاڑی دکھائی دے جاتی ہے۔ اندلسی محلات گھنے ٹروپیکل درختوں میں چھپے کھڑے ہیں جن میں فلپائن کا اعلیٰ طبقہ رہتا ہے۔ شکستہ فصیل کے اندر پرانا شہر ہے جو ہسپانیوں نے قرون وسطیٰ کے یورپین شہروں کی طرز پر تعمیر کیا تھا۔ یہ سارا شہر جاپانی بمباری سے تباہ ہو چکا ہے۔ اور اس میں کھنڈروں کے علاوہ کچھ باقی

نہیں سارے شہر میں افلاس زدہ لوگوں کے جھونپڑے پھیلے ہیں۔

جاپان میں ہر طرف امریکن بمباری کے نشانات دکھائے جاتے تھے۔ یہاں ہر طرف جاپانیوں کی بمباری کے نشانات نظر آرہے ہیں۔ خوب صورت قدیم کیتھڈرل کو شہنشاہ ہیرو ہیٹو کے جاں بازوں نے بم گرا کر تباہ کیا۔ خوب صورت مکانات پرانے میوزیم۔

اہلِ انڈونیزیا کی طرح ان لوگوں کو بھی جاپانیوں سے نفرت ہے۔

ان کو اہلِ ہسپانیہ سے بے اندازہ نفرت ہے جنھوں نے چار سو سال انتہائی جابرانہ حکومت کی۔ فلپائن میں امریکن بے انتہا مقبول ہیں۔ گویا یہ ملک امریکہ کی کولونی رہا لیکن امریکن آقاؤں نے یہاں تعلیم پھیلائی فلپنو قوم کو برابری کا درجہ عطا کیا اور آخر میں بڑے پُر امن اور دوستانہ طریقے سے آزاد کر دیا۔

فلپنو نفسیاتی طور پر الجھے ہوئے لوگ نہیں ہیں مس جاپان میں فلپنو صحافی کو چڑایا کرتی تھی کہ تمھاری کوئی قدیم تہذیب نہیں اور آج کل قدیم تہذیبوں کا بڑا زبردست ریکٹ چل رہا ہے لہٰذا اب تم بھی اپنی ایک پرانی تاریخ ایجاد کر ڈالو۔ نِک اداسی سے خاموش ہو جایا کرتا تھا۔

ہسپانوی عجیب و غریب لوگ ہیں۔ انھوں نے دُنیا کی تہذیبوں کی جس طرح بیخ کنی کی ہے اس کی مثال تاریخ میں نہیں ملے گی۔ اپنے ملک میں انھوں نے ہسپانوی تہذیب کے معمار عربوں کو نیست و نابود کیا۔ میکسیکو پہنچ کر وہاں کے پرانے تمدن کا قلع قمع کر ڈالا مگر فلپائن آکر انھوں نے یہ ستم ڈھایا کہ اس قوم کا پورا پس منظر ہی مٹا دیا۔ فلپنو دنیا کی وہ واحد متمدن قوم ہیں جن کو یہ خبر نہیں کہ ان کی تاریخ کیا ہے کیا وہ سولھویں صدی سے قبل جنگلوں میں بسنے والے تھے یا ان کی بھی میکسیکو کی طرح کوئی کلچر تھی جسے ہسپانوی فاتحین نے تباہ کیا۔

اب مجھے اندازہ ہوا کہ میرے چڑانے سے نِک کو کس قدر تکلیف ہوتی ہوگی میرا خیال تھا ہو نہ ہو۔ مصنوعی ہسپانوی امریکن زدہ دوغلی تہذیب کا وارث بھلا اس کو مشرقیت کا کیا احساس ہو سکتا ہے اس کی جڑیں تو رامائن یا مہابھارت یا زین یا بغداد کے بجائے میڈرڈ اور سان فرانسسکو میں پلانٹ کی گئی تھیں اور نک اداسی سے مسکراتا تھا۔

فلپونسلاً ملایائی ہیں۔ان کے آباواجداد ہندواور منگول اقوام تھیں جوانڈونیزیا سے یہاں پہنچیں انہی اقوام میں شامل سے چینی تاجرآن ملے۔1521 عیسوی میں ہسپانیوں نے ان جزیروں کاانکشاف کیا۔(1498 عیسوی میں ایک پرتگالی ہندوستان کو پہنچ چکا تھا) انھوں نے ان جزیروں کواپنے بادشاہ فلپ دوم کے نام پر معنون کردیا۔ان کے چارسوسالہ دورحکومت میں فلپنو قوم کی رگوں میں تھوڑاسا ہسپانوی خون بھی شامل ہوگیا۔

مجموعی طور پر فلپائن تمدنی اعتبار سے وسیع پیانے پر گوا ہے فرق صرف یہ ہے کہ فلپنو لوگ اپنے ہسپانوی ترکے اوراس دورغلامی سے شرمندہ اور متنفر ہیں اوراپنی موجودہ آزادی سے بےحدخوش۔

1898 میں امریکہ اوراسپین میں جنگ چھڑی اوراسپین کی شکست کے بعدفلپائن امریکہ کے قبضے میں چلا گیا۔اُنیسویں صدی میں فلپنو قوم نے آزادی کے لیے شدید جدوجہد کی۔ان کے عظیم ترین قومی ہیروڈاکٹر رزال کو ہسپانیوں نے 1896 میں پھانسی پر لٹکادیا۔فلپنو لوگوں کوڈاکٹر رزال سے بڑی شدید عقیدت ہے چپے چپے پرآپ کوان کے تذکرے اور یادگاریں ملیں گی۔ دوسری جنگِ عظیم میں جاپانیوں نے فلپائن پر قبضہ کیا۔1946 میں امریکہ نے ان جزیروں کومکمل طور پرآزادکردیا۔

جزائرفلپائن میں تیس مختلف مقامی بولیاں بولی جاتی ہیں۔خوب صورت جزیرے اور پہاڑیاں سرسبز جنگلوں سے ڈھکی ہیں۔جنوب کے چند جزیروں میں مسلمان بستے ہیں جو ہسپانوی زمانے سے مورو کہلاتے ہیں۔فلپائن میں جوسب سے شکستہ حال اور پس ماندہ انسان آپ کو ملے سمجھ لیجیے کہ مسلمان ہوگا۔مسلمان بھائی اپنی اس خصوصیت کی وجہ سے ساری دنیا میں الگ پہچانا جاسکتا ہے نہ وہ تعلیم حاصل کرتا ہے نہ ترقی کی اسے فکر ہے وحشیوں کی طرح مچھلیاں پکڑتا ہے اور عمیق جنگلوں میں رہتا ہے اورڈاکے ڈالتا ہے اس ملک میں زیادہ تر ڈاکوؤں کا طبقہ مسلمان[2] فرقے سے تعلق رکھتا ہے۔فلپنو مسلمان کومنیلا کی یونیورسٹیوں اور ٹیلی ویژن اسٹیشنوں اورتعمیری پروگراموں سے کوئی مطلب نہیں۔

نہ جانے اکثریت کے رومن کیتھولک تعصب کو اس کی اس حالت میں کہاں تک دخل ہے۔

چونکہ اہل فلپائن کیتھولک ہیں لہٰذا سخت کٹر مذہبی اور قدامت پسند ہیں۔ امرا کی خواتین ہسپانوی وضع کی پھولی ہوئی آستینوں کے گاؤن اور منٹیلا پہنتی ہیں۔ سرینیڈ تک ہوتے ہیں۔ بس بُل فائٹ کی کسر ہے۔

تعلیم کا چرچا بھی کافی ہے۔ افلاس عام ہے پریس کو بڑی آزادی حاصل ہے۔ چوراہوں پر آنے والے الیکشن کے سلسلے میں ہر طرف دھواں دھار تقریریں۔ انگریزی عام طور پر بولی جاتی ہے اور یہاں کی قومی زبان ہے لوگ بے انتہا کاہل ہیں۔ ایک تو جنوبی ایشیائی صفت اوپر سے ہسپانوی اثر ـــ سستیا کی عاشق اسپینش قوم یوں ہی بہت زیادہ پھرتیلی نہیں تھی لہٰذا کڑوا کریلا نیم چڑھا اہل گوا کی طرح بے حد میوزیکل ہیں۔

شہر کے باہر سرسبز گھاس پر فلپائن یونیورسٹی کی جدید وضع کی عالیشان عمارات دور دور تک پھیلی ہیں۔ ان کی دوسری مشہور یونیورسٹی سانتو طوماس ہے جو 1611 عیسوی میں قائم کی تھی۔ اس میں اولڈ ورلڈ ماحول برقرار ہے منیلا میں 22 ریڈیو اسٹیشن ہیں اور ان گنت اخبار۔

منیلا کے مضافات میں کروڑ پتیوں کا محلہ ہے۔ ہرے بھرے ایونیو خوب صورت جدید ترین طرزِ تعمیر کی کوٹھیاں شان دار کنٹری کلب۔ درختوں کے سائے میں طویل امریکن کاریں کھڑی ہیں۔ کچھ کچھ لاہور کی گلبرگ کالونی کا سا نقشہ ہے درختوں کے پرے لکڑی کے جھونپڑے ہیں جن کے دروازوں پر بیٹھی خستہ حال عورتیں بچوں کو گود میں لیے چاول پھٹک رہی ہیں۔

فلپنو فلم دیکھنے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ اپنی اس بناسپتی ہسپانوی اور امریکن تہذیب کے باوجود یہ لوگ واقعی مشرقی ہیں۔ ان کے اس فلم کی کہانی عین بین کسی پاکستانی یا ہندستانی فلم کی مانند تھی۔ ہیروئن کا انداز، چال ڈھال، ہیروئن کی ماں گویا نِمّو کا نعم البدل تھی، باپ مستقل ڈریسنگ گاؤن پہنتا تھا اور آرام کرسی پر بیٹھ کر پائپ پیتا رہتا تھا۔ ہیرو ظالم سماج کے ہاتھوں نالاں تھا ویلن اجمل کا بڑا بھائی تھا۔ ویمپ آشا بھونسلے تھی۔ بات بات پر گانا اور رونا جاری تھا۔ یہ فلم دیکھ کر مجھے

بہت اچھا لگا۔ چنانچہ یہ لوگ ہمارے ہی بھائی بہن ہیں۔ معلوم ہوا کہ اس بے حد مقبول فلم کی ہیروئن سینوریتا لولیلیا گویا اس ملک میں صبیحہ کا درجہ رکھتی ہے۔ ہیرو ایک قسم کا سنتوش کمار تھا۔ ہیرو کا باپ غلام محمد۔ قسم خدا کی بڑی تقویت ہوئی۔

ان فلموں کی زبان ٹگولوگ ہے جو فلپائن کی دیسی اور عوامی زبان ہے۔

منیلا کا پریس کلب عالمگیر صحافی برادری کی طرح وہاں جمع ہونے والے لڑکے اور لڑکیاں بھی بے تکلف اور خوش خلق ہیں۔ ایک روز ان لوگوں نے مجھے رات کے کھانے کی دعوت دی۔ ایک نیوز پیپر کا مالک اور اس کی بی بی جو میزبان تھے۔ ایک لڑکی جو ایک روزانہ اخبار میں کالم نویس تھی ایک ناولسٹ لڑکی جو بہت پُر مذاق تھی۔ ایک بے حد ذہین لڑکا پیڈرو وہاں کا مقبول ترین اور شعلہ بیان اخبار نویس تھا۔ دو تین اور صحافی جو ٹیلی ویژن اور مختلف اخباروں کے لیے لکھتے تھے۔

پیڈرو ہندوستان اور نہرو کا بے حد معتقد تھا۔ وہ سب اپنے ماضی سے متنفر تھے۔ امریکنوں کو پسند کرتے تھے۔ شروع میں میں نے امریکن امداد، فلپنو کیپیٹلزم کے متعلق چند بے ڈھب سوال کیے مگر کچھ دیر بعد مجھ میں اور میرے میزبانوں میں بڑی دوستی ہوگئی۔ آخر ہم سب ایک ہی کشتی میں تو سوار ہیں۔ ان کو جاپان سے شدید نفرت تھی جو اب ان کی خام پیداوار خرید کر کے اپنی صنعتی اشیاء ان کے ہاتھ بیچ رہا ہے۔ کیونکہ فلپائن بھی انڈر ڈیولپڈ ملک ہے۔

پھر وہاں سیاسی انتشار ہے۔ بے شمار سیاسی جماعتیں ہیں۔ سب پریذیڈنٹ میگسے سے کو یاد کر کے روتے ہیں اور امریکن ڈالر کے سہارے زندہ ہیں۔

پیڈرو غصے سے بولتے بولتے جذباتی ہوگیا۔ اس نے میز پر زور سے مکا مارا۔ میں تم کو سچ بتاؤں اس نے کہا یہ سب فراڈ ہے۔ یہ ساری ہسپانوی تہذیب اور امریکن تعلیم میم! ہم سب۔ میں تم کو سچ بتاؤں۔ ہم فلپنو مشرق اور مغرب کی ناجائز اولاد ہیں پھر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

رات گہری ہوتی گئی۔ دور دور سے اداس رومینٹک موسیقی کی آواز آ رہی تھی۔ نیچے بولنگ ایلی میں نوجوان صحافی لڑکے لڑکیاں بولنگ کر رہے تھے۔ ٹیلی ویژن کا پروگرام ختم ہو چکا تھا۔ صبح

سویرے میں ان پیارے لوگوں کو خیر باد کہہ کر منیلا سے جا رہی تھی۔

ہانگ کانگ میں مَیں کرینمر بنگ کے خوب صورت فلیٹ میں بیٹھی ان کی بیوی سے باتیں کرتی رہی مسز کرینمر بنگ بھی کیمبرج کی تعلیم یافتہ ہیں۔ ملایا میں پیدا ہوئی تھیں۔ ان کی ایک سالہ بچی کو چینی آیا کھلا رہی تھی۔

خدا کا شکر کہ میں مدتوں بعد برطانیہ کے زیرِ سایہ موجود ہوں میں نے ایک گہرا سانس لیا۔ سامنے یونیورسٹی کی عمارات، سرسبز پہاڑیوں پر دور دور تک پھیلی تھی۔ میرے میزبان کرینمر بنگ یہاں فار ایسٹرن ہسٹری پڑھاتے ہیں اور ٹوکیو کی کانگریس میں اسپنڈر اور انگس ولسن کے ساتھ برطانیہ کی نمائندگی کر رہے تھے۔ اپنے والد کی طرح یہ بھی مستشرق ہیں اور اپنی نوعمری کے باوجود بہت متوازن طبیعت کے بڑے عمدہ آدمی ہیں۔ یونیورسٹی میں خالص انگریزی ماحول ہے۔ شعبۂ انگریزی کے صدر مشہور برطانوی شاعر ایڈمنڈ بلنڈن ہیں۔

فلیٹ کی بالکنی سے میں نے نظر ڈالی —— چاروں اور بل کھاتے پہاڑی راستے دور نشیب میں شاندار بازار تھے جہاں لاکھوں کروڑوں کا کاروبار ہو رہا تھا۔ ہندو سندھی تاجر دکانیں سجائے بیٹھے تھے۔ چوراہوں پر سکھ سپاہی ٹریفک کنٹرول کر رہے تھے۔ لندن کی طرح سرخ ڈبل ڈیکر بسیں چل رہی تھیں۔ بولر ہیٹ والے انگریز متانت سے بنکوں کو جا رہے تھے۔ چینی قلی رکشا کھینچ رہے تھے۔ چھوٹے چھوٹے پیروں والی بوڑھی عورتیں تاریک گلیوں میں سے جھانک رہی تھیں۔ مکاؤ میں افیم کا کاروبار جاری تھا۔ ریسٹورانوں میں بےہودہ ترین کیبرے ہو رہا تھا۔

ری پلس بے میں سوئمنگ کرتے ہوئے یا کسی اعلیٰ درجے کے برطانوی کلب کے برآمدے میں بیٹھے ہوئے کون مردود یہ سوچ سکتا ہے کہ اسی قوم کا ایک بڑا حصہ اب ایک دوسری فضا میں سانس لے رہا ہے۔ آزاد دنیا کا چینی تو اب بھی مزے سے افیم کھاتا ہے اور دندناتا ہے جیب کترتا ہے۔ جگہ جگہ غیر ملکی سیاحوں کو خبردار کرنے کی نوٹس لگے ہیں کہ جیب کتروں سے

ہوشیار رہے۔

شنگھائی کا سارا رنگ و بوعیش و عشرت تو کیمونسٹوں نے لوٹ کر تاراج کر دیا۔ وہاں کی طوائفیں سڑکیں کوٹنے کے کام پر لگا دی گئیں مگر یہاں خدا کے فضل سے ابھی بڑی رونق ہے۔ مین لینڈ چائنا میں لوگوں کا جو حشر ہوا اگر یقین نہ ہو تو ان پناہ گزینوں سے پوچھ لیجیے جو ہانگ کانگ میں بھرے ہوئے ہیں اور جن کی وجہ سے یہاں سلمز کی آبادی بڑھ گئی ہے۔

مگر برطانیہ بہر حال بہت حقیقت پسند ہے۔ ایکشوٹی امریکنوں پر ہوگئی کہ جو چینی نوادر عوامی چین سے یہاں امپورٹ کیے جاتے ہیں اور کوڑیوں کے مول بکتے ہیں۔ امریکن سیاح ان کو خرید نہیں سکتے کیونکہ اُن کی حکومت کی طرف سے اس کی مناہی ہے۔ ان چینی اشیا کے خریدنے کا مطلب یہ ہوا گویا وہ دُشمن ملک سے تجارت کر رہے ہیں۔ ایلمر رائس کو بے حد کوفت تھی کہ اس وجہ سے وہ کچھ نہ خرید پائے۔

آج کلب میں ملکہ معظمہ کی تصویر دیکھی تو آنکھوں میں تراوٹ آگئی اور گورنمنٹ ہاؤس پر لہراتے ہوئے یونین جیک پر نظر ڈال کر قسم خدا کی جی بھر آیا میرا۔

مشرق میں برطانیہ عظمیٰ کی آخری کولونی۔ پائندہ باد۔

کرنیر بنگ نے کہا "ریڈیو ہانگ کانگ والے بے حد اکسائیٹڈ ہیں کیونکہ اس کمرشل شہر میں تمھاری قسم کے لوگ ذرا کم ہی آتے ہیں لہٰذا وہ تمھارا انٹرویو کرنے پر اُدھار کھائے بیٹھے ہیں۔"

"میری طرح کے لوگ کی ذرا وضاحت کرو۔"

ریڈیو اسٹیشن پر آج کل بی بی سی کی ہوم سروس کا ایک اناؤنسر ٹرانسفر ہو کر آیا ہوا ہے۔ پرانے ساتھیوں کی خیریت دریافت کی۔ یہ بھول ہی گیا کہ اسے میرا انٹرویو کرنا تھا وہ ہانگ کانگ میں اس قدر مگن ہے کہ بش ہاؤس واپس جانا نہیں چاہتا۔

ریڈیو اسٹیشن کے سامنے سمندر ہے۔ ہر طرف سمندر ہے اور سرسبز پہاڑ اور ہری بھری وادیاں۔

ہانگ کانگ کی خوب صورتی کا کیا کہنا۔ ساری دنیا میں مشہور ہے فلک بوس عمارات، دلفریب کولونیل کوٹھیاں، غلیظ ترین محلے، پیچ در پیچ راستے خالص مشرقی پرل بک کے ناولوں والا پراسرار ماحول مکاؤ پرتگالی علاقہ ہے لہٰذا اور زیادہ پراسرار اور زیادہ رومینٹک کشتیوں پر ایک پورا شہر آباد ہے۔ شمپانوں میں ریسٹوران ہیں جہاں سلیٹ فراک پہنے حسین لڑکیاں بیٹھی ہوتی ہیں۔

وائی ڈبلیو سی اے کی عالیشان عمارت کے برابر سے ایک سڑک ڈھلوان پر فیشن ایبل شاپنگ سنٹر کی طرف جاتی ہے جو گویا یہاں کی ریجنٹ اسٹریٹ ہے۔ سامنے پہاڑی —— اوپر سے بندرگاہ نظر آتی ہے۔

یہاں بڑے دلچسپ لوگ ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ایک امریکن مشنری خاتون جو سال بھر جنوبی ہند کے ایک مشن میں رہنے کے بعد وطن واپس لوٹ رہی ہیں۔ دو آسٹریلین لڑکیاں جو ماسکو کے یوتھ فیسٹول سے آئی ہیں اور سڈنی واپس جارہی ہیں کئی بددماغ انگریز لڑکیاں جو سرکاری دفاتر میں ملازم ہیں۔ پھر چینی عیسائی خواتین ہیں اور مسز لم وائی ڈبلیو سی اے کی چینی سکریٹری جو بے انتہا خوش اخلاق ہیں۔ ٹوکیو اور منیلا کی پُرتکلف فضاؤں کے بعد یہ کالج ہوسٹل کا ایسا ماحول بہت آرام دہ ہے۔

آسٹریلین لڑکیاں مارگریٹ اور پالا عوامی چین کی تعریفیں کرتے کرتے بے حال ہوئی جارہی ہیں۔ یہ دونوں چند سال انگلستان میں پڑھتی رہیں۔ ماسکو کے تہوار میں شامل ہونے کے بعد چین ہوتی ہوئی یہاں پہنچی ہیں۔ ان کے ہمراہ ان امریکن طلبا کا گروہ بھی ماسکو سے ٹرین کے ذریعے پیکنگ آیا تھا جن سے امریکی حکومت بے حد ناراض ہے۔ مارگریٹ اور پالا دونوں کمیونسٹ نہیں ہیں۔ مارگریٹ سڈنی کی کئی عیسائی نوجوانوں کی انجمنوں کی عہدے دار ہے۔ پالا ایک مشن کالج میں پڑھاتی ہے لیکن مارگریٹ عوامی چین سے اس قدر متاثر ہو کر آئی ہے۔ اٹھتے بیٹھتے اس نے وہاں کی بکھان کرتے کرتے ناک میں دم کر رکھا ہے۔ چیئرمین ماؤ ایسے اور چیئرمین ماؤ ایسے امریکن مشنری خاتون مس ہنگ کو وہ ہر وقت بتاتی رہتی ہے کہ عوامی چین میں وائی ڈبلیو سی اے کی تحریک نے انقلاب کے بعد کس قدر ترقی کی ہے اور کیا کیا کمالات ہوئے ہیں۔

مس ہنگ بے چاری چپ چاپ بیٹھی سنتی رہیں۔ یقین کریں یا نہ کریں۔ راوی ریڈ نہیں بلکہ خود ایک جوشیلی کرسچین ورکر ہے مس ہنگ بیشتر امریکن مشنریوں کی مانند بے حد سوئیٹ بڑھیا ہیں مسز لیم کو جو قوم پرست چینی ہیں مارگریٹ کی باتیں بہت ناگوار گزرتی ہیں۔ یہ سب پروپیگنڈہ ہے جھوٹ بالکل بکواس۔ میں تم کو ان پناہ گزینوں سے ملواؤں گی جو سرخ چین سے آئے ہیں۔

مارگریٹ اکثر بڑی اُداسی سے مس ہنگ سے کہتی ہے۔ کس قدر مضحکہ خیز بات ہے کہ آپ کا ملک اتنی عظیم قوم کے وجود ہی سے منکر ہے مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔

مس ہنگ کیرالا کے ایک مشن میں سال بھر رہ چکی ہیں۔ آپ تو خود ایک کیمونسٹ حکومت کا تجربہ کر کے آرہی ہیں ذرا وہاں کے غلط حالات بتایئے۔ پالا معصومیت سے پوچھتی ہے۔

''عوامی چین کے لوگوں میں کتنا وقار ہے کتنا توازن ــــــ انھوں نے برسوں برس کس قدر شدید تکلیفیں اُٹھائی ہیں۔'' مارگریٹ کہہ رہی ہے۔ ''جب میں سرحد عبور کر کے ہانگ کانگ پہنچی اور میں نے یہاں کی غلاظت یہاں کے سلمز یہاں کی آوارگی فری ورلڈ کی ساری نعمتیں دیکھیں تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ چین فری ورلڈ میں نہیں۔ برطانوی کراؤن کولونی! ہونہہ۔ جب میں نے یہاں دکانوں پر انگریزی نام دیکھے چینی لڑکیوں کو مغرب کی اسٹریٹ واکرز کی طرح گھومتے دیکھا۔ برطانوی جہاز نظر آئے۔ برطانیہ کو کیا حق ہے کسی ایشیائی رقبے پر حکومت کرے؟''

ہیلناسے کے اونچے دریچوں اور شاہ بلوط کی دیواروں والے ایوان نشست میں دو برطانوی اپر کلاس لڑکیاں میرے ساتھ بیٹھی ہیں۔ تذکرہ شہزادی مارگریٹ کے رومان گریس کیلی کی بچی اور مارلن برانڈو کے فلموں کا ہو رہا ہے۔ مودب چینی بٹلر (لکھنؤ کے محمد باغ کلب کے ہیڈ آب دار عبدل کا روحانی کزن خاموشی سے کھانا سرو کرنے میں مصروف ہے۔ دریچے کے باہر عمیق اندھیرا ہے) میزبان جیلین یہاں کولونیل سروس میں عہدے دار ہے۔ اس کا باپ انڈین آرمی میں بریگیڈیر تھا اور دوسری جنگِ عظیم سے قبل لکھنؤ چھاونی میں رہا کرتا تھا۔ دوسری لڑکی پمیلا بھی جیلین کے طبقے سے تعلق رکھتی ہے اور اسی کی طرح یہاں ملازم ہے۔ غیر معمولی طور پر

بے وقوف لڑکی ہے۔ اس کا باپ افریقہ کی کسی برطانوی کولونی کا گورنر رہ چکا تھا۔ مجھے تفصیلات یاد نہیں۔ یہ دونوں لڑکیاں اعلیٰ درجے کے اقامتی کلب میں رہتی ہیں جو ہانگ کانگ کے کسی انگریز سابق گورنر کی بیوی کے نام پر معنون کیا ہے۔ تیسرے پہر کوری پلس بے میں سوئمنگ کرتی ہیں۔ رات کو اعلیٰ سرکاری طبقے کی دعوتوں میں شامل ہوتی ہیں۔ اسی ڈھب سے ان کی زندگی گزر رہی ہے۔ ان کی تعلیم انگلستان اور سوئٹزرلینڈ کے فنشنگ اسکولوں میں ہوئی ہے ان کا مطالعہ لندن کے سوسائٹی رسالوں تک محدود ہے ان کو بسنت کی کچھ خبر نہیں مارگریٹ ان کو دیکھ پائے تو ہنسی کے مارے دیوانی ہو جائے۔ یہ بے چاری لڑکیاں جو برطانوی امپریلسٹ اپر کلاس کے آخری چراغ ہیں۔

صبح مارگریٹ کہہ رہی تھی کہ میرا خیال تھا کہ ہانگ کانگ شاید دس سال تک برطانیہ کے پاس رہ جائے مگر آج ایک چینی نے اس سے کہا کہ فقط تین چار سال کی بات اور ہے۔

چند روز اور میری جان۔ چند ہی روز۔

ایسی بدشگونی کی باتیں مارگریٹ کرتی ہے۔

دوسرے روز ہم تینوں ہانگ کانگ سے روانہ ہو رہے تھے رات کو ہم پیکنگ سے پہلے اپنا سارا سامان پھیلا کر فرش پر بیٹھ گئے۔

مارگریٹ اور پالا روس اور چین سے ڈھیروں تحفے لے کر آئی تھیں۔ چین میں ان کو جو تحفے دیے گئے وہ حیرت انگیز تھے۔ ہزاروں سال پرانے زیورات سینکڑوں برس پرانی پینٹنگز، دوسرے انتہائی بیش قیمت نوادر۔ مس ہنگ بے حد تعجب اور مسرت سے ایک ایک چیز دیکھتی ہیں۔

تم ان سب چیزوں سے اچھا خاصا میوزیم کھول سکتی ہو۔ انھوں نے کہا۔

ہانگ کانگ پانی کے دوسرے کنارے پر رہ گیا کولون میں زندگی کا ہنگامہ اسی طرح جاری تھا۔ میں نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ سامنے پنیسولا ہوٹل تھا جہاں سے مجھے چند لمحوں میں ایئرپورٹ جانے کے لیے ایئرلائنز کی بس پکڑنا تھی۔

سڑک عبور کرتے ہوئے مجھے مارگریٹ اور پالا نظر آئیں۔

خدا حافظ ـــــ وہ ہاتھ ہلا کر چلا گئیں۔

تمھیں معلوم ہے ہم دوبارہ کہاں ملیں گے؟'' مارگریٹ نے قریب آتے ہوئے شگفتگی سے کہا۔

''تم ہی بتاؤ ـــــ''

''ریڈیو ہانگ کانگ میں ـــــ''

''خدا خیر کرے۔ تم تو واقعی بہت بری طرح برین واش کر دی گئی ہو تمھارا کیا حشر ہوگا۔'' میں نے متفکر ہو کر کہا۔ پھر ہم سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر خوب ہنسے اور دونوں لڑکیاں اپنا اپنا سامان اٹھائے اپنے راستے چلی گئیں۔ اب مارگریٹ گھر پہنچے گی۔ جب لوگ گھر واپس پہنچتے ہیں تو کیسا لگتا ہے۔

ہر سفر کے بعد گھر موجود ہونا چاہیے۔

اور گھر تباہ نہ ہونے چاہئیں۔

دنیا کے ایشیا کے شہروں کو بمباری سے بچاؤ۔

میں نے سوچا کہ اگر یہی جملہ میں کاغذ پر لکھ دوں تو کس قدر بے معنی، واہیات، مصنوعی، سلوگن اور پروپیگنڈہ اور نعرہ بازی معلوم ہوگا۔

جب میں بنکاک پہنچی تو اس سے کچھ ہی عرصہ قبل ریوری میرین قسم کا قلمی کو کیا جا چکا تھا۔ ایئرپورٹ پر مسافروں کی نہایت زبردست چیکنگ کی جارہی تھی۔ چاروں طرف مسلح سپاہی کھڑے تھے۔ باہر سڑکوں پر ٹینک گھوم رہے تھے اور نہایت سنجیدہ شکلوں والے افسر جو سب کے سب کوک اوپرا کے کردار معلوم ہو رہے تھے۔ ایک صاحب نے پاسپورٹ دیکھنے کے بعد میرے ٹائپ رائٹر کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ کیا ہے ـــــ''

''تارپیڈو ـــــ''

''ایں ـــــ کیا ـــــ''؟

"تارپیڈو——" میں نے سادگی سے دہرایا۔

"یہ——یہ——؟" انھوں نے انگلی سے دوبارہ اشارہ کیا۔

"جی! کیا اسے مارشل لاء میں اندر لے جانے کی اجازت نہیں——؟" میں نے اسی سنجیدگی سے پوچھا۔

"لیکن یہ ہے کیا——؟"

"تارپیڈو ٹائپ رائٹر——مغربی جرمنی کا بنا ہوا——نہایت مضبوط پائیدار——"

"آپ آگے تشریف لے جاسکتی ہیں۔"

شہر میں عجب چنڈوخانے کا مارشل لاء نافذ ہے۔ لوگ گویا تہوار مناتے پھر رہے ہیں۔

شام کے اخبار جنرل سری آنند کے متعلق سنسنی خیز اور ڈرامائی خبروں سے پُر ہیں جو پرسوں بھاگ کر جنیوا پہنچے۔ فیلڈ مارشل سرت تھانارت نے حکومت پر قبضہ کرلیا ہے۔ نئی حکومت میں سری وسارن واچاشال ہیں اور ایک اور صاحب جن کا نام آسانی سے سمجھ میں نہیں آتا۔ جہاں تک ان حضرات کے نام سنسکرت میں ہیں وہاں تک تو خیریت ہے مگر پھوم پھاں پھونگ قسم کے خطابات سن کر دم پھولا جاتا ہے۔

معزول شدہ وزیراعظم مارشل سنگرام کل رات ایک دیہاتی سے موٹر بوٹ مستعار لے کر کمبوڈیا کی طرف نکل گئے۔ بالکل ہالی ووڈ کے کسی جاسوسی فلم کا اسکرپٹ معلوم ہو رہا ہے۔

سیام——! سیام——!!

سیام جو کہ تھائی لینڈ ہے۔ جس طرح انڈیا جو کہ بھارت ہے۔

تھائی کے معنی آزاد کے ہیں۔ یوں بھی ملک فری ورلڈ کی آزادی کا بہت بڑا علمبردار ہے۔ اسی لیے فلپائن اور پاکستان اور تھائی لینڈ تینوں میں بڑی پکی دوستی ہے۔

بنک کاک سے کچھ فاصلے پر سیام کی قدیم راجدھانی ایوتھیا[3] ہے۔ سرحد کے اس پار کمبوڈیا میں انگ کورواٹ ہے۔

ہم انگ کور جارہے ہیں۔ ایک یورپین سیاح اپنے ساتھی سے کہہ رہا ہے۔

ہم انگ کورواٹ ہو آئے ——— آپ ابھی نہیں گئے؟

سارے یورپین اور امریکی سیاح انگ کورواٹ جانا چاہتے ہیں جو ایک زمانے میں روم کی مانند عظیم الشان تھی۔

اور چمپا ——— اور ملایا ——— اور جاوا ——— ہند قدیم کی نوآبادیاں جو پہلی سے پندرھویں صدی عیسوی تک پھلی پھولیں۔

کمبوڈیا مہاراجگان جے ورمن یشو ورمن اور سوریہ ورمن کا ملک کمبوج دیس کمبوڈیا کے جنوب کی بادشاہت تھی جسے پانچویں صدی عیسوی میں مشرق کے انام اور مغرب کے تھائی لوگوں کے حملوں نے کمزور کر دیا۔ اپنے عروج کے زمانے میں سارا سیام کوچین چائنا کمبوڈیا لاؤس برما ملایا کے چند حصے اس میں شامل تھے۔ انگ کور اس کی راجدھانی تھی جس کا وشنو کا مندر دنیا کے عجائبات میں شامل ہے۔

انگ کور کا مندر۔ قرطبہ کی مسجد، اوّل و آخر فنا!

انگ کورواٹ آج بھی ایک خواب کی طرح موجود ہے۔ خاموش، مہیب، سنسان، جنوبی ہند اور اُڑیسہ کی طرز کے مندر لوکیشور اور ہری ہر کے عظیم الشان بت شو کے لرزہ خیز مجسمے ایلورا اور کھجوراہو کی روایت کے دیوتا اور دیویاں اور دو یادھر اور گندھرو دیواروں کے ریلیف کے مجسمے چھٹی اور ساتویں صدی عیسوی میں یہاں کا فنِ سنگ تراشی جس بلندی پر پہنچ گیا تھا صرف دیکھ کر اس کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ گپتا عہد کے کتنے فن کار یہاں آئے ہوں گے۔

مردوں کا خاموش شہر۔

چمپا ——— مہاراج دھیراج سری جے اندرورمن کا ملک۔

سولھویں صدی میں قبلائی خان کے حملہ آوروں نے ان ساری جگہوں کا خاتمہ بالخیر کر دیا۔

اوّل و آخر فنا ———

آخر میں چمپا اور اندلس اور انگ کور سب مٹ جاتے ہیں۔ ہمیشہ یہی ہوتا ہے کہ جب تمدن اپنی بلندی پر پہنچتا ہے تو اُفق پر تخریب پسندوں کی فوج طلوع ہوتی ہے۔

آج ان خطوں میں مون کھمیر، تھو برمی نامی ملایائی اور تھائی نسلوں کی ایک عجیب وغریب کھچڑی آباد ہے۔ بڑا بڑا اینتھرو پولوجسٹ اور ماہر لسانیات یہاں آن کر چکرا جائے گا۔ میں ان کے عمرانی مطالعے کی کوشش سے فوراً دست بردار ہوگئی۔

ایک ہزار سال قبل سیام دوارروتی کے مون لوگوں اور کھمیر (کمبوڈیا یا کمبوج دیس) کی ہندو سلطنت کے زیر نگیں تھا۔ جزیزہ نما ملایا کی طرف کا حصہ سماٹرا کے سری وجے کے قبضے میں تھا۔ اسی زمانے میں تھائی قوم نے جنوبی چین سے جزیرہ نما انڈو چائنا کی طرف ہجرت کی۔ دو ہزار سال ادھر تھائی نسل شمالی مغربی چین کے اس صوبے میں رہا کرتی تھیں جو آج کل شین سی کہلاتا ہے۔ لفظ سیام اسی شین سے نکلا ہے۔ جنوبی چین میں جب تھائی بادشاہت پر قبلائی خاں نے باضابطہ قبضہ کرلیا اس وقت تھائی لوگ ہجرت کر کے انڈو چائنا آچکے تھے۔ یہاں انھوں نے چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم کیں اور آپس میں اور اپنے ہمسایوں سے لڑتے رہے۔ ان کی ایک شاخ برما میں شان قبیلے کے نام سے آباد ہوگئی۔ وسط سیام اب کھمیر سلطنت کی ہندو کلچر کے زیر اثر دیس کہلاتا تھا۔ 1257 عیسوی میں ایک تھائی شہزادے اندر جیت اور اس کے بیٹے رام نے کھمیر تسلط سے آزاد ہو کر اپنی حکومت قائم کی۔ ایوتھیا کا نیا شہر آباد کیا گیا جو 1792 عیسوی تک سیام کی راجدھانی رہا جس کے بعد بنگ کاک کی بنیاد پڑی۔

سیام تہذیبی اعتبار سے کمبوڈیا کی برہمن تہذیب کا حلقہ بگوش رہا۔

مجموعی طور پر چین اور ہندوستان کی تہذیبوں اور ہندو اور بدھ مت کے معجون مرکب کا دوسرا نام سیام یعنی تھائی لینڈ ہے۔ ان کا رقص بیلے اور ڈرامہ ہندستانی کلاسیکل رقص اور ڈانس ڈرامہ کا چربہ ہے۔ موسیقی پر چین اثر انداز ہوا۔ سیام کی سنگ تراشی دراصل گپتا عہد کی عظمت کی یادگار ہیں۔ کمبوڈیا کے زیر اثر سیام کے فنون لطیفہ نے بہت ترقی کی۔ تیرھویں صدی میں سیام نے کمبوڈیا ہی کے ذریعے جنوبی ہند کا ایک رسم الخط حاصل کیا۔ پالی سنسکرت اور کمبوڈین الفاظ سے ان کی زبان کی تشکیل ہوئی۔ رامائن تھائی ادب کی بنیاد ہے اور اس کا سیامی ورژن یہاں کا اعلیٰ ترین کلاسیک سمجھا جاتا ہے۔

مذہب کا یہاں ہر چیز میں بہت سخت عمل دخل ہے۔ دیہات میں لوگ اپنے اپنے دیوی دیوتاؤں اور درختوں اور پرکھوں کی عبادت کرتے ہیں۔ وسط سیام کا اعلیٰ طبقہ اب بھی مذہبی طور پر خالص ہندو ہے۔ بنگ کاک میں چار سو خانقاہ ہیں۔ لہٰذا تجارت سکھوں اور چینیوں کے ہاتھ میں ہے۔

یہاں عیسائی مشنریوں کو بہت زیادہ کامیابی نہیں ہوئی ہے۔ مسلمان تقریباً مفقود ہیں۔ پگوڈا بھی ہندوستانی مندروں کی سکھارا طرز سے نکلے ہیں جو یہاں کمبوڈیا سے آیا۔ رنگین ٹائیل شوخ رنگ آئینوں اور رنگ برنگی گھنٹیوں اور سونے کے پتروں اور پروں والا —— طرزِ تعمیر خالص سیامی خصوصیت ہے۔ ستوپ منڈپ کٹی ان کی مختلف طرزِ تعمیر ہیں۔ واٹ مندر کو کہتے ہیں۔ ستوپ ستوپ ہے۔ منڈپ منڈپ کٹی کے معنی کٹی ستوپ کے سر پر چھتر ہوتا ہے جس کا مطلب چھتر ہے۔

اس سے قبل کہ میں اور زیادہ گڑبڑا جاؤں میں اس موضوع کو تبدیل کرتی ہوں۔

بنگ کاک مشرق کا وینس کہلاتا ہے۔ بوجہ بہت سی نہروں کے جو شہر میں سے گزرتی ہیں مگر یہ نہریں زیادہ تر غلیظ ہیں اور ان پر چلنے والی کشتیاں شکستہ اور گندی اور افسوس کہ مجھے ان میں کوئی افسانویت نظر نہیں آئی۔ دریا پر سے سینکڑوں کشتیاں دھان اٹھائے گزرا کرتی ہیں۔ دریا اس ملک کی خاص تجارتی شاہراہ ہے اس کے دونوں طرف بے شمار نہریں ہیں جن پر سمپان، موٹر بوٹ، اسٹیم لانچیں بہتی نظر آتی ہیں۔ ہاؤس بوٹ میں لوگ رہتے ہیں۔ نہریں گویا بازار کی چھوٹی چھوٹی گلیاں ہیں جہاں کشتیوں پر ہاٹ لگتے ہیں۔ شہر میں ہر طرف نارنجی کپڑوں والے راہبوں کی ریل پیل سے جو اکثر ناؤ کھیتے بڑی کشتیوں کے پاس جاتے ہیں وہاں سے خیرات لے کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔

تھائی لینڈ کا سارا ماحول اس قدر مانوس سا ہے کہ مجھے بالکل یہ احساس نہیں ہوا کہ میں کسی اجنبی غیر ملک میں ہوں۔ یہ سب تو چاٹگام کی طرح ہے یا مشرقی پاکستان کے کسی بھی خطے کی مانند، ایئرپورٹ سے شہر تک کا راستہ تیج گاؤں سے ڈھاکے جانے والی سڑک کی یاد دلاتا ہے۔ چھوٹے

چھوٹے لکڑی کے جھونپڑے ٹوٹی پھوٹی چھکڑا، ایسی بسیں سائیکل رکشائیں، کائی آلود تالاب اور نالے جغرافیائی اور عمرانی لحاظ سے مشرقی پاکستان واقعی جنوب مشرقی ایشیا کا ایک حصہ ہے۔

مجھ سے ایک امریکن نے کہا "یہاں مکمل آزادی ہے۔ ملک اپنی ضرورت بھر اناج اور چاول اُگاتا ہے لوگ خوشحال ہیں لیکن حد سے زیادہ کاہل، مجھے ایک اور احمق امریکن مت سمجھو۔ میں جانتا ہوں کہ اصلیت کیا ہے۔ یہ لوگ طبعاً لاپروا اور خوش باش ہیں سیاست ان کے نزدیک محض ایک اور تفریحی مشغلہ ہے۔ ان کے یہاں حکومت تبدیل کرنے کا نارمل طریقہ ہی کو ہے۔ اور ملکوں میں الیکشن ہوتے ہیں آئینی طور پر رد و بدل کیے جاتے ہیں۔ یہاں کو دی تا کا فیشن ہے۔ بے شمار سیاسی جماعتیں ہیں سب اپنی اپنی ہانکتے ہیں مگر ایک عام آدمی کو سیاست کی مطلق فکر نہیں یہ صرف امرا کا کھیل ہے۔"

"میں نے سنا ہے کہ شمال میں بڑا سخت قحط پڑ رہا ہے بنگ کاک کی سڑکوں پر بے شمار قحط زدہ کسان مارے مارے پھر رہے ہیں۔" میں نے پوچھا۔

"یہ سب روسی پروپیگنڈہ ہے" اس نے جواب دیا۔ تھائی لینڈ خوشحال ملک ہے۔ لوگ اپنی کھال میں مگن ہیں اور بے حد شست الوجود پیشہ ور سیاست دانوں کو پلیس پولیٹکس لڑانے کی انھوں نے کھلی چھوٹ دے رکھی ہے۔ بادشاہ اور ملکہ پریوں کی داستانوں والے ماحول میں رہتے ہیں۔ واقعی یہ بہ قول تمھارے بزاز بردست کو کہ اور بیرا ہے مگر ان پریشان حال حقیقت پرست دنیا میں ایک الف لیلوی ملک بھی تو ہونا ضروری ہے تم پاکستانیوں اور ہندستانیوں میں یہ مرض ہے کہ ہر چیز کو حد سے زیادہ سنجیدگی سے لیتے ہو اور پھر تم کو اپنا مقابلہ ان لوگوں سے یوں بھی نہیں کرنا چاہیے یہ یونہی مصنوعی سے لوگ ہیں ان کے یہاں وہ عظمت اور گمبھیرتا نہیں جو پاکستان میں ہے۔ تم نے لیٹے ہوئے بدھا (برسبیل تذکرہ ہمارا اردو ہندی ہندستانی کا لفظ بڈھا اس لفظ بدھ سے نکلا ہے یعنی ایک بہت بدھمان بزرگ) کا پگوڈا دیکھا ــــــ؟

پگوڈا ــــــ مزید پگوڈا ــــــ شاہی محلات زمرد کے بدھا کا مشہور و معروف مندر جو دراصل ایک عظیم الشان تعزیے کی مانند ہے جس کے چاروں اور برآمدوں کی دیواروں پر رامائن کی

کہانی کے نہایت بھدے فریسکو ہیں۔ ہال میں فراکوں میں ملبوس عورتیں مورتی کے سامنے سجدے میں پڑی ہیں اور امریکن ٹورسٹ اِن کی تصویر کھینچ رہے ہیں۔

میں جلدی سے باہر نکل آئی۔ مشرق کے EXOTIC ہونے کی بھی ایک حد ہونی چاہیے۔

باہر سڑکوں پر اخبار والے جنرل سنگرما کے متعلق تازہ ترین خبروں کی سرخیاں لگائے پھر رہے تھے۔ سیٹو کے دفاتر کے آگے طویل کاریں کھڑی تھیں۔ ٹینک بدستور چاروں اور چکر لگا رہے تھے۔

تب مجھے محسوس ہوا کہ یہ جزیرہ نما مشرق میں ریاست ہائے بلقان کی کمی کس خوب صورتی سے پورا کر رہا ہے۔ چھوٹی چھوٹی مضحکہ خیز بادشاہتیں جہاں انقلاب آتے ہیں سازشیں اور خوں ریز جنگیں ہوتی ہیں۔ گوریلا جاں بازوں کے سروں پر انعام مقرر کیے جاتے ہیں۔ یہ بڑا عجیب و غریب علاقہ ہے۔ یہاں شمالی ویت نام بھی ہے اور تھائی لینڈ بھی۔ یہ ہو چی منہ اور پرنس وان دونوں کی سرزمین ہے۔ ان سارے ممالک کی طرح جو اپنی تاریخ کو محض ٹورسٹ انڈسٹری کے طور پر استعمال کر رہے ہیں۔ تھائی لینڈ بھی خاصا بوگس ہے۔

تاریخ تھکا دیتی ہے۔ حال بے کیف ہے۔ مستقبل نامعلوم۔

پگوڈاؤں میں ہر طرف گھنٹیاں بج رہی ہیں۔ دھان کے سرسبز کھیت کھلی ہوا میں لہرا رہے ہیں۔ غیر ملکیوں کے لیے ان فضاؤں میں بڑا گلیمر ہے۔ اصلیت میں ہر طرف بھوک اور تباہ حالی ہے۔ غیر ملکیوں کو تو سندھ اور سرحد کے پس ماندہ ترین گاؤں میں بھی بڑا گلیمر نظر آتا ہے اور اگر کوئی سمجھ دار غیر ملکی اس پس ماندگی کی طرف ذرا سا بھی اشارہ کرتا ہے تو فوراً موہن جوداڑوں کی قدیم پاکستانی تہذیب کے متعلق ایک رنگین پمفلٹ اس کی ناک میں ٹھونس دیا جاتا ہے۔ غیر ملکی سیاح یہ سوچ کر کہ پیسے وصول ہو گئے خوش خوش کراچی کے میٹرو پول واپس آ جاتا ہے۔

میں بھی سارے تاریخی مقامات کی سیر کے بعد خوش خوش بنگ کاک میں اپنی قیام گاہ پر لوٹی۔

بنگ کاک کی مشہور پبلشر خاتون اور زنانہ رسالے استری سرن کی ایڈیٹر مس نیلاون نے رائٹر لوگوں کی دعوت کی ہے۔ اسٹیون اسپنڈر، اینگس ولسن اور ڈیوڈ کارورز جاپان سے واپسی میں مختلف ممالک کا چکر لگاتے ہوئے آ رہے ہیں اور آج ہی انگ کورواٹ سے واپس لوٹے ہیں۔ کمبوڈیا میں خالص سیاحوں والے طرز کے بڑے بڑے ایڈونچرز ان کے ساتھ رہے۔ یہ لوگ جنگلوں میں راستہ بھول گئے۔ ہوٹل میں رات کو مچھروں نے انھیں بہت ستایا۔ ایک مرتبہ طیارہ فورسڈ لینڈنگ کرتے کرتے بچا۔ اکثر موٹر کا انجن خراب ہوا۔ وشنو کے مندر کے سناٹے میں انھوں نے وقت کی پرواز کی صدائیں سنیں اور چمپا کے پرانے بادشاہ جو پریشوروماد یو ایشورمورتی کے نام سے متعارف ہوئے۔

میرے خیال میں مشرق کا DOZE مسٹر اسپنڈر کے لیے اب ضرورت سے زیادہ ہو گیا تھا۔ موصوف معمول سے کہیں زیادہ اُکتائے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ طرہ یہ ہوا کہ بہن نیلاون کی دعوت میں تھائی ادبا اور صحافیوں کی ایک بارات کی بارات ان کا دماغ چاٹنے کے لیے موجود تھی اور سارے مشرقیوں کی طرح کیا ناقابلِ یقین مسخرے پن کے ان خواتین و حضرات کے نام تھے —— الوناج راج دھن، شہزادہ پریم، ڈاکٹر وڈیا، شیوسری آنند، مس اندرا کاسنگ، مس سدھی لکشن۔

رات بھر بارش ہوا کی۔ میری لکڑی کی کاٹج اندھیرے میں گھری کھڑی ہے۔ چاروں اور گھنے درخت ہیں۔ جھاڑیوں میں جھینگر بول رہے ہیں۔ میری امریکن میزبان خاتون باہر بارش میں بھیگتی کھڑی دروازہ کھٹکھٹا رہی ہیں۔ صبح ہوتے خنکی زیادہ ہو جائے گی یہ لو میں تمھارے لیے کمبل لائی ہوں۔

تنگ نظر امریکن اور بوگس سیامی، متعصب قوم پرست چینی اور ری ایکشنری جاپانی مغربیت زدہ فلپنو اور اکل کھرے انگریز، حریت کے دشمن فرانسیسی اور مسخرے جنوبی کورین۔ سب انسان ہیں عفریت اور شیاطین نہیں۔ ان سے ڈرنے یا بدظن ہونے کی آخر کیا وجہ ہے۔ ان سب کے دلوں میں محبت اور ہمدردی اور شرافت اور نیکی کے جذبات موجود ہیں جو ہم آپس کی نفرت اور

شکوک کی وجہ سے دیکھنا نہیں چاہتے۔ یہ دنیا مایوس کن نہیں ہے۔ اس دنیا میں امریکہ کے جان ڈوس پیسو اور مغربی جرمنی کے ڈاکٹر گلینسپ جیسے عظیم اور پیارے انسان بستے ہیں جنھیں جاننا کسی بھی انسان کی بہت بڑی خوش قسمتی ہے۔

میری امریکن میزبان کمبل دینے کے بعد بارش میں بھیگتی ٹارچ کی روشنی چمکاتی گھاس کا وسیع قطعہ عبور کر کے اپنے مکان کی طرف چلی گئیں۔ میں نے روشنی جلا کر ایک تھائی رسالہ اٹھا لیا۔ جس پر ہندو دیومالا کے روایتی عقاب گرڑ کی تصویر بنی تھی جو انڈونیشیا کی طرح تھائی لینڈ کا بھی قومی نشان ہے۔ قریب ہی پاکستان اور ہندوستان کے سفارت خانوں سے آئے ہوئے ہلال اور اشوک چکر والے پمفلٹ رکھے تھے۔ قومی نشانوں کی نفسیات کیا ہے۔ میں نے سوچنا چاہا۔ اکتا کر میں نے کاغذات میں سے دوسری کتاب اٹھائی ایک امریکن صحافی کی لکھی ہوئی ضخیم کتاب اٹھائی جس کے گرد پوش پر اردو ہندی اور دوسری ایشیائی زبانوں میں لکھا تھا ''ایشیا کا کوئی وجود نہیں۔''

اے لیجیے اس سمجھ دار آدمی نے سارا قصہ ہی پاک کر دیا۔ اب سارے کھلیے میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے کہ ٹوملیی فار ایسٹرن سوسائٹیوں کے متعلق کہتے ہیں اور پنڈت نہرو کا ایشیا کا تصور پاکستان والوں کی تھیوری سے کیوں جداگانہ ہے۔ اور انقلابی ایشیا اور غیر جانب دار ایشیا اور فری ایشیا اور اسلامی ایشیا میں کیا فرق ہے۔ ممکن ہے بھائی ڈوائٹ کک نے اس مسئلے پر بڑی دقیق ریسرچ کر کے اعداد و شمار جمع کیے ہوں اور ان کا تجزیہ صحیح ہو مگر ان کو یہ نہیں معلوم کہ یہ ایشیا جو اتنے ایشیاؤں میں بٹا ہے اس کے اختلافات کے پردے میں صرف ایک حقیقت چھپی ہوئی ہے۔

وہ حقیقت محض اتنی سی ہے کہ میری اس سفید لکڑی کی خوب صورت اور چار کھمبوں پر کھڑے ہوئے ایک جھونپڑے پر بارش برس رہی ہے اور جب صبح ہوگی اور بارش تھمے گی تو ایک دبلا پتلا مرنجان مرنج تھائی انسان اُٹھ کر پھر چاول اگانے میں جٹ جائے گا۔ وہ اور سارے بھائی بند ان تمام انواع و اقسام کے ایشیاؤں میں ہزاروں برس سے اسی طرح

کولہو میں جتے ہیں جو مہا تما بدھ کے چکر کی طرح چلے جا رہا ہے اور اس نقطے پر پہنچ کر مورخین کے عالمانہ نظریے اور صحافیوں کی رپورٹیں اور سیاست دانوں کی تقریریں کیا بے حد فالتو نہیں معلوم ہوتیں؟

('نقوش'، لاہور، دس سالہ انتخاب نمبر، جون 1958)

حواشی:

1. ماؤ کاٹو کی ایک نظم
2. یہ 1957 کی بات ہے۔ ممکن ہے اب ایسا نہ ہو
3. جو ہمارے ایودھیا کے نام پر بسایا گیا کیوں کہ سیام میں رام جی کی پرستش کی جاتی ہے

پدما ندی کنارے

غصیلے بادل جنگل کے تاریک افق پر جمع ہو رہے ہیں۔ میرے چاند باہر نہ جا جھیل کے ساحل پر ناریل کے درختوں کی قطاریں اندھیرے آسمان سے اپنا سر ٹکراتی ہیں۔ بھیگے ہوئے پروں والے کوّے املی کی شاخوں پر چپ چاپ بیٹھے ہیں۔ دریا کا مشرقی کنارا ہیبت ناک تاریکی میں ڈوب گیا۔ جنگلے سے بندھی ہوئی، ہماری گائے زور زور سے ڈکرا رہی ہے۔ مُنّے میرا انتظار کر تاکہ میں گائے کو اندر تھان پر لے آؤں۔ سیلاب زدہ کھیتوں میں گھس کر لوگ مچھلیاں پکڑنے میں جٹے ہیں جو پانی سے لبریز تالابوں سے اُچھل اُچھل کر باہر آ گئی ہیں۔ تنگ گلیوں میں بارش کا پانی اس طرح بہہ رہا ہے جیسے کوئی ہنستا ہوا لڑکا اپنی ماں کو تنگ کرنے کے لیے باہر بھاگ آیا ہو۔

سنو۔ گھاٹ پر کوئی مانجھی کو آواز دے رہا ہے۔ میرے بچے دن کا اجالا مدھم ہے۔ دریا کے دوسرے کنارے پر جانے والی کشتیاں گھاٹ پر بندھی ہوئی ہیں۔ دریا کا پانی پُرشور ہے اور بے صبر۔ عورتیں گنگا[1] پر اپنے گھڑے بھر تیز تیز قدم اٹھاتی گھروں کو لوٹ گئی ہیں۔

اب رات کے چراغ میں جل جانا چاہئیں۔

میرے بچے۔ باہر مت جا۔ ہاٹ کی سڑک سنسان ہے اور ندی کی اور جانے والی گلی میں

قدم پھسل پھسل جاتے ہیں۔ جال میں پھنسے ہوئے وحشی جانور کی مانند ہوا بانس کے جھنڈ میں چیخ رہی ہے۔ بارش بہت زور سے برسی۔ دریا نے جزیرے کو نگل لیا۔ اور میں ڈوبتے ہوئے ساحل پر اناج کا گٹھا سنبھالے تنہا، بارش تھمنے کا انتظار کرتا رہا۔ (ٹیگور)

(اب نوبت آ چکی ہے کہ جب لوگ باگ کہیں جانے لگتے ہیں تو ان سے درخواست کی جاتی ہے کہ بھائی۔ آپ آدٹر منگولیا، یا بلجیئن کانگو یا چلّی ضرور تشریف لے جائیے مگر للہ واپس آ کر اس کے متعلق رپورتاژ نہ لکھیے گا۔ اس مرتبہ جب ہم رائٹرز گلڈ کے وفد کی صورت میں ڈھاکہ روانہ ہوئے تو مجھے قوی شبہ ہوا تھا کہ نہ صرف یہ کہ مجھ سے رپورتاژ لکھنے کے لیے کہا جائے گا۔ بلکہ میں خود چھوٹتے ہی ایک عدد رپورتاژ رقم فرماؤں گی۔

میرا شبہ غلط نہ تھا۔

میں پہلی بار 1954 میں پی۔ای۔این کانفرنس کے لیے ڈھاکہ گئی تھی۔ اس کے فوراً بعد ہی جب میں نے پی آئی اے میں پبلک اینکر کا کام شروع کیا تو ایر ہوسٹس لڑکیوں کی بھرتی کی غرض سے مشرقی پاکستان کا دورہ کرنا پڑا۔ اور اب پچھلے چار پانچ برس سے وزارت اطلاعات کے ڈوکومنٹری فلموں کی تیاری کے سلسلے میں سال میں تقریباً دو مرتبہ مشرقی پاکستان جانا ہوتا ہے لیکن اس دفعہ ڈھاکہ کے سفر میں اور کئی ساتھی بھی شریک تھے اور اس سفر کی نوعیت بہت مختلف تھی۔

بچپن میں جزائر انڈمان سے کلکتے آتے ہوئے اور کلکتے سے جزائر انڈمان جاتے ہوئے میں ہُگلی کی لہروں کو دیکھ کر سوچا کرتی تھی جانے کتنے مزدور لگے ہوں گے جب یہ دریا اور سمندر کھود کر ان میں پانی بھرا گیا ہوگا۔ پی اینڈ او کے جہاز کی ریلنگ میں سے جھانک کر میں بڑے غور سے پہروں سمندر کی گدلی موجوں کو دیکھتی اور متحیر ہوتی رہتی تھی۔ سیر وِنگ پہنے اور سر پر رومال باندھے والے برمی جو پورٹ بلیئر میں ہمارے یہاں ملازم تھے، ہماری پرائیویٹ لانچ کے چگی ڈاڑھیوں والے بنگالی ملاح، ناریل کے درختوں پر بندر کی طرح چڑھ جانے والے سیاہ فام

بچے، سرخ کنارے والی سفید ساریاں باندھنے والی عورتیں۔ یہ سب مجھے پریوں کی کہانیوں کے کردار معلوم ہوتے۔ پگوڈا کی وضع کے چوبی بنگلوں والا سرسبز اور بارش میں بھیگا ہوا جنوبی مشرقی ایشیا قطعاً پریوں کا دیس ہے اور کندھے پر بال بکھرائے لڑکیاں گورا چاند روڈ کے ایک مکان کے برآمدے میں فرش پر سیتل پاٹی بچھا کر ایسراج بجاتی تھیں۔ نورالنہار بیگم۔ شمس النہار بیگم۔ جہاں آرا چودھری۔

ایک مرتبہ ڈھاکے میں اپنے چچازاد بھائی اور بہن سید و بیگم لقمان حیدر کے یہاں (جو اسٹیٹ بنک آف پاکستان کی دوسری منزل پر رہتے تھے) رات کے بارہ بجے کمرہ نشست میں بیٹھے ہوئے مجھے ایک عجیب سا خیال آیا تھا۔ یہ عظیم الشان عمارت اٹھارھویں صدی میں ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنے گورنر کے رہنے کے لیے بنوائی تھی۔ اس کے چاروں طرف مکانات، محلے، ڈھاکہ۔ جے دیو پور اور راجندر پور کے جنگل سارا مشرقی بنگال آدھی رات کے گہرے سکوت میں ڈوبا ہوا تھا۔ دور میگھنا کے جزیروں کے سامنے سے، جہاں ایک زمانے میں پرتگالی اور اراکانی بحری قزاق ایسی اندھیری راتوں میں چھپے بیٹھے رہتے تھے، اس وقت بھاری بھاری، روشن اسٹیمر گذر رہے تھے۔ نیچے باغ میں رادھا کلی اور کرشن چورہ اور اپاراجیتا اور گندھوراج کے پھول ساکت تھے۔ سامنے کالق ودق اور طویل و عریض برآمدہ تاریک پڑا تھا اور میں نے سوچا تھا دو سو سال قبل، انہی اونچی چھتوں والے کمروں میں، انہی چیل پائے والے برآمدوں میں جہاں ہم رہتے ہیں، یورپین تاجر، کولونیل قسمت آزما سرخ کوٹ پہنے تلواریں چمکاتے ان ہی چوبی سیڑھیوں پر کھٹ کھٹ چڑھتے اوپر آتے ہوں گے۔ شاہ بلوط کی ان بھاری میزوں کے چاروں طرف بیٹھ کر بنگال کے مزید استحصال کے پروگرام بناتے ہوں گے۔ وہی عمارت اب بھی موجود ہے۔ اس کی ایک ایک اینٹ اپنی جگہ قائم ہے۔ اور ڈچ تاجر تو جاوا اور سماٹرا سے بھی چلے گئے۔ پرتگالی اور فرانسیسی اور ہسپانوی اور انگریز سب کے سب ایشیا کے خطوں پر اپنا اپنا اثر ڈال کر اپنا برا اور بھلا رول ادا کر کے غائب ہو چکے ہیں۔ ان ملکوں کے رہن سہن، طرز تعمیر، لباس، خیالات، زبانوں غرضیکہ ہر چیز پر مغرب یورپ کی چھاپ پڑ چکی ہے۔ (ایسی گہری چھاپ جس کا اکثر ہمیں

احساس بھی نہیں ہوتا نئے ایشیا کی قومی تہذیبوں کو شدھ اور خالص بنانے کی سعی کرنے والوں کے سامنے یہ بڑا مسئلہ ہے کہ پچھلی صدیوں کے بدیشی عناصر کو کس طرح علاحدہ کیا جائے۔ لیکن اب یورپین دور بھی ماضی میں شامل ہو گیا۔ غیر اشتمالی دنیا امریکی عہد میں داخل ہو چکی ہے۔ یہ دیسی اور بدیشی عناصر کا معاملہ خاصی ٹیڑھی کھیر ہے)۔ بہرحال، میں بیٹھی یہی سب سوچا کی۔ ان لوگوں کی بنائی ہوئی عمارتیں قائم ہیں۔ ان کی زبانیں ہم بول رہے ہیں، ان کے سیاسی آزادی کے خیالات، فلسفے، سائنس کو ہم اپنا چکے ہیں۔ باہر اندھیرے میں ان کی قبریں موجود ہیں۔ سارے میں ان کی قبریں موجود ہیں۔ ان کے مشن، اسکول، کالج، دیبز ہاؤس، وہ ڈچ گورنر جو 1765 عیسوی میں اس کمرے میں اس جگہ پر بیٹھا ہوگا جہاں ہماری آپا کا صوفہ رکھا ہے، اس کی اولاد اس وقت کہاں ہوگی؟ تاریخ نے اسے کس طرح ٹرانسفارم کیا ہوگا؟ تاریخ نے بالکل میرا اپٹرا کر دیا۔

اس پر مجھے یاد آیا کہ تقسیم سے قبل چند نوجوان پروفیشنر کلکتے کی ایک پرانی کوٹھی کے چند کمروں میں مقیم تھے۔ (ان میں سے ایک صاحب نے قسمیں کھا کر یہ قصہ سنایا ہے)۔ یہ لوگ نچلی منزل میں تھے۔ اوپر کی منزل کے کمرے مقفل پڑے تھے۔ اس کوٹھی میں ایک زمانے میں کلکتہ سپریم کورٹ کا چیف جسٹس سر ایلیجاہ امپی رہا کرتا تھا۔

یہ نوجوان رات گئے گھر لوٹ کر کار گیراج میں بند کرتے اور سونے کے لیے چلے جاتے۔ صبح اٹھ کر پھر دفتر کا رخ کرتے۔

ایک روز صبح کو ان کے ڈرائیور نے بڑی خفگی سے کہا "سرکار میں یہ نوکری چھوڑنا چاہتا ہوں"۔

کیوں؟" انھوں نے پوچھا۔

ڈرائیور کہنے لگا۔ حضور۔ رات کو دو انگریز صاحب لوگ زینے پر سے کھٹ کھٹ کرتے اترتے ہیں۔ سرخ رنگ کا لمبا سا کوٹ پہنے۔ جھالردار آستین۔ تنگ سفید پتلون۔ بکل والے جوتے۔ سفید سفید بالوں کی چوٹی باندھے جس میں ربن لگا ہوتا ہے۔ عجیب حلیہ ہے ان صاحب لوگوں کا۔ نیچے آ کر مجھے جگاتے ہیں اور کہتے ہیں موٹر نکالو۔ ان کی تلواریں اور ان کے سفید لال

بھبو کا چہرے دیکھ کر میری گھگھی بندھ جاتی ہے۔ میں چپ چاپ موٹر باہر نکالتا ہوں۔ دونوں جنے اس میں بیٹھ جاتے ہیں اور کہتے ہیں سیر کو چلو۔ ساری رات کلکتے کی سڑکوں پر انھیں گھماتا ہوں۔ صبح ہونے سے پہلے پہلے سارے شہر کا چکر لگا کر واپس آتے ہیں۔ میں موٹر گیراج میں رکھتا ہوں۔ دونوں صاحب لوگ اسی طرح کھٹ کھٹ کرتے دوسری منزل پر چڑھ جاتے ہیں۔ دوسرے روز آدھی رات کو پھر یہی قصہ ہوتا ہے۔ ایک مہینے سے یہی ہو رہا ہے۔ حضور میں روزانہ رات بھر کی ڈیوٹی بجانے سے عاجز آ گیا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم یہ کون صاحب لوگ ہیں، مگر حضور مجھے چھٹی دے دیجیے۔"

(ان میں سے ایک صاحب سرالیجاہ امپی تھے۔ دوسرے غالباً وارن ہیسٹنگز رہے ہوں گے) ان نوجوانوں نے یہ ہیبت ناک قصہ سن کر دوسرے دن ہی وہ کوٹھی چھوڑ دی۔

چنانچہ میں جھلملیوں والے طویل اور اونچے دریچے کے نزدیک صوفے پر بیٹھی بڑے غور سے دیکھتی رہی کہ شاید ابھی پردہ سرکے گا اور لقمان بھائی کے دفتر میں سے ایسٹ انڈیا کمپنی کا کوئی افسر نکل کر آئے گا اور تلوار چمکا کر مجھ سے کہے گا۔ کون ہو تم لوگ۔ ہماری مقبوضات پر کس طرح تم نے دخل اندازی کی۔ اس وقت میں اسے تاریخ کے آہنگ کے متعلق کچھ سمجھانے سے قاصر رہوں گی اور پروفیسر ٹوئنبی بھی آ کر میری مدد نہ کر سکیں گے۔

ڈھاکہ سو رہا ہے۔ وقت جاگ رہا ہے۔ ماضی حال میں موجود ہے۔ اس بات کو کوئی نہیں پہچانتا۔ جس طرح مستقبل حال میں موجود ہے۔ اس بات کو بھی کوئی نہیں پہچانتا۔

چنانچہ بیسویں صدی میں پیدا ہونے والے چند لوگ جنوری کے آخری ہفتے میں مشرق وسطیٰ کی سرحدوں کی سمت سے جنوبی مشرقی ایشیا کی طرف روانہ ہوئے اور نئے ایشیا کی یہ دونوں جغرافیائی اور سیاسی حد بندیاں ایک ہی ملک میں شامل ہیں۔ یہ 1960 عیسوی ہے۔ اور دنیا میں عجیب عجیب باتیں ہو رہی ہیں۔ یہ چند لوگ لکھک ہیں یعنی یہ ایسے لوگ ہیں جو لکھے بغیر رہ ہی نہیں سکتے۔ ان میں سے کچھ نے اسی لکھنے کی خاطر بہت تکلیفیں اٹھائی ہیں۔ چند ایک نے اہم خطوط اور زاویوں کا تعین اور نئے راستوں کی نشاندہی کی ہے۔ ابھی ایک قافلہ لاہور سے آ رہا ہے۔

Mystic سندھ اور دور افتادہ سرحد سے لوگ آ رہے ہیں تا کہ ڈھاکہ میں اکٹھے ہوں۔
سید انشا مرزا غالب کلکتے جا کر اپنے مقدمے کے سلسلے میں ناکام اور دل شکستہ ہوئے۔ مگر بنگال پر عاشق ہو کر لوٹے۔ اگلے وقتوں کا فن کار بھی بڑی آن بان والا تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر بے دماغ ہوتا تھا۔ دلّی اور لکھنؤ کی چوکھٹ کو چھوڑنا نہ چاہتا تھا مگر کشاکش روزگار اسے کلکتے، عظیم آباد، رامپور، حیدرآباد اور جانے کہاں کہاں لیے پھرتی تھی۔ سید انشا مرشد آباد سے پہلی بار دلّی گئے تو سوچتے ہوں گے پایہ تخت جانے کیسا شہر ہوگا۔ کس طرح کے لوگوں سے واسطہ پڑے گا۔ کیا گذرے گی۔ ذرا اس وقت کا تصور کیجیے کہ میرؔ بہلی میں دلّی سے پورب کی سمت چلے جاتے ہیں۔ غریب الوطنی کے علاوہ سفر میں اپنی زبان خراب ہونے کا بھی شدید غم ہے۔
بہلیاں، پالکیاں، سرائیں، بھٹیاریاں، نخاسّل کی مجالس۔ آصف الدولہ اور سعادت علی خاں کے دربار لال قلعے کی محفلیں یہ سب اب ہمارے لیے ''ہسٹری آف اردو لٹریچر'' میں داخل ہو چکا ہے۔ لیکن یہ سب کل کی باتیں ہیں۔ اکبر الٰہ آبادی کا ''دہلی دربار'' اور چاندی والی بارہ دری کے مشاعرے بھی کل کی بات ہے۔ لیکن یہ سب بھی ''ہسٹری'' میں داخل ہو چکا ہے۔
تو یہ سب لوگ، شاعر، افسانہ نویس، ناول نگار، نقاد، جو ڈھاکے جا رہے ہیں کیا ان میں سے چند ایک ادبی تاریخ میں شامل نہیں ہوں گے؟ ہونا تو چاہئیں۔ پریم چند کا زمانہ ایک عہد میں تبدیل ہو چکا ہے۔ 1935 سے 1947 والا گروہ گو اب بھی موجود ہے اور لکھ رہا ہے مگر تاریخی اہمیت اختیار کر چکا ہے۔

یہ رائٹرز گلڈ والا دور تو ابھی شروع ہوا ہے۔
پہلے منشی سجاد حسین، تربھون ناتھ ہجر، رتن ناتھ سرشار اور اکبر الٰہ آبادی ہم عصر منظر پہ کمنٹری کرتے تھے اب زمانے نے یہ کام آج کے مزاحیہ شاعروں اور اردو روزناموں کے کالم نگاروں کے سپرد کر دیا۔ پس منظر اور اسٹیج اور آڈینس یکسر بدل چکا ہے اور ان لکھنے والوں کے

قد و قامت میں بہت فرق ہے۔ مگر یہ فرق زمانے کی تبدیلی کا غماز ہے۔ اردو کی روایت تو برابر قائم ہے۔

آزادوں کی جانشینی بوہمین حضرات نے کی۔ بانکوں کی جگہ Beatnik آئے۔ جاگیردار کا ''دربار دُربار''، ڈپٹی کمشنر کے ڈرائنگ روم میں ''ڈزالو'' ہوا۔ پہلے شاگردوں کی بھیڑ پیچھے پیچھے چلتی تھی اب Fan لوگ آٹوگراف البم لیے چاروں طرف گھوم رہے ہیں۔ شمع کی جگہ مائیکروفون اور ہجو کی جگہ اخبار کے کالم نے لی۔ پہلے تذکرہ غوثیہ 2 تصنیف ہوتا تھا اب رپورتاژ لکھے جاتے ہیں۔

جو کچھ آج کل ہمارے آس پاس، ہمارے ساتھ ہو رہا ہے۔ اس کا خوف، اس کی دہشت، امید، ناامیدی، تجسس، جستجو، آرزوئیں، پشیمانیاں، مایوسیاں، یہ سب ایک وقفہ گذرنے کے بعد متشکل ہوگا۔

مہارشی دیویندر ناتھ ٹیگور جو حافظ حافظ کہلاتے تھے خدا کی تلاش میں اور برہما سے لو لگانے ہمالیہ پہاڑ پر گئے تھے، راستے میں جو کچھ انھوں نے دیکھا اور اسے ریکارڈ کیا وہ اس لمحے ان کے لیے وقتی باتیں تھیں ہم آج اسے پڑھتے ہیں تو کیسا عجیب لگتا ہے۔[3]

لہٰذا عین ممکن ہے کہ جب رائٹرز گلڈ کی ڈائمنڈ جوبلی انشاجی کے چاند نگر میں منائی جارہی ہو تو قدیم نسخوں کی نمائش کے موقع پر آج کے رسالے میوزیم میں سے نکال کر لوگ اس طرح دیکھیں گے جیسے ہم بھوج پتر دیکھتے ہیں۔ اور کہیں گے اچھا! یہ اگلے وقتوں کے لوگ ہوائی جہاز ایسی دقیانوسی چیز پر اس قدر آہستہ رفتار سے سفر کرتے تھے! کمال ہے بھئی—!

رات گئے ہوائی جہاز ڈھاکے اترا۔ خنکی تھی۔ اور گہری تاریکی۔ خوشگوار، خنک، ڈھاکے کی رات۔ صبح چار بجے کے قریب تیج گاؤں سے پراونشل سرکٹ ہاؤس پہنچی۔ چوکیدار سے پوچھا ''لاہور سے بیگم صاحب لوگ آگئی ہیں؟'' ''جی ہاں رات کو آئی ہیں، برابر کے کمرے میں ٹھہری ہیں''۔ چوکیدار نے میرے کمرے کا دروازہ کھولا (میں پچھلے سال بھی اتفاق سے اسی کمرے میں ٹھہری تھی)۔

اب خنکی زیادہ ہو گئی تھی۔ تھوڑی دیر میں صبح ہو گئی۔ میں نے برابر کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

ناشتے کے بعد ہاجرہ، خدیجہ اور جمیلہ نے ڈھاکہ کی سیر کرنے کی ٹھانی۔ چنانچہ باہر آ کر ہم لوگ سائیکل رکشاؤں پر بیٹھے۔ سب سے پہلے ہم نے ڈھاکہ آرٹ اسکول کا رخ کیا۔

ڈھاکہ آرٹ اسکول چند سال قبل تک ایک بہت پرانی دو منزلہ کوٹھی میں تھا۔ اب ایک خوب صورت الٹرا ماڈرن عمارت میں منتقل ہو چکا ہے۔ زین العابدین حسب معمول اپنے کام میں کھوئے ہوئے بیٹھے مسکرا رہے تھے۔ صفی الدین مہمانوں کو کلاسوں میں گھماتے پھرے جہاں بنگالی لڑکے اور لڑکیاں تصویریں بنانے میں محو تھے۔ عمارت کے سرے پر تالاب تھا۔ ایک سرخ رنگ کی گائے گھاس چر رہی تھی (یہ جزئیات ممکن ہے غیر اہم ہوں لیکن مجھے بہت اہم معلوم ہوتی ہیں)۔ زین العابدین سے تقریباً ڈیڑھ سال کے بعد ملاقات ہوئی۔

میں اکثر سوچتی ہوں کہ زین العابدین جیسا عظیم فنکار اس قدر منکسر المزاج اور سیدھا سادہ آدمی کیسے ہے جبکہ کہا جاتا ہے کہ بڑا فن کار ہمیشہ بد دماغ اور خود پسند ہوتا ہے۔ لیکن مشرقی پاکستان کے سارے بڑے فن کار — زین العابدین، رحیم الدین، بیگم صوفیہ کمال، عباس الدین احمد مرحوم، لیلیٰ ارجمند بانو، سب میں میں نے ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر کسر نفسی، خوش خلقی اور ملائمت پائی۔

آرٹ اسکول سے لوٹے تو ام عمارہ اور بانو اختر شہود آ گئیں۔ یہ ذہین اور نفیس لڑکیاں بڑے جان دار افسانے لکھ رہی ہیں۔ ان دونوں سے میں پچھلی مرتبہ ڈھاکہ یونیورسٹی کی بزم ادب میں ملی تھی۔ چند سال ہوئے لقمان بھائی کا ڈھاکہ سے تبادلہ ہو گیا۔ جب تک آپا حسنہ (بیگم لقمان حیدر) یہاں رہیں ان کی وجہ سے اردو حلقے میں بڑی گہما گہمی رہتی تھی۔ اعلیٰ پیمانے کے تمثیلی مشاعرے، انجمن ترقی اردو کا کام، ادبی محفلیں، احسن احمد اشک، اقبال عظیم، سلیم اللہ فہمی، کلیم اللہ، سرور بارہ بنکوی اردو والوں کے اس حلقے کے سرگرم اراکین تھے۔ اسی زمانے میں انجمن ترقی اردو کی عمارت کے لیے چندہ جمع کیا گیا۔ (اس عمارت کی نچلی منزل اب بن کر تیار ہو چکی ہے) متین

الدین احمد ڈھاکہ گلڈ کی طرف سے میزبانی کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ احسن احمد اشک کو گلڈ کی طرف سے کانفرنس کا افسر رابطہ مقرر کیا گیا تھا اور وہ صبح سے شام تک تیوری پر بل ڈالے بغیر طرح طرح کے انتظامات میں مصروف رہتے تھے۔

سید وقار عظیم، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، جمیلہ ہاشمی، میرزا ادیب، جاوید اقبال، اشفاق احمد، اے حمید، اعجاز بٹالوی......، فارغ بخاری، احمد راہی، منیر نیازی، شہرت بخاری، ناصر کاظمی، محمد خالد اختر، تجمل حسین اور تسیم حجازی لاہور اور پنڈی اور پشاور سے آئے تھے۔ شیخ ایاز اور اختر اکبر آبادی حیدر آباد سندھ سے اور شاہد احمد و بیگم شاہد، غلام عباس، فخر ماتری، جمیل جالبی، عبدالعزیز خالد، طفیل احمد جمالی، ابن انشا، ابراہیم جلیس اور ''بابائے گلڈ'' جمیل الدین عالی کراچی سے ڈھاکہ پہنچ چکے تھے۔

ان میں سے کچھ لوگ گلڈ کی مجلس عاملہ کے اجلاس کے لیے آئے تھے اور باقی ''خیر سگالی کے مشن'' کے اراکین کی حیثیت سے مدعو کیے گئے تھے۔ انجمن ترقی اردو کی طرف سے شاہ باغ ہوٹل میں بڑا زبردست ڈنر دیا گیا۔ حبیب انصاری، سید اقبال عظیم، سرور بارہ بنکوی اور ڈھاکہ کے دوسرے اردو لیکھک، میزبانی کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ انجمن کے زیر اہتمام ایک مشاعرہ بھی گلستان سینما میں منعقد کیا گیا۔ جسٹس مرشد مشاعرے کی صدارت فرما رہے تھے۔ مشاعرہ بہت رنگا رنگ تھا۔ شیخ ایاز اور احمد راہی کی سندھی اور پنجابی نظمیں، جمیل الدین عالی کے دوہے، حفیظ جالندھری کی 'رقاصہ' احسن احمد اشک کی 'موصوف'۔

ڈھاکے کے گجراتی حضرات نے بھی شاہ باغ میں مہمانوں کو دعوت پر بلایا۔ جس میں ڈاکٹر جاوید اقبال نے اسلام، افلاطون اور ارسطو پر مشتمل ایک تقریر کی۔

31 جنوری کو انجینئرز انسٹیوٹ میں گلڈ کی پہلی سال گرہ منائی گئی۔ سید وقار عظیم نے صدارت فرمائی۔ مائیکروفون حسب معمول فیل ہو گیا۔ قدرت اللہ شہاب نے اپنے ایڈریس میں کہا:

''پچھلے سال آج کے دن رائٹرز گلڈ کا قیام عمل میں آیا۔ اس وقت مجھ سمیت بہت سوں کو

معلوم نہ تھا کہ یہ تحریک کیا صورت اختیار کرے گی۔"

اس انجمن کا دفتر کراچی کے ایکسلسیئر ہوٹل میں ہے۔ یہ کمرہ نمبر 20 ایک تاریک جگہ ہے جہاں ٹھنڈی چائے بہت مہنگی ملتی ہے اور جہاں کے بیرے ہمیں بڑی حقارت سے دیکھتے ہیں کیونکہ ہوٹل کے دوسرے مکینوں کی مانند ہم انھیں روزانہ انعام نہیں دے سکتے۔ ہوٹل کا مالک بھی ہمیں قاتلانہ نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ کیونکہ ہم نے اب تک اس کمرے کا کرایہ ادا نہیں کیا اور نہ مستقبل میں کرایہ ادا کرنے کا ہمارا ارادہ ہے کیونکہ بہر حال اس کا کرایہ ہماری مقدور سے قطعی باہر ہے۔

اس کمرے کے باہر بھی بہت سوں نے اس ہوٹل کی ٹھنڈی چائے کی طرح سرد مہری کا برتاؤ کیا ہے۔ ہوٹل کے بیروں کے مانند بہت سے لوگ ہمیں حقارت سے دیکھتے ہیں اور بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جو اس ہوٹل کے مالک کی طرح یہی چاہیں گے کہ ہمارا جلد سے جلد قلع قمع ہو جائے۔

لیکن آج درہ خیبر سے کاکس بازار تک کہیں چلے جائیے کسی نہ کسی کمرے، جھونپڑی یا گاؤں میں ہرا پنج لگائے ہوئے کوئی نہ کوئی ضرور مل جائے گا۔ اتنی عظیم الشان تنظیم صرف سال بھر کا کارنامہ ہے۔ لیکن ہمیں یہ بھی نہ بھولنا چاہیے کہ گلڈ محض ایک ٹریڈ یونین ہے، ذہنی دیانت داری اور اس کے اظہار اور استعمال کی جرأت اور آزادی گلڈ کی واحد آئیڈیالوجی ہے۔ چنانچہ جب گلڈ کا کوئی رکن ذہنی سطح پر کوئی بات کرتا ہے تو یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ وہ گلڈ کی ترجمانی کر رہا ہے۔ گلڈ میں اس کا کوئی بھی عہدہ ہو ادب میں اس کی شخصی حیثیت برقرار رہے گی۔ ہمیں اس سلسلے میں کوئی غلط فہمی نہ ہونا چاہیے۔

میری دوسری تنبیہہ ہمارے سرکاری افسروں کے اس طبقے کے لیے ہے جو یہ سمجھنے پر تلے بیٹھے ہیں کہ گلڈ سیاسی لحاظ سے دائیں بازو یا بائیں بازو کا آلۂ کار بن جائے گا۔ ہم سیاسی جماعت نہیں۔ لیکن سیدھے راستے کا بائیں بازو والا بننا یا بائیں راستے کا داہنے بازو والا ہونا کیا کوئی گناہ ہے 4؟ تخلیقی صلاحیت ہمیشہ بے چین رہتی ہے۔ اور ہر نظام جاریہ کی کسی نہ کسی بات سے اس

صلاحیت کا غیر مطمئن رہنا لازمی چیز ہے۔ بائیں بازو کے رجحان یا دائیں بازو کے رجحان کو دبانے کی ہر کوشش کا صرف ایک نتیجہ ہوگا کہ یہ رجحانات بائیں بازو اور دائیں بازو کی سیاست میں تبدیل ہو جائیں گے۔ ایک رجحان تلخ اور دوسرا شیریں معلوم ہوتا ہو مگر دونوں انسانی زندگی کے توازن کے لیے زہر قاتل کا حکم رکھتے ہیں۔"

دوپہر کو کتابوں کی نمائش تھی۔ جس کا مشرقی پاکستان کے عظیم دانشور ڈاکٹر شہید اللہ نے افتتاح کیا۔ ڈاکٹر صاحب برصغیر کے چوٹی کے ماہرین لسانیات میں سے ہیں۔ سنسکرت کے جید عالم اور سنسکرت اور عربی اور فرانسیسی کے علاوہ ایشیا اور یورپ کی ان گنت زبانوں کے استاد ہیں۔ انھوں نے نصف صدی قبل ناول بھی لکھے تھے اور مشرقی پاکستان کے دوسرے بڑے دانشوروں اور پروفیسروں کی مانند ڈاکٹر صاحب بھی انتہائی سادہ اور منکسر المزاج انسان ہیں۔

نمائش میں نوابین ڈھاکہ کے خاندان کے قلمی نسخے اور بیاضیں رکھی تھیں۔ (پٹنہ اسکول کے رنگ میں کہی ہوئی غزلیں کجریاں، شادی بیاہ کے گیت اور ہولیاں — اس قسم کی چیزیں جو آپ کو یوپی کے پرانے خاندانوں میں پرانی پرانی کاپیوں پر مدھم سیاہی سے لکھی ہوئی اب بھی مل جائیں گی اور جس سے اس کلچر اور طرز معاشرت کو سمجھنے میں بڑی مدد مل سکتی ہے جو ڈھاکہ اور کلکتہ سے لے کر دہلی تک پھیلی ہوئی تھی اور جسے ریکارڈ کرنا سوشل ہسٹری لکھنے والوں کا کام ہے لیکن سوشل ہسٹری لکھنے والا یا اس کی طرف توجہ دینے والا ہمارے یہاں کوئی نہیں) بنگال سے شائع ہونے والے اُردو رسالے رسالہ جادو جو غالباً 1920 عیسوی میں میمن سنگھ سے نکلتا تھا۔ اور جس کے پرچوں میں نہایت نادر اور قابل قدر مضامین اور مقالے نظر سے گذرے (اس پرچے کو دیکھ کر خیال آیا کہ اردو کے پرانے رسالوں دلگداز، مخزن، زمانہ، تمدن، اردوئے معلی اور محشر خیال وغیرہ میں کیا کچھ شائع ہوتا تھا۔ ان تاریخی اور ادبی دستاویزوں کی مکمل لائبریری بنانا اور ان کا انتخاب شائع کرنا کتنا ضروری ہے۔ مگر اس کی طرف بھی اب تک کسی نے توجہ نہیں کی) علامہ وحشت کلکتوی اور ناطق لکھنوی کے دیوان — اور جانے کیا کیا۔ ڈھاکے میں ان چیزوں کو محفوظ رکھنے کا سہرا سید اقبال عظیم کے سر ہے۔

دوپہر کو بے نظیر احمد کے یہاں کھانا تھا۔ بے نظیر احمد شعر کہنے کے علاوہ تقسیم سے قبل صوبے کے مشہور انقلابی ورکر تھے۔ اور ایک مرتبہ انگریزوں نے ان کو گرفتار کرلیا تھا۔ تو یہ ہتھکڑیوں سمیت پدما ندی میں کود کر فرار ہو گئے تھے۔

بے نظیر احمد کے لنچ کے علاوہ اور بھی کئی جگہ بنگالی میزبانوں نے دعوتیں کیں۔ ان محفلوں میں ڈرامہ نگار منیر چودھری بھی تھے جو دو سال ڈھاکہ جیل اور دو سال امریکہ کی ہارورڈ یونیورسٹی میں رہ چکے ہیں۔ پرانے اور نئے، بوڑھے اور جوان، اسلام پسند اور ترقی پسند، انقلابی اور رومانی، ٹیگور اور نذرالاسلام کی روایت والے اور مہاکوی کیقباد کی روایت والے، سبھی طرح کے بنگالی ادیب اس کانفرنس کے موقع پر ڈھاکے میں موجود تھے۔

جب سے گلڈ بنا ہے مغربی پاکستان کے اردو والے کم از کم ان لوگوں کی صورتوں ہی سے آشنا ہو گئے ہیں۔ باتیں ایک دوسرے سے انگریزی میں کی جاتی ہیں اور لٹریچر کے متعلق نہیں۔

ہم امریکی اور فرانسیسی ادب بڑے چاؤ سے پڑھتے ہیں۔ بنگالی ادب سے واقف نہیں۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ انسان کی عمر اتنی کم ہے اور دنیا کی زبانیں اتنی بہت سی ہیں اور دنیا کا ادب اتنا وسیع! ہم اطالوی یا ہسپانوی یا تامل یا پوش نہ جاننے کی وجہ سے کیسے کیسے خزانوں سے زندگی بھر محروم رہتے ہیں! مگر کیا کیا جائے۔ انسان ہفت زبان تو بن نہیں سکتا۔ ایک زبان ہی ڈھنگ سے آجائے تو غنیمت ہے۔

اور سوچئے کہ بنگال ادب کے لحاظ سے کیا بحر زخار ہے۔ بدھ مت کے معرفتی نغمے۔ سنسکرت ادب۔ مسلمان سلاطین کا اوّلین عہد سلطان رکن الدین، یار بک شاہ کے دربار کا شاعر مالا دھر باسُو۔ ودیاپتی، شاہ محمد صغیر، سنت چنڈی داس، چیتن، مغل دور، سترھویں صدی کے دربار اراکان کے بنگالی شاعر مگن ٹھاکر۔ دولت قاضی اُلاول 5۔ اٹھارھویں صدی کے بھارت چندر، پوتھی ادب، انیسویں صدی کا فورٹ ولیم کالج اور بنگالی نثر کا پہلا دور، ایشور گپتا، ایشور چندر ودیاساگر، بنکم چندر چٹرجی، مائیکل مدھوسودن، ہیم چندر، دین بندھومترا، بہاری لال، ان کے بعد ٹیگور، سرت چندر، نذرالاسلام، جسیم الدین۔ بنگال کے عظیم افسانہ نگاروں اور ناول نویسوں کی

تخلیقات سے ہم عرصے سے واقف ہیں۔ شیلجا نند مکرجی، شاماتا دیوی، سیتا دیوی۔ ''بن پھول''۔ پربودھ سانیال، بدھ دیو بوس، تارا شنکر بنرجی۔

بندے علی میاں، صوفی طاہر حسین، عبدالقادر کے ناموں سے ہم حال ہی میں آشنا ہوئے ہیں۔ شہادت حسین، کوی غلام مصطفےٰ، فرخ احمد، ابوالحسین، احسن حبیب، سید علی احسن اور صوفیہ کمال نے ''اسلامی اثرات'' اور ''ٹیگور کے طرز'' کا امتزاج پیدا کیا ہے۔ ہم عصر لکھنے والوں میں ہمیں علاء الدین الآزاد، ابوالکلام شمس الدین، شوکت عثمان، منیر چودھری، سکندر ابوظفر اور سید ولی اللہ کے ڈراموں، افسانوں اور ناولوں سے ترجموں کے ذریعے واقف ہونا چاہیے۔

مشرقی پاکستان کے جدید تر ادباء شاہد علی، ابورشد، سردار زین الدین، جہاں آرا آرزو، زیبو احمد کے متعلق ہم کچھ نہیں جانتے۔ کیا یہ ضروری نہیں کہ ان نئے فن کاروں کو جو مشرقی بنگال کی ٹھیٹھ علاقائی زبانوں میں وہاں کی کہانی سنا رہے ہیں، اردو میں متعارف کیا جائے؟ ان لوگوں نے اپنا علاحدہ اور نیا اسٹائل تخلیق کیا ہے اور ان کے پاس بہت کچھ کہنے کو ہے۔

جدید شاعروں میں شوکت عثمان، علاء الدین الآزاد، ثناء الحق، سید علی اشرف۔ مفخر السلام، اشرف صدیقی، حسن حفیظ الرحمٰن، برہان الدین خاں، نورالنہار بیگم، لطیفہ رشید، روشن یزدانی، من موہن برمن، محمد مامون، شمس الرحمٰن، جدید شعرا کی صف اوّل میں شمار کیے جاتے ہیں۔ شمس الرحمٰن اس نوجوان گروہ کا بہترین نمائندہ ہے۔ ان کی نظموں میں کیا ہے؟ مشرقی پاکستان کی نئی شاعری کا اسٹائل اور موضوع، ڈکشن اور امیجری کیسی ہے؟ افسوس کہ ہم اوریجنل میں پڑھے بغیر اس کا کوئی اندازہ نہیں لگا سکتے۔ مجھے بنگالی نہیں آتی۔ مگر میں نے بیگم محمد حسین کی کتاب میں سے چند نظموں کا انتخاب کیا ہے۔ (گو بنگالی سے انگریزی اور انگریزی سے اردو نثر میں ترجمہ ان شاعروں پر بڑا ظلم ہے جس کے لیے مجھے امید ہے کہ وہ مجھے معاف کریں گے۔ کیونکہ میرے پاس اس کے علاوہ اور کوئی طریقہ ان کو اردو میں متعارف کرنے کا نہیں)۔

اگر آج غم و غصے سے آگ بگولا سیاہ زمین پر دھان کے

بجائے کھیتوں میں نیزے اُگنے لگیں تو تمھیں حیرت نہ ہوگی؟
کمان کی طرح جھکا ہوا شخص تیر کی طرح سیدھا کھڑا ہو جائے
اگر ان دھان کے کھیتوں کے تیر نشانے پر جا لگیں
تمھیں یقین نہ آئے گا؟
تمھارا دل نہ لرزے گا؟
اگر خون کا بدلہ خون سے چکایا گیا
تمھیں تعجب نہ ہوگا؟
اگر تاکستانوں کی شراب نے مے خانے پُر کرنے کے بجائے
زمین کے زہر سے تلخ ہو کر
خونخوار عفریتوں کی مانند جڑوں تک کو نگل ڈالا۔
تم کو یقین نہ آئے گا؟
ناشپاتی اور سیب کے پھل پتھروں میں تبدیل ہو گئے۔ اور نیلی
چڑیوں کے جھنڈ نئی ابابیلیں چونچ میں زہر آلود کنکر لے کر سارے
آسمان پر چھا گئیں
تو تم کو ڈر نہ لگے گا؟
تمھیں یقین نہ آئے گا؟

("اچانک اگر—" فخر الاسلام)

علاء الدین الآزاد کی نظم "عجائب خانے کی سیڑھیاں" میں لوئی مک نیس کے طرز کی جھلک ہے۔

اتوار کے طے شدہ چھٹی کے گھنٹوں میں بہت سے شہری پھاٹک
پر جمع ہیں۔ ان کے درمیاں میں اور تم—

تمھاری آنکھوں میں انسائیکلوپیڈیائی استعجاب ہے اور تم
بڑے ڈرامائی سوالات کر رہی ہو۔
بنگالی جنٹلمین سفید چادر میں لپٹے اپنے خاندان سمیت موجود ہیں
ان کی بیٹی چوکلیٹ کتر رہی ہے۔ اور اجنتا کی تصویروں ایسی
متانت اس کے چہرے پر طاری ہے۔
ایک جوڑا اودھ سے آیا ہے۔
ایک الٹرا ماڈرن لڑکی اپنے دوست کی منتظر ہے۔
جوٹ کا تھیلا کندھوں سے لٹکائے۔
آرٹ اسکول کا خشک بالوں والا فرسٹ ایر اسٹوڈنٹ ایزل
سنبھالے کھڑا ہے۔ اور بھی بہت سے لوگ آرہے ہیں۔
شام کی کرنیں کالی سے پھیلی ہیں۔
ہم اندر جانا چاہتے ہیں۔
چوڑیاں بے صبری سے کھنکتی ہیں۔ بوٹ چرمراتے ہیں۔
چار بج گئے۔ پھاٹک کھلا۔ ہم اوپر چڑھے۔
شیر کے سر والا شکستہ ستون۔
اگنی دیوتا کا نیلا مجسمہ۔ زنگ آلود مہاتما بدھ۔ پہلی نظر میں مَیں
نے غیر قدرتی مخلوق کے ڈھانچوں میں پرانی دنیا کی قدرتی دہشت
کو بھی دیکھا۔
چڑیاں، جانور سمندری مچھلیاں جنھوں نے بے پروا نا عاقبت اندیش
تخلیق کی ان گنت غلطیوں کی تشکیل کی۔ اور حیرت انگیز طریقے سے
ان کے ساتھ ساتھ
فن تعمیر اور سنگ تراشی میں کتروں بے بضاعت انسان کی آس بھی

زندہ رہتی ہے۔
میں سائنس کا پروفیسر ہوں۔ میں مایوسی سے واقف نہیں۔
ہم سب اسی لابدی زینے پر چڑھ کر آگے جا رہے ہیں۔
ہمیں معلوم ہے کہ ہم وقت کے عجائب خانے کے ڈھانچے ہیں،
مگر کوئی خوف، کوئی الم ہمارے خواب نہیں دھندلا سکتا۔

اشرف صدیقی کی ''شاہجہاں بادشاہ'' ——
پھر گندی گلیوں میں بھیڑ لگ گئی۔
نائب علی، صاحب علی، شمشیر۔
بہارالدین کوچوان، طالب علی رکشا والا، مرگلا فیکٹری ورکر رحمٰن
بچے، بوڑھے۔
بدصورت ٹائیلوں والے کمرے میں جمع ہوئے۔
کھیل شروع ہو گیا۔ شاہجہاں بادشاہ کا ناٹک۔
کمرے میں بدبو بسی تھی، پان کی پیک، دھواں، شور۔
یکا یک پھٹا پرانا پردہ اٹھا۔
ارے واہ۔ شاہجہاں بادشاہ تو سامنے تخت پر چڑھا بیٹھا تھا
تخت کا ایک ہتھا غائب تھا۔ شاہی پوشاک میلی تھی۔ جہاں پناہ گرج
گرج کر بڑی دقت کے ساتھ اور بڑی محنت سے اپنا مکالمہ ادا کرنے لگے
جے سین اور شائستہ خاں صبر سے اپنے کیو کے منتظر تھے۔
''توپوں'' کا دھماکہ۔ گانے اور ناچ۔
پری چہرہ کنیزوں کے جلو میں۔
حور تمثال ممتاز سامنے آئی۔

واہ—واہ—واہ کالومیاں نے بیڑی کا کش لے کر داد دی
بیڑی پیتے ہوئے صاحب علی شاہجہاں میں تبدیل ہو کر دلّی کے خواب
دیکھ رہا ہے۔
کھیل ختم۔
شاہجہاں نے اپنا کرائے کا لباس اتارا۔
اور اپنی لنگی پہن کر اپنی کھولی میں سونے کے لیے چلا گیا۔
اس نے ایک انوکھا خواب دیکھا۔
کہ وہ دلّی کے تخت پر براج رہا ہے۔ ملکہ، کنیزیں، درباری، سپاہی
جام و مینا۔
صبح کو ''ہاف کپ'' کا ناشتہ کر کے لالومیاں ٹیکسی لے کر نکلتا ہے۔
(لالومیاں کو چوان جورت شاہجہاں تھا، اس کے سلطنت رمنا سے
بندر گھاٹ تک پھیلی ہوئی ہے)
کنجوس مسافر کرائے پر جھگڑ رہا ہے۔
ڈھاکہ شہر مچھروں اور مکھیوں کا مسکن ہے۔
وزیر اور بیرسٹر لوگ کاروں میں گھوم رہے ہیں۔
بستی میں بھوکی لڑکی دن بھر رویا کی۔
صاحب زادی کالج جا رہی ہیں۔
اخبار فروش چلاتے ہیں— آزاد— اتحاد—
نئی خبر چاہیے—؟ کشمیر؟ حیدرآباد؟
چاول کا بھاؤ اسّی روپے ہو گیا—
قحط، تباہی
آج ہم آزاد ہیں، کیسے کیسے خواب!

آنکھیں کھلیں تو سب دھوکا نکلا۔
بے بسی سے ہم تاش کے پتوں کا محل گرتا دیکھ رہے ہیں۔
وژن غائب ہو چکا ہے۔
اپنے لکڑی کے "تخت" پر بیٹھا شہنشاہ لالو میاں پسینے میں ڈوبا
اپنی مچھی ہانکتا ہوا جا رہا ہے۔

پوتھی بنگال کا عوامی ادب ہے۔ جسے صوفی اور ویشنو مذہب کے امتزاج نے گاؤں میں تخلیق کیا۔ پچھلے کئی برسوں میں ہزاروں گمنام شاعروں نے اس کی نشوونما میں حصہ لیا ہے۔ پندرھویں صدی کا سید سلطان (گیان پردیپ کا مصنف) سید مرتضیٰ، سید فیض اللہ، سید حمزہ، کوی منگل چاند ("شاہ جلال مدھو مالا" کا مصنف) کوی کمن ٹھاکر ("گیان ساگر کا مصنف) بینا متی گان، گوپی چندر گان، موشو منگل، بارہ ماسے ـــ یہ سب پوتھی لٹریچر میں شامل ہیں، ساڑھے چار ہزار پوتھیاں اب تک موجود ہیں۔ ہزاروں پوتھیاں زمانے نے تلف کر دیں۔

ہیومنزم اس عوامی ادب کی خصوصیت تھی۔ چودھویں صدی کا ایک ویشنو گیت ہے ۔
سُن ہے مانس بھائی ـــــ سبار او پارے مانس ستیہ تار پور چھوتائی[6]

ان لوک گیتوں، لوک کہانیوں، جاتراؤں، جاری گانوں کی روایت دیہات میں دھوم دھام سے زندہ ہے۔ جسیم الدین اسی فوک کلچر، شاپد[7] کی کلیوں، پٹ سن کے پہلے پھولوں اور بھٹیالی[8] گانے والوں کا ترجمان ہے۔ "دھنک کی ناؤ کا مسافر"، "مدھو مالا"، "ایک پیسے کی بانسری" اور "لکشمی کا تھار ماٹھ" کا یہ مصنف ڈی سی سین کے خیال میں نئے بنگالی ادب کا بہترین PASTORAL شاعر ہے۔

رات کو جسیم الدین کے یہاں کھانا اور اس کے بعد رقص و موسیقی کی محفل تھی۔ میں نے

جسیم الدین کے گیت عباس الدین احمد مرحوم سے سنے ہیں۔ اس عظیم سنگیت کار کی بیٹی بھی اس محفل میں موجود تھی۔ عباس الدین احمد مر گئے لیکن بھٹیالی کو بنگال اور بنگال سے باہر متعارف کر کے امر بنا گئے۔

بنگال نے کلاسیکل موسیقی سے زیادہ عوامی موسیقی کو اپنایا ہے۔ ان کے یہاں کلاسیکل موسیقی کی کوئی لمبی چوڑی روایت موجود نہیں۔ لیکن زیادہ تر رابندر سنگیت اور نذرل سنگیت مشرقی بنگال کی عوامی دھنوں پر مشتمل ہے۔ نیو تھیٹرز سے لے کر طلعت محمود تک فلموں میں سبھی نے ان دھنوں کی خوشہ چینی کی ہے۔

بنگال میں مغنی شاعر کی روایت بہت پرانی ہے۔ شاعر اپنے اشعار خود ہی کمپوز کر کے خود ہی گاتا ہے۔ صدیوں سے ایسا ہوتا چلا آیا ہے۔ رابندر سنگیت اور نذرل گیت اسی روایت کے جزو ہیں۔ قاضی نذرالاسلام بہت بلند پایہ موسیقار ہیں اور اپنی علالت سے قبل کلکتہ ریڈیو سے اپنے گانے براڈکاسٹ کیا کرتے تھے۔ کوی غلام مصطفیٰ بھی خود ہی گاتے ہیں۔

کوی جسیم الدین کے گھر پر بہت سے بنگالی گیت اور کورس گائے گئے۔ کئی رقص ہوئے۔ ایک عوامی فن کار نے اپنا لوک ناچ دکھایا۔ جسیم الدین کی بیٹیوں نے بھی اپنے فن رقص کا مظاہرہ کیا۔ مغربی پاکستان کے بیشتر مہمانوں کے لیے بنگالی معاشرت کا یہ دلآویز پہلو ایک بالکل نیا اور انوکھا تجربہ تھا۔

اب رات گہری ہوگئی ہے۔ رات وقت کا پھیلا ہوا لرزہ خیز، تاریک احساس ہے۔

بنگال کے قحط کے زمانے میں لکھنؤ یونیورسٹی کے لڑکے اور لڑکیاں روز ریلیف فنڈ کے سلسلے میں ناچ گانے کے نت نئے پروگرام کرتی تھیں۔ اس پر سلام مچھلی شہری نے ایک نظم لکھی تھی ع

"آپ بنگال سے کل آئی ہیں"

حسب معمول اس نظم کی طرح طرح سے پیروڈی کی گئی تھی۔ مجھے وہ نظم بالکل یاد نہیں۔

صرف وہی ایک مصرعہ ذہن میں رہ گیا ہے ع "آپ بنگال سے کل آئی ہیں"

لازم نہیں کہ ہر شخص کو ماضی سے دلچسپی ہو۔ (آرکیالوجی مغربی علم ہے۔ یہ ہمیں اپنی طرف متوجہ نہیں کرتی کیونکہ ہم اہل مشرق AHISTORIC ہیں۔ بہت سے سیاح روم جا کر سب سے پہلے نائٹ کلبوں کا رُخ کرتے ہیں۔ اور سینٹ پیٹر صرف اس لیے جاتے ہیں کہ اس کے سامنے کھڑے ہو کر اپنی تصویر کھنچوائیں۔

لیکن بنگال کی کوئی کم تصویریں کھنچی ہیں۔ بھٹیالی کی ہرتان، ٹیگور اور نذر الاسلام اور جسیم الدین کا ہر شعر بنگال کی تصویر ہے۔ صرف چشم بینا کی ضرورت ہے۔

یہ مہا بھارت کا پراگ جیوتش ہے۔ کامروپ۔ دنگا۔

—اونہہ۔ بکواس۔

یہ قرون اولیٰ کا بنگ اور سام تٹا ہے۔

—اچھا ہے۔ تو پھر کیا کیا جائے—؟

یہ قرون وسطیٰ کے مسلم سلاطین کا بنگال ہے۔

1202 عیسوی سے لے کر 1339 عیسوی تک یہاں دہلی کے ستائیس گورنروں نے حکومت کی۔ شہنشاہ التمش کا بیٹا، ناصر الدین محمود، سیف الدین ایبک، عز الدین طغرل، اختیار الدین ازبک، عز الدین بلبن، محمد ارسلان تاتارخاں۔ اونہہ۔ خالی خولی نام۔ یہ نام تو نقوش ہیں جو ندی کے بہتے پانی پر لکھے گئے۔

یہ مسلمان بادشاہوں کا بنگال ہے۔

1339 عیسوی سے 1573 عیسوی تک بتیس مسلمان سلاطین بنگال کے خود مختار فرماں روا رہے۔

فخر الدین مبارک، شمس الدین الیاس، سیف الدین حمزہ، غیاث الدین جلال، بایزید، داؤد۔

—اونہہ خالی خولی نام۔ یہ نام تو نقوش ہیں جوندی کے بہتے پانی پر لکھے گئے۔

1576ء سے 1765ء تک سلطنت چغتائیہ کے پینتیس وائسرائے اس سنہرے دیس کے حاکم رہے۔

خانِ جہاں۔ راجہ ٹوڈرمل۔ راجہ مان سنگھ۔ قطب الدین کوکلتاش۔ مرشد قلی خان۔ میر قاسم۔

اونہہ۔ خالی خولی نام۔ یہ نام تو نقوش ہیں جوندی کے بہتے پانی پر لکھے گئے۔

پلاسی

مشرقی پاکستان...... مکانوں کی اینٹیں بہت پرانی ہیں۔ ان پر کائی جمی ہے۔ یہاں کی گلیاں غلیظ ہیں۔ سیاح لوگ کہتے ہیں یہاں غربت بہت زیادہ ہے۔ فقیروں کی افراط ہے، بنگالی مسلمان بے حد پس ماندہ ہے۔ یہاں آئے دن کال پڑتا ہے۔ لوگ فاقہ زدہ ہیں، ملیریا اور مچھروں کی کثرت ہے۔ موٹر کاریں بہت کم نظر آتی ہیں۔ ڈھاکے میں انگریزی سنیما صرف دو ہیں۔ نائٹ کلب ایک بھی نہیں۔ یہاں بازاروں میں لوگ عورتوں کو نہیں تاکتے۔ نہ آواز کستے ہیں۔ اس قدامت پرست پس ماندہ بنگالی مسلمان کی سوسائٹی طوائف کے وجود سے ناواقف ہے۔

یہ امام باڑہ حسینی دالان ہے۔ میں نے لڑکیوں سے کہا۔ جسے امیر الامرا شائستہ خاں کے عہد میں— سید مراد نے بنوایا۔ قلعہ لال باغ۔ جے کالی کا مندر۔

بی بی پری کا مقبرہ۔ بی بی پری نواب شائستہ خاں کی بیٹی تھی۔

اسلام خاں اور شہزادہ عظیم الشان کا جہانگیر نگر۔

میر جملہ کا پُل۔

بڑا کٹرہ۔

ارمنی قبرستان۔

ڈبلیو بی ییٹس نے اپنی نظم "موہنی چٹرجی" میں لکھا ہے۔

قبروں پر قبروں کے انبار ہیں۔
تا کہ وہ جلی ہوئی سیاہ زمین پر آسودہ ہو سکیں۔
پرانی فوجیں پریڈ کر رہی ہیں۔
پیدائش کا پیدائش پر انڈم لگا ہے۔
تا کہ ایسی توپیں وقت کو اپنی گرج سے اڑا دیں۔
پیدائش اور موت کے گھنٹوں کا سنجوگ!
یا جیسا کہ رشی کہتے ہیں، انسان غیر فانی قدموں پر رقصاں ہے۔

2 فروری کی شام معلوم ہوا کہ سندربن جانے کا پروگرام بن رہا ہے۔ مجھے بڑا افسوس ہوا کہ میں اس دریائی سفر میں نہ جاسکوں گی کیونکہ مجھے ایک سرکاری کام کے سلسلے میں کومیلا کے لیے روانہ ہونا تھا اور ابھی یہ بھی معلوم نہ تھا کہ اٹل گل کی یہ سیاست کس روز سے شروع ہے ورنہ میں اسی لحاظ سے اپنا پروگرام بناتی۔

"آج رات ایک ٹھوبنگالی فلم دیکھی جائے۔" ہاجرہ نے تجویز کیا۔

چنانچہ ہم لوگ پھر رکشاؤں میں سوار ہوئے اور ام عمارہ اور بانو اختر شہود کی قیادت میں ایک تنگ اور گنجان بازار کے اندر ایک انتہائی دقیانوسی اور چھوٹے سے سنیما ہال پر پہنچے۔ (مجھ ایسی Bengal phile کو اس میں بھی شدید رومان نظر آیا) اندر جا کر خواتین کے درجے میں بیٹھے جو کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔

نہایت عقیدت اور جوش کے ساتھ ہم تینوں نے فلم دیکھنا شروع کی۔ کیونکہ ایک تو ڈھاکہ۔ خالص روایتی اولڈ فیشن بائیسکوپ گھر۔ اوپر سے بنگالی فلم۔ ہر طرف مقامی رنگ ہی

رنگ تھا۔ مگر پکچر شروع ہوئی تو پہلے پہل خیال آیا کہ خیر کوئی بات نہیں آگے چل کر دلچسپ ہو جائے گی۔ مگر کئی ریلیں گذر گئیں اور پکچر بور تر ہوتی چلی گئی۔ کشور کمار اور ان کی ہیروئن جب مزید بور کرنے پر آمادہ ہوئے تو سوچا کہ خیر گانے اچھے ہوں گے۔ (گانے واقعی بے حد اچھے تھے) پھر نوبت آئی کہ میں نے آنکھیں بند کر کے باقاعدہ سونا شروع کر دیا۔ ہاجرہ، خدیجہ اور جمیلہ بڑی مستقل مزاجی سے فلم دیکھتی رہیں۔ آخر میں نے ذرا مری ہوئی آواز میں (گائیڈ لوگ ٹورسٹ لوگوں کے آگے کبھی ہمت نہیں ہارنا چاہیے) کہا۔

''خیر چلو۔ بنگالی پکچر تو دیکھ لی۔ بقول شخصے آئیڈیا ہو گیا۔''

لطیفہ:۔ سی ایس پی کے چند پروبیشنر پاکستان سے لندن آئے۔ برٹش کونسل والوں نے حسب معمول ان کے لیے ساری تہذیبی یاتراؤں کا انتظام رکھا تھا۔ کونسرٹ، بیلے، اوپیرا وغیرہ۔ ویسٹ اینڈ کے ایک تھیٹر میں انھیں ایک مشہور بیلے دکھانے کے لیے لے جایا گیا۔ بیلے شروع ہونے کے دس پندرہ منٹ بعد ایک پروبیشنر نے دوسرے سے کان میں کہا:

''چلو پارٹنر۔ اب باہر چلیں۔ آئیڈیا تو ہو ہی گیا۔''

دوسری صبح میں نے ایڈن بلڈنگ جا کر اپنے آنے کی اطلاع کا تار کومیلا بھجوایا اور تیسرے پہر کی ٹرین کا ٹکٹ منگوالیا۔ واپس آ کر میں نے ان بیبیوں کو اطلاع دی۔ ''میاں خوش رہو۔ ہم دعا کر چلے۔''

''کیا ہوا؟'' خدیجہ نے پوچھا۔

''اس حقیر پر تقصیر کا اور آپ کا ساتھ ختم۔ یہ خاکسار بکار سرکار آج شب کو عازم کومیلا ہے۔''

''یہ کیا فراڈ ہے؟'' ہاجرہ نے احتجاج کیا۔ معلوم ہوا کہ آج ہی رات کو ایک پارٹی سندربن جا رہی ہے۔ دوسری چاٹگام کا رخ کر رہی ہے۔

''میں کوشش کروں گی کہ کومیلا سے سیدھی چاٹگام پہنچ کر آپ لوگوں کو وہاں جوائن کرلوں۔'' میں نے نہایت متانت سے جواب دیا۔ دل میں سخت کوفت ہو رہی تھی۔

''اچھا تو پھر خدا حافظ؟''

"خدا حافظ"

چاروں منہ لٹکا کر بیٹھ گئے۔

"دراصل مجھے فلاں فلاں تاریخ کو کراچی پہنچنا بہت ہی ضروری ہے۔ ورنہ نوکری سے نکال دی جاؤں گی۔"

"بہت ہی ضروری ہے کومیلا جانا؟" ہاجرہ نے پوچھا۔

"ہے تو سہی۔" میں نے کھنکار کر جواب دیا۔

ان تینوں نے پیکنگ شروع کر دی۔ میں اپنے کمرے میں آ کر اپنا سامان باندھنے میں جٹ گئی۔

تھوڑی دیر بعد ہاجرہ نے دروازے میں آ کر کہا:

"تمھارا یہ ٹرپ فی الحال ملتوی نہیں ہو سکتا؟"

"ہیں—؟"

"تمھارا یہ ٹرپ—"

"ہو تو سکتا ہے۔ لیکن چاٹگام تو میں ہزاروں لاکھوں مرتبہ جا چکی ہوں۔ سندر بن جا رہے ہوتے تو کوئی بات بھی تھی۔ یہ سندر بن کا پروگرام کیوں غتربود ہو گیا؟"

"کیا ہو گیا؟"

"غتربُود۔"

انفارمیشن ڈپارٹمنٹ کے چپراسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہ کومیلا کا ٹکٹ خرید لایا تھا۔ دوبارہ فون کھڑکھڑائے گئے۔ کومیلا دوسرا تار بھیجا کہ آج کے بجائے فلاں تاریخ کو پہنچ رہی ہوں۔

رات کو ریلوے اسٹیشن پر میں نے "مشرقی پاکستان میں ریل کے سفر" کے عنوان کے تحت ان خواتین کو اپنی معلومات سے مستفید کرنا شروع کیا۔ "ارے ایسی ریل ہوتی ہے کہ روک اینڈ رول بالکل انجر پنجر ڈھیلے ہو جاتے ہیں۔ مگر آہاہا— صبح صبح جب مناظر قدرت دکھائی دیتے ہیں۔ سپاری کے جھنڈ اور گاؤں اور—سارے میری جاپانی گڑیاؤں تو سرکٹ ہاؤس ہی میں

رہ گئی۔"

"اناس کھاؤ گی۔"

ارے بھئی ذرا پانی کی صراحی کا انتظام بھی ہو جائے۔"

"چلو پان خریدیں۔"

"بی بی اب سمرسٹ واپس جا کر بنگالی پس منظر کے ساتھ ایک عدد طویل مختصر افسانہ لکھنے کا بندوبست تمھیں کرنا ہوگا۔"

ہم چاروں ایک ڈبے میں فروکش ہوئے۔ ٹرین چلی تو ہم لوگوں نے نوٹنکی شروع کی۔ پرانے پرانے فلمی گانے گائے گئے۔ صبح سویرے ٹرین چاٹگام پہنچی۔ دوپہر کے دو بجے کاکس بازار کے لیے روانہ ہونا تھا۔ سب لوگ بھاگم بھاگ ایک اناتھ آشرم میں لے جائے گئے۔ جو ایک پہاڑی پر واقع ہے۔ چھٹی کا روز تھا۔ آشرم کی ٹین کی چھتوں والی بارکیں سنسان پڑی تھیں۔ یتیم بچوں کی بنائی ہوئی چپلیں اور خالی، اداس کلاس روم اور کالج نما مندر ملاحظہ کرنے کے بعد سب لوگ واپس جا رہے تھے۔ جب میں نے بڑی بشاشت کے ساتھ منیجر صاحب سے کہا:

"آپ کے مندر میں کیرتن تو بڑے اچھے ہوتے ہوں گے۔"

"جی ہاں۔" انھوں نے خوش ہو کر جواب دیا۔ "آپ لوگ ذرا ٹھہر جائیے تو میں ابھی سنوانے کا انتظام کرتا ہوں۔" وہ لڑکیوں کو جمع کرنے کے لیے ہوسٹل کی طرف لپکے ہوئے چلے گئے۔ دھوپ بہت تیز تھی۔ ہم لوگ لائبریری میں جا بیٹھے۔

دفعتاً جاوید اقبال نے کہا: "آپ نے یہ کیرتن کی فرمائش کر کے بہت برا کیا۔"

"کیوں؟" میں نے بھونچکا ہو کر پوچھا۔

"چونکہ آپ حاکم قوم ہیں آپ نے بڑے ٹھاٹھ سے اقلیتی فرقے سے فرمائش کر دی کہ اپنے طریق عبادت کا گویا تماشا دکھاؤ۔ اگر ہندوستان میں ہندوؤں کی تفریحی ٹولی کسی مسجد میں جا کر مسلمانوں سے فرمائش کر کے کہ اپنی نماز پڑھ کر دکھاؤ۔ تو ان مسلمانوں کو کیسا لگے گا؟"

اس منطق کا میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ لہٰذا میں منہ لٹکا کر خاموش ہو گئی۔

چند لمحوں میں مندر میں سے کھڑتال اور ہارمونیم کی آواز بلند ہوئی۔ لڑکیوں کی ایک بہت بڑی ٹولی نے ایک ویشنو بھجن شروع کر دیا تھا۔ جمیلہ پہلے سے مندر کے ہال کے اندر دروازے کے قریب سر ڈھانپے بیٹھی تھیں۔ میں اور ہاجرہ اور خدیجہ برآمدے کے فرش پر بیٹھ گئے۔ حضرات برآمدے کے باہر چاروں طرف کھڑے رہے۔ ایک صاحب نے کہا۔ ہماری خواتین عیسائی ہو جائیں گی۔ بدھ ہو جائیں گی۔ ہندو ہو جائیں گی۔ مسلمان کبھی نہ ہوں گی۔"

اندر شفاف فرش پر بیٹھی ہوئی سفید ساڑھیوں اور لمبے لمبے بالوں والی لڑکیاں ایک کے بعد ایک میرا کے بھجن گاتی چلی گئیں۔ کاکس بازار جانے کا وقت قریب آ گیا تھا۔ لیکن ایک بھجن ختم ہوتا تو منیجر صاحب بے حد اصرار سے کہتے۔ بس ایک اور سن لیجیے۔

ایرپورٹ پر بری پوشاک میں ملبوس چند پاکستانی خواتین طیارے کا انتظار کر رہی تھیں۔

ڈکوٹا چاٹگام سے اٹھا اور سمندر پر اڑنے لگا۔ سمندر سونے کے رنگ کا ہو گیا تھا۔ دور دور سونے کی اس بیکراں وسعت پر کوئی چھوٹی سی کشتی اپنی جگہ پر تھمی نظر آتی تھی۔ چند مسافر اس منظر سے بے نیاز ٹائم میگزین پڑھ رہے تھے۔

آدھ گھنٹے بعد طیارہ کاکس بازار کی ایرفیلڈ پر اترا۔ عین اسی وقت ایک جیپ رن وے کے قریب آن کر رکی اور غلام عباس، اعجاز اور اشفاق اس میں سے برآمد ہوئے۔ یہ لوگ دو روز قبل آ گئے تھے اور اب اس فلائٹ سے ڈھاکہ واپس جا رہے تھے۔

"اس قدر خوب صورت جگہ ہے۔" اعجاز نے جلدی جلدی کہنا شروع کیا۔ "ایسا خوب صورت ساحل میں نے ساری دنیا میں کہیں نہیں دیکھا۔"

"اور وہ سرخ رنگ کا جنگل جو سمندر کے ساتھ ساتھ میلوں تک چلا گیا ہے— اور مندر—" غلام عباس نے کہا۔

"اور وہ پہاڑیاں— بڑا سخت حضور قلب حاصل ہوا یہاں آ کر۔" اعجاز نے ہوائی جہاز کی طرف بھاگتے ہوئے اطلاع دی۔

"بھئی بہت ہی حسین علاقہ ہے یہ—" غلام عباس نے خدا حافظ کہتے ہوئے دہرایا۔

اب تو یہ حالت تھی کہ ہر شخص ٹورسٹ ڈیپارٹمنٹ کے پمفلٹ کی زبان میں گفتگو کر رہا تھا۔ لیکن کاکس بازار کے سلسلے میں مجھ پر زیادہ جوش و خروش طاری نہیں تھا۔ کس واسطے کہ سمندری ساحلوں سے مجھے قطعی دلچسپی نہیں۔ لیکن بہر حال ہم بھی پانچوں سواروں میں تھے۔

بہر حال سب لوگ جیپ گاڑیوں پر بیٹھ کر ریسٹ ہاؤس کی طرف روانہ ہوئے۔ جو غیر ملکی سیاحوں کے لیے بنایا گیا ہے۔ کاکس بازار کا ستر میل لمبا ساحل دنیا کا سب سے لمبا ساحل ہے۔ اٹھارھویں صدی میں ایک نوجوان انگریز ایڈونچر مسٹر کاکس نے یہاں پہنچ کر ایک موگھ گاؤں کے چاروں طرف لکڑی کے جنگلے کھڑے کر دیے تھے۔ دوسری جنگ عظیم میں کاکس بازار ایک اہم چھاؤنی تھی اور جاپانیوں نے اس پر چھیالیس مرتبہ بمباری کی۔ چاٹگام سے اسٹیمر پر کاکس بازار آتے ہوئے ان گنت خوب صورت جزیرے اور دریاؤں کے دہانے راستے میں پڑتے ہیں اور یہاں کے جنگلات انڈو چائنیز قسم کے ہیں۔ ریسٹ ہاؤس کے احاطے کے برابر کاٹجوں کی ایک قطار ہے۔ ان میں سے ایک کاٹج میں مستورات نے قیام کیا۔ یہاں بجلی کی روشنی نہیں تھی۔ رات کو سمندری ہوا بہت خوفناک تھی۔ سمندر کے کنارے پگوڈا کی وضع کا ایک چھوٹا سا ڈاک بنگلہ کھڑا تھا۔

صبح کو ہم لوگ شہر کے خوب صورت بازار میں سے گذرے۔ دلآویز چوبی مکان۔ ناریل کے گھنے جھرمٹ۔ ایک سگار فیکٹری میں جو دراصل لکڑی کا بری وضع کا بنگلہ تھا۔ یہاں کے مشہور چُرٹ تیار کیے جا رہے تھے۔ کچھ دور پر ایک سحر زدہ سا پگوڈا تھا۔ اداس بے رونق ریتیلے احاطے میں دو بھکشو ایک تخت پر چڑھے بیٹھے تھے۔ پگوڈا لکڑی کے کھمبوں پر استادہ تھا۔ ان گنت سیاہ چوبی ستونوں کے اس خستہ حال پگوڈا میں بڑا سناٹا تھا۔ اس کے عقب میں ایک چھوٹا سا مندر اور تھا جس میں گوتم سدھارتھ براجمان تھے۔ قریب ایک پہاڑی پر ایک اور اسٹوپ موجود تھا۔ یہ خاموش پُرسکون جگہ بھی ہماری دنیا میں موجود ہے۔ سیام کا لوپ بوری — انڈونیزیا کا بوروبدر اور چنڈی مندت۔ سانچی کا اودے گرام۔ تخت بہائی، ٹکسیلا، لنکا کا انورادھاپورہ، دیناج پور کا سوم پورہ دیہار ان سب جگہوں پر یہ مورتی اسی طرح رکھی ہے۔ کنول کے سنگھاسن پہ دھیان میں محو۔

وقت کا پرکار ماورا کے اس نقطے پر آن کر تھم جاتا ہے۔

جنگل میں کھیدا ہو رہا تھا۔ دوسرے روز جیپ گاڑیوں پر بیٹھ کر سب لوگ افتاں و خیزاں خاک دھول پھانکتے وہاں پہنچے شفاف چشمے کو پھلانگ کر پہاڑی پر چڑھے جہاں درختوں کے گھنے جھنڈ میں ایک مقید ہاتھی اداسی سے کھڑا تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ سوچ رہا تھا...... کھیدا کس کا ہوا ہے۔ میرا یا ان لوگوں کا۔

میں نے ہاجرہ کے سامنے پھر ایک پراز معلومات تقریر شروع کی۔ ارے یہ تو بہت معمولی کھیدا ہے۔ تم کو تو وہ عظیم الشان کھیدا دیکھنا چاہیے تھا جس کی میں نے بندربن کے جنگلوں میں ڈوکومنٹری...... دفعتاً معلوم ہوا کہ ہاتھی خفا ہو گیا ہے، خاصی بھگدڑ مچ گئی۔ سب لوگ گھبرا کر پہاڑی سے نیچے اترنے لگے۔ نیچے پہنچے تو کچھ دور چل کر جیپ خراب ہو گئی۔ دھوپ بہت سخت تھی اور گرد کی وجہ سے حالت خراب تھی۔ بہزاد وقت ایک دوسرے سے بیزار اور ناراض، ہم جائے قیام پر واپس پہنچے۔

اب شام ہو چکی تھی۔ کمرہ کی نشست کے طویل دریچے سے سمندر کا پورا منظر دکھلائی دے رہا تھا۔ دور افق کے نزدیک ایک سفید جہاز غالباً سنگاپور کی طرف رواں تھا۔

رات بھر سمندر کا شور چاروں طرف سے محصور کیے رہا۔ سمندر اور گہری تاریکی۔ سارا عالم اس عمیق، سیال، پرُشور، قہرناک تاریکی میں ڈوب چکا تھا۔ میرے کمرے میں ایک لالٹین اندھی اندھی ٹمٹما رہی تھی۔ جمیلہ، ہاجرہ اور خدیجہ کاٹج کے دوسرے سرے پر سو رہی تھیں۔

صبح کو جاوید اقبال اور تجمل حسین نے بتایا کہ وہ دونوں رات بھر سمندر کی اونچی موجوں کے قریب ساحل پر بیٹھے رہے تھے اور ان کو اس آفاقی سناٹے کا احساس ہوا تھا جس میں انسان کا وجود قطعاً معدوم ہو جاتا ہے۔

''میرے اور سمندر کے درمیان ایک حد فاصل ہے۔'' میں نے کہا۔

'' آج کا انسان فطرت سے بھاگنا چاہتا ہے۔ سمندر اور انسان...... میں اس موضوع پر ایک ڈرامہ لکھوں گا...... جاوید اقبال نے کہا۔

پانچ بجے شام کوکاکس بازار سے روانگی تھی۔اس سے ایک گھنٹہ قبل ہم پانچ چھ بجے ساحل پر ٹہلتے ہوئے بہت دور نکل گئے۔ریسٹ ہاؤس سے کئی میل آگے نکل آئے ہوں گے۔جب اچانک دیکھا کہ طیارہ ہمارے سروں پر سے اڑتا ایرفیلڈ کی طرف جارہا ہے۔تب ہم نے بے تحاشہ بھاگنا شروع کیا اور ہانپتے ہانپتے ایرفیلڈ پہنچے۔

پھر ڈیکوٹا اس سرکٹ ہاؤس اور ان کاٹجوں اور اس ساحل پر سے گذرتا چاٹگام کی طرف پرواز کرنے لگا۔ہم سونے کے سمندر پر اڑتے چاٹگام واپس پہنچے۔

رات کو مشرقی پاکستان کے عظیم افسانہ نگار محبوب عالم کی طرف سے ایک محفل مشاعرہ منعقد کی گئی تھی۔(معلوم ہوا کہ چاٹگام میں تین سو اردو شعرا موجود ہیں) اس رات غضب کا کہرہ پڑا۔دوسرے روز تیسرے پہر کولانچ سے اتر کر ریسٹ ہاؤس واپس جانے کے لیے جیٹی پر کاروں کا انتظار کیا جارہا تھا۔

شدید گرمی پڑ رہی تھی۔سڑک کی دوسری طرف کسی کارخانے کے شاندار دفاتر تھے۔ ہمارے میزبان نے کہا یہاں میں ایک صاحب کو جانتا ہوں۔دھوپ سے بچنے کے لیے آیئے ان کے دفتر میں چل کر بیٹھ جائیں۔لہٰذا میں، جمیلہ ہاشمی، فخر ماتری، تجمل حسین اور جمیل جالبی ان کے ساتھ ایک شاندار دفتر کے اندر گئے۔جہاں ایک نوجوان ایک لمبے چوڑے ڈیسک کے ادھر بیٹھا تھا......

میزبان نے کہا......''یہ خواتین وحضرات مغربی پاکستان سے آئے ہیں۔''

''اوہ......فائن......ڈیٹس جولی گڈ......''

''یہ رائیٹر ہیں......''

''آ......ہا......از نٹ ڈیٹ انٹرسٹنگ......''

''ونڈرفل......تو آپ لوگ رائیٹر ہیں......جسٹ امیجن۔

''آپ بھی رائیٹر ہیں......؟''اس نوجوان نے مڑ کر مجھ سے دریافت کیا۔

''جی ہاں......''میں نے معذرت طلب انداز میں جواب دیا۔

"تو آپ لوگ کیا لکھتے ہیں؟" نوجوان امریکی لہجے میں انگریزی بول رہا تھا اور بہت خوش اخلاق تھا۔

"جی۔ ایسے ہی کچھ نہ کچھ لکھ لیتے ہیں۔" جمیلہ نے کہا۔

"پھر بھی......؟" نوجوان نے بڑی ہمت افزائی کے انداز میں پوچھا۔

"آپ گجراتی کے لیکھک ہیں۔ آپ افسانے لکھتے ہیں۔ آپ نقاد ہیں......" تجمل حسین نے پژمردگی سے کہنا شروع کیا۔

"ازنٹ دیٹ اکسائٹنگ! کیا لٹریری میگزین وغیرہ میں لکھتے ہیں آپ لوگ۔ یا نیوز پیپرز میں......؟"

اب تجمل حسین سے رہا نہ گیا۔ انھوں نے بہت اخلاق سے دریافت کیا" آپ اسی ملک کے رہنے والے ہیں؟"

"جی ہاں......" نوجوان نے دفعتاً ذرا جھینپ کر جواب دیا۔

"کس جگہ کے؟"

"جی......وہ......امرتسر کا......"

"خاص امرتسر......؟" تجمل حسین نے جرح کی۔

"جی نہیں......اس کے قریب ایک قصبہ ہے......ویسے میں تو وہاں بہت کم گیا ہوں اور چائے لیجیے؟"

دوسرے روز دوپہر کی ٹرین سے میں کومیلا جارہی تھی۔ ہاجرہ اور خدیجہ جلد از جلد ڈھاکہ پہنچ کر لاہور کے لیے روانہ ہونا چاہتی تھیں۔ پارٹی کے تقریباً سارے افراد پہلے ہی چاٹگام سے مغربی پاکستان واپس جا چکے تھے۔ صرف تھوڑے سے لوگ اشک صاحب کی قیادت میں ریسٹ ہاؤس میں باقی رہ گئے تھے۔ میں نے تجویز کیا کہ آپ لوگ بھی کومیلا کیوں نہ چلے چلیے کہ نہایت پُرفضا مقام ہے۔

کومیلا اسٹیشن پر ہماری میزبان سعیدہ احسان اسٹیشن پر موجود تھیں۔ ہاجرہ اور خدیجہ سیدھی ڈھاکہ چلی گئیں۔ ہم لوگ باہر آ کر مینامتی چھاؤنی کی طرف روانہ ہوئے۔ مشرقی پاکستان کے دوسرے تمام حسین ترین علاقوں کی مانند کومیلا کا حسن بھی دنیا کی نظروں سے چھپا ہوا ہے۔

سعیدہ کی کوٹھی ''جی جی ہلز'' کی چوٹی پر تھی۔ ایک طرف وادی میں گاؤں تھے۔ جھیلیں، ناریل کے جھنڈ، کچھ فاصلے پر میناتی کے متعدد کھنڈروں میں سے ایک کی کھدائی کی جارہی تھی۔ چاروں طرف چھاؤنی کے خوب صورت بنگلے بکھرے ہوئے تھے۔ لال مائی کی پہاڑیوں کی سرخ مٹی میں سرخ پھول کھلے تھے۔ سرخ رنگ یہاں کی خصوصیت ہے۔ ہر تیسرے آدمی کا نام لال میاں ہے۔

رات کو ابن الحسن کی بہن کے یہاں کھانا کھاتے ہوئے ایک اعلیٰ افسر کی بیگم صاحبہ نے جمیلہ سے پوچھا...... ''اچھا آپ افسانے لکھتی ہیں؟ میں نے شمع میں تو آپ کے افسانے کبھی نہیں پڑھے۔''

باہر چاند سال کے درختوں پر اتر آیا تھا۔ ہوا میں خنکی تھی۔ اور رجنی گندھا[9] اور ''حسنہ حنا''[10] کی مہک...... گھر واپس آنے کے بعد برساتی میں پہنچ کر سعیدہ نے کہا...... ''ادھر وادی میں سے آدھی رات کے بعد بے حد دلکش موسیقی بلند ہوتی ہے۔ اگر اس وقت تک جاگ سکیں تو ضرور سنیے گا''...... ''کومیلا اپنے جادوٹونے، اسرار اور اپنی ساحراؤں کے لیے صدیوں سے مشہور ہے۔ آج بھی ہمارے پنجابی اور پٹھان فوجی سپاہی قسمیں کھا کر بتاتے ہیں کہ رات گئے اپنی بارکوں کو واپس جاتے ہوئے سنسان سڑکوں پر پریوں، چڑیلوں اور پچھل پائیوں سے اکثر ان کی ملاقات ہو جاتی ہے۔ آخر بنگال کے جادو والی کہاوت میں کچھ تو اصلیت ہوگی......!'' کرنل احسان نے کہا۔

دوسرے روز رات کو دس بجے کی ٹرین سے مجھے ڈھاکہ واپس جانا تھا۔ دوپہر کو ولیج اکیڈمی میں اپنا کام ختم کرنے کے بعد سعیدہ کے ہاں واپس پہنچ کر میں نے میناتی جانے کا پروگرام بنایا۔ ہمارے میزبانوں کو کہیں اور جانا تھا۔ اس لیے ہم لوگ تنہا ہی چل کھڑے ہوئے۔

اس وقت شام کے پانچ بج چکے تھے۔ ہم نے پہاڑی سے اتر کر چاروں طرف دیکھا۔ خاموش سڑک کے کنارے دو دبلے پتلے لڑکے رکشائیں لیے چپ چاپ کھڑے تھے۔

''اے بھائی......رکشا والے......ادھر آنا......کیا نام ہے تمھارا؟''

''لال میاں''

''لال میاں۔ لال مائی پہاڑی پر چلو۔''

''مینامتی......؟''

''ہاں۔ ہاں۔ وہیں۔''

''کون جگہ......کھدائی تو کئی جگہ ہو رہا ہے۔''

''سال بن راجہ کے دیہار۔'' میں نے جواب دیا۔

''وہ تو بہت دور ہے۔ دس میل دور......''

''جی نہیں، بس صاحب۔ کوئی بیس میل دور ہوگا۔''

''کوئی حرج نہیں، چلے چلو۔''

کول تار کی سڑک پر کافی دور چلنے کے بعد ہم کچے راستے پر آگئے۔ رکشا والے وقت، فاصلے اور سمت کے تصورات سے انتہائی بشاشت کے ساتھ بے نیاز تھے۔ ٹرین کا وقت قریب آتا جا رہا تھا۔ اسٹیشن یہاں سے کوسوں دور تھا۔ کچی سڑک پر ہم کبھی اتر کر پیدل چلنے لگتے، کبھی پھر رکشا پر بیٹھ جاتے۔ کچھ معلوم نہ تھا کہاں جا رہے ہیں۔

اسی طرح بہت دیر تک دشت پیمائی کرنے کے بعد محکمۂ آثار قدیمہ کا ایک بورڈ نظر آیا جس سے پتہ چلا کہ ہم منزل کے قریب پہنچ چکے ہیں۔

خدا خدا کر کے دور سے مینامتی کے کھنڈر نظر آئے۔ ہم آگے بڑھے۔

اب سورج پر سرخی آچکی تھی۔ شام کا سناٹا دور دور تک پھیلا تھا۔ مینامتی[11] سامنے موجود تھا۔

پراچین زمانے میں گنگا برہمپترا کا میدان جنوب میں ورگا کہلاتا تھا۔ میگھنا کے اس

پار مشرق کے پہاڑی علاقے سام تٹا کے نام سے مشہور تھے۔ ضلع چٹرداسی سام تٹا کے علاقے میں ہے۔ کومیلا جس کا صدر مقام ہے۔ مہارانی پربھاوتی اور اس کا بیٹا راجہ راج یہاں کے فرماں روا تھے۔ یہ کھدگا خاندان بدھ مت کا پیرو تھا۔ اور اس نے ساتویں سے آٹھویں صدی عیسوی تک یہاں حکومت کی۔ جے کارمنت واسک ان کی راجدھانی کا نام تھا۔ ہیون سانگ یہاں بھی آن پہنچا تھا اور اس نے لکھا تھا کہ یہاں تیس بدھ خانقاہیں آباد ہیں۔

کھدگا خاندان کے بعد دیو گھرانا سام تٹا کا حکمراں بنا۔

سال بن وہار (سال کے جنگلوں یا نبوں کا ذکر ہمیں مہاتما بدھ کی حکایات میں متواتر ملتا ہے) دیو راجہ شری بھادا دیو نے بنوایا تھا۔ اس کا پایہ تخت دیو پربت کہلاتا تھا۔ ملی جلی بدھ مت اور ہندوازم یہاں رائج تھی۔ یہ محل بہت عظیم الشان ہے اور بہت ہیبتناک ہے۔ اس کی طرح کا طرز تعمیر آٹھویں صدی کے جاوا اور گیارھویں صدی کے برما کے آنند مندر کی مانند ہے، ہم اندر گئے۔ ایک ڈاڑھی والے مسلمان گائیڈ نے سایوں میں سے نمودار ہو کر سلام کیا۔ وہار سے باہر ایک جھونپڑے میں کھدائی میں سے نکلے ہوئے مجسمے رکھے تھے۔ ایک انتہائی نادر مجسمے کا دھڑ اور اس سے زیادہ نادر پاروتی کا مجسمہ دروازے کے پاس کھڑا تھا۔ ان گنت خوب صورت مورتیاں، برتن اور کھلونے جھونپڑے کے اندر رکھے تھے۔ یہ آٹھویں صدی عیسوی کے فن کے حیرت انگیز نمونے تھے۔ اس طرح کے برتن اور مٹی کے کھلونے اور مورتیاں جادو نگری کومیلا اور برہمن باڑیا، لوک کہانیوں کے دیس میمن سنگھ اور دوسری جگہوں کے گاؤں میں آج تک بنائے جا رہے ہیں۔

شمالی حصے سے ایک راستہ خانقاہ کی بے حد وسیع مرکزی شرائن کی طرف جاتا ہے۔ جو یونانی صلیب کی وضع کی ہے اور جس کے سروں پر معبد اور تالاب ہیں۔ چاروں طرف چبوترے اور سیڑھیاں بنی ہیں۔ شرائن کے وسیع احاطے کو چاروں طرف سے ایک انتہائی عظیم الشان دالان نے گھیر رکھا ہے۔ سات فٹ چوڑے اس دالان کے ساتھ ساتھ ایک سو پندرہ (115) حجرے ہیں۔ ان حجروں میں آتش دان اور کھڑکیاں اور راکھ اور کوئلہ اور گھڑے اور بدھ کے مجسمے موجود ہیں۔

اتنے ہی بڑے بڑے کئی اور محلات اور وہ بہار محکمہ آثار قدیمہ نے کومیلا میں دریافت کیے ہیں۔ چاروں طرف دور دور تک یہ کھنڈر پھیلے ہیں جو گذرے زمانے میں آنند راجہ کا محل، روپ بن کنیا کا محل اور بھوج راجہ کا محل کہلاتے تھے، جو دیو، خاندان کے راجاؤں سری شانتی دیو، سری ویر دیو اور سری آنند دیو نے تعمیر کروائے تھے۔ ان کے سکوں پر ان کے نام کے ساتھ ''مہاراج دھیراج'' لکھا ہے یعنی یہ بادشاہ بڑی جاہ و حشم والے تھے اور گپتا سلطنت کے زوال کے بعد شمالی بنگال کے پال بادشاہوں کے ہم عصر تھے۔

دیو خاندان نے دسویں سے گیارھویں صدی تک یہاں راج کیا۔ لال مائی کی پہاڑی پر بسا ہوا اس کا نام وکرم پور تھا۔ ان کے طلائی سکوں پر ''تری رتن'' (بدھ۔ دھرم۔ سنگھ) منقش ہے اور ''بنگالہ مری گنگ'' لکھا ہے۔

ینا متی کی پہاڑی پر ان ہی سکوں کے ساتھ عباسی خلفا کے دو سکے بھی ملے ہیں۔ ان میں سے ایک طلائی سکے پر آخری عباسی ابواحمد عبداللہ المستعصم باللہ کا نام خط کوفی میں منقش ہے۔

مہارانی ینا متی چندر خاندان کی ملکہ تھی۔ اس کا دوسرا نام مدن وتی تھا اور مہاراجہ مانک چندر سے اس کا بیاہ ہوا تھا...... اوتہہ...... خالی خولی نام...... یہ نام تو نقوش ہیں جو ندی کے بہتے پانی پر لکھے گئے۔

ییٹس نے اپنی ایک نظم میں کہا ہے:

> تہذیب کو آہنی حلقوں میں جکڑ کر امن کے رنگارنگ فریبوں کے ذریعے ایک نظام میں تبدیل کر دیا گیا۔ لیکن آدمی کی زندگی خیال ہے۔ وہ اپنی ذاتی دہشت کے باوجود ایک کے بعد ایک، ہر صدی میں چیختا چنگھاڑتا، غارت گری مچاتا، جڑیں اکھاڑتا رہا تا کہ حقیقت کے ویرانے تک پہنچ سکے۔
>
> مصر و یونان الوداع! الوداع روم!

کوہ میرو اور ایورسٹ کی بہتی برف اور اندھیری رات اور طوفان
کے تھپیڑوں کے نیچے جھکے ہوئے یوگی جانتے ہیں کہ دن کے بعد رات آتی
ہے، اور طلوع آفتاب سے پہلے پہلے اس کی شان وشوکت اور اس کی
یادگاروں کا خاتمہ ہو جائے گا۔

محل کے ایوان کے اوپر چڑھ کر میں نے چاروں طرف دیکھا۔ سارے میں گہرا سکوت تھا۔ ڈوبتے سورج کی روشنی نے ان باجبروت، لرزہ خیز کھنڈروں کو قرمزی بنا دیا تھا۔ بھکشوؤں کے دالانوں کے ستون خاموش کھڑے تھے۔ دور افق پر دھواں اٹھ رہا تھا۔

''وہ جہاں دھواں اٹھ رہا ہے۔ ہندوستان کا بارڈر ہے۔'' گائیڈ کی آواز نے اس خاموشی کو توڑا۔

''اچھا۔''

ہم آہستہ آہستہ نیچے اترے۔ مینامتی کے کھنڈروں کو پیچھے چھوڑ کر ''تہذیب'' کے آہنی حلقوں کی طرف واپس لوٹ آئے۔ رکشائیں کچے راستوں پر سے گذرتی تارکول کی شفاف سڑک پر آ گئیں۔ جو چاندنی میں نہائے ہوئے وسیع کھیتوں میں سے بل کھاتی کومیلا کی طرف جاتی تھی۔ یہ سڑک بالکل سنسان تھی۔ اور اس کے دونوں طرف تھوڑے فاصلے پر بانس کے جھنڈ اور پھولوں سے لدے ہوئے درخت تھے اور جھونپڑوں اور دیہاتی چائے خانوں میں چراغ جل رہے تھے۔

کومیلا......خواب کا، الوہی، ابدی، امٹ سکون اور شانتی کا شہر۔

صبح کو ڈھاکہ میں بوندا باندی ہو رہی تھی۔ جب ٹرین اسٹیشن میں داخل ہوئی، چاروں طرف کہرہ تھا۔ سرکٹ ہاؤس پہنچ کر میں نے دروازے پر دستک دی۔ ہاجرہ اور خدیجہ صبح کی چائے پی رہی تھیں۔ دوسرے روز منہ اندھیرے ان کو لاہور جانا تھا۔ میں دوسری شام کو کراچی واپس لوٹ رہی تھی۔

رات کو ہم لوگ ''کاجل مایا'' کی شفیق اور مہربان مصنفہ کو خدا حافظ کہنے ان کے

وہاں گئے۔

چند سال قبل جب میں ڈھاکے میں پہلی مرتبہ بیگم صوفیہ کمال سے ملی تھی تو انھوں نے بنگالی خواتین کی ایک ادبی محفل میں میرے متعلق ایک بہت خوب صورت نظم پڑھی تھی اور اس کا انگریزی ترجمہ مجھے دیا تھا۔ اس سے پہلے میں بیگم صاحبہ اور ان کی غنائیہ شاعری سے واقف نہیں تھی۔ جبھی مجھے معلوم ہوا کہ تقسیم کے پہلے سے بیگم صوفیہ کمال کا شمار بنگال کے صف اوّل کے شعرا میں کیا جاتا ہے۔ ان کے طرز میں ٹیگور کی جھلک نظر آتی ہے۔

بیگم صوفیہ کمال ہم تینوں سے بڑی دیر تک بہت شفقت کے ساتھ باتیں کرتی رہیں۔ ان کے مکان کے چاروں طرف گھنے درخت ہیں۔ اور اس کے احاطے میں تالاب کے اوپر ایک پل بنا ہے اور تالاب کے کنارے نشست کے لیے چبوترہ ہے جس پر پھولوں کے درخت جھکے ہوئے تھے۔ چاند کی روشنی بہت تیز تھی اور چمپا کے درخت آہستہ آہستہ سرسرا رہے تھے۔ ہوا میں بہار کی آمد آمد تھی۔

اس وقت مجھے صوفیہ کمال کی ایک غنائیہ نظم یاد آئی:۔

''کوی، خاموش کیوں ہو؟ بہار تمھاری منتظر ہے؟''

اپنی خوب صورت آنکھیں اٹھا کر اس نے پوچھا۔

''جنوبی پھاٹک کھل چکے ہیں؟ چکوترے کے درختوں پر پھول کھل گئے؟ آم پر بور آ گیا؟''

''تم نے دیکھا نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''ایسی بے نیازی بھی کیا! اور تمھارا پھولوں کا لباس کہاں ہے؟''

دور دیکھتے ہوئے اس نے آہستہ سے کہا:

''جہاز سمندر پر سے گذر گیا؟ آمد کا اعلان کر دیا گیا؟ میرا بلاوا آ چکا ہے؟''

میں نے پھر کہا ''بہار کے سواگت کے لیے کوئی گیت لکھو کوی۔''

''اگر اس مرتبہ نہ لکھوں تو کوئی ہرج ہے؟''

''لیکن اپنی بے پروائی سے رتوں کی مہارانی کو دکھ کیوں پہنچاتے ہو؟''
اور اس نے چپکے سے اس کی وجہ بتائی:
''خزاں کی جوگن، کہرے میں چھپی، خالی ہاتھ ان بنجر علاقوں کی طرف چلی گئی جہاں پھول نہیں
کھلتے۔ میں یہ بات بھول سکتا ہوں؟
میں یہ بات..................''

('افکار'، کراچی، سالنامہ، 1960)

حواشی

1. بوڑھی گنگا یا پدما
2. ''ہم نے شہر (بصرہ) کی خوب سیر کی۔ نہایت کنگال اور ویران شہر ہے۔ وہاں سے سورت اور بمبئی پہنچے۔ وہاں سے روانہ ہو کر منزل بہ منزل سیر کرتے ہوئے دلی آن پہنچے۔ اور چھ مہینے تک زینت المساجد میں رہے۔

ایک روز ہم مرزا نوشہ کے مکان پر گئے۔ نہایت حسن اخلاق سے ملے۔ لب فرش تک آ کر لے گئے۔ اس دن سے مرزا صاحب نے دستور کر لیا کہ تیسرے دن زینت المساجد میں ہم سے ملنے کو آتے۔ اور ایک خوان کھانے کا ساتھ لاتے۔ ہر چند ہم نے عذر کیا کہ یہ تکلیف نہ کیجیے مگر وہ کب مانتے تھے۔ ہم نے ساتھ کھانا کھانے کے لیے کہا تو کہنے لگے کہ میں اس قابل نہیں ہوں۔ مے خوار روسیہ گنہگار۔ مجھے آپ کے ساتھ کھاتے ہوئے شرم آتی ہے۔ ہم نے بہت اصرار کیا تو الگ طشتری میں لے کر کھایا۔ ان کے مزاج میں کمال کسر نفسی اور فروتنی تھی۔

ایک روز کا ذکر ہے کہ مرزا رجب علی بیگ سرور لکھنؤ سے آئے۔ مرزا نوشہ سے ملے۔ اثنا گفتگو میں پوچھا کہ مرزا صاحب اردو زبان کس کتاب کی عمدہ ہے۔ کہا چار درویش کی۔ میاں

رجب علی بولے۔ اور فسانہ عجائب کی کیسی ہے؟ مرزا بے ساختہ کہہ اٹھے۔ اجی لاحول ولاقوۃ۔ اس میں لطف زبان کہاں۔ ایک تک بندی اور بھٹیار خانہ جمع ہے۔ اس وقت مرزا نوشہ کو خبر نہ تھی کہ یہی میاں سرور ہیں۔ جب چلے گئے تو حال معلوم ہوا۔ بہت افسوس کیا کہ ظالمو پہلے سے کیوں نہ کہا۔ دوسرے دن مرزا نوشہ ہمارے پاس آئے یہ قصہ سنایا اور کہا کہ حضرات یہ امر مجھ سے ناداننگی میں ہوگیا ہے آیئے آج ان کے مکان پر چلیں اور کل کے مکافات کرائیں۔ ہم ان کے ہمراہ ہوئے اور میاں سرور کی فرودگاہ پر پہنچے۔ مزاج پرسی کے بعد مرزا نے عبارت آرائی کا ذکر چھیڑا اور ہماری طرف مخاطب ہوکر بولے کہ جناب مولوی صاحب رات میں نے فسانہ عجائب کو جو بہ غور دیکھا تو اس کی خوبی عبارت اور رنگینی کا کیا بیان کروں۔ نہایت ہی فصیح و بلیغ عبارت ہے۔ میرے قیاس میں تو ایسی عمدہ نثر نہ پہلے ہوئی نہ آگے ہوگی۔ اور کیوں کر ہو اس کا مصنف اپنا جواب نہیں رکھتا۔ غرض اس قسم کی بہت سی باتیں بنائیں۔ اپنی خاکساری اور ان کی تعریف کر کے میاں سرور کو نہایت مسرور کیا۔ دوسرے دن ان کی دعوت کی اور ہم کو بھی بلایا۔"

3. مہارشی برما کی سیاحت کے بعد بردوان۔ اڑیسہ۔ بنارس۔ الٰہ آباد۔ بندرابن سے گذرتے آگرہ پہنچے۔ آگرے سے روانہ ہونے کے ایک مہینے بعد پوس کی 27 تاریخ کو میری کشتی دہلی کی ریت سے جالگی۔ میں نے دیکھا کہ ایک جم غفیر ساحل پر جمع ہے۔ اور بادشاہ دہلی پتنگ اڑا رہے ہیں۔ ان کے پاس اب کوئی اور کام نہ رہ گیا تھا لہٰذا پتنگ بازی کے علاوہ اور کیا کر سکتے تھے؟ دہلی شہر کے اندر جا کر میں نے ایک مکان کرائے پر لیا۔" یہ 1854 عیسوی تھا۔ مہارشی ابھی شملے ہی میں مقیم تھے جب غدر پڑا۔ شملے میں بڑا قتل و غارت ہوا۔ کارتک کی پہلی تاریخ کو رابندر ناتھ کے صوفی والد شملے سے چلے۔ انبالہ اتر کر گھوڑا گاڑی کے ذریعے واپسی کی ٹھانی۔ گورنمنٹ نے باغیوں کے ڈر سے رات کے وقت مسافر گاڑیوں پر سواروں کے دستے تعینات کر دیے تھے۔ دوپہر کے وقت گاڑی کانپور کے نزدیک گھوڑے بدلنے کے لیے ٹھہری۔ میں نے دیکھا کہ کھیت میں بہت سے خیمے نصب ہیں۔ بھیڑ اکٹھی ہوگئی ہے اور

بزار لگا ہے۔ میں نے کشوری سے کہا کہ دکانوں سے اشیائے خورد ونوش اور بھینس کے دودھ خرید لائے۔ "یہ بازار کیسا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"دہلی کے بادشاہ کو قید کر کے لے جایا جارہا ہے"۔ اس نے جواب دیا۔

میں نے شملہ جاتے ہوئے انھیں جمنا کی ریت پر بڑی خوشی پتنگ اڑاتے دیکھا تھا۔ واپسی پر وہ مجھے ایک قیدی کی حیثیت میں نظر آئے۔ اس ہر لحظہ فنا ہوتی ہوئی دکھی دنیا میں کس کو خبر ہے کہ اگلے لمحے کیا ہونے والا ہے؟

کانپور کے اسٹیشن پر معلوم ہوا کہ ٹکٹ نہیں مل سکتے کیونکہ پوری ٹرین میں زخمی سپاہی لے جائے جارہے ہیں۔ بنگالی اسٹیشن ماسٹر نے مجھے دیکھتے ہی کہا 'آپ یہاں کہاں؟ میں آپ کو بھی ٹکٹ دیتا ہوں۔ تو ابودھنی گرامر اسکول میں میں آپ کا شاگرد تھا۔ آپ نے امتحانات کے موقع پر مجھے اکثر انعام بھی دیے ہیں!!

تین بجے ہم الٰہ آباد پہنچے۔ اسٹیشن ابھی تعمیر نہیں ہوا تھا۔ ٹرین سڑک پر ایک جگہ ٹھہر گئی......"

4. قدرت اللہ شہاب نے یہ بڑی مابعد الطبیعاتی بات کہی۔

5. اراکان کے موگھ دربار کا صوفی شاعر سید الاول چاٹگام کا رہنے والا تھا۔ اس نے ملک محمد جائیسی کے پدماوت کا پدماہتی کے نام سے بنگالی میں ترجمہ کیا تھا اور اسے جدید بنگالی شاعری کا پیش رو سمجھا جاتا ہے۔

"بہورانی تم تو بھور بھئے جمنا جی گئی تھیں۔ دن گذرا۔ رات ہوگئی۔ کہاں رہیں اتنی دیر؟

"میں کنول کا پھول توڑنے گئی تھی مگر مجھے تیتیے نے کاٹ کھایا۔ میری چوڑیاں کانٹوں میں رہ گئیں، انھیں نکالنے کے لیے میں ندی پر جھکی تو میری مانگ کا سیندور اور آنکھوں کا کاجل پانی میں ڈھل گیا۔"

"ستی مینا متی لور چندرانی" کا مصنف دولت قاضی بھی چاٹگام کا باسی اور اراکان دربار کا راج کوی تھا۔

6. محمد حسین۔

7. لمبے ڈنٹھل والا کنول۔

8. ''جوار بھاٹا کا گیت'' جو مانجھی بہاؤ کے رخ پر کشتی کھیلتے ہوئے گاتے ہیں۔

9. ''رات کی خوشبو''۔

10. ''رات کی رانی''

11. مینامتی کی ''ڈسکوری'' بالکل اتفاقیہ ہوئی۔ دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں برما کے محاذ پر جانے والی انگریزی فوجوں کا بہت بڑا استقر کومیلا میں بنایا جا رہا تھا۔ چھاؤنی کے بنگلوں اور بارکوں کے لیے زمین ہموار کرتے ہوئے ایک دن مزدوروں کے کدال مٹی میں چھپی ہوئی چند اینٹوں سے جا ٹکرائے۔ نکال کر دیکھا تو بہت پرانے زمانے کی اینٹیں تھیں۔ پھر زمین کا سروے کرنے پر پتہ چلا کہ اس علاقے میں کھنڈروں کے بہت سے ملبے مٹی میں دفن ہیں۔ رانی مینامتی بنگال کی لوک کہانیوں کی ہیروئن ہے۔ پچھلے ایک ہزار سال سے اس کے متعلق گیت اور بیلڈ بنائے جا رہے ہیں۔ 1875 عیسوی سے پہلے بہت سے مجسمے اور ایک عمارت اس پہاڑی سے برآمد کی گئی تھی۔ مگر 1944 عیسوی تک کسی کو اچھی طرح معلوم نہ تھا کہ رانی مینامتی کا، رنگ محل مٹی میں دبا اب تک اس کی پرانی راجدھانی میں موجود ہے۔

چھٹے اسیر تو بدلا ہوا زمانہ تھا

یاد ایک ایسا پُرسکون اور طوفانی، شفاف اور گدلا سمندر ہے جس کی تہہ میں ان گنت شکستہ جہازوں، جگمگاتے خزانوں اور لاشوں کے شہر خموشاں دفن ہیں۔ ان زیرِ آب بلوریں محلات میں سمندری پھول تیرتے پھرتے ہیں۔ سبز اور نیلی موجوں کے عکس ان ایوانوں میں لہریں مارتے ہیں اور زمرّد کی روشنی میں مونگے کی چٹانوں کے پیچھے چھپی جل پریوں کی آوازیں اس سیّال، ابدی سناٹے میں مدھم مدھم گونجتی ہیں۔ (یہ آوازیں اگر آپ ساحل پر کوئی سیپی اٹھا کر کان سے لگائیے تو آپ کو سنائی دیں گی)۔ منور، نازک سنہری مچھلیاں اور ہیبت ناک شارک چکر کاٹتے ہیں اور وقت کے نئے طوفانوں میں نئے جہاز ڈوب کر اسی تہہ میں جا بیٹھتے ہیں۔ مزید لاشوں اور مزید خزانوں کے انبار کا اس زیرِ آب شہر خموشاں میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ وقت کے ساتھ تہہ میں پڑی پرانی لاشیں اور گہرائی میں ڈوبتی چلی جاتی ہیں۔ ان کی شکلیں مدھم ہو جاتی ہیں، جواہرات ماند پڑ جاتے ہیں اور شکستہ جہاز کھیل کھیل ہو کر پانی میں گھل جاتے ہیں۔ اسے ''بھول جانا'' کہا جاتا ہے۔

ایسا صدیاں گذرنے پر بھی ہوتا ہے اور ایک ایک برس، یا ایک مہینہ گذرنے پر بھی۔

بھول جانے یا یاد رکھنے کی کوئی مقررہ میعاد نہیں۔انسان ہزاروں اور صدیوں کے پیمانے سے اپنے اجتماعی ماضی کو ماپتا ہے۔اس کی اپنی عمر اس قدر مختصر ہے کہ وہ اپنے تصور زماں کو اپنے محدود پیمانہ وقت سے ہی ماپ پاتا ہے اور اسی کو بے چارہ بہت اہم سمجھتا ہے۔وقت کے محدود تجربے کو، جو اس کی تیز رفتار زندگی سے مترادف ہے، وہ تاریخ کی مجموعیت کے پس منظر میں دیکھنے کی کوشش کرتا ہے اور سمندر سنسناتا رہتا ہے۔اس سے مفر نہیں تاوقتیکہ آپ خود، دوسروں کے لیے ایک یاد بن کر اس تہہ سے جالگیں۔

1939 میں دوسری جنگ عظیم میں کانگریس کے عدم تعاون کے اعلان کے موقع پر یوپی لجسلیٹو اسمبلی میں اقبال سہیل اعظم گڑھی نے للکار کر برطانوی حکومت کو مخاطب کیا تھا۔

ستم جو ہوگا تو دیکھ لیں گے۔کرم کا بھانڈا تو پھوٹ جائے
بلا سے قزاق آ کے لوٹیں یہ پاسبانوں کی لوٹ جائے
اچک لے شاہیں تو غم نہیں ہے قفس تو کمبخت ٹوٹ جائے

اس وقت سارا ہندوستان ایک عظیم قفس تھا،لیکن اس سے چند سال قبل جب ہمارے جہاز ایس ایس مہارانیہ نے کلکتے سے لنگر اُٹھایا تو مجھے معلوم نہیں کیسے اور کن متضاد نظریوں کے تحت آزادی کی لڑائی لڑی جارہی ہے۔اور ہنسا اور اہنسا کے کیا معنی ہیں۔والد کے دوستوں میں سے مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا شوکت علی اور حسرت موہانی کے لیے سنا ہے کہ ابھی ابھی برآمدے میں بیٹھے چائے پی رہے تھے،ابھی معلوم ہوا کہ جیل چل دیے۔ہمت والے لوگ تھے۔اور ان ہی دنوں جب یہ خبر آتی کہ ''کسی انقلابی نے وائسرے بہادر پر بم پھینک دیا، دھڑ ادھڑ گرفتاریاں ہورہی ہیں، ان کے گھروں پر سناٹا چھاجاتا کہ نہ جانے کس مائی کے لال نے پھانسی کی جے مالا پہننے کی سعی کی ہے۔یہ ہنساوادی یعنی انقلابی یا دہشت پسند کہلاتے تھے۔

چنانچہ جب روشنیوں سے جگمگاتا جہاز (جس کے عرشے پر گوانی بینڈ ''رول برٹینا'' بجا

رہا تھا اور عالمگیر اقتصادی کساد بازاری کا غم غلط کرنے کے لیے صاحب اور میم لوگ بار پر بیٹھے بے تحاشہ شراب پی رہے تھے، یا ہال روم میں ناچ رہے تھے، کیونکہ بہرحال، سر سراتے پام اور بگوڈا ٹری کے جھرمٹوں میں گھری یہ رومان پرور نوآبادیاں برطانوی امرا کے ''چھوٹے بیٹوں'' کے ایڈونچرز اور مالی بہبودی کے لیے ابھی سالم و محفوظ تھیں۔ سمرسٹ ماہم اور ایولین وا کے ناولوں کا مشرق تھا۔ لندن کے اخباروں میں بکری ساتھ لیے ''ننگے فقیر'' گاندھی کی تصاویر شائع ہوتیں جو ایمپائر بیچ کئی کے درپے تھا نئی دہلی کے وائسریگل لاج کے ''مغل باغات'' میں لیڈی ولنگڈن سفید سایہ پہن کر والیان ریاست کے ساتھ چائے پیتیں اور کیتھرین میو کا مدر انڈیا کب کا چھپ چکا تھا) سبز رنگ کے پانیوں میں داخل ہوا تو اچنبھا مجھے محض اس بات پر ہوا کہ سمندر اتنا وسیع ہے ''جانے کتنے مزدور لگے ہوں گے تب جا کر اسے کھودا گیا ہوگا''۔ میں نے اظہار خیال کیا اور ریلنگ میں سے سر نکال کر لہروں کو دیکھا کی۔

—صاحب لوگوں کے اس جہاز پر ہندی غلاموں میں ہم لوگوں کے علاوہ دوسرا کنبہ مولانا رب نواز کا تھا۔ مولانا رب نواز پورٹ بلیئر کے کسی سرکاری محکمے میں آفس سپرنٹنڈنٹ تھے۔ پورٹ بلیئر کی مسجد کے پیش امام اور واعظ بھی تھے اور رخصت ختم ہونے کے بعد انڈمان واپس جا رہے تھے۔ وہ سنہری کلاہ، اونچے طرّے اور طویل شملے والی ریشمی پگڑی باندھتے تھے اور شلوار فراک کوٹ پہن کر اس کے ساتھ ٹائی بھی لگاتے تھے۔ اور فرنچ کٹ داڑھی رکھتے تھے۔ یہ ملکی سیاست کا غالباً بہت ہی نازک دور تھا۔ اکثر وہ زینے پر آ کر اور صاحب لوگ پر دور سے ایک نظر ڈال کر زمیندار اخبار کا پلندہ والد کو تھما دیتے اور چپکے چپکے سیاسی تبادلۂ خیال کرتے رہتے۔ مجھے ان کا حلیہ دھندلا سا یاد ہے مگر یہ سب تفصیلات بڑے ہونے پر والد نے بتایا کہ (مولانا رب نواز اس دور کے لاہور کی نفیس تہذیب کے پروردہ تھے۔ عربی و فارسی کے عالم تھے۔ بڑے سچے مسلمان باشعور اور حساس انسان تھے اور پیٹ کی خاطر انھیں سرکار کی کلرکی کرنا پڑ رہی تھی) مولانا کی بی بی ڈھیلی ڈھالی ریشمی شلوار قمیص میں ملبوس نچلی منزل میں اپنے کیبن میں بند رہتی تھیں۔ مولانا کی بچی فرخندہ جمال میری ہی جتنی رہی ہوگی۔ وہ اکثر کھیلنے کے لیے اوپر عرشے پر آ جاتی اور

اس کے جانے کے بعد میں پھر جا کر ریلنگ پر ٹک جاتی۔ (جہاز کی بھٹی کے مانند گرم 'ہولڈ' میں جیل خانہ تھا)۔

چند روز بعد افق پر جزیرے نمودار ہوئے۔ مونگے کی چٹانیں۔ ناریل کے جھنڈ اور سرسبز، ٹروپیکل پہاڑ۔ پورٹ بلیئر کی بندرگاہ قریب آئی۔ بہت سی ڈونگیاں اور موٹر لانچیں جہاز کی سمت بڑھیں۔ بندرگاہ کی عمارت پر یونین جیک لہرا رہا تھا۔ پولیس کے اینگلو انڈین اور کالے سپاہی بندوقیں اٹھائے پہرے پر مستعد تھے۔ سفید سولا ہیٹ پہنے صاحب لوگ رپ رپ کرتا جیٹی پر پھر رہا تھا۔

بینڈ نے "رُول برٹینیا" دوبارہ چھیڑا اور جہاز کنارے سے لگ گیا۔ صاحب میم لوگ نیچے اترے۔ مولانا رب نواز کی بی بی بھی سفید شٹل کاک برقعے میں ملفوف، پھلوں کی ٹوکریاں سنبھالے اپنے کیبن سے نکلیں نیچے جیٹی پر پہنچ کر مولانا نے فرخندہ جمال کو کندھے پر بٹھالیا اور بی بی کے آگے آگے چلنے لگے۔

آخر میں ہولڈ میں سے پابجولاں قیدی نکالے گئے۔ یہ انقلابی نوجوان عمر قید کاٹنے کے لیے ایشیا کے سب سے بڑے قید خانے سیلولر جیل لے جائے جا رہے تھے۔

ہمارا مکان بورہ بنگلہ ایک سرسبز پہاڑی کے اوپر جھلملا رہا ہے۔ پیچ دار سڑک پر سے اس کے پھاٹک تک پہنچنے کے لیے ایک جاپانی وضع کے...... پل پر سے گذرنا پڑتا ہے۔ مکان اونچے اونچے چوبی کھمبوں پر ایستادہ ہے۔ اس کا نام غالباً "بڑا بنگلہ" کی بگڑی ہوئی بنگالی یا انگریزی شکل ہے۔ احاطے میں سامنے کی جانب ربڑ کے درختوں کا جھرمٹ ہے۔ بڑے بڑے فرانسیسی دریچوں والے برآمدے میں سے سمندر نظر آتا ہے جس کی لہریں باغ کی ڈھلان سے ٹکراتی رہتی

ہیں۔ پرائیویٹ جیٹی پر کھڑی نیلے پردوں والی سفید سرکاری لانچ لہروں پر ڈولا کرتی ہے۔ ''بارہ بنگلہ'' چوبی اونچی عمارت ہے اس لیے نچلی منزل میں جو صرف چوبی کھمبوں کے ایک جنگل پر مشتمل ہے، مسلح گارڈ کے علاوہ چھوٹا سا فائیر انجن اور آگ بجھانے والوں کا عملہ بھی مستعد رہتا ہے۔ مکان کے عین عقب میں کاجو کے درختوں سے ڈھکا ہوا اونچا پہاڑ ہے۔

انڈامان کے یہ جزیرے اور پہاڑ دراصل برما کے ارکا کن یوما پہاڑوں کے زیر سمندر سلسلے کی سات سو میل تک پھیلی چوٹیاں ہیں جو سطح آب سے اُبھر آئی ہیں۔ کرۂ ارض کی تشکیل اور طبعی تبدیلیوں کے دوران پہاڑ کے پہاڑ انڈر گراؤنڈ ہوجاتے ہیں اور کبھی کبھی جوالا مکھی کے بھیانک پہاڑ بھاپ میں نمودار ہوکر پھٹ پڑتے ہیں۔ جیولوجیکل وقت میں گھری انسان کی زندگی چیونٹی کی عمر سے بھی زیادہ حقیر ہے۔

دوسو جزیروں کے اس جھرمٹ میں اکثر زلزلے آتے رہتے ہیں۔

ہم ایسے پہاڑوں کی چوٹی پر رہ رہے ہیں جو سارے کے سارے نیلے سمندروں میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

انڈومان ملایائی زبان کی ہندومان کی انگریزی شکل ہے۔ ہندومان ملایائی زبان میں ہنومان جی کو کہتے تھے۔ راماین کا جنوب مشرقی ایشیا خصوصاً سیام اور کمبوڈیا وغیرہ کی تہذیب پر صدیوں سے بہت گہرا اثر رہا ہے۔

''ہنومان جی اپنے بندروں سمیت یہاں بھی پہنچے تھے؟'' بھائی نے گارڈ کے حوالدار رام چندر سے پوچھا۔ جو فیض آباد یعنی اجودھیا کا باشندہ ہے۔

جی ہاں بابا۔ کون جانے لنکا تک پل بناتے بناتے کودتے پھاندتے یہاں بھی آگئے ہوں۔ بجرنگ بلی ہی جو ٹھہرے۔ آکر ایک سنجیونی بوٹی کھا کر بھگوان نے سارا پہاڑ ایک ہتھیلی پر اٹھالیا تھا کہ نہیں؟ ہمیں تو لگتا ہے غصے میں آکر ان جوالا مکھی پہاڑوں کو بھی انھوں نے ہی ساگر

میں ڈبو دیا''۔ رام چندر نے اپنی لمبی لمبی نوکیلی مونچھوں پر ہاتھ پھیر کر شفقت سے جواب دیا۔ جغرافیہ کی کتاب میں بھائی نے اسی روز پڑھا تھا کہ سفید فام یورپین آریوں نے جنوب کی سیاہ اقوام کو حقارت سے بندر کہا تھا کیونکہ وہ قدیم ترین نیگرو نسلیں وادیٔ سندھ، دکھنی بھارت اور لنکا سے لے کر ملایا اور آسٹریلیا تک بسی تھیں اور جزائر انڈومان نکوبار کے یہ ''ہنومان'' یعنی بندر نما وحشی قبائلی اسی قبل از تاریخ نسلی خاندان کے افراد تھے۔ (اینتھروپولوجی کے ماہرین کے مطابق، انڈومان کے قبیلے دنیا کی اوّلیں نسل انسانی کے آخری بچے کھچے افراد تھے) مگر حوالدار رام چندر جی کی اور وہ ہنومان جی والی بات زیادہ میرے جی کو لگی۔

کورومنڈل، بنگال، مالابار، سوراشٹر، سندھ اور لنکا کی بندرگاہوں نے حضرت سلیمانؑ کی سلطنت اور بحیرۂ روم کے ممالک اور بابل دنینوا سے تجارت کی تھی فراعنہ مصر کی ممیاں ہند کی ململ اور سوتی چھینٹوں میں لپیٹی جاتی تھیں اور پوپ گریگری اعظم کے ترجمہ کیے ہوئے لاطینی عہد نامہ قدیم میں حضرت ایوبؑ نے فرمایا تھا ''میری عقل و فراست کو ہند کے رنگین کپڑوں سے تشبیہ مت دو''۔ گپتا تمدن سارے جنوب مشرقی ایشیا میں پھیلا تھا اور قرون وسطیٰ میں عرب تاجر اور چاٹگام کے ملاح دنیا کے سمندروں پر اپنے پھریرے اڑاتے پھرتے تھے۔ مگر جب مشرق کا زوال شروع ہوا اور دنیا کے بازاروں میں ہند کی تجارتی قیادت اور صنعتی دھاک ختم ہو چلی تب بھی، حیدر علی اور ٹیپو سے قبل، دہلی کے مغلوں اور بنگال کے نوابوں کو یہ خیال نہ آیا کہ بحری طاقت بھی کوئی شئے ہے۔ بے چارے حیدر علی نے نیوی بنائی اور ٹیپو نے مالدیپ پر اپنے بحرے کے ہیڈکوارٹرز قائم کیے مگر اس وقت تک پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا۔ فرض کیجیے، سارے جزیرہ نما کی حفاظت کے لیے نیوی موجود ہوتی تو سولھویں صدی میں یورپین طاقتیں اس آسانی سے ملک میں نہ گھس آتیں۔ اب مثال کے طور پر ہندوستان دیپ ہی کو لیجیے۔ اگر مغل گورنمنٹ نے یا ماندٔے کے بادشاہوں نے یہاں ایک بحری چوکی قائم کر دی ہوتی اور جو پرتگالی ڈچ، فرانسیسی یا برطانوی جہاز ادھر سے

گذرتا اس میں بھوسہ بھر دیتے۔

چنانچہ برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک نقشہ نویس آرچی بالڈ بلیئر نے ایک ایک ٹاپو کی پیمائش کر کے یہاں 1788 عیسوی میں نوآبادی قائم کی۔ ان زرخیز ٹاپوؤں پر قبضہ کرنے کے لیے انگریزوں نے اپنی جان لڑادی کیونکہ ہندومانی قبائل نے اپنے زہر میں بجھے تیروں اور بھالوں کے ذریعے صاحب لوگ کی ایسی تواضع کی تھی کہ امریکہ کے ریڈ انڈین، افریقہ کے حبشی اور آسٹریلیا کے بش مین نے بھی صاحبان عالیشان کا ایسا بھرکس نہ نکالا ہوگا۔

لیکن انگریز کا اقبال بھی کیا شے ہے۔ صاحب جہاں پہنچتا ہے وہاں گلزار کھلا دیتا ہے۔ اب ان جزیروں پر خالص ولایتی ناموں والے بارونق اور خوب صورت شہر آباد ہیں۔ پورٹ کارنوالس۔ ایلفنسٹن ہاربر۔ پورٹ کیمپ بل۔ جیسے اپنے یہاں منٹگمری، ڈلہوزی کیمبل پور۔

پورٹ بلیئر میں اسکول نہیں تھے۔ لہٰذا ایک بری نوجوان بھائی کو پڑھانے کے لیے آیا کرتا۔ اور خوابناک آنکھوں سے سمندر کو تکتے ہوئے کبھی کبھی برما کی عظمت رفتہ کے قصے سناتا۔ ''جانتے ہو بنگال اور مشرقی ہند کے برطانوی نوآبادکار زیادہ تر اسکاٹش کیوں ہیں؟ اس لیے کہ اسکاٹ لینڈ کے اجاڑ پہاڑوں پر بھوکے مرتے تھے''۔ وہ بڑا جوشیلا بری تھا۔ ''ہر چیز کی ایک اقتصادی وجہ ہے۔ کاز اینڈ ایفکٹ'' وہ ہوا میں انگلیاں گھما کر بتاتا۔ دس گیارہ سالہ بھائی کی سمجھ میں اتنی بڑی باتیں نہ آتیں تو وہ اکتا کر چپ ہو جاتا اور سمندر کو تکنے لگتا۔ یا پھر اراکانی قزاقوں کے قصے سنانے لگتا جنھوں نے دو سو سال قبل یہاں اڈے بنالیے تھے اور مشرقی بنگال کی دریائی تجارت پر حملے کیا کرتے تھے۔ ''لیکن یہ پورٹ کیمپ بل جن بزرگ کے نام پر بسایا گیا ہے ان سے بڑا بحری قزاق ساری دنیا میں نہ ہوگا۔ انھوں نے تو سارے برما پر ہی قبضہ کرلیا۔ یہ سب......'' وہ باہیں پھیلا کر اور بچّوں کی طرح آنکھیں گول گول کر کے کہتا۔ ''یہ سارا ایشیا ایک سیلو مارکیٹ ہے۔ تم ہندستانی مہنگے سیلو ہو۔ ہم تم سے ذرا سستے سیلو ہیں۔ بائی بائی......'' اور کرسی سے اچھل کر تیزی

کے ساتھ زینے سے نیچے اتر جاتا۔
یہ جزیرے۔ گوگاں اگر یہاں آتا تو تاہیٹی کو بھول جاتا، اہل ہند کے لیے ''کالا پانی'' ہیں۔ غدر کے باغیوں کو عمر قید کی سزا دینے کے لیے یہ جیل تعمیر کیا گیا تھا۔ ان جزائر کو چیف کمشنر کا صوبہ بنایا جا چکا ہے۔ 1874 میں لارڈ میو وائسرائے ہند سیلولر جیل (جو عام طور سے سلور جیل کہلاتا ہے) کا معائنہ کرتے ہوئے ایک قیدی شیر محمد کے ہاتھوں مارے گئے۔ یہ ہندوستان کا پہلا سیاسی قتل تھا۔ اس صدی کے شروع سے ملک میں انقلابی تحریک چل رہی ہے اور دہشت پسندوں کو بغیر ٹرائل کے کالے پانی بھیجا جا رہا ہے۔

یہ مرجانی جزیرے سونا اگلتے ہیں۔ گھنے جنگلوں کی قیمتی لکڑی، یورپ اور امریکہ ایکسپورٹ کی جاتی ہے، کافی اور چائے کی کاشت کے لیے ایشیا کے سب سے بڑے جیل کے ہزارہا قیدیوں کی بیگار موجود ہے۔

سامنے شیشوں والے برآمدے کے کونے میں پرانی وضع (اس وقت وہ نئی وضع تھی) کے ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے۔ تو میں اسٹول پر چڑھ کر اس تک پہنچتی ہوں: ''ہلو۔ ہلو جی ہاں ہم بارہ بنگلہ سے بول رہے ہیں۔''

ہمارا اس نظام سے کیسا سمجھوتہ ہے؟ سمجھوتے کے کیا معنی ہیں۔

ہم سب، ساری دنیا، ساری اقوام، نسلیں، مذاہب، فرقے، طبقے، ممالک، افراد، ہمارے خیالات، نظریے، تعصبات، فلسفے، ادبیات، علوم و فنون، ہماری مختلف الٰہیات، روحانی اور جذباتی تجربات، سیاسی، سماجی، تمدنی مسائل، ہماری اجتماعی اور انفرادی شخصیت ہماری خامیاں اور ہماری خوبیاں، دشمنی اور دوستی، فتح و شکست، کمال اور زوال، دکھ اور سکھ، حسب نسب تاریخ کی وجوہ کے گنجلک، دھندلے، روشن، واضح، غیر واضح تفاعل کی پیداوار ہیں۔

رات بھر باغ کی کول تار کی سڑک پر گارد کے قدموں کی کھٹ کھٹ گونجتی ہے۔ لفٹ رایٹ...... لفٹ رایٹ...... ہالٹ حکم صدر...... کھٹ۔ کھٹ۔ کھٹ۔ صبح سویرے سر پر سفید رومال باندھے بری مہتر پہلو کے چوبی زینے پر نمودار ہوتا ہے اور نیچے بھگوتی چرن مالی کھرپا

سنبھالے انگوچھا سر پہ لپیٹتا باغ میں پہنچ جاتا ہے۔ بھگوتی مشرقی یو.پی سے برآمد شدہ Indentured Labour سے تعلق رکھتا ہے اور اس کا سارا کنبہ دو پیڑھیوں سے کافی کے باغات میں کام کر رہا ہے۔ برطانوی پلانٹر جن کے مالک ہیں۔ لارڈ کارنوالس کے نافذ کیے ہوئے استمراری بندوبست کی بدولت جب یو.پی میں بھیانک قحط پڑا تو آج سے ایک صدی قبل ہزارہا فاقہ زدہ کسانوں کو جہازوں میں بھر بھر کر نیم غلاموں کی حیثیت سے آسام، افریقہ، جزائر غرب الہند، فی جی اور ماریشس میں اہل برطانیہ کے پلانٹیشنز پر مزدوری کرنے کے لیے بھیج دیا گیا تھا۔ ان کی اولاد آج بھی وہاں اسی حالت میں موجود ہے۔ بھگوتی انہی لوگوں کا بھائی بندھو ہے۔

جب سورج نکل آتا ہے تو پینٹری میں سے نور محمد بیرے کی چھینک اور گرج دار الحمدللہ کی آواز آتی ہے۔ نور محمد ضلع جھنگ کا باشندہ ہے۔ اور اپنی بیوی اور اس کے عاشق کو کلہاڑے سے قتل کر کے یہاں تشریف لایا ہے۔ بوڑھا نور محمد ایک نیک دل اور دین دار انسان ہے۔ ہر بات کے جواب میں "یوں جناب" کہتا ہے جو "بہت اچھا جناب" کا مخفف ہے۔ نوجوان کلینر اور بوڑھا خانساماں دونوں قاتل ہیں۔ یہ تینوں اچھے اور آزاد قیدیوں میں شامل ہیں۔ ان کی مانند سرکاری مکانوں پر جو ملازم برسوں سے کام کر رہے ہیں انھوں نے بھی زیادہ تر پنجاب کے کھیتوں میں آب رسانی کے جھگڑوں، آبائی عناد اور معاملات حسن و عشق کے سلسلے میں خون خرابہ کیا تھا۔ یہ سب، سیدھے سادے جوان، ادھیڑ، بوڑھے، ہندو، مسلمان، سکھ، ہندستانی، پنجابی اور دوسرے صوبوں کے لوگ ہیں۔

تری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

کتے کا نام ایک مسئلہ ہے۔ یہ بے حد محبت شعار السیشین ہمیں پچھلے انگریز افسر سے ترکے میں ملا ہے۔ اس کا نام ٹیپو تھا۔ "ہم اسے آرتھر[1] پکاریں گے"۔ والد نے فیصلہ کیا۔

مگر وہ آرتھر کے نام پر بیوقوفوں کی طرح چپ بیٹھا دم ہلاتا رہتا کہ ٹیپو کہلانے کی اس کی

عادت راسخ ہو چکی تھی۔ چونکہ سب کو منع کر دیا گیا تھا کہ اسے ٹیپو نہ پکارا جائے اس لیے اب وہ گم نام ہی اِدھر اُدھر پڑا پھرتا اور متعجب اور پُر امید نظروں سے سب کی شکلوں کو تکتا۔

پرکاش چند کلیئر پابندی سے شام کے وقت آرتھر کو ساحل پر ٹہلانے لے جاتا ہے اور سر جھکا کر اس کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے جانے کیا سوچتا رہتا ہے۔ اس نے جے پور میں اپنی محبوبہ کے قاتل کو مار ڈالا تھا۔ پرکاش چند تعلیم یافتہ نوجوان ہے۔ اکثر پنڈت رام پرشاد بسمل شاہجہانپوری کا مشہور شعر زیر لب پڑھتا ہے

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

''بھگت سنگھ اور رام پرشاد بسمل اور اشفاق اللہ اور چندر شیکھر آزاد اور ان گنت نوجوان تختہ دار پر چڑھ چکے ہیں۔ اس وقت سارا ہندوستان بسمل کے اس شعر سے گونج رہا ہے اور میں یہاں ذلت کی موت مروں گا۔'' وہ سر اٹھا کر بھائی سے کہتا ہے۔ پھر کوئی سیپی اٹھا کر کان سے لگا لیتا ہے اور سمندر کی آواز سنتا رہتا ہے۔ میں اِدھر اُدھر ریت پر ماری ماری پھر رہی ہوں اور خوب صورت بڑی بڑی کوڑیاں، سیپیاں اور گھونگے جمع کرتی جا رہی ہوں۔ تب پرکاش چند ایک سیپی دور پانی میں پھینک کر اچانک بھائی سے کہتا ہے: ''بابا۔ آپ کو معلوم ہے جب سراج الدولہ کی شہادت کی خبر راجہ رام نرائن موزوں نے سنی تو انھوں نے کیا کیا......؟ وہ...... وہ ایک راجہ تھے پٹنے کے...... اور شاعر تھے...... یہ خبر سن کر جس کے بعد سے ہندوستان کی دیپا دلی بجھ گئی، انھوں نے کہا۔

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کے
دیوانہ مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

اور کپڑے پھاڑ کر سر پہ خاک ڈالتے گھر سے نکل گئے۔ ''ادھر''۔ وہ افق کی سمت باہیں پھیلا کر کہتا ہے ''اُدھر'' اس ویرانے پر تب سے لے کر آج تک کیا گزری ہے اور اس وقت بھی کیا گزر رہی ہے؟'' اور پھر آرتھر ویلز لے کو بلا کر چپ چاپ اس کی ٹہل میں مصروف ہو جاتا ہے۔ اب سورج سمندر میں ڈوب چکا ہے اور بارہ بنگلہ میں روشنیاں جل اٹھی ہیں اور شفق کی سرخی ریت

پر لہریں مار رہی ہیں۔ میں اور بھائی سر جھکائے اکا دُکا سیپیاں اور کوڑیاں چنتے لان کی سیڑھیاں چڑھ کر گھر کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں۔

''ذریر جلیل یہ تو آپ سن چکے ہوں گے کہ میں نے پھر ہندوستان چھوڑ دیا۔ دو برس کے لیے جلاوطنی اختیار کر لی۔ یہاں فرصت ہے اور تنہائی

قید خود اختیاری

ہوں مبارک دوستو دنیا کی تم کو وسعتیں میری قسمت میں فقط اک تنگ زنداں رہ گیا
ہم کو کیا اہل خرد ہوں محوِ گل گشتِ چمن ''چل دیے اہلِ جنوں خالی بیاباں رہ گیا''

انڈامان کا جزیرہ بہت بدنام ہے۔ مگر یہاں عیش بھی ہے۔ کالے آدمیوں کے لیے نہیں جن کی قسمت میں محنت و مشقت کے سوا کچھ نہیں بلکہ انگریزوں کے لیے ان کی الگ آبادی ہے۔ بنگلے ہیں۔ سبزہ ہے۔ کلب ہے جس میں میمیں اور انگریز ہر طرف نظر آتے ہیں مگر ہندستانی شاذ و نادر۔ میں بھی اس کلب میں شامل کر لیا گیا ہوں۔ مگر چونکہ نہ ناچنا آتا ہے نہ پینا۔ اُلّو کی طرح بیٹھا رہتا ہوں۔

وہ کسی کے واسطے تو ہو گیا عشرت کدہ
انڈمن کیوں ہند کا منحوس زنداں ہو گیا

آپ لوگوں کی یاد اور تذکرہ ہر وقت رہتا ہے۔

سیدین و سرور و قدوائی کا ذکر و خیال
درد بھی یہ ہو گیا اور یہ ہی درماں ہو گیا

خاکسار
سجاد[2]

میں اور بھائی ساحل سے واپس آ چکے ہیں۔ آرتھر برآمدے کے فرش پر لیٹا قناعت سے ستا رہا ہے۔ دور دوسرے جزیرے پر جھلملاتے کلب کی روشنیاں دریچے میں سے نظر آ رہی ہیں۔ حوالدار رام چندر ہمارے والدین اور مدراسی ہمسائے مسز و مسٹر کیودر کو لانچ پر پہنچا کر اندھیرے میں اپنی لالٹین چمکاتا ساحل سے واپس آ رہا ہے۔ تاریکی گہری ہو چکی ہے اور چاروں کھونٹ سمندر کی سنسناہٹ خوفناک ہے۔

رام چندر کے قدموں کی چاپ زینے پر سنائی دیتی ہے۔ بھائی برآمدے کے ایک سرے پر ٹیبل لیمپ کے نیچے بیٹھے بری ٹیچر کو سنانے کے لیے سبق یاد کر رہے ہیں۔ جو کل سویرے پھر آ جائے گا۔ روشن لانچ فراٹے بھرتی سمندر کی تاریکی میں غائب ہو جاتی ہے۔ رام چندر مونچھوں کے اندر مسکراتا برآمدے میں داخل ہوتا ہے اور بھائی کے پاس جا کر بڑی راز داری سے کہتا ہے۔

"بابا۔ کل آپ لوگ ایک تماشہ دیکھئے گا۔ مِل ڈریے گا نہیں۔"

"کیا ہے؟" بھائی سوئی چکرورتی میز پر پٹخ کر خوشی سے پوچھتے ہیں۔

"کیا تماشہ ہے رام چندر؟ جلد بتاؤ" میں جواب تک کرسی پر کھڑی ہو کر دریچے سے باہر لانچ کو دیکھ رہی تھی فوراً چلاتی ہوں۔

"ابھی نہیں۔ بیٹا کل سویرے۔" اتنا کہہ کر حوالدار رام چندر دوسرے زینے سے نیچے اتر جاتا ہے۔ کھٹ۔ کھٹ۔ کھٹ۔ دور پھاٹک پر ٹہلتے پہرے دار کی آواز بلند ہوتی ہے۔

"ہالٹ! حکم صدر!" کھٹ۔ کھٹ۔ کھٹ

وہ ایک قبائلی وحشی بچہ تھا۔ نہ معلوم کس طرح بھٹک کر آبادی میں آ نکلا اور ہارہ بنگلہ کی عقبی پہاڑی پر کاجو کے جنگل میں چھپ رہا تھا۔ نور محمد تڑکے گجردم پہاڑی کی ایک چٹان پر جا کر نماز پڑھا کرتے تھے۔ سلام پھیرنے کے بعد ان کی نظر اس بچے پر پڑ گئی جو پتوں کی جھالری پہنے، چند جنگلی جڑیں کھا کر اپنا پیٹ بھر رہا تھا۔ نور محمد کی آدھی زندگی پورٹ بلیئر میں گذر گئی تھی مگر انھوں نے

اصل نسل وحشی پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ وہ اسے پکڑنے کو دوڑے مگر بوڑھے آدمی تھے اس کا تعاقب نہ کر سکے اور وہ چھلاوے کی طرح غائب ہو گیا۔ لیکن شام پڑنے تک اس نے ربڑ کے جھرمٹ میں سے ڈھونڈھ نکالا جہاں وہ ایک درخت سے چمٹا، سہا ہوا بیٹھا تھا۔

صبح کو والد کے دفتر چلے جانے کے بعد رام چندر وعدے کے مطابق ہمیں تماشہ دکھانے کے لیے اسے گھسیٹتے ہوئے اوپر لائے اور برآمدے کے چوبی فرش پر اسے اس طرح چھوڑا جیسے بلی کے بچے یا پلے کو بوری میں سے نکال کر زمین پر رکھ دیتے ہیں۔

وہ ایک نو دس سالہ لڑکا تھا لیکن بے حد پستہ قد ہونے کی وجہ سے چار پانچ سال سے زیادہ کا معلوم نہ ہوتا تھا۔ وہ ساحل کے راستے سے بہ آسانی اپنے جنگلوں کو واپس جا سکتا تھا مگر شاید وہ کوشش کر کے شہر آیا تھا۔ مہذب انسانوں سے خائف بھی تھا ان کے ساتھ رہنا بھی چاہتا تھا۔ لیکن اپنی خواہش کا اظہار کرنے سے قاصر تھا۔

بارہ بنگلے کا سارا عملہ اس کے چاروں طرف جمع ہو گیا۔ کرۂ ارض کی اوّلین نسلِ انسانی کا یہ نمائندہ، ارتقا کی پہلی سیڑھی پر پہنچ کر ہزاروں برسوں سے اسی سیڑھی پر ٹھٹکا ہوا ابنِ آدم ارد گرد جمع اپنے ترقی یافتہ رشتے داروں کو خوف زدہ وحشی جانور کی طرح تکتا رہا۔

''ہا۔ گھوڑا ابن مانس کیسے ٹکر ٹکر سب جنوں کا تکت ہے''۔ صدیق چپراسی کی بی بی مشاقن نے جو گھونگھٹ کاڑھ کر سامنے آیا کرتی تھیں بڑی ممتا سے کہا۔

''تم ہی کا دیکھت ہے ٹکر ٹکر! بھگوتی مالی نے کہا۔

''اپنی موسی کا چینہن لیہسں ہے بھر جائی۔'' رام چندر، کہ بہت پُر مذاق تھے، مشاقن سے بولے۔ مشاقن پیٹ بھر کے بدصورت تھیں۔ ''کالا منہ نیلے ہاتھ پاؤں''۔ مشاقن نے مصنوعی غصے سے کہا۔

اتنے میں بھگوتی مالی کی بی بی گلبا اور عزیزن آیا بھی آن پہنچیں۔

''ارے باپ رے۔ ای تو بہوتے بھیانک ہے۔ جیس تیلی مسان۔ بدارواح۔ توبہ توبہ''۔ عزیزن نے کہا۔

''اِدھر سمندر میں بہت جل مانس رہت ہیں''۔ رام چندر نے مسکرا کر مونچھوں پر ہاتھ پھیرا۔

''نا بھیا! ہم کا ناڈراوٗ ہم رات برات باہر نکلت ہیں۔'' عزیزن نے ہاتھ جوڑے۔

''جل مانس ہوں کہ گج گینڈے۔ ہم کسی سے نہیں ڈرت ہیں۔ آہ۔ چُخ چُخ چُخ۔'' مشتاقن نے پیار سے چٹکی بجا کر بچے کو بلانا چاہا۔ اتنے میں نور محمد باقاعدہ کھانے کی ٹرے لے کر آ گئے اور پلیٹ اس کے سامنے رکھ دی۔ بچے نے اپنے جھبرے بال جھٹک کر ان کی طرف دیکھا۔ چاروں ہاتھ پاؤں سے پلیٹ کی سمت چلا۔ اور کھانے کو غور سے دیکھنے لگا۔

''ہا...... ڈکھیا چنڈال بن میں سانپ چھپکلی کھا کھا کر جیت ہیں''۔ بی مشتاقن بولیں اور اس کے لیے نوالے بنانے کے ارادے سے اکڑوں بیٹھی ہی تھیں کہ اس نے گوریلا کے تھپڑ کی طرح ایک ہاتھ رسید کیا۔ مشتاقن زور سے چیخ مار کر وہاں سے بھاگیں افراتفری مچ گئی۔ والدہ صبح سے سبز کیوور کے گھر گئی ہوئی تھیں۔ عزیزن انھیں بلانے کے لیے دوڑیں۔ رام چندر بچے کو اچھی طرح پکڑ کر بیٹھ گئے اور اسے کھلانے کی کوشش کرنے لگے۔

''جناب اسے کلمہ پڑھا کر مسلمان کر لیں؟'' نور محمد نے چپکے سے صدیق سے تجویز دی۔

''گورنمنٹ کا آرڈر نہیں ہے''۔ صدیق نے اسی سرگوشی میں جواب دیا۔

''کیا؟''

''جنگلی والا کو جنگلی والا ہی رہنا مانگتا......'' بری مہتر نے نور محمد کو سمجھایا۔

''واہ اور مشنری لوگ کو آرڈر ہے کہ بنائے جاؤ سب کو کرسٹان۔ ابھی جا کر اسے چپکے سے مولانا صاحب کو دے آتے ہیں''۔

''نور محمد'' سلامت خان ہیڈ کانسٹیبل نے قریب آ کر ڈنڈا بجاتے ہوئے ذرا ڈپٹ کر کہا ''جاؤ جا کر اپنا کام کرو''۔

''ہوں جناب'' نور محمد نے جھاڑن کندھے پر ڈالا اور سر جھکائے پینٹری کی طرف چلے گئے۔

''ہم بابا لوگ کو تماسا دکھائے کھاترا ای کا اوپر لائے رہے۔ تماسا کھتم۔ پیسہ ہجم۔ چلیے کہاں صاحب۔ ای کا جنگل ماواپس پٹھائے دیں......''

بچہ سرکاری قانون کے مطابق واپس لے جا کر جنگل میں چھوڑ دیا گیا۔ ''اس پر مضمون لکھو مسٹر......'' دوسرے روز بری ٹیوٹر بھائی سے کہتا ہے (''ایک انڈومانی لڑکا'' اور پورٹ بلیئر کے شب و روز کے متعلق ہوم ورک کے طور پر لکھے ہوئے بھائی کے "Essays" کی شکستہ اور پیلی کاپی بک کی مدد سے اس وقت میں یہ کہانی لکھ رہی ہوں'')

جزائر کے گھنے اور ناقابل عبور جنگلوں میں قدیم آبادی صرف چند ہزار رہ گئی تھی۔ متعدی بیماریاں جو نوآبادکار اپنے ساتھ لائے تھے اور انھیتر وپولوجی کی اصطلاح میں ''متمدن دنیا سے تعارف'' کی وجہ سے قدیم حجری عہد کے یہ قبائل تیزی سے مر رہے تھے۔ تاریک جنگلوں میں جن کے اندر سانپ اور بھیانک مگرمچھ ایسی چھپکلیاں سرسراتی تھیں، یہ بے چارے وحشی تیر کمان سے شکار کھیلتے، پھرتے، ان کی بولیوں کا کسی لسانی گروہ سے تعلق نہیں تھا۔ اکثر قبائل کے یہاں بول چال ہی کا ارتقا نہیں ہوا تھا۔ اور آگ کے استعمال سے وہ ناواقف تھے۔

اِکا دُکا سیاسی قیدی درختوں کے کھوکھلے تنوں کی ناو بنا کر فرار کی کوشش کرتے مگر حکومت نے نسبتاً ترقی یافتہ قبائل کو ان کے تعاقب کے لیے مقرر کر رکھا تھا۔ اور زہر آلود تیروں کی زد سے بچ نکلنا مفرور قیدیوں کے لیے ناممکن تھا۔ (غالباً ایسی ہی صورت حال کے لیے میرا بائی کہہ گئی تھیں ''کوس کوس پر پہرہ بیٹھا۔ پنڈ پنڈ بٹ مار''۔

اکثر شام پڑے ہم لوگ ہوا خوری کے لیے شہر کے قریبی جنگلوں کی طرف نکل جاتے۔ پورٹ بلیئر اور اس کے پڑوسی شہر ایبرڈین کی روشنیاں اندھیرے میں غائب ہو جاتیں اور کسی گھاٹی

میں سے گذرتے ہوئے میں دفعتاً ناریل کی فرمائش کرتی۔ سڑک پر جاتا ہوا قہوے کے پلانٹیشنز کا کوئی مزدور ناریل کے درخت پر چڑھتا اور ناریل توڑ کر بندر کی سی پھرتی سے نیچے اتر آتا۔

کافی کے باغات سے نکل کر ہم جنگلوں کی طرف رواں رہتے۔ دور کہیں آگ جلتی نظر آتی۔ سمندری ہوا ساحلی چٹانوں میں سائیں سائیں کرتی۔ راستے میں چاند ملتا۔

''چاند ہمارے ساتھ ساتھ کیوں چل رہا ہے؟'' میں تعجب سے پوچھتی۔

''آپ کو سلام کرتا ہوا جا رہا ہے'' والد جواب دیتے۔ سارے جزیرے پر تاڑ کے سیاہ درختوں پر، ہری بھری پہاڑیوں پر تیز چاندنی پھیل جاتی۔ بانس کے جھرمٹ ہوا میں سرسراتے۔ ہوائیں بھی میری دوست ہیں۔

کبھی کبھی اتوار کے روز شہر سے مولانا رب نواز فرخندہ اور شٹل کاک برقعے میں ملفوف اپنی بیوی کے ہم راہ ہمارے یہاں آتے اور شیشوں والے برآمدے میں بیٹھ کر والد سے باتیں کرتے۔ کلامِ اقبال پڑھتے جاتے اور پگڑی کے شملے سے آنسو پونچھتے۔ جمعہ کے روز مسجد میں مولانا کے وعظ مسلمان قیدیوں میں اس قدر مقبول ہو چکے تھے کہ انگریزوں کو مولانا کی طرف سے فکر ہو گئی تھی۔

ایک روز روس آئی لینڈ (Ross Island) پر حوالدار رام چندر کے ساتھ چیف کمشنر کے باغ میں سے گذرتے ہوئے اس کے بنگلے کے دریچے میں سے مجھے دو فل بوٹ نظر آئے جو مگدر جیسے چوبی فرموں پر چڑھے ہوئے تھے۔ یہ مسٹر اینڈرسن کی ٹانگیں ہیں جنھیں گھر پر چھوڑ کر وہ خود باہر چلے جاتے ہیں۔ میں نے سوچا اور بے حد ڈری۔

بھائی کی کاپی میں لکھا ہوا ایک قدیم ''نرسری گیت''۔

HOW MANY MILES TO BABYLON?
THREE SCORES AND TEN
CAN I GET THERE BY CANDLE-LIGHT
YES, AND BACK AGAIN
IF YOUR HEELS ARE NIMBLE AND LIGHT
YOU CAN GET THERE BY CANDLE-LIGHT

اچانک بڑی گہما گہمی سی شروع ہوگئی۔ سلور جیل کے چند بنگالی انقلابیوں نے جیل کے حکام کی شدید بدسلوکیوں کے خلاف احتجاجاً بھوک ہڑتال کر دی۔ ان سیاسی اسیروں میں قید تنہائی کاٹنے والے بھی شامل تھے۔ ان میں سے کچھ نوجوانوں نے دم توڑ دیا۔ شام کو میں نے دیکھا کہ مسٹر اینڈرسن فل بُوٹ پہنے کار میں سوار ہو رہے ہیں جو جاپانی پُل کے نیچے کھڑی تھی۔ والد جزائر انڈامان نکوبار کے اسسٹنٹ ریونیو کمشنر تھے۔ ریونیو کمشنر ایک انگریز تھا، جس کا تعلق جزائر کے محکمہ مالیات سے تھا۔ پینل سٹیلمنٹ کا انتظام علاحدہ اور صرف انگریزوں کے ہاتھ میں تھا۔ اس کے باوجود جزیرے میں ممکن بغاوت کے خدشے سے بورہ بنگہ کی گارد دوہری کر دی گئی۔

دوسرے روز ایک سیاسی قیدی اسٹریچر پر پڑا ہوا نیچے گھاٹی کی سڑک پر سے گذرا۔

''سدھیر کمار بوس یہی ہے''۔ پرکاش چند کلیبز نے آہستہ سے بری ٹیوٹر کو بتلایا۔

وہ دونوں بھائی کے ساتھ پہلو کے برآمدے کے جنگلے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ میں جنگلے کی جال میں سے نیچے جھانک رہی تھی۔

''سنا ہے کل بڑا صاحب خود اس کی کوٹھری میں گیا تھا۔ جو تالات سے بات کرنے۔ اتنا تو یہ کمزور ہے۔ سینکیا پہلوان۔ مگر کھاٹ سے اٹھ کر پل پڑا بڑے صاحب پر۔ صاحب بھاگا باہر سرپٹ۔'' نور محمد نے کہا ''اور پولس کو آرڈر دیا کہ اسے خوب پیٹو''۔

''مسٹر اینڈرسن اپنی ٹانگیں ساتھ لے گئے تھے تبھی تو بھاگے سرپٹ'' میں نے اطمینان سے جواب دیا۔

''اب شاید ٹھکائی کرکے ہسپتال لے جا رہے ہیں۔ سول سرجن والے ہسپتال، مگر مرجائے گا''۔ نور محمد نے آہستہ سے کہا۔ آنکھیں پونچھیں داڑھی پر ہاتھ پھیرا۔ اور پلٹ کر آواز دی۔'' آجاؤ ٹیپو۔ ٹیپو۔ نہیں......توبہ......آرتھر......آرتھر......چلو راتب کا ٹیم اور اندر چلے گئے۔

ایک روز ایام جاہلیت کا افسوس ناک خاتمہ ہوگیا۔ والد برآمدے میں بیٹھے ہندوستان سے آئی ہوئی تازہ ڈاک دیکھ رہے تھے میں فرش پر بیٹھی جہازی سائز کے نئے ادبی دنیا اور نیرنگ خیال کے ورق الٹنے پلٹنے میں مصروف تھی کہ غالباً نیرنگِ خیال میں ایک الف لیلوی سے بازار کی رنگین تصویر پر نظر پڑی جس میں قالین بچھے تھے اور حسین کنیز فروخت کی جا رہی تھی۔ تصویر کے نیچے جلی حروف میں ایک شعر 3 لکھا تھا۔ میں نے تصویر والد کو دکھا کر ان سے پوچھا'' یہ کیا لکھا ہے؟''۔

انھوں نے چونک کر ذرا رنج کے ساتھ مجھے دیکھا اور کہا'' افسوس کہ یہاں آپ بالکل جاہل رہ جائیں گی۔ اب آپ کو پڑھنا شروع کردینا چاہیے۔''

چنانچہ دوسرے دن مولانا رب نواز کو بلایا گیا۔ جب وہ برآمدے میں آن کر بیٹھے تو نور محمد نے فرطِ عقیدت سے ان کے ہاتھ چومے اور اپنی آنکھوں سے لگائے اور جلدی سے چائے اور مٹھائی لا کر ان کے سامنے رکھی۔

''کڑی چار سال چار ماہ چار دن دی ہوگئی اے'' انھوں نے دریافت کیا اور مطلع کیا کہ جمعے کے روز قاعدہ لے کر آئیں گے۔

اب میں یہ سمجھی کی قاعدہ گڑیا کا گھر ہوگا۔ یہ بے وقوفی کی انتہا تھی۔ معلوم تھا کہ مولانا پڑھانے کے لیے آرہے ہیں۔ مگر قاعدہ گڑیا کا گھر ہوگا۔ قاعدے کو گڑیا کے گھر سے کیا نسبت

ہوسکتی ہے!

دوسرے روز صبح بھائی نے آواز دی "چلیے آپ کا قاعدہ آ گیا" میں تیر کی طرح بھاگتی ہوئی برآمدے میں پہنچی۔ چنانچہ یہ ایک پتلی سی بے رنگ کتاب تھی جس کے پہلے صفحے پر آم، بکری، پتنگ وغیرہ کی تصویریں بنی تھیں۔

باقاعدہ بسم اللہ کی تقریب ہرگز نہیں ہوئی اس واسطے کہ بسم اللہ، روزہ کشائی، سالگرہ وغیرہ کی رسوم بسلسلہ تحریک اصلاح معاشرت مدتوں قبل اماں ترک کر چکی تھیں۔

لہٰذا اس طویل دریچے میں جس کے باہر سمندر پر سفید پرندے چکر کاٹ رہے تھے اور ڈیوک آف ونگٹن، لارڈ آرتھر ویلز کے باغ میں گلہریوں کے تعاقب میں مصروف تھا اور دور سلولر جیل میں گولیاں چل رہی تھیں، میں دریائے علم میں غوطہ زن ہوئی۔

"کہو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ شروع کرتا ہوں۔" مولا نا رب نواز نے قاعدے کے پہلے صفحے پر شہادت کی انگلی رکھتے ہوئے ذرا ہل ہل کر کہا۔ "ساتھ نام اللہ کے"۔

"جی نہیں۔ شروع کرتی ہوں" میں نے اعتراض کیا۔

"اچھا اچھا پڑھو بٹی آگے پڑھو"

"شروع کرتی ہوں ساتھ نام اللہ کے۔"

"سارے ملک، خصوصاً بنگال، یوپی صوبہ سرحد میں واقعات کی رفتار تیز ہوگئی۔ ہزارہا ستیہ گرہی جیلوں میں بند تھے۔"

"دہشت پسندوں کی وجہ سے بنگال کی حالت کانگریس کے لیے خصوصیت کے ساتھ زیادہ نازک تھی۔ دہشت پسندی نے ایسی فضا پیدا کر دی تھی جس میں پُر امن ڈائریکٹ ایکشن زیادہ دشوار ہو گیا تھا اور حکومت کے شدید ترین جبر و تشدد کا اثر نارکسٹ اور پُر امن دونوں تحریکوں پر یکساں پڑ رہا تھا۔ پولس اور مقامی حکام وہ قوانین اور آرڈی نینس جو دہشت پسندوں کے لیے

بنائے گئے تھے کانگریس مزدور اور کسان ورکرز پر بھی لاگو کیے جا رہے تھے۔ جیل کے بلوے روز مرّہ کے واقعات تھے جس میں حکام نہتّے سیاسی قیدیوں کو مارتے پیٹتے تھے۔"

"جواہر لال نہرو نے لکھا، دہشت پسندی کی مختلف زاویوں سے مذمت کی جا چکی ہے لیکن اس کے ایک ممکن نتیجہ سے مجھے خاص طور پر ڈر لگتا ہے اور وہ یہ کہ اس کے ذریعے سارے ملک میں اچانک فرقہ وارانہ تشدد پھیل جانے کا خطرہ ہے۔ جس قوم میں مذہب سے اتنی شدید وابستگی ہو اس قوم کے لیے دہشت پسندی کے تصور کا عادی ہو جانا بے حد خطرناک ہے۔ سیاسی قتل بے حد بُری شے ہے لیکن ایک سیاسی دہشت پسند کو سمجھا بجھا کر دوسرے سیاسی راستے دکھائے جاسکتے ہیں۔ مگر مذہب کے نام پر قتل دنیوی اور عالم بالا کے امور سے تعلق رکھتا ہے اور ان معاملات میں سمجھانے بجھانے یا عقلیت پرستی کا راستہ دکھانے کی کوشش بھی بہت دشوار ہے اور اکثر اوقات ایک سیاسی قتل ایک مابعد الطبیعاتی طریقے سے نیم مذہبی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ آج دہشت پسندوں کی قوم پرستی فسطائیت امپیریلیسٹ فاشزم کا مقابلہ کر رہی ہے۔"

"میں نے اپنی تقریروں میں دہشت پسندوں کی سخت مذمت کی لیکن دوسرے لیڈروں کی مانند ان لوگوں کو بزدل نہیں کہا۔ کیونکہ ایسے مردوں اور عورتوں کو جو اپنی جان کی بازی لگا رہے ہوں، بزدل کہنا خاصی حماقت ہے۔"

"جب میں کلکتے سے روانہ ہو رہا تھا تو دو نوجوان مجھ سے ملنے آئے۔ وہ مجھ سے بے حد خفا تھے کہ میں ان کی دہشت پسندی کے خلاف پرچار کر رہا ہوں۔ وہ دونوں پیلے، نروس، ذہین چہروں والے نوجوان تھے۔ میری ٹرین کا وقت نزدیک تھا۔ انھوں نے کہا کہ وہ اپنے کام میں میری مداخلت برداشت نہیں کریں گے اور اگر میں باز نہ آیا تو جو حشر انھوں نے دوسروں کا کیا ہے اسی طرح وہ میرا بھی فیصلہ کر دیں گے۔"

"اس رات، کلکتے سے روانہ ہوتے ہوئے اور ٹرین میں اپنی برتھ پر لیٹنے کے بعد مجھے ان نوجوانوں کے چہرے دیر تک پریشان کرتے رہے۔ جوش اور نروس انرجی سے بھرپور یہ لڑکے کیسے غلط راستے پر پڑ گئے تھے مجھے افسوس رہا کہ وقت اتنا کم تھا کہ ان نوجوانوں سے مفصل بات

چیت کر کے ان کو ملک کی خدمت اور حصولِ آزادی کے دوسرے راستے اختیار کرنے پر مائل کر سکتا تھا، ان راستوں پر ہمدردی اور قربانی کے مواقع کی کمی نہیں۔ پچھلے برسوں میں مجھے اکثر ان کا خیال آتا رہا ہے۔ مجھے ان کے نام کبھی نہ معلوم ہو سکے ہیں۔ سوچتا ہوں کہ وہ شاید مر چکے ہوں۔ یا انڈمان کی کسی کوٹھری میں پڑے ہوں"۔ 4

ہندوستان میں ستیہ گرہ جاری ہے۔ انڈمان میں دہشت پسند قیدیوں کو بھوک ہڑتال اور اموات کے خلاف احتجاج کرنے پر قید کر لیا گیا۔ ستمبر 1933 میں رہائی اور دوبارہ گرفتاری کے درمیان مختصر وقفے میں پنڈت نہرو نے ٹیگور اور سی ایف اینڈریوز وغیرہ کے دستخطوں کے ساتھ ایک اپیل شائع کی جس میں انڈمان کے سیاسی قیدیوں کے ساتھ بہتر سلوک اور ان کے جیلوں میں منتقل کرنے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ برطانیہ کے ہوم ممبر نے لندن میں اس اپیل پر شدید ناراضگی کا اظہار کیا اور سیاسی قیدیوں سے اظہار ہمدردی بنگال میں ایک قانونی جرم قرار پایا۔

انڈمان سے واپسی کے چند سال بعد دہرہ دون میں ایک صبح بھائی اور میں والد اور ایک رشتے دار مہمان کے ساتھ کہیں جاتے ہوئے ایک عمارت کے سامنے سے گذرے تو والدہ نے اچانک کہا" وہ دیکھو سامنے جواہر لعل بیٹھے ہیں"۔

جواہر لعل نہرو ایک چھوٹے سے سنسان برآمدے میں آرام کرسی پر بیٹھے تھے اور دونوں ہاتھ سر کے پیچھے رکھے دور پہاڑوں کو دیکھ رہے تھے سامنے کار رکتی دیکھ کر وہ کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں اور بھائی اتر کر نیچی دیوار کی طرف بھاگے جس کے سامنے وہ سپاہی ٹہلتا ہوا آ رہا تھا۔ جواہر لعل نہرو متبسم اور سوچ میں ڈوبے ہوئے چند لمحوں تک ہماری طرف دیکھتے رہے۔ سپاہی ٹہلتا ہوا ہماری سمت آیا۔ ڈرائیور نے ہارن بجایا۔ ہم لوگ کار کی طرف مڑے۔ پنڈت نہرو دوبارہ کرسی

پر بیٹھ گئے۔ کار آگے روانہ ہوگئی۔

”—— میں ساڑھے چودہ مہینے تک دہرہ دون جیل کی کوٹھری میں رہا۔ مجھے دوسرے جیلوں میں بہتر کوٹھریاں دی گئیں مگر دہرہ دون جیل کی ایک رعایت میرے لیے بے حد قیمتی تھی یہ جیل بہت چھوٹا تھا اور ہم لوگوں کو قید خانے کی فصیل سے باہر لیکن صرف احاطے میں اندر ہی ایک مختصر سی حوالات میں رکھا گیا تھا۔ یہ جگہ اتنی چھوٹی تھی کہ اس میں ٹہلنے، یا چلنے پھرنے تک کی گنجائش نہ تھی بس اتنی اجازت تھی کہ صبح وشام پھاٹک کے قریب ٹہل لیا کریں۔ یہاں سے ہمیں پہاڑ اور کھیت اور پبلک سڑک، جو کچھ فاصلے پر تھی“۔ یہ رعایت خصوصیت سے میرے لیے نہیں بلکہ سارے اے اور بی کلاس قیدیوں کے لیے تھی۔ صرف وہی انسان جو طویل سزا کے لیے اونچی دیواروں کے پیچھے محصور کر دیا گیا ہو اس چہل قدمی اور کھلی فضاؤں کے نظارے کی نفسیاتی قدر و قیمت کا اندازہ کر سکتا ہے۔ میں ان پہاڑوں کو جس سے مجھے عشق ہے، دیکھا کیا۔ کوٹھری میں سے مجھے پہاڑ نظر نہ آتے۔ لیکن وہ میرے تصور میں موجود تھے۔ مجھے ان کی قربت کا احساس تھا، میرے اور پہاڑوں کے درمیان گہری یگانگت پیدا ہوگئی۔ دہرہ دون کا موسم گل بے حد خوشگوار ہے۔“ جاڑے نے درختوں کو پتیوں سے عاری کر دیا تھا۔ جیل کے پھاٹک کے سامنے پیپل کے چار شاندار درخت بھی اپنے پتے دے چکے تھے کہ اچانک درختوں میں خفیف سی جنبش اور سرسراہٹ پیدا ہوئی اور ایک پُر اسرار سی کیفیت اور فضا چاروں طرف جو گویا پس منظر میں بے حد خفیہ کارروائیاں کی جا رہی ہوں اور پھر نہایت سرعت کے ساتھ لاکھوں نئی نویلی پتیوں نے دھوپ اور ہوا کے جھرد کے سے کھیلنا شروع کر دیا۔ لیکن برسات کے زمانے میں، پانی سے بچنے کے لیے تنگ و تاریک کوٹھری کے ایک کونے میں سکڑ کر بیٹھنا زیادہ خوشگوار نہیں تھا کیونکہ پانی چھت سے ٹپکتا اور مینہہ کی بوچھار کھڑکیوں میں سے اندر آتی۔ موسم خزاں دل آویز تھا لیکن جاڑوں میں جب طوفان باد و باراں آگھیرتا اور بڑے بڑے اولے ٹین کی چھت پر گولیوں کی باڑھ کی طرح گرتے تو ایک

نسبتاً ذرا سی گرمی اور تھوڑے سے آرام کی خواہش پیدا ہوتی۔ کوٹھری میں ان گنت بھڑیں اور مکھے تھے، چمگادڑیں جو اندھیرا پڑتے اڑتیں۔ ان سے سخت وحشت ہوتی۔ گھنٹوں میں چیونٹیوں، دیمک، چھپکلیوں، گلہریوں اور کبوتروں کو دیکھا کرتا۔ دہرہ دون جیل میں میناؤں کے ایک جوڑے نے کوٹھری کے دروازے کے اوپر اپنا گھونسلہ بنالیا تھا میں ان کو دانہ کھلاتا اور اگر ان کے کھانے کے وقت میں صبح وشام تھوڑی دیری ہو جاتی تو وہ میرے بالکل قریب آکر پُرشور احتجاج کرتے۔ دہرہ دون میں پرندوں کی افراط تھی۔ ہم ان کو دیکھ نہیں سکتے تھے کیونکہ حوالات کے صحن میں درخت نہیں تھے۔ صرف ان کی آوازیں سن سکتے تھے۔ میں نے ہوا میں بانکپن سے تیرتے ہوئے عقابوں کو دیکھا کہ اکثر جنگلی بطخوں کی ڈار سر پر سے گذر جاتی بچھو......عموماً اور برسات کے زمانے میں خصوصاً (ملک کے مختلف جیلوں میں) کوٹھریوں میں پائے جاتے۔ مجھے تعجب ہے کہ مجھے کبھی کسی بچھو نے ڈنک نہیں مارا۔ حالانکہ بچھو مجھے عجیب عجیب اور غیر متوقع جگہوں میں ملتے رہتے تھے۔ بستر پر، کسی کتاب کے اندر، تین چار سانپ بھی (مختلف جیلوں میں) میری کوٹھریوں کے اندر یا ان کے آس پاس پائے گئے۔ ان میں سے صرف ایک کی خبر باہر نکل گئی تو اخباروں نے جلی سرخیوں میں شائع کی۔[5]

اب مجھے یہ معلوم نہیں کہ پنڈت نہرو کو میں نے دہرہ دون میں جس برآمدے میں بیٹھا دیکھا انھیں اس کوٹھی میں نظر بند کیا گیا تھا یا اس وقت وہ آزاد تھے۔

تاریخ کا ایک پورا دور گذر جانے کے بعد 1957 میں یا شاید اس سے ذرا قبل کراچی جم خانہ کی ایک دعوت میں ایک فیشن ایبل اور بے حد حسین وجمیل بیگم صاحبہ سے میری ملاقات ہوئی جو کسی بہت زبردست وی آئی پی کی دوسری بیوی کی دعوت کی مہمان خصوصی تھیں۔ بیگم صاحبہ نے بے حد بلندی پر سے اور خاصے سرپرستانہ انداز میں مجھ سے دو چار باتیں کیں، جامِ مئے کو خالی پپائی پر رکھا اور برقِ تبسم گراتی دوسری طرف مڑنے لگیں تو میزبان نے نزدیک آتے ہوئے کہا

''ارے فرخندہ!...... یہ کیا تمھارا گلاس خالی پڑا ہے۔''

''اب نہیں......'' بیگم صاحب نے ہاتھ اٹھا کر نزاکت سے انکار کیا۔

''ارے بھئی، کالا پانی کاٹ چکی ہو اور کالا پانی پینے میں اتنا بخل......'' میزبان مصر ہوئے۔

اتنے میں بیگم صاحبہ کے وی آئی پی شوہر بھی اپنا گلاس تھامے قریب آکر بیٹھ گئے۔

کالے پانی کے نام پر میرے کان کھڑے ہوئے اور میں نے بیگم صاحبہ سے پوچھا:

''آپ کس زمانے میں تھیں کالے پانی میں؟''۔

انھوں نے نہایت خوب صورتی سے سنی اَن سنی کردی۔ رئین نے دوبارہ دریافت کیا ''کس زمانے میں؟''۔

زمانے سے آپ کا کیا مطلب ہے؟ بالآخر انھوں نے ذرا تیوری پر بل ڈال کر پوچھا''۔

اب دفعتاً مجھے سوجھ گیا اور میں نے بے ساختہ ذرا اونچی آواز میں کہا ''ارے آپ مولانا...... مولانا رب نواز کی لڑکی فرخندہ؟''

بیگم صاحبہ جو بہت دیر سے چہک رہی تھیں ایک دم چپ ہوگئیں اور مختصر اور ذرا خشکی سے کہا......''جی ہاں''۔

بھئی حد ہوگئی میں نے جگمگاتے ہوئے مجمع کو اسی بے وقوفی کے عالم میں مخاطب کیا۔ ''بھئی یہ تو فرخندہ جمال نکلیں۔ ان کے والد مولانا رب نواز اس قدر سویٹ تھے اور ایسے نڈر قیدیوں کے سامنے ایسے ایسے وعظ کہتے۔ پورٹ بلیئر میں' میں نے جواب دیا۔ ''خود سرکاری ملازم تھے لیکن ایسے لطیف پیرائے میں ایسی بڑی بڑی باتیں کہہ جاتے کہ لوگ کھل کر رہ جاتے۔ مگر وہ وعظ اس انداز سے کہتے تھے کہ ان کی کسی بات کو گرفت میں نہ لایا جاسکتا تھا'' اب مجھے مولانا کے متعلق وہ ساری باتیں یاد آتی جارہی تھیں جو بعد میں ایک مرتبہ والد نے بتائی تھیں۔ مثلاً یہ کہ مولانا ان قدیم وضع کے پٹھانوں کے کسی سید سے پہلی بار ملتے ہی زیر لب درود شریف پڑھنے لگتے ہیں۔

''وہ زمانہ بے حد خطرناک تھا......'' میں نے بات جاری رکھی۔ ''ہندوستان میں

ٹیررسٹ موومنٹ زوروں میں چل رہا تھا۔ انڈامان کے سیاسی قیدیوں پر گولیاں چلتی تھیں۔ تیسری گول میز کانفرنس تو ہو چکی تھی۔ بچنے کس سن میں ہوئی تھی۔ بھئی کمال ہے......'' وی آئی پی شوہر کبھی مجھے دیکھتے اور کبھی اپنی دلہن کو۔ فرخندہ بیگم میری سمجھ میں نہ آیا کہ کیوں اس قدر مجھ سے خفا نظر آ رہی تھیں۔

مولانا رب نواز......'' میں نے قریب کے صوفے پر بیٹھے ہوئے ایک بااقتدار، نئے سیاست داں کو جو اپنی سیاسی بددیانتی کے لیے بہت مشہور تھے مخاطب کیا۔ ''اس نسل کے فرد تھے جس نسل نے دیوزاد پیدا کیے — حالانکہ کوئی ان کا نام نہ تب کسی نے سنا ہوگا اور نہ اب کسی نے سنا ہے......وہ ایک فردتن اور غریب عالم اور صحیح معنوں میں مردِ مومن تھے۔''

میزبان نے اس دوران میں فرخندہ بیگم کے گلاس میں شراب انڈیل دی تھی۔ فرخندہ بیگم نے ذرا جھجک کر گلاس تپائی پر رہنے دی۔ سیاست داں نے پہلو بدل کر سگریٹ جلایا میں فضا کی ان Overtones سے قطعی بے خبر، اداسی سے کہتی رہی۔ ''مولانا رب نواز تھے آج برسوں بعد ایک دم اس طرح یاد آ گئے تو ایسا عجیب سا لگ رہا ہے۔ وہ مجھے الف بے پڑھاتے تھے۔ وہ بھی شروع کروانے والے تھے مگر ہم لوگ انڈامان سے جلد ہی واپس چلے آئے۔ وہ بھی کیا زمانے تھے...... ہیں نا فرخندہ بتا کیسے ہیں ان کو ضرور میرا آداب کہیے گا......اور آپ کی ای کیسی ہیں......؟ آپ ہی بتائیے ایسا اتفاق روز روز کیسے ممکن ہے کہ بچپن کے ساتھ کھیلے، اس طرح غیر متوقع دوبارہ نظر آ جائیں۔ مگر فرخندہ بیگم جلدی سے معذرت چاہ کر اٹھیں اور میزبان کے ساتھ ڈانس فلور پر چلی گئیں۔ دوسرے لمحے ان کے شوہر بھی جو عنقریب ایک مرکزی وزیر بننے والے تھے ایک خاتون کے ساتھ رقص کرنے کے لیے وہاں سے اُٹھ گئے۔ جب نامور سیاست داں بھی چند منٹ بعد دوسری طرف چلے گئے تو نزدیک بیٹھی ہوئی میری ایک سہیلی بیگم سراج نے آہستہ سے مجھ سے کہا ''تمھاری بے وقوفی کی بھی کوئی حد و انتہا نہیں......جانتی ہو اس وقت تم نے کیا غضب کیا'' کیا ہوا—؟'' میں نے تعجب سے پوچھا۔

''فرخندہ بیگم کی ابھی ابھی شادی ہوئی ہے۔ ان کی اوفیشل عمر محض بائیس تئیس برس کی

ہے اور تم ہو کہ بین اس کے شوہر غدر کے وقتوں کی بڑی بوڑھیوں کی طرح گڑے مُردے اکھیڑنے بیٹھ گئیں...... ہندوستان کا ٹیررسٹ موومنٹ...... اور گول میز کانفرنس اور یہ اور وہ...... لے کے ان کے شوہر کو بھونچکا کر دیا۔ اور مستقل بیگم صاحبہ سے جرح کیے جا رہی ہو کہ کس زمانے میں تھیں —

''یہ زمانے کی بھی ایک ہی رہی۔''

''اچھا...... تو یوں کہو......'' اب جا کر میری سمجھ میں آیا۔

''ان کے والد بے چارے کا بہت عرصہ ہوا انتقال ہو چکا ہے''۔

''ارے......'' میں نے رنج سے کہا ''اتنے سویٹ تھے۔ مجھے دھندلے دھندلے اب تک یاد ہیں''۔

''ٹھیک ہے۔ مگر آپ اس وی آئی پی مجمع کے سامنے یہ ثابت کرنے میں جٹی ہوئی تھیں کہ فرخندہ بیگم کسی بڑے آدمی کی بیٹی ہونے کے بجائے کسی نگوڑے جیل خانے کے سنکی واعظ کی بٹیا ہیں......''

میں نے ہکابکا ہو کر بیگم سراج کو دیکھا اور تب مجھ پر پہلی بار اچانک یہ انکشاف ہوا کہ میں ان لوگوں سے کسی دوسری زبان کا استعمال کر رہی تھی۔

''اینٹیں گرانے میں تمھارا کوئی ثانی نہیں ہے'' بیگم سراج نے ساری کا پلو سنبھال کر اٹھتے ہوئے کہا اور مسکراتی ہوئی ڈانس پارٹنر کے ساتھ ڈانس فلور پر چلی گئیں۔

دسمبر 1959 دہلی کے ورلڈ اگری کلچر فیئر میں ہندوستان کی ساری ریاستوں کے پویلین طرزِ تعمیر اور آرائش کے لحاظ سے تہذیبی روایات کے عکاس تھے...... اتر پردیش کی عمارت لکھنؤ کے امام باڑوں کی وضع کی بنائی گئی تھی۔ راجستھان اور آندھرا اور محل، ایلور اور بانس کے جھونپڑوں کے انداز کے تھے اور وہیں ٹروپیکل پودوں سے گھری ایک مصنوعی جھیل کے کنارے ایک بنگلے پر

میری نظر پڑی جس کی پیشانی پر ''انڈامان ونکوبار'' لکھا تھا۔ میں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر گئی۔ اندر دیواروں پر آزادی کے جزائر کی صنعتی اور تعلیمی ترقی کے اعداد وشمار کے گراف آویزاں تھے۔ سفید ساریوں میں ملبوس دو بنگالی لڑکیاں ایک کاؤنٹر پر تھیں جن پر گھریلو دستکاریوں کے نمونے سجے تھے۔

''یہ سامان سلور جیل کے قیدیوں نے بنایا ہے؟'' میں نے دریافت کیا۔

''سلور جیل......؟'' ایک لڑکی نے دہرایا۔ دوسری سیلز گرل اس کے قریب آئی۔

''سلور جیل تو عرصہ ہوا ختم ہو چکا۔ انڈمان اب پینل سیٹلمنٹ نہیں ہے۔ اب وہاں آزاد نئے انڈامانی بستے ہیں۔

''نئے انڈامانی......؟ میں نے پوچھا۔

''جی ہاں، مشرقی بنگال سے آئے ہوئے زراعت پیشہ رفیوجیوں کو وہاں بسایا گیا ہے۔ ہم دونوں بھی ایسٹ پاکستان کے رہنے والے ہیں''۔

''انڈامان سیاحوں کی جنت ہے''۔ پہلی لڑکی نے کہا ''کلکتے سے پورٹ بلیئر ہفتہ وار فضائی سروس بھی ہے کبھی آیئے!''

''ضرور......!'' میں نے اخلاق سے جواب دیا اور سامنے دیوار پر لگی آدی واسیوں یعنی جنگلی قبائل کے رقص کی تصویر دیکھنے لگی۔ ''انڈامانی'' قبیلے کے اب صرف تئیس افراد باقی ہیں۔ دوسرے قبائل کی تعداد چند سو رہ گئی ہے۔

گو قدیم حجری عہد ابھی مہذب انسان کی جبلت میں زندہ ہے مگر تاریک جنگلوں میں اس کے آثار ختم ہونے والے ہیں۔

میں دوسری طرف مڑی اور تب اچانک مجھے بارہ بنگلہ کی ایک بہت بڑی تصویر دکھلائی پڑی۔ بورہ بنگلہ......!! میں ٹھٹک کر گم سم اس تصویر کو دیکھنے لگی۔ بورہ بنگلہ جس میں اب جزائر کی حکومت کا کوئی اہم دفتر تھا۔ اپنے چوبی کھمبوں پر ایستادہ ثابت وسالم محفوظ اسی طرح اپنی پہاڑی پر موجود تھا۔ میں محویت سے اسے دیکھنے لگی۔ اس کے فرانسیسی دریچوں کے شیشے اس طرح

جھلملائے گویا جوابادہ مجھے گھور رہا ہو۔

بورہ بنگلہ کے سامنے ربڑ کے درختوں کا جھنڈ موجود تھا۔ مگر ان کے سائے میں کھیلتا آرتھر ویلز لے وہاں نہیں تھا۔ حوالدار رام چندر مولانا رب نواز اور نور محمد اور پرکاش چند اور بری ٹیوٹر اور مسٹر اینڈرسن نہیں تھے۔ ان دریچوں کے نیچے بیٹھ کر والد صبح کا اخبار پڑھتے تھے۔ سمندر کی سفید موجیں اسی طرح باغ کی ڈھلان سے ٹکرا رہی تھیں۔ زندگی، مجھے معلوم ہوا، اسی طرح جاری رہتی ہے۔ وقت بدل جاتا، ہے آگے بڑھ جاتا ہے۔

جیولوجیکل وقت میں گھرے انسان کی زندگی چیونٹی کی عمر سے بھی حقیر اور مختصر ہے مگر زندگی جاری رہتی ہے اور آگے بڑھتی ہے۔ وقت بدل جاتا ہے آگے بڑھ جاتا ہے۔

کیونکہ، اس لمحے۔ اس تصویر کے سامنے کھڑی میں وہ ہستی نہیں تھی جوان کمروں ان برآمدوں اور اس باغ میں کھیلتی اور کودتی پھاندتی تھی گلا پھاڑ کر روتی تھی، کھانے کے میز کے نیچے بلی کے ساتھ بیٹھ جاتی تھی۔ میں ایک دوسری، قطعاً مختلف ہستی تھی۔

بورہ بنگلہ مجھے گھورتا رہا۔ وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا۔ اتنے طویل عرصے کے بعد جو تم میرے سامنے آئی ہو تو مجھے بتاؤ کہ مجھ سے کیا کہنا چاہتی ہو۔ اتنے عرصے، تم نے زندگی میں کیا کیا......؟ اور مجھے سنانے کے لیے تمھارے پاس کیا ہے؟

میں جلدی سے کاؤنٹر کی طرف مڑی۔ ''نئی انڈا مانی'' سیلز گرل نے اناناس کے ریشے سے بنا ایک شاپنگ بیگ پیش کیا...... ''واجبی قیمت لی بیگ تھا خوب صورت اور بہت مضبوط!''

اگر میں اس لڑکی کو بتاتی کہ کسی زمانے میں، میں اس دیوار پر آویزاں تصویر کے اندر رہتی تھی تو اسے کتنا عجیب لگتا۔

یہ لڑکی ایک دوسری نسل سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کے دکھ دوسرے تھے۔ اس نسل کی قسمت میں جتنے دکھ لکھے تھے، سہہ چکی تھی۔ وہ آزاد برصغیر Root Less نوجوان پیڑھی کی ایک فرد تھی۔ وہ لوگ جنھوں نے پچھلے پچاس برس تک آزادی کی لڑائی لڑی ان کے قدم کے نیچے ان کی اپنی دھرتی تھی جس کی پائندگی اور تابندگی کی خاطر وہ لڑے تھے۔ مگر اس نئی نسل کے قدموں کے نیچے

سے زمین نکل چکی تھی۔ اس نسل میں ریفیو جی تھے اور نئے کلیت پسند تھے۔ اور ٹیڈی نوجوان تھے۔ منزل پر پہنچ کر منزلیں دھندلا گئی تھیں۔

بورہ بنگلہ کی تصویر نے دوبارہ مجھے اپنی طرف متوجہ کیا اور اس پر نظر ڈال کر میں نے پھر خود کو یقین دلانا چاہا کہ اس شگفتہ آرٹسٹک پویلین کے اندر موجود، میں ایک مختلف ہستی ہوں۔

بورہ بنگلہ مجھے گھورتا رہا۔

شاید میں اب بھی وہی بے وقوف، حیرت زدہ ہستی تھی جس کے خیال میں سمندر مزدوروں نے کھودا تھا، مسٹر اینڈرسن اپنی ٹانگیں علاحدہ کر کے گھر پر رکھ جاتے تھے اور قاعدہ گڑیا کا گھر تھا۔ اور یہ پرانی چوبی عمارت میری اس حقیقت سے واقف تھی۔ اس کی نظروں سے بچنے کے لیے میں تیز تیز قدم رکھتی پویلین سے نیچے اتر آئی۔

نومبر 1961 کلکتے کے مہاجتی سدن میں للت کلا کیندر کی سالانہ میوزک کانفرنس شروع ہونے میں کچھ ہی دیر تھی۔ بڑے غلام علی خاں، بسم اللہ خاں، مشتاق علی خاں، بیگم اختر اشتیاق اور دوسرے بڑے بڑے فن کاروں کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے باہر سڑک پر بھیڑ جمع ہو چکی تھی لیکن ہال ابھی خالی پڑا تھا۔ میرے ساتھی زینے کے نیچے باتوں میں مصروف تھے میں ٹہلتی ہوئی ہال کے اندر چلی گئی اور ہال کی دیواروں پر آویزاں روغنی تصاویر کی قطاروں نے مجھے اپنی طرف متوجہ کیا۔ سارے ہال میں کئی سو (100) تصویریں رہی ہوں گی۔ جن کے نچلے کونوں میں بنگال کے نامور فن کاروں کے دستخط تھے۔ یہ کس قسم کی پورٹریٹ گیلری ہے میں نے ذرا تعجب سے سوچا اور نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی ان تصویروں کے قریب گئی۔

......متجسس، بے چین آنکھیں، پُرسکون آنکھیں اداس تبسم، مطمئن، شانت تبسم، مسرور چہرا۔ سنجیدہ چہرے، مضطرب اور سوچتے ہوئے چہرے۔ یہ کون لوگ ہیں......؟ حیرت کے ساتھ میں نے تصاویر کے نیچے پیتل کی چھوٹی تختیوں پر منعکس نام پڑھنے شروع کیے۔

خودی رام باسو	ــــــــــــ	پھانسی 1908
پرفلا چکی	ــــــــــــ	جیل میں خودکشی 1908
اشفاق اللہ	ــــــــــــ	پھانسی 1929
بھگت سنگھ	ــــــــــــ	پھانسی 1931
پرتی لتا دادیدا	ــــــــــــ	خودکشی 1932
راجندر لہری	ــــــــــــ	پھانسی 1927
گوپی ناتھ ساہا	ــــــــــــ	پھانسی 1924
جیتش گوہا	ــــــــــــ	پولیس کے مظالم سے مرے 1930
دیب پرشاد گپتا	ــــــــــــ	گولی ماردی گئی
ماتانگنی ہاجرہ	ــــــــــــ	پولیس کی گولی سے شہید 1942
سدھیر کمار بوس	ــــــــــــ	انڈامان میں بھوک ہڑتال سے مرے

......میں ٹھٹھک گئی......سدھیر کمار بوس......انڈامان میں......بھوک ہڑتال سے مرے۔

اچانک میں نے محسوس کیا کہ میرے پیچھے کوئی کھڑا ہے۔

''یہ......یہ میرے بڑے بھائی تھے......'' میں نے پلٹ کر دیکھا۔ایک خستہ حال کھچڑی بالوں والا دبلا پتلا آدمی میرے پیچھے کھڑا مجھ سے کہہ رہا تھا......'' آپ تصویروں کو بڑے دھیان سے دیکھ رہی تھیں......'' اس نے میرے برابر آکر کہنا شروع کیا'' آپ تو ان کے نام بھی نوٹ کرتی جارہی ہیں۔آپ کیا جرنلسٹ ہیں......؟''

''میں شاید آپ کے بھائی کی ایک جھلک دیکھ چکی ہوں''۔

''دادا کو دیکھ چکی ہیں آپ......؟ یہ کیسے ممکن ہے؟'' اس نے بے حد تعجب سے پوچھا۔

''......آ......کم آن ہنی (Honey)......'' ایک گورا چٹا ٹیڈی بوائے اپنے بے حد نوکیلے جوتوں پر تیرتا ہوا آکر میرے اور تصویر کے درمیان حائل ہوگیا جہاں سے وہ اپنی گرل فرینڈ کو آواز دے رہا تھا جو ہال کے دوسرے سرے پر شاید اپنی کرسی تلاش کررہی تھی۔

''ہائی ڈوپ...... کم آن ہیر......'' لڑکی ے جو بے حد تنگ شلوار اور اس سے بھی زیادہ تنگ قمیص میں جکڑی ہوئی تھی، ٹیڈی بوائے نے جواباً پکارا۔ ٹیڈی بوائے اسی طرح نوکیلے جوتوں پر تیرتا ہوا آگے نکل گیا۔ اس کی چست سیاہ پتلون کی نازک کمر پر بندھی ہوئی نقرئی پیٹی روشنی میں جگمگا رہی تھی۔

مدقوق بنگالی نے پھر مجھ سے بات شروع کیا۔ ''میں بھی کرانتی کاری تھا[6]۔ آدھی زندگی جیل میں کاٹی''۔ اس نے اداسی سے کہا...... آپ...... آرٹیکل لکھیں گی......؟

''شاید...... پتہ نہیں......؟

''میرا نام پربودھ کمار بوس ہے۔ میں باریسال کا رہنے والا ہوں۔ دادا کے انڈامان جانے وقت میں اسکول میں تھا۔ دادا کے غم میں روتے روتے میری ماں بھی مرگئی۔ مگر میں اسکول سے نکلتے ہی موومنٹ میں شامل ہوگیا اور جیسور میں پکڑلیا گیا۔ بارہ برس تک میں علی پور جیل میں بند رہا۔ آزادی کے بعد آزادی ملی۔ تب میرا ضلع دوسری طرف جاچکا تھا۔ اب میں......اب میں......''

''ٹیڈی بوائے برق رفتاری سے پھر واپس آیا۔ اب کے اس کے ساتھ چند امریکن بیٹ نک (Beatnik) تھے۔ جن میں سے کچھ نے سیاہ شیروانی، چوڑی دار پائجامہ اور ایک کلائی میں چاندی کا کڑا پہن رکھا تھا۔ دوسرے امریکن بیٹ نک نے خاکی نیکر پر بنگالی کرتا پہنا ہوا تھا۔ تیسرے امریکن بیٹ نک نے مغربی لباس ہی پر اکتفا کیا تھا مگر وضع قطع سے لڑکی معلوم ہورہا تھا۔ امریکن بیٹ نک لڑکی کے حلیے سے لڑکا دکھائی دے رہی تھی۔ یہ سب اسٹیج کے نیچے کھڑے اس انگریز لڑکی شرلے کی سمت جارہے تھے جو ہندستانی رقص سیکھنے کے لیے انگلستان سے آئی ہوئی تھی اور برجو مہاراج کی شاگردی میں کتھک کی مہارت حاصل کرنے کے بعد آج شام اپنے فن کا مظاہرہ کرنے والی تھی۔ ہندستانی ٹیڈی بوائے نے مدقوق انقلابی کو بازو کی ایک جنبش کے ساتھ اپنے راستے سے ہٹایا اور اپنے بیٹ نک مہمانوں کے ہم راہ آگے بڑھ گیا۔

عین اسی وقت مارواڑی سیٹھوں، سوسائٹی لیڈیز، پروفیشنل انٹیلکچوئلز اور کلچرولچرز

(Culture Vultures) کا ایک ریلا برابر کے دروازے سے ہال میں داخل ہوا۔ اور مدقوق انقلابی اس ریلے میں نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ میں نے اس کی تلاش میں چاروں طرف دیکھا۔ میں اس سے کہنا چاہتی تھی کہ میں اس کے دادا کی کہانی ضرور لکھوں گی۔ میں اس سے کہنا چاہتی تھی کہ میں تو سارے برصغیر کی کہانی جاننا اور لکھنا چاہتی ہوں۔ مگر یہ کہانی سننے اور سنانے کے لیے محض ایک حیاتِ مستعار بے حد ناکافی ہے...... میں تو اس سے پوچھنا چاہتی تھی کہ کیا اس کے دادا ہی وہ جوشیلے نوجوان تو نہیں تھے جو غصے میں بھرے پنڈت جی کے پاس پہنچے تھے...... مگر وہ گمنامی، تباہ حال کرانتی کاری اس زرق برق، بے پروا، خوش باش، آسودہ حال مجمع میں کہیں کھو چکا تھا۔

اسٹیج پر جل ترنگ بجنا شروع ہوگئی۔ 7

('نقش' کراچی، افسانہ نمبر، 1967، 'نقوش' لاہور، اپریل- جون 1966)

حواشی:

1. آرتھر ولزلے
2. جلیل قدوائی کے نام یلدرم کے ایک خط سے اقتباس
3. دکھایئے لے جاکے تجھے مصر کا بازار   خواہاں نہیں لیکن یہ کسی جنسِ گراں کا
4. سوانح عمری از جواہر لعل نہرو۔ جو جیل میں لکھی گئی اور 1936 میں شائع ہوئی۔
5. سوانح عمری از نہرو۔
6. انقلابی
7. یہ کہانی میں نے پچھلے سال لکھی تھی۔ حال ہی کی خبر ہے کہ چچا محمد، ایک پرانے انقلابی جن کی پھانسی کی سزا حبسِ دوام میں تبدیل کردی گئی تھی اور جو بیس برس تک انڈامان میں قید رہے، پچھلے دنوں انھوں نے لاہور میں گمنامی اور شدید مفلسی کے عالم میں انتقال کیا۔

درچمن ہر ورقی دفترِ حالِ دگرست

ہا ئیکسوس دور کے بعد ان پچھلی ساری صدیوں میں مصر میں مقیم بنی اسرائیل پر مظالم کی زیادتی ہوتی گئی۔ ''اور ایک مدت کے بعد یوں ہوا کہ فرعون مصر مر گیا۔ اور خدا نے بنی اسرائیل کا کراہنا سنا اور خدا نے اپنے عہد کو جو اس نے ابراہیمؑ اور اسحٰقؑ اور یعقوبؑ کے ساتھ کیا تھا یاد کیا۔

''اور موسیٰ اپنے خسر[1] تیرو کی جو مدیان کا کاہن تھا بھیڑ بکریاں چراتا تھا اور انھیں ہنکاتے ہوئے بیابان کی پرلی طرف الوہی پہاڑ حورب کے نزدیک لے گیا اور خداوند کا ایک فرشتہ ایک جھاڑی میں سے آگ کے شعلے میں اس پر ظاہر ہوا اور موسیٰ کیا دیکھتا ہے کہ جھاڑی میں آگ لگی ہوئی ہے پر وہ جھاڑی بھسم نہیں ہوتی ہے۔ تب خدا نے جھاڑی میں سے پکارا: اے موسیٰ! اے موسیٰ کیا تو دیکھتا ہے کہ جھاڑی میں آگ لگی ہوئی ہے پر وہ جھاڑی بھسم نہیں ہوتی۔ تب خدا نے کہا۔ اِدھر پاس مت آ۔ اپنے پاؤں سے جوتا اُتار۔ کیونکہ جس جگہ تو کھڑا ہے وہ مقدس زمین ہے۔''

(انجیل مقدس: کتاب خروج)

''پھر جب موسیٰ اس آگ کے پاس پہنچا آواز آئی میدان کے داہنے کنارے سے برکت والی زمین اس درخت سے کہ اے موسیٰ میں

ہوں۔ اللہ: جہان کا رب۔ پھر کہا۔ میں ہوں تیرا پروردگار تیرا۔ پس اُتار
ڈال دونوں جوتیاں۔ تو طویٰ کی مقدس وادی میں ہے۔"
(قرآن حکیم)

"اور موسیٰ نے اپنا منہ چھپایا کیونکہ وہ خدا پر نظر کرنے سے ڈرتا
تھا اور خدا نے کہا کہ میں اپنے بندوں کی تکلیف سے واقف ہوں۔ سو
آ میں تجھے فرعون کے پاس بھیجتا ہوں کہ تو بنی اسرائیل کو مصر سے نکال
لائے۔ تب موسیٰ نے کہا جب میں بنی اسرائیل کے پاس جا کر کہوں کہ
تمھارے باپ دادا کے خدا نے مجھے تمھارے پاس بھیجا ہے اور وہ مجھ سے
پوچھیں کہ اس کا نام کیا ہے تو میں اُن کو کیا بتاؤں؟ تب خدا نے جواب دیا
میں وہ ہوں جو میں ہوں سو تو بنی اسرائیل سے یوں کہنا کہ میں وہ ہوں جو
میں ہوں تمھارے باپ دادا کے خدا نے مجھے تمھارے پاس بھیجا ہے۔"
(کتاب خروج۔ باب-3)

چنانچہ موسیٰ 1227 ق م میں اپنی قوم کو مصر سے نکال لے گئے اور
انجیل کے مطابق "بیابان میں خداوند کا فرشتہ اس قافلے کو دن میں راستہ
دکھانے کی خاطر بادل کے ستون میں اور رات کو روشنی دینے کے لیے
آگ کے ستون میں ہو کر ان کے آگے آگے چلا کرتا تھا۔"

اس کے بعد خدا نے موسیٰ کو کوہِ سینا پر احکام و شریعت عطا کی "اور تیسرے دن صبح کو رعد کی کڑک اور چمک کے ساتھ صور پھونکنے کی آواز آئی اور خداوند کا جلال کوہِ سینا پر آ کر ٹھہرا اور پہاڑ پر گھٹا چھا گئی اور ساتویں دن اس گھٹا میں سے خدا نے موسیٰ کو بلایا اور موسیٰ گھٹا میں سے ہو کر پہاڑ پر چڑھا اور چالیس دن اور رات وہاں رہا۔" اور کتاب خروج کے مطابق اس وقت خدا نے موسیٰ کو اپنے مسکن اور خیمۂ اجتماع کی آرائش کی تفصیلات، شہادت نامہ رکھنے والے صندوق کی پیمائش، قربانیوں، کفاروں، عقیقہ وغیرہ کی رسوم، کاہنوں کے فرائض ان کی پوشاک اور قربان گاہ کے پردوں کی کتر بیونت، زیبائش، رنگ، کپڑوں کی اقسام، طلائی شمع دانوں، مقدس ظروف، مسح کرنے کے تیل، مقدس روٹی، خوشبودار بخور، حلال حرام و مکروہ غذا وغیرہ وغیرہ کی مکمل تفصیلات

موسیٰ کو بتلائیں اور کہا ''بنی اسرائیل سے کہہ میرے احکام اور آئین پر عمل کریں۔ برے کاموں سے آلودہ نہ ہو جانا کیونکہ جن قوموں کو میں تمھارے آگے سے نکالتا ہوں وہ برے کاموں میں آلودہ ہیں۔ جو مکروہ رسمیں تم سے پہلے کی جاتی تھیں اُن میں نہ پھنس جانا۔ لیکن اگر تم میرے خلاف چلوگے تو میں بھی تمھارے خلاف چلوں گا۔ تمھاری سورج[2] کی مورتیوں کو توڑ ڈالوں گا۔ تمھاری لاشیں تمھارے شکستہ بتوں پر ڈال دوں گا۔ تمھارے شہر ویران کردوں گا۔ وبائیں بھیجوں گا۔ اور تم کو غیر قوموں میں پراگندہ کردوں گا۔''

کتاب خروج کے مطابق خدا نے موسیٰ کے بھائی ہارونؑ کو اپنا کاہن مقرر کردیا تھا اور حکم دیا تھا کہ کہانت کا عہدہ نسل در نسل ہارونؑ کی اولاد کے لیے مخصوص ہے (یورپ اور امریکہ میں COHEN ایک عام یہودی خاندانی نام ہے اور ان کنبوں کے بڑے بوڑھے اپنا سلسلۂ نسب ہارونؑ سے ملاتے ہیں) کچھ عرصے بعد یہود کے موروثی کاہن بے حد بااقتدار ہوئے (اسی زمانے میں ہندوستان میں برہمن پروہت اپنا زور باندھ رہا تھا اور ایران میں مجوسی موبد طاقت حاصل کرنے والے تھے) اس سلسلے میں انجیل میں ایک دلچسپ حکایت یہ بھی موجود ہے کہ ایک اسرائیلی نے جس کا نام قورح تھا (اسلامی روایت کا قارون خزانے والا) گویا اپوزیشن پارٹی بنا کر ہارون کی کہانت کے خلاف موسیٰ سے سخت احتجاج کیا کہ ''جماعت کا ایک ایک آدمی مقدس ہے اور خدا اُن کے درمیان رہتا ہے۔ تم اپنے آپ کو خداوند کی جماعت سے بڑا کیوں گردانتے ہو؟'' قصہ مختصر دوسرے روز قہرِ الٰہی قورح پر نازل ہوا اور ''زمین نے اپنا منہ کھول دیا اور قورح اور اس کے گھر بار اور مال و اسباب کو نگل گئی'' اور یہ واقعہ ''بنی اسرائیل کے لیے یادگار رہا کہ کوئی غیر شخص جو ہارون کی نسل سے نہیں خداوند کے حضور بخور جلانے کے نزدیک نہ جائے تا کہ وہ قورح اور اس کے ساتھیوں کی طرح ہلاک نہ ہو۔ جیسا کہ خداوند نے اس کو موسیٰ کی معرفت بتلا دیا تھا۔''

(کتاب اعداد)

صحرانوردی کے دوران خدا کے حکم سے موسیٰ نے اپنے بارہ اسباط کے سردار دشت فاران سے آگے بھیجے کہ جو موعودہ ملک کنعان کا حال دریافت کرکے لائیں۔ چنانچہ انھوں نے

واپس آ کر رپورٹ دی کہ "جو لوگ وہاں بسے ہوئے ہیں وہ زور آور ہیں اور اس کے شہر بڑے بڑے اور فصیل دار ہیں اور ہم نے بنی عناق کو بھی وہاں دیکھا۔ اس ملک کے جنوبی حصے میں عمالقہ آباد ہیں اور حتی اور عموری پہاڑوں پر رہتے ہیں اور ساحل سمندر پر یردن کے کنارے کنعانی بسے ہوئے ہیں۔ تب کالب نے موسیٰؑ کے سامنے ان لوگوں کو چپ کرایا اور کہا چلو ہم ایک دم جا کر اس ملک پر تصرف کر لیں۔ لیکن جو اور آدمی اس کے ساتھ گئے تھے وہ کہنے لگے کہ ہم اس لائق نہیں کہ ان لوگوں پر حملہ کریں اور ہم نے بنی عناق کو دیکھا جو جباروں کی نسل سے ہیں اور ہم تو اپنی نگاہ میں ایسے تھے جیسے ٹڈے۔ اور ایسے ہی اُن کی نگاہ میں تھے [3]

> "تب ساری جماعت زور زور سے چیخنے لگی اور وہ لوگ رات بھر روتے رہے اور کل بنی اسرائیل موسیٰؑ اور ہارونؑ سے شاکی ہوئے اور کہا اے کاش ہم مصر ہی میں مرجاتے۔ یا اس بیابان ہی میں موت آتی۔ تو کیوں ہمیں اس ملک میں لے جا کر قتل کروانا چاہتا ہے۔ تب موسیٰ اور ہارونؑ سجدے میں گرے۔ یشوع بن نون اور کالب بن یفنہ جو حال دریافت کر کے آئے تھے اپنے اپنے کپڑے پھاڑ کر جماعت سے مخاطب ہوئے، وہ ملک نہایت اچھا ملک ہے اگر خدا ہم سے راضی ہے تو وہ ہمیں اس ملک میں جہاں دودھ اور شہد بہتا ہے پہنچائے گا۔ تم خداوند سے بغاوت نہ کرو، تب جماعت چلائی کہ ان کو سنگسار کرو۔ اس خیمہ اجتماع کے سامنے خدا کا جلال نمایاں ہوا۔ اور خداوند نے موسیٰ سے کہا یہ لوگ کب تک میری توہین کرتے رہیں گے اور میرے پیغمبروں پر ایمان نہیں لائیں گے؟"

(کتاب اعداد باب 13 و 14)

چنانچہ خدا نے ان کو یہ سزا دی کہ وہ چالیس سال تک بیابان میں بھٹکتے رہے اور مزید سرکشی اور نافرمانیاں کرتے رہے۔ اطراف کے حکمرانوں کے ہاتھ قتل ہوئے اور موسیٰ کو جی بھر کے ستایا۔ انجیل کے مطابق وہ دشت صین میں آئے اور شہر قادس میں رہنے لگے۔ "اور وہاں موسیٰ کی بہن مریم نے وفات پائی اور وہاں پانی نہ تھا۔ چنانچہ بنی اسرائیل پھر موسیٰؑ سے جھگڑنے لگے

کہ مصر سے کیوں نکالا۔ تب موسیٰؑ اور ہارونؑ خیمہ اجتماع کے آگے سجدے میں گرے اور خداوند نے کہا اے موسیٰ اپنا عصا چٹان پر مار کر پانی نکال اور موسیٰؑ اور ہارونؑ نے جماعت سے پوچھا۔ اے باغیو کیا ہم تمھارے لیے اس چٹان سے پانی نکالیں؟ اور ضربِ کلیم نے چٹان سے پانی برآمد کیا۔ مگر موسیٰؑ اور ہارونؑ سے خدا نے کہا کہ چونکہ تم نے میرا یقین نہیں کیا کہ جماعت کے سامنے میری تقدیس کرتے اس لیے اپنی اُمت کو ملک موعودہ تک نہیں پہنچا پاؤ گے۔ پھر موسیٰؑ نے ادوم کے بادشاہ کے پاس ایلچی بھیجا کہ تیرا بھائی اسرائیل عرض کرتا ہے ہم تیری سرحد پر قادس میں ہیں۔ سو ہمیں اپنے ملک میں سے ہو کر جانے کی اجازت دے۔ ہم تیرے کھیتوں اور تاکستانوں میں سے ہو کر نہیں گذریں گے۔ نہ کنوؤں کا پانی پئیں گے اور اگر پیا تو اس کے دام دیں گے اور سیدھے سڑک سڑک نکل جائیں گے مگر بادشاہ اس عاجزانہ درخواست کے جواب میں فوج لے کر ان پر آن پڑا۔ چنانچہ بنی اسرائیل اس کی طرف سے مڑ گئے اور ہارونؑ نے راستے میں انتقال کیا اور بہ حکم خدا موسیٰ نے عزرا ابن ہارونؑ کو کہانت کا لباس پہنایا۔ پھر خدا کے حکم سے کنعانیوں کا قلع قمع کر کے بنی اسرائیل نے بحرِ قلزم کا راستہ لیا۔ مگر ان کی جان اس راستے سے عاجز آ گئی۔ پھر انھوں نے بہ رضائے الٰہی عموریوں کے علاوہ عوج بن عنق اور اس کے لشکر کا بھی بھُرتہ بنا دیا اور موآب کے میدان میں یریحو کے مقابل خیمہ زن ہوئے اور موآب کا بادشاہ بالق بن صفور ان کی کثرت سے خائف ہوا۔ عابد بلعم بن باعور نے اُن کے حق میں دُعا کی اور کہا "چٹانوں کی چوٹی پر سے وہ مجھے نظر آتے ہیں اور پہاڑوں پر سے میں ان کو دیکھتا ہوں۔ دیکھ! یہ وہ قوم ہے جو اکیلی بسے گی اور دوسری قوموں کے ساتھ مل کر اس کا شمار نہ ہوگا۔ اے یعقوب! تیرے خیمے کیسے خوشنما ہیں اور وہ ایسے قوموں کے ساتھ مل کر اس کا شمار نہ ہوگا۔ اے یعقوب! تیرے خیمے کیسے خوشنما ہیں وہ ایسے پھیلے ہیں جیسے وادیاں اور دریا کے کنارے باغ اور خداوند کے لگائے ہوئے عود کے درخت اور ندیوں کے کنارے دیودار کے جھنڈ اور یعقوب میں سے ایک ستارہ نکلے گا جو باقی ماندہ قوموں کو نابود کر ڈالے گا۔ عمالقہ کا انجام بھی ہلاکت ہے اور قین بھی خانہ خراب ہوگا اور اشور تجھے اسیر کر کے لے جائے گا۔ پر کتیم کے ساحل سے جہاز آئیں گے اور وہ اشور اور عبر دونوں کو دکھ دیں

گے۔ پھر وہ بھی ہلاک ہو جائیں گے۔ اس کے بعد بلعم اٹھا اور اپنے ملک کو روانہ ہو گیا۔"

مگر اب بنی اسرائیل نے جو موآب میں سکونت اختیار کر چکے تھے۔ موآبی خواتین کے چکر میں پڑ کر بعل کی پوجا شروع کر دی۔ اور سزا کے طور پر خدا نے اُن میں سے 24 ہزار کو وہاں ہلاک کر دیا۔ بعدازاں بہ حکم خدا موسیٰؑ نے بنی اسرائیل کی مردم شماری کروائی تا کہ اُن کے بارہ اسباط کو موعودہ زمین قرعہ ڈال کر میراث کے طور پر بانٹ دی جائے۔ پھر خداوند نے موسیٰؑ سے کہا اے موسیٰؑ تو عباریم کے اس پہاڑ پر چڑھ کر اس ملک کو جو میں نے بنی اسرائیل کو عنایت کیا ہے دیکھ لے اور جب تو اسے دیکھ لے گا تب تو بھی اپنے اجداد سے اپنے بھائی ہارونؑ کی طرح جا ملے گا۔ کیونکہ دشت صین میں پانی کے چشمے پر تو نے میرے حکم سے سرکشی کی۔" اس کے خداوند نے یوشع کو موسیٰؑ کا جانشین مقرر کیا۔ اور خدا سے اس مکالمے کے بعد جو چالیسویں برس کے گیارھویں مہینے کی پہلی تاریخ تھی، موسیٰؑ نے دشت موآب میں اپنی اُمت کو آخری بار احکام شرع سمجھائے اور کہا کہ اب خدا تمھیں کنعان پر قبضہ کرنے کے لیے بھیجتا ہے۔" اور میں نے خدا سے منت کی کہ مجھے بھی یردن پار جانے دے تا کہ میں کنعان اور اس خوشنما پہاڑ اور لبنان کو دیکھ لوں لیکن خداوند تمھاری وجہ سے مجھ سے ناراض تھا اور اس نے میری نہ سنی اور کہا۔ اے موسیٰؑ بس کر۔ اس مضمون پر مجھ سے کبھی کچھ نہ کہنا۔ تو پہاڑ پر چڑھ کر اس ملک پر نظر ڈال لے مگر تو یردن پار نہیں جانے پائے گا اور اب اے اسرائیل! جو آئین اور احکام میں سکھاتا ہوں ان پر عمل کرو۔ اور خداوند تمھارا خدا رحیم و کریم ہے اور ابتدائے آفرینش سے اب تک اتنی بڑی واردات سننے میں کبھی آئی کہ کیا کبھی کوئی قوم خدا کی آواز جیسی تو نے سنی آگ میں سے آتی ہوئی، سن کر زندہ بچی ہے؟ یہ سب تجھے دکھایا گیا کہ خدا کے علاوہ اور کوئی معبود نہیں ہے۔ سن لے اے اسرائیل آج تجھے یردن پار اس لیے جانا ہے کہ مشرکوں کے سارے بت توڑ ڈالے۔ خداوند تیرا خدا آگے آگے بھسم کرنے والی آگ کی طرح پار جا رہا ہے اور وہ ان اقوام کو فنا کر دے گا۔ مگر یہ نہ سمجھنا کہ تمھاری صداقت کی وجہ سے خداوند تمھارا خدا اس ملک پر تمھارا تصرف کرنے والا ہے۔ وہ ان قوموں کو ان کی شرارت کی وجہ سے تیرے آگے سے خارج کرتا ہے۔ پس اے اسرائیل خدا سے ڈر جو الٰہوں کا اللہ ہے جو

رُو رعایت نہیں کرتا نہ رشوت لیتا ہے اور تم اس کے احکام پر عمل کرو۔ تو لبنان سے اور دریائے فرات[4] سے مغربی سمندر تک تمھاری سرحد ہوگی۔ لیکن تو نے خدا کی نافرمانی کی تو سلطنتوں کے بیچ مارا مارا پھرے گا اور تیرے تلووں کو آرام نہ ملے گا۔ میں تو آج کے دن ایک سو اکیس برس کا ہوں۔ میں اب چل پھر نہیں سکتا اور بہ حکم خدا یردن پار نہیں جاسکتا۔ اب یشوع تیرے آگے آگے پار جائے گا اور جب تو اس ملک میں پہنچے تو وہاں کے پھل خدا کے مذبح میں پیش کر کے کہو کہ میرا باپ ایک ارمی تھا جو مرنے والا تھا وہ مصر میں جا کر رہا اس کی قوم تھوڑی سی تھی مگر وہ ایک زور آور اور کثیر التعداد قوم بن گیا اس وجہ سے مصریوں نے اسے دکھ دیے اور خدا ہمیں وہاں سے نکال کر اس ملک میں لایا جہاں دودھ اور شہد بہتا ہے۔ اے اسرائیل! خاموش ہو جا اور سن۔ تو آج کے دن خداوند اپنے خدا کی قوم بن گیا۔ لیکن تو جیتے جی میری جو نافرمانی کرتا رہا تو میرے مرنے کے بعد کیا کچھ نہ کرے گا۔ پھر موسیٰؑ نے کہا سنو اے آسمانو اور اے زمینو! میں بولوں گا اور میری تعلیم مینہ کی طرح برسے گی۔ میری تقریر شبنم کی طرح ٹپکے گی۔ جیسے نرم گھاس پر پھوار پڑتی ہو اور سبزے پر بارش کی جھڑیاں۔ اے کم عقلو! کیا خداوند تمھارا باپ نہیں جو یعقوب کو ویرانے، ہولناک بیابان میں ملا۔ اور جس نے بنی اسرائیل کی اس طرح حفاظت کی جیسے عقاب اپنے گھونسلے ہلا ہلا کر اپنے بچوں پر منڈلاتا ہے! مبارک ہے تو اسرائیل کہ خدا تیری سپر اور تیرے جاہ و جلال کی تلوار ہے۔ اس کے بعد موسیٰؑ کوہ نبو کی چوٹی پر چڑھ گیا جو یریحو کے مقابل ہے اور خدا نے ممالک موعودہ اسے دکھائے اور پھر خدا کے بندے موسیٰؑ نے وہیں موآب کے ملک میں رحلت کی اور اسے موآب کی ایک وادی میں بیت فعوز کے مقابل دفن کیا گیا۔ پھر آج تک کسی انسان کو اس کی قبر کا علم نہیں۔ اور بنی اسرائیل اس کے لیے تین دن تک روتے رہے اور اس وقت سے اب تک بنی اسرائیل میں کوئی نبی موسیٰؑ کی مانند جس نے خدا سے روبرو باتیں کیں، نہیں اُٹھا۔ (کتاب استثنا)

حضرت موسیٰؑ کی وفات کے بعد یوشعؑ کی قیادت میں بنی اسرائیل نے آگے بڑھ کر یریحو پر دھاوا بولا۔ ''اور اسرائیلی کاہنوں نے مینڈھے کے سینگوں کے قرنے یعنی نرسنگے اتنی زور سے پھونکے کہ یریحو کی مضبوط فصلیں گر گئیں۔'' پھر حملہ آوروں نے شہر کے باشندوں کو تہ تیغ کیا۔ لا

ایک طوائف رحب اور اس کے خاندان کے جس نے حملے سے قبل یوشعؑ کے بھیجے ہوئے دو جاسوسوں کی مدد کی تھی۔ بعدازاں بنی اسرائیل نے عموریوں پر تسلط جمایا اور یوشعؑ نے پکارا۔ "اے سورج تو جبعون پر ٹھہر۔ اے چاند تو وادیٔ ایالون پر تھم جا۔ اور سورج ٹھہر گیا اور چاند تھمارہا۔ جب تک قوم نے اپنے دشمنوں سے انتقام نہ لے لیا۔" اس طرح متعدد قبائل پر جن کے سرداروں کی تعداد اکتیس تھی قوم اسرائیل نے فتح حاصل کی اور جب وہ جنگ کے لیے نکلتے تھے تو تابوت سکینہ ایک گدھا گاڑی میں رکھ کر اپنے اپنے آگے لے جاتے تھے اور جب یوشعؑ (جو اس دوران میں ایک حطی لڑکی سے بھی شادی کر چکے تھے) بوڑھے ہوئے تو خدا نے کہا اے یوشعؑ تو بڈھا ہو گیا اور ابھی بہت سے ملک قبضہ کرنے کے لیے باقی ہیں اور ان باقی ماندہ ملکوں میں حطی سلطنت تاراج کرنے والے بلقانی قبیلے یعنی فلسطینیوں کے زیرنگیں علاقے بھی شامل تھے اور بنی اسرائیل کی پیادہ فوج اس انڈو یورپین قبیلے کا مقابلہ نہ کر سکی کیونکہ اس کے پاس آہنی رتھ تھے (ان ہی رتھوں اور گھوڑوں کی وجہ سے انڈو آرین قبائل نے ہندوستان سمیت سارے مغربی ایشیا میں مقامی باشندوں کو زیر کیا تھا) پھر اپنے مفتوحہ علاقوں کو یوشعؑ نے قرعہ اندازی کے ذریعے قوم کے بارہ اسباط میں تقسیم کر دیا اور بیت شمس، بیت العمق، رامہ، تبول، بیروت، عرابہ، بصر وغیرہ وغیرہ اڑتالیس شہر اور گاؤں بنی اسرائیل کے تصرف میں آ گئے۔ یوشعؑ کے انتقال کے بعد اسرائیلیوں نے کنعانیوں سے لڑ کر یروشلم بھی لے لیا اور اسے آگ میں پھونک ڈالا۔ لیکن اب اس نامعقول قوم نے مقامی عورتوں سے شادیاں کر کے دوبارہ بعل پوجنا شروع کر دیا۔ تب خدا نے غصے میں آ کر انھیں شاہِ عراق کے ہاتھ بیچ ڈالا۔ غرضیکہ بنی اسرائیل اسی طرح مستقل خدا سے بدعہدی کرتے رہے اور خدا ان کو وقتاً فوقتاً مختلف زورآور دشمنوں کے ہاتھوں بیچتا رہا۔ یوشعؑ کے انتقال کے بعد بنی اسرائیل کی قیادت خداپرست قاضی کر رہے تھے مگر قوم ان کو بھی برابر ستاتی رہی۔ اسی زمانے میں بنیہ دبورہ پیدا ہوئیں جو ایک خاتون قاضی تھیں اور بنی افرائیم کے کوہستانی علاقے میں رامہ اور بیت ایل کے درمیان ایک کھجور تلے اپنی عدالت لگاتی تھیں۔ اُن کی قیادت میں قوم اسرائیل نے رتھوں والے غنیم کو بھی شکست دی اور کنعان پر اس زبردست فتح کے بعد دبورہ نے گایا۔ اے

بادشاہو۔سنو۔اے شہزادو۔کان دھرو۔میں خود خداوند کی مدح گاؤں گی۔اے خداوند! جب تو شعیر سے چلا تو زمین کانپ اٹھی اور آسمان ٹوٹ پڑا اور سینہ لرزنے لگا۔اور بائبل کے ایام میں شاہراہیں سونی پڑی تھیں اور مسافر پگ ڈنڈیوں سے آتے جاتے تھے۔اسرائیل میں حاکم موقوف رہے جب تک میں دبورہ برپا نہ ہوئی اور اسرائیل کی ماں سو کر نہ اٹھی۔نئے نئے دیوتا چن لیے گئے اور جنگ پھاٹکوں پر ہونے لگی۔میرا دل اسرائیل کے حاکموں کی طرف لگا ہے۔تم خداوند کو مبارک ہو۔اے کہ تم جو سفید گدھوں پر سوار ہوتے ہو اور جو نفیس قالینوں پر بیٹھتے ہو اور جو راستہ چلتے ہو۔تیراندازوں کے شور سے دور پنگھٹوں پر خدا کا چرچا کرو۔جاگ جاگ اے دبورہ۔اٹھ اے برق اپنی جنگی اسیروں کو باندھ لے جا۔اے ابی نوعم کے بیٹے۔

اس کے بعد چالیس برس امن رہا۔پھر خدا نے بنی اسرائیل کو ان کی بدکاریوں کے کارن پہلے بنی عمون اور پھر فلسطینیوں کے ہاتھ بیچ دیا۔

اس زمانے سے فلسطینیوں نے اتنا زور باندھا کہ کنعان انہی کے نام سے منسوب ہو کر فلسطین کہلانے لگا۔ایک زبردست اسرائیلی پہلوان سمسون نے دلیری سے فلسطینیوں کا مقابلہ کیا لیکن ایک نہایت چارسوبیس خاتون دلیلہ پر (جو فلسطینی تھی) عاشق ہو کر اپنی اوقات گنوائی اور ملٹن کی نظم اور ہالی ووڈ کا موضوع بنا۔

1050ق م میں فلسطینیوں سے بنی اسرائیل کی ایک بار پھر بڑی بھاری جنگ ہوئی اور فلسطینی تابوت سکینہ اُٹھا کر لے گئے۔"مگر ان کے ساتھ جہاں جہاں تابوت سکینہ جاتا وبائیں پھیلتیں اور طرح طرح کی آفتیں آتیں۔" چنانچہ ایک رات وہ چپکے سے اس متبرک صندوق کو واپس کر گئے پیغمبر زماں شموئیل کی قیادت میں فلسطینیوں کو شکست ہوئی۔

زمین کا مالک بننے کے بعد بنی اسرائیل میں بھی بسلسلۂ زر زمین زن خانہ جنگیاں شروع ہو گئیں بارھوں سباط کے سردار جن کو فتوحات کے صلے میں اراضی دی گئی تھیں ایک نوع کے فیوڈل طبقے میں تبدیل ہو گئے اور عبرانی لفظ گبر یعنی فوجی سورما اب زمیندار کے معنی میں استعمال کیا جانے لگا۔آپس کی لڑائی جھگڑے بڑھے کیونکہ ان دنوں اسرائیل میں کوئی بادشاہ نہ تھا اور ہر شخص اپنی من

مانی کرتا تھا (کتاب قضاۃ باب 21) چاروں طرف بادشاہوں کی ریل پیل دیکھ کر بنی اسرائیل کو بھی بادشاہت کا شوق چرایا اور وہ رامہ میں حضرت شموئیل کے پاس گئے اور ان سے فرمائش کی کہ انھیں ایک عدد بادشاہ درکار ہے۔ شموئیل نے ہی اس کے جواب میں قوم کو جو وارننگ دی اس سے عبرانی انبیا کی شدید جمہوریت پرستی کا اندازہ ہوتا ہے۔ شموئیل کو یہ بات بری لگی اور اس نے خدا سے دعاء کی اور خدا نے شموئیل سے کہا "جو کچھ یہ لوگ کہتے ہیں اے شموئیل تو اس کو مان کیونکہ انھوں نے تیری نہیں میری تحقیر کی ہے کہ میں ان کا بادشاہ نہ ہوں۔" اور شموئیل نے بادشاہت کے طالبوں سے کہا جو بادشاہ تم پر حکومت کرے گا اس کا طریقہ یہ ہوگا کہ وہ تمھارے بیٹوں کو اپنے رتھوں کے لیے اپنے رسالے میں نوکر رکھے گا۔ اور وہ اس کے رتھوں کے آگے آگے دوڑیں گے۔ اور وہ ان کو ہزار ہزار کا سردار اور پچاس پچاس کا جمعدار [5] بنائے گا۔ اور بعض سے ہل جتوائے گا اور فصل کٹوائے گا اور اپنے لیے جنگ کے ہتھیار اور رتھوں کے ساز بنوائے گا۔ اور تمھاری بیٹیوں کو اپنی عطر پاش کنیزیں اور باورچنیں بنائے گا۔ تمھارے کھیتوں اور تاکستانوں اور زیتون کے باغوں کے بہترین حصے چھین کر اپنے مصاحبوں کو دے دے گا۔ اور تمھارے ملازموں اور لونڈیوں اور شکیل جوانوں و گدھوں کو بے گار میں لگائے گا۔ تمھارے کھیتوں، تاکستانوں اور غلوں کا دسواں حصہ خود وصول کرے گا۔ اور تم اس کے غلام بن جاؤ گے۔ اور جب تم اس بادشاہ کی فریاد کرو گے۔ تب خدا تم کو کوئی جواب نہ دے گا۔ [6] مگر وہ لوگ ہرگز نہ مانے۔ چنانچہ شموئیل نے ساول بن قیس بن ابی ایل (جو اپنے گمشدہ گدھوں کی تلاش کرتا شموئیل کے پاس پہنچا تھا اور اسرائیل کا شکیل ترین جوان تھا) اس کے سر پر تیل انڈیل کر اسے بادشاہ بنا دیا۔ ساول بھی زندگی بھر فلسطینیوں سے جنگ کرتا رہا لیکن عمالقہ سے لڑائی کے سلسلے میں "اس نے خدا کی نافرمانی کی اور خدا ساول کو بادشاہ کر کے ملول ہوا۔ تب اس نے شموئیل سے کہا۔ اے شموئیل تو کب تک ساول کے لیے غم کھاتا رہے گا۔ تو اپنے سینگ میں تیل بھر اور بیت لحم میں لیسی کے پاس جا میں نے اس کے بیٹوں میں سے ایک کو بادشاہ چنا۔ شموئیل نے کہا میں کیوں کر جاؤں گا۔ اگر ساول نے سنا تو مجھے مار ہی ڈالے گا۔ خدا نے کہا ایک بچھیا لے جانا اور کہنا میں تو قربانی کے لیے آیا ہوں اور لیسی کو قربانی کی دعوت

دینا۔ پھر میں تجھے بتادوں گا کہ کیا کرنا ہے۔ القصہ شموئیل نے بیت لحم جا کر نوجوان گڈریے داؤدؑ بن یسی کو مسح کیا۔ ادھر بھائی سال باد لے اور خفقانی ہو گئے اور دل بہلانے کے لیے بربط نوازوں کو طلب کیا۔ چنانچہ داؤدؑ بلائے گئے اور سال اُن کا جانی دشمن ہو گیا۔ اور داؤدؑ بھاگ کر رامہ میں شموئیل کے ہاں پہنچے اور سال نے اُن کو پکڑنے کو قاصد بھیجے اور قاصدوں نے دیکھا کہ نبیوں کا مجمع نبوت کر رہا ہے اور شموئیل ان کا پیشوا بنا کھڑا ہے۔ تو خدا کی روح قاصدوں پر نازل ہوئی وہ بھی نبوت کرنے لگے۔ دوسرے قاصد آئے وہ بھی نبوت کرنے لگے۔ اس کے بعد داؤدؑ نے فلسطینیوں سے زبردست جنگ کی۔ سال بھی ان سے لڑنے کو آیا لیکن داؤدؑ نے اسے قتل نہ کیا۔
پھر وہ فلسطینیوں کے محاذ پر مارا گیا۔ اور خود داؤد جالوت پے پر فتح یاب ہو کر بادشاہ ہوئے۔

سال کا دورِ حکومت 1020 ق م سے 1000 ق م تک ہے۔ اب دنیا ولادت مسیح سے قبل کے یک ہزار سالہ دور میں داخل ہو رہی تھی جس میں بڑی زبردست سیاسی تبدیلیاں پیش آنے والی تھیں۔ حضرت داؤدؑ کے عہد میں اسرائیل ایک طاقتور اور شان دار ریاست بن گئی۔ داؤدؑ نے یروشلم فتح کر کے صیہون کے قلعے میں رہنا شروع کیا۔ ہمسایہ ریاست صور سے دوستی کی اور تابوت سکینہ کو اس شان و شوکت سے یروشلم میں لا کر رکھا کہ داؤدؑ اور اسرائیل کا سارا گھرانا صنوبر کی لکڑی کے ساز اور ستار، بربط، دف اور جھانجھ بجاتے۔ اس کی نئی گاڑی کے آگے آگے چلے اور ایک روز داؤدؑ بادشاہ نے ناتن نبی سے کہا کہ میں تو دیودار کے محل میں مقیم ہوں (یہ محل صور کے بادشاہ نے لبنان سے لکڑیاں اور کاری گر بھیج کر داؤدؑ کے لیے بنوایا تھا) اور خدا کا صندوق پردوں کے اندر رہتا ہے اور اس رات ناتن نبی سے عالم رویا میں خدا نے کہا کہ جا میرے بندے داؤدؑ سے کہہ کر خداوند یوں فرماتا ہے کہ کیا تو میرے رہنے کے لیے گھر نہ بنائے گا؟ کیونکہ جب سے میں بنی اسرائیل کو مصر سے نکال کر لایا آج تک کسی گھر میں نہیں رہا۔ بلکہ خیمہ اور مسکن میں پھرتا رہا ہوں۔
پھر حضرت داؤدؑ بت سبع پر عاشق ہو گئے جو اسرائیلی فوج کے ایک حِطّی سپاہی اوریا کی بیوی تھی۔ حضرت داؤدؑ نے اوریا کو بنی عمون کے خلاف جنگ کے محاذ پر بھیج دیا اور بت سبع (بطشا) کو اپنے حرم میں داخل کر لیا اور ان سے حضرت سلیمانؑ پیدا ہوئے۔ 920 ق م میں داؤدؑ کی وفات کے بعد

سلیمانؑ تخت نشیں ہوئے اور ان کے دور میں اسرائیل کی سلطنت اپنے عروج پر پہنچ گئی۔ ایک وقت تھا جب خستہ حال بنی اسرائیل فرعون سے دہشت زدہ ہوکر مصر سے نکلے تھے۔ اب سلیمانؑ نے اپنے حرم میں فرعون وقت کی بیٹی داخل کی۔ ایک حطی شہزادی سے رشتہ جوڑا۔ ہند اور لنکا سے تجارتی تعلقات قائم کیے۔ صور کے بادشاہ حیرام اعظم 970-940 ق م نے صنوبر کی لکڑی اور کاریگر بھیجے اور ایک عظیم الشان ہیکل تیار کیا گیا۔ ایک طاقتور بحریہ وجود میں آیا اور اسرائیل کی شان وشوکت ضرب المثل بن گئی مگر سلیمانؑ کے انتقال کے بعد خانہ جنگیاں شروع ہوئیں اور شمال کے دس قبائل نے اپنی ریاست بنی اسرائیل سے الگ کر لی جس کا پایۂ تخت سامریہ تھا۔ بنیامین اور یہوداہ کے قبیلوں نے جنوب میں یہودیہ کے نام سے اپنی حکومت قائم کی اور اس کا صدر مقام یروشلم رکھا۔ دونوں ریاستوں میں عیاشی اور بت پرستی کا دور شروع ہوگیا۔ اسرائیل کے بادشاہ احب نے فنقی شہزادی یزبیل سے شادی کی اور وہ اپنے دیوی دیوتا کے ساتھ لائی۔ پیغمبر وقت الیاسؑ نے سماجی بے انصافی اور بعل پرستی کے خلاف بہت کچھ ڈانٹا پھٹکارا۔ مگر کون سنتا ہے۔ بٹوارے کے بعد سے دونوں ریاستیں کمزور ہوتی چلی گئیں اور اشوریہ نے ان پر حملے شروع کر دیے۔

عبرانیوں کو اُن کے حال پر چھوڑ کر اب دوبارہ وادیٔ فرات اور عیلام اور ایشیائے کوچک واپس چلیے۔ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ حضرت ابراہیم کی 850 ق م میں سومیر سے کنعان ہجرت سے ذرا قبل یوریشین اقوام ہُری قاضی حطی وغیرہ نے شمالی پہاڑوں سے نیچے آکر اس علاقے میں جو بعد میں ایران اور اناطولیہ اور عراق کہلایا خوب اودھم مچائی تھی اور قاصیوں نے عیلام کو تباہ کر کے عروق پر بھی قبضہ کر لیا تھا اور اسی زمانے میں ایک انڈو ایرانی قبیلہ آکر مقامی آبادیوں میں مدغم ہوگیا تھا۔ اس کے بعد کی صدیوں میں عیلام پھر طاقتور ہوگیا۔ اور تیرھویں اور بارھویں صدی قبل مسیح (جب آلِ ابراہیمؑ مصر سے نکل کر کنعان واپس گئے) عیلام شترخ نہونتے، کتہز نہونتے اور شیلہک انشُشنک تین بالکل ناقابل یقین ناموں والے بادشاہوں کا عہد زریں ہے۔ شترخ نہونتے اوّل نے عظیم الشان مندر اور عمارتیں بنوائیں۔ 1175 ق م میں بابل پر حملہ کر کے قاصیوں کی حکومت ختم کی اور مردت کا دیوزاد بت قوانین حمورابی کی الواح بابل سے شوش لے گیا

لیکن حلی مصر اور حضرت سلیمانؑ کی سلطنت اسرائیل کے انحطاط کے ساتھ مشرق اوسط میں طاقتی توازن پھر تبدیل ہو رہا تھا۔ اب اشوریہ نے صدیوں کے بعد دوبارہ زور باندھا اور اس کے خوں خوار حکمرانوں نے ہر طرف قتل و غارت کا بازار گرم کر دیا۔ اسی زمانے میں ایشیائے کوچک میں ایک نئی سلطنت قائم ہوئی جس کا نام اراراتو تھا (طوفان نوح والا ارارات اسی علاقے میں تھا) یہاں کے ایک زبردست بادشاہ ارم نے (آج تقریباً ہر چوتھے ارمنی کا نام ارم ہے) اشور کے سلم نصر سوئم سے 858 ق م میں جنگ کی ارمی دیوتاؤں کے نام خالدی اور شیونی تھے) اراراتو نویں صدی ق م میں اپنے عروج پر تھا (غالباً اہل اراراتو ہی کی زبان نے قدیم فارسی کو متاثر کیا) بعد میں اراراتو کو بھی اہل اشوریہ نے زیر کر لیا اور عبرانی ریاستوں اور اسرائیل اور یہودیوں پر تباہ کن حملے کرنے میں جٹ گئے۔

اسی زمانے میں اشوریہ کی وزارت جنگ کی گویا CLASSIFIED الواح پر دو نئے دشمنوں کے نام درج کیے گئے۔ اشّن مندا یعنی مندا کی امت اور پرسوا۔

بارھویں گیارھویں صدی ق م ایک بار پھر قبائلی ہجرتوں کا دور تھا۔ اس مرتبہ جو دو آریہ یا انڈو یورپین قبیلے پہاڑوں سے نیچے اترے وہ مدآئی اور پرسوا کہلا رہے تھے۔ انہی ذہین اور حیرت انگیز قبائل کی آمد کے ساتھ ایران کی تاریخ کا باقاعدہ آغاز ہوتا ہے۔ یہ پرسوا اور مدآئی جو اس وقت تو مشرقی یوپی کے دیہاتی سے نام لگتے ہیں۔ مگر انہی کو قدیم یونانی مورّخوں نے پرشین اور میڈین کہا۔ جو انڈو ایرانی قبیلہ 2000 ق م میں اس علاقے میں آیا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو عیلامی اور مقامی آبادیوں میں مدغم کر لیا تھا۔ لیکن ان تازہ وارد قبیلوں کو اپنے آریہ پن کا شدت سے احساس تھا۔ چنانچہ انھوں نے سارے ملک کو اپنے نام سے موسوم کر لیا اور اسے ایران کشیتر اور ایران شہر پکارا۔ اپنی قبائلی روایات کے مطابق ان کا نسلی مرکز شمال مغربی ایران یعنی ایریانہ وائجا یا ایران ویج (ویج = بیج) تھا جو بعد میں آذربائیجان کہلایا۔ انہی کی وجہ سے موجودہ افغانستان آریانہ کے نام

سے مشہور ہوا اور ان کے بھائی بندوں نے جو پہلے سے ہندوکش عبور کر کے پنجاب میں داخل ہو چکے تھے شمالی برصغیر ہند کو آریہ ورت کہا۔

میڈین یا مادی قبیلے نے عیلام فتح کر کے وہاں اپنی حکومت قائم کر لی۔ میڈین جو قبائیں اور چمڑے کے خود اور نوکیلے جوتے پہنتے تھے (جو فی الحال پشاوری چپلوں کی شکل میں موجود ہیں) بادشاہ گری کے فن میں سب سے زیادہ ہوشیار ثابت ہوئے۔ سب سے پہلے تو ان کے سرداروں نے بہت ہی ٹھاٹھ باٹھ سے رہنا شروع کیا۔ اونچے چبوتروں پر محل بنوائے۔ مردوں کو مروجہ دستور کے مطابق مکان کے اندر دفن کرنے کے بجائے شہر سے باہر قبرستانوں میں سپرد خاک کرنا شروع کیا۔ تاجر، کاری گر، غلام اور کسان کی طبقاتی تقسیم کی (اسی طرح کی درجہ بندی ورن آشرم اور جاتی کے نام سے آریہ ورت میں عمل میں آ چکی تھی) اور زبردست فوجیں آراستہ کیں اور مزید ملک گیری کے ارادے سے شرق اوسط کے دائمی میدانِ جنگ میں کود پڑے۔ اشوریہ والا شاہ اشور نصر پال کوہ دماوند تک پہنچ کر اُن سے خوب خوب لڑا۔ مگر میڈین بادشاہ خشترتھ (یہ بھی متانی وشرت اور بھارتی درتھ کا بھائی بند معلوم ہوتا ہے) اپنا دائرہ اور اقتدار وسیع کرتا گیا۔

ابھی گویا یہی بادشاہ لوگ ایک دوسرے سے لڑنے بھڑنے کے لیے کافی نہ تھے کہ اوپر سے سیتھین اور کیمرین (کہ کریمیا سے آئے تھے) قبیلوں نے آن کر ایران، اناطولیہ اور اسرائیل و یہودیہ میں بڑی سخت لوٹ مار مچائی۔ یہ حضرات نسب نامہ نوحؑ کے مطابق یافث کی اولاد تھے (یاد کیجیے بنی یافث: گومر، کیمرین یا اہلِ کریمیا ماجوج مسک اور توبل یعنی بحیرۂ اسود کا بالائی علاقہ وغیرہ) جنوب کی متمدن زراعت پیشہ اقوام ہمیشہ ان شمالی صحرائی قبائل سے خائف رہیں۔ یہ سیتھین آئندہ صدیوں میں ہمیں مختلف علاقوں کے ساتھ بار بار ملیں گے۔ ان سے بچنے کے لیے دیوارِ چین اور سدِ سکندری تعمیر کی گئی اور اُنہی کی وجہ سے ایرانی اور تورانی آویزش شروع ہوئی۔ ہنگری اور وسطی یورپ پہنچ کر یہ لوگ مکیار اور ہن کہلائے اور مشرق میں تورانی، تاتاری، ساکا سیتھین، منگول یا مغول اور ترک (ایک ترک محقق کے خیال میں 2000 ق م میں یہ منگول آبنائے بے رنگ عبور کر کے شمالی امریکہ پہنچے اور وہاں کے اصلی باشندوں یعنی بے چارے ریڈ انڈین

لوگوں کے مورث اعلیٰ بنے۔امریکہ کی قدیم مایااور AZTEC تہذیبوں کی زبانوں میں بہت سے ترکی زبانوں سے مشابہ لفظ دریافت کیے گئے ہیں۔ایک اور نظریے کے مطابق ایک اور وسط ایشیائی قبیلہ یوآچی غالبًا عبرانی میں یاجوج بن گیا۔حزقیلؑ نے اسرائیل و یہودیہ پر سیتھین یلغار کے متعلق پیشین گوئی کی۔ ''پھر بارھویں برس میں مہینے کے پندرھویں دن پر مجھ پر خدا کا کلام نازل ہوا کہ اے آدم زاد واویلا کر۔وہ جو زورآوروں میں سب سے توانا ہیں پاتال میں اُتر گئے۔ عیلام اور اس کا گروہ تلوار سے قتل ہوا۔وہ جو روئے زمین پر ہیبت کا باعث تھا۔اے آدم زاد جوج کی طرف جو ماجوج کی سرزمین ہے۔اور رُوش[8] اور مسک اور توبل کا فرماں روا ہے متوجہ ہو۔اور اس کے خلاف نبوت کر۔اور کہہ خداوند یوں فرماتا ہے کہ اے جوج روش، مسک اور توبل کے حاکم میں تیرا مخالف ہوں۔میں تیرے جبڑوں میں آنکڑے ڈال کر تجھے اور تیرے مسلح لشکر کو کھینچ نکالوں گا۔اور اُن کے ساتھ فارس، کوش اور جمر جو سب کے سب سپر بردار اور خود پوش ہیں۔اے آدم زاد جوج سے کہہ کہ جب میری امت اس میں بسے گی کیا تجھے خبر نہ ہوگی؟ تو شمال سے اپنے لشکر لے کر آئے گا اور میری امت کے مقابلے کو نکلے گا اور زمین کو بادل کی طرح چھپا لے گا۔میں تجھے اسرائیل کے پہاڑوں پر چڑھالاؤں گا تا کہ تو مجھے جانیں[9]'' اس زمانے میں عبرانیوں نے پھر بدکاری اور بت پرستی شروع کر دی تھی۔چنانچہ یرمیاہؑ نبی نے سیتھین حملے کے متعلق کہا—

''خداوند فرماتا ہے اے برگشتہ اسرائیل واپس آ۔اپنی بدکاری کا اقرار کر کہ تو ایک ہرے درخت کے نیچے غیروں کے ساتھ آوارہ پھری۔پھر مجھے ترک کیا اور غیر معبودوں کے آگے لوبان جلایا۔ اے یہوداہ۔اے یروشلم! پناہ لینے کو بھاگو۔اور دیر نہ کرو۔کیونکہ میں ہلاکت شدید کو شمال کی طرف لاتا ہوں۔شیر ببر جھاڑیوں سے نکلا ہے۔قوموں کو برباد کرنے والا آرہا ہے تا کہ تیرے شہر ویران کر دے۔نرسنگا پھونکو۔ٹاٹ اوڑھ کر ماتم کرو کیونکہ اس وقت یوں ہوگا کہ بادشاہ اور سردار بے دل ہو جائیں گے۔کاہن حیرت زدہ اور نبی سراسیمہ ہوں گے۔تب میں نے کہا افسوس اے خداوند تو نے یروشلم کو یہ کہہ کر دغا دی کہ تم سلامت رہو گے حالانکہ تلوار جان تک پہنچ گئی ہے۔دیکھو وہ گھٹا کی طرح چڑھ آئے گا۔اس کے رتھ گردباد کی مانند اور اس کے گھوڑے

عقاب سے تیز تر ہیں۔ واحسرتا! کہ ہم غارت ہو گئے 10۔ سیتھین حملہ آوروں نے خوب ہی تباہی مچائی مگر میڈیہ میں خشترتھ کے بیٹے نے ان کو ٹھیک کر دیا اور ان میں سے بہت سے کان دبا کر میڈین فوج میں بھرتی ہو گئے۔

خشترتھ نے کوہ الوند کے دامن میں ہگمتانہ یا ایکتانہ (موجودہ ہمدان) اپنا پرشکوہ پایۂ تخت بنایا تھا ایران میں دریا ناپید ہیں جن کی وادیوں میں گنجان شہر بس سکیں۔ مختلف قبیلے آج تک دور دور بکھرے ہوئے ہیں۔ ایک طاقتور بادشاہ کی مضبوط اور شاندار شخصیت پر ہی ان قبائل کی اطاعت اور اتحاد منحصر تھا۔ اس نکتے کو میڈین سرداروں نے بھانپ لیا تھا۔ چنانچہ انھوں نے ایرانی لینڈ اسکیپ چٹیل پن اور سختی سے اپنے آپ کو مماثل کیا اور سنگلاخ پہاڑوں پر چٹانوں میں اپنی قوت اور اقتدار کے سمبل تلاش کیے۔ اپنے مقبرے اونچی چٹانوں پر تعمیر کروائے اور پہاڑوں کی سلوں پر اپنے مجسمے ترشوائے (بھائی فرہاد جوئے شیر نکال لانے میں یونہی ایکسپرٹ نہیں ہو گئے تھے۔ اس وقت تک ایرانی خارتراشی صدیوں پرانی ہو چکی تھی) میڈین عہد سے ایرانی شہنشاہیت کی ایک ایسی منفرد رمزیت قائم ہو گئی جو کہنے والے کہتے ہیں کہ آج تک موجود ہے۔

مجوی اس میڈین قوم کے آبائی آتش پرست پروہت تھے اور چونکہ یہ بھی آذربائیجان کے علاقے سے آئے تھے۔ اس وجہ سے ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ اس خطے کا اصل نام آذر آبادکان یعنی آتش کدوں کا ملک تھا۔ یہ پروہت موگوش کہلاتے تھے۔ (بعد میں عربوں نے اُنھیں مجوس اور مغ کہا اور انجیل مقدس میں انھیں مجائی کہا گیا۔ یہ چونکہ ساحر بھی تھے۔ اس وجہ سے ان کے نام سے لفظ میجک نکلا) آذربائیجان زلزلوں اور آتش فشاں پہاڑوں کا ملک تھا۔ چٹانوں میں سے گندھک کے شعلے بلند ہوتے۔ موسم خزاں میں زمین سے فاسفورس کی ایسی لپٹیں نکلتیں جن کی روشنی خاموش راتوں میں دور دور تک پھیل جاتی۔ کیسپین کی سطح پر فاسفورس کے ایسے بلبلے پیدا ہوتے رہتے۔ انواع واقسام کی اس خنک، بے ضرر اور نظر فریب آگ نے مقامی باشندوں کو بہت متاثر کیا۔ جو بظاہر خود بخود پیدا ہو جاتی تھی۔ (''خدا جو خود بخود پیدا ہوا) یہی سرزمین پٹرولیم کے ذخائر کا وسیع خزانہ ہے جو روس سے لے کر ایران تک پھیلا ہوا ہے۔ اسی جگہ یونانی دیومالا کے ہیرو پرو تھیس

کو آسمانی آگ چرانے کے جرم میں ایک چٹان سے باندھ دیا گیا تھا۔ سرد علاقوں میں رہنے والوں کے لیے آگ یوں بھی بڑی نعمت تھی (صحرا کی ٹھنڈی رات میں موسیٰؑ آگ لینے گئے تو پیمبری مل گئی، چنانچہ آذر بائیجان کے باشندوں نے آگ کو مظہر الٰہی قرار دیا۔ بعد میں ایران کے سرسبز گلزاروں اور ان کے چاروں طرف پھیلے ہوئے چٹیل تکلیف دہ بنجر میدانوں کے تقابل نے نظریۂ خیر و شر کو تقویت پہنچائی (اسی طرح وسط ایشیا کے بے کراں آسمانوں کے نیچے سرگرداں منگول قبائل نے "آسمان" کو معبود خاقان چین نے فوراً خود کو فرزندِ فلک مان لیا۔ ہندوستان کے کشان راجہ بھی جو مغربی ایشیا سے آئے تھے اپنے آپ کو "آسمان کا بیٹا" کہتے تھے۔ غالباً اسی کشان تصور سے متاثر ہو کر عیسائیوں نے حضرت عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا پکارنا شروع کیا (ہندوستان میں فلورا اینڈ فانا کی بہتات سے لوگوں کو ہر شئے میں بھگوان نظر آئے) مجوسی دخمے تعمیر کر کے اپنے مردے چیلوں کوؤں کو کھلاتے تھے جو ایک بہت قدیم وسط ایشیائی دستور تھا۔

میڈین بادشاہ خشترتھ 653ق م میں اس جہانِ فانی سے کوچ کر گیا۔ اس اثنا میں کلدانیہ اشور سے زیادہ طاقتور ہو چکا تھا۔ چنانچہ خشترتھ کے فرزند اور جانشین ہودخ شتر نے بابل کے شاہ بنو پلصر سے اتحاد کر کے نینوا پر حملہ کر دیا۔ 625ق م میں مادی اور کلدانی افواج نے نینوا کو نذرِ آتش کر دیا اور 614ق م تک اشور نیست و نابود ہو چکا تھا۔ اِدھر سے چھٹی پا کر مادیوں نے 590ق م میں ارارتو کا بھی فیصلہ کر دیا۔ جس کے بعد سے یہ علاقہ آرمینیہ کہلانے لگا کہ اس کے باشندے اناطولیہ کے ضلع ارم سے آئے تھے۔

لیکن اب میڈیہ یا مادا کا بھی انت ہونے والا تھا کیونکہ اس کا ساتھی، جنوب کا پارسی قبیلہ ان سے زیادہ زور پکڑ چکا تھا۔

پہلے بڑے پارسی سردار ہخامنش کے وارث چش پش (675ق م-640ق م) اپنی مملکت اپنے دو لڑکوں میں تقسیم کر کے آریہ رمنا کو پارسا اور کوروش اوّل کو بختیاری کا دامنی علاقہ پرسومش سونپ دیا۔ آریہ رمنا (640ق م-590ق م) نے خود کو شاہان شاہ کہلوایا۔ اس کے طلائی سکوں پر جو سوش سے برآمد ہوئے ہیں لکھا ہے کہ "بہترین گھوڑوں اور انسانوں والا پارسیوں کا

ملک جس کا میں آقا ہوں مجھے اہورمزدہ نے عطا کیا۔'' آریہ رمنا کے بعد اس کے بیٹے آرشا کو غالباً اس کے چچازاد بھائی یعنی پرسومش کے حاکم کورش اوّل لڑکے کمبوجیہ اوّل نے معزول کر کے خود پارسا پر قبضہ جمالیا۔ ہیروڈوٹس لکھتا ہے کہ سائیرس اعظم کی تخت نشینی کے وقت آرشا کا بیٹا گشتاسپ ایک صوبائی گورنر تھا۔

پارس کا بادشاہ بننے کے بعد کمبوجیہ اوّل نے اپنے حریف شاہ ماوا استیاجیز کی لڑکی سے شادی کی اور اس بچے نے جنم لیا جسے تاریخ نے سائرس اعظم کے نام سے یاد رکھا ہے اور جسے ایرانیوں نے کوروش بزرگ اور یہودیوں نے مسیح خورس پکارا۔

عالمگیر ہخامنشی سلطنت کا بانی سائیرس ایران کا کلچر ہیرو ہے۔ اور متعدد افسانوی روایات اس سے منسوب ہیں۔ ہیروڈوٹس کے مطابق جابر اور ستم پیشہ استیاجیز نے خواب میں دیکھا کہ اس کا نواسا سائیرس اسے قتل کر دے گا۔ اس نے اپنے وزیر کو حکم دیا کہ بچہ پیدا ہوتے ہی مار ڈالا جائے (فرعون و موسیٰ، راجہ کنس و سری کرشن کی بازگشت) لیکن دانا اور رحم دل وزیر نے شہزادی کے نوزائیدہ بچے کو گڈریے کے ہاں بھجوادیا، جہاں پہاڑوں میں اس کی پرورش ہوئی (نیک اور عادل بادشاہ کے بچپن میں گڈریوں کے ہاں پرورش کا موضوع ایرانی روایات میں صفوی دور تک باقی رہا) بڑے ہو کر سائیرس نے اپنے ظالم نانا کے خلاف بغاوت بلند کیا اور اسے شکست دی میڈیا اور پارس کو متحد کرنے کے بعد خود بھی ایک میڈین شہزادی سے شادی کر لی۔ مادی پایۂ تخت ایکتبانہ سے علاحدہ دشتِ مرغاب میں پسارگاد آباد کیا۔ (غالباً پس ارکاوش پہاڑ کے پیچھے) لیکن اس کے دربار میں عیلامی اور میڈین قبائیں اور فل بوٹ ترک نہیں کیے گئے اور میڈین روایات برقرار رہیں۔ متعدد مادی اصطلاحات قدیم فارسی یعنی ہخامنشی زبان میں شامل ہو گئیں۔ مثلاً خشایاتھیہ (یعنی شاہ) مادی صوبوں کے گورنر کے لیے لفظ خشتر بان یونانی میں SATRAR اور ہندوستان میں کھشتر اپ اور مہا کھشتر اپ کہلایا۔

'' آدم کوروش خشایتھیہ ہخامنشیہ۔ میں ہوں کوروش۔ بادشاہ۔ ہخامنشی۔'' دشتِ مرغاب میں بکھرے ہوئے شکستہ ستونوں پر قدیم ترین زبانوں میں لکھے سائیرس اعظم کے کتبے دریافت

ہوئے ہیں۔ اسی دشتِ مرغاب میں کوروش نے اپنے نانا استیاجیز کو شکست دے کر ایرانی سلطنت کی بنیاد رکھی تھی۔ ایک بابلی کتبے میں آخری کلدانی بادشاہ جنودی نس کے لیے لکھا ہے کہ اس کے عہد کے چھٹے سال یعنی (550ق م) میں شاہ اشت میگو نے سائیرس پر چڑھائی کی لیکن مادی فوج نے بغاوت کر دی اور بادشاہ کو قید کر کے سائیرس کے حضور میں لے گئے۔ سائیرس نے اگمتانور (ہگمتانہ ایکبتانہ) پر حملہ کر دیا اور اس کی دولت لوٹ کر اپنے ملک انشان لے گیا۔ انشان غالباً پارس کا ایک قدیم نام تھا۔ کیونکہ سائیرس اپنے کتبے میں خود کہتا ہے کہ وہ کمبوجیہ کا فرزند، شہنشاہ انشان کا حکمراں، کوریوش کا پوتا اور چش پش کی اولاد ہے اور اس کے خاندان نے ہمیشہ فرماں روائی کی۔

ماوا سے نپٹ کر سائیرس کشور کشائی پر نکلا اور اشور، ارارتو، لیڈیا اور بابل پر قبضہ کر کے پھر اعلان کیا۔ آم کوروش خشایتھ، ہخامنشیہ۔ وغیرہ۔ میں ہوں کوروش۔ سارے عالم کا فرماں روا۔ شہنشاہ بابل۔ لیکن اس گھن گرج سے پہلے کوروش کی آمد سے قبل ہمیں ایک مقدس آواز سنائی دیتی ہے۔ ”قوموں کے درمیان منادی کرو۔ بابل لے لیا گیا۔ بعل رسوا ہوا اور مروک سراسیمہ۔ اور اس کے بت بہت خجل ہوئے کیونکہ اتر سے ایک قوم چڑھتی ہوئی آ رہی ہے جو اس کی سرزمین اجاڑ دے گی۔“

یرمیاہ نبی کی اس بشارت کے ساتھ ہم پھر فلسطین واپس پہنچتے ہیں جہاں کوروش بزرگ کے دور تک عبرانیوں کے حالات کا جائزہ لینا ضروری ہے۔

عیلامی، حطی، مصر اور اسرائیلی انحطاط اور میڈیہ اور پارس کے عروج کے درمیانی وقفے میں اشور نے اپنی جارحانہ حرکتوں سے سارے شرق اوسط میں آفت مچا رکھی تھی اور جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا حضرت سلیمانؑ کے انتقال کے بعد اسرائیل شمالی ریاست یہود[11] میں بٹ چکا تھا جن میں یہودیہ نسبتاً زیادہ طاقتور تھا۔ چنانچہ اشوری حکمراں اس کی تباہی کے درپے ہو گئے اور مٹا کر ہی دم لیا۔ اشور نصر پال (883-859 ق م) سلم نصر (858-824 ق م) تگلت پلیسر سوئم (ایک ہی کافی تھا۔ مگر تین تین تگلت پلیسر ہوئے) سارگون، اصر حدون، اشور بنی پال تگلتی نزتا (کیا کیا

نام ہیں) وغیرہ نے اپنے اپنے وقت میں بنی اسرائیل پر وہ قہر ڈھائے کہ عبرانی انبیا نے اپنی نافرمان قوم کے آگے خدا کو بھی ایک قہرناک اور منتقم معبود کی حیثیت سے پیش کیا جس کا عذاب ان کفار کے مظالم کی صورت میں گمراہ ملت ابراہیم پر مستقل نازل ہوتا رہا۔

آل ابراہیم اپنے ہادیوں کی مسلسل تنبیہہ کے باوجود غیر معبودوں کے آگے کیوں جھکتی تھی، پیغمبروں کی یہ اکثر ناکام رہبری ایک ترقی یافتہ روحانیت اور گردوپیش کے نیم وحشی مذہبی تصورات کی باہم کشمکش کی نمائندہ ہے اور انبیا کی اس طویل جدوجہد اور تصور وحدانیت کے ارتقا کا سُراغ ہمیں معبود کے لیے قدیم ترین سامی لفظ ال میں ملے گا۔[12]

جیسا کہ شروع میں عرض کیا گیا حضرت ابراہیم کے ظہور کے وقت متمدن دُنیا میں متعدد آریہ وغیر آریہ ضمیات کا دوردورہ تھا۔ عروق، کنعان و مصر میں مروک، عشتر، بعل، ایسس وغیرہ کی پرستش کی جارہی تھی۔ کنعانیوں کی دیبی عشرت عروق مین عشتر کہلاتی تھی۔ بعد میں ایران نے اسے افرادیت کہا۔ مولوخ کنعان کا بڑا خون آشام دیوتا تھا جس کے سامنے انسانی قربانیاں چڑھائی جاتی تھیں۔ جابجا زیتون کے جھرمٹوں میں بعل کے بت سجے تھے۔ اِل ان سارے بعلوں کا باوا تھا۔ الوئی، الوہی، الٰہ، رب معبود کے نام تھے۔ یہ ''خدایان کہن، خدائے مصرورب الیمن، ورب الفراق[13]'' ضرب کلیم سے آزردہ ہونے والے تھے پر ابتدائی صدیوں میں ملت ابراہیم ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ مصر کے طویل دورِ غلامی اور دشتِ نوردی کے مصائب نے البتہ روحوں پر جلا کی اور وحدانیت کا عقیدہ پختہ ہوتا گیا۔ بابل، کنعان، مصر دولت مند عیش پرست شہری دیوی دیوتا تاریک مندروں میں مقید تھے۔ صحرا صحرا بھٹکنے والے خستہ حال عبرانیوں نے بے کراں ریگستانوں میں تجسیم سے بے نیاز لامکاں ذات مطلق پر غوروفکر کیا۔ مابعدالطبیعات کے اسٹیج پر پہنچے تو خدا کے لیے کسی نام کا استعمال بھی ترک کردیا گیا یعنی اس قادرِ مطلق کو کمزور انسانی الفاظ میں کس طرح یاد کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ کتاب خروج کے الفاظ یاد کیجیے جب موسیٰ نے جھاڑی میں آگ دیکھنے کے بعد خدا سے پوچھا کہ جب میں تیرے حکم کے مطابق بنی اسرائیل کے پاس جاکر کہوں کہ تمھارے باپ دادا کے خدا نے مجھے تمھارے پاس بھیجا ہے تو میں ان کو کیا

بتاؤں؟ تب خدا نے جواب دیا کہ میں وہ ہوں جو میں ہوں۔ سو تو بنی اسرائیل سے یہ کہنا "میں وہ ہوں جو میں ہوں" نے مجھے تمھارے پاس بھیجا ہے۔ اس دور میں اسمِ اعظم ایک انتہائی پراسرار شے بن گیا۔ اور اس کی جگہ YHVH کا نشان بنایا جانے لگا جو غالباً سامی زبانوں کے "ہو" ہونے یا وجود رکھنے سے مشتق تھا۔

(دوسری سامی زبانوں کی مانند عبرانی میں حروف علت نہیں ہیں۔ چنانچہ عبرانی انجیل کے YHVH یعنی یاہ ویہہ [14] کو یورپین زبانوں میں حروف علت کے ساتھ لکھا گیا اور جرمن میں اس کا ترجمہ:- JEHOVAH ہو گیا۔ اسی یہوواہ کے عیسائی مبلغ اور "گواہ" ہمیں چوراہوں پر اپنے اشتہار اور پمفلٹ بانٹتے نظر آتے ہیں)۔

کچھ عرصہ بعد عبرانیوں نے مزید تقدیس کے خیال سے لفظ یاہ ویہہ بھی ترک کر دیا اور خدا کو اروناۓ (میرا آقا) کہنے لگے جس کا صدیوں بعد مغربی زبانوں کی اناجیل میں LORD کے نام سے ترجمہ کیا گیا۔

چاروں طرف بت پرستی کا زور تھا۔ لہٰذا عبرانی اب بھی اکثر ایک خدا اور کئی خداؤں میں گھپلا کر جاتے۔ اسی وجہ سے کتاب پیدائش کے ایک قدیم ترین نسخے میں الوہی کی جگہ الوہم لکھا گیا ہے۔ یعنی الوہم (خداؤں) نے چھ دن میں دنیا بنائی۔ الوہم نے یہ کیا۔ وہ کیا۔ بت پرستی کی طرف راغب ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ یاہ ویہہ [15] کا تجریدی تصور بہ آسانی گرفت میں نہ آتا تھا اور بعل اور عشرت وغیرہ نہایت دلچسپ معبود تھے۔ جن کے مندروں میں دیوداسیاں بھی تھیں اور ان کی عبادت کے ساتھ ساتھ خوب تفریح رہتی تھی۔ انبیا نے ان کو بار بار منع کیا کہ کفار کی عورتوں کے ساتھ شادی نہ کرو مگر وہ ہرگز نہ مانے۔ پیغمبروں نے ان کو یہ بھی سمجھایا کہ یاہ ویہہ نے حضرت ابراہیمؑ کی قربانی والی آزمائش کے بعد انسانی قربانی ہمیشہ کے لیے منسوخ کر دی ہے۔ مگر انھوں نے مولوخ کے سامنے بچے بھی قربان کیے۔ مصر میں گائے بیل پوجے جا رہے تھے تو وے کیوں نہ سونے کا بچھڑا بناتے۔ فنِ سنگ تراشی نے بت پرستی کو فروغ دیا تھا اسی وجہ سے شریعت موسوی میں تصویر کشی و حجاری کی شدت سے ممانعت کی گئی اور ایمان بالغیب پر زور دیا گیا۔

پھر صحرا نشیں اور مصیبت زدہ عبرانی رفتہ رفتہ ایک سخت گیر اخلاقی ضابطے کا پابند بنا جس میں سنگ ساری ایسی سزائیں موجود تھیں (جو عرب میں آج تک رائج ہیں) اس کے برعکس شہری تمدن عیاشی میں ڈوب چکے تھے۔ اسی وجہ سے عبرانیوں کے قائدین یعنی انبیا نے ڈیکیڈنس سے کبھی سمجھوتہ نہ کیا۔ اشوری بادشاہوں کے ذریعے خدا کے بھیجے ہوئے عذابوں سے قوم کو آگاہ کرتے رہے، اور راکھ میں بیٹھ کر اور ٹاٹ اوڑھ کر توبہ استغفار کرنے کی کوشش کی (اور ان کی وجہ سے انگریزی میں SACK CLOTH AND ASHES اور MOOD OF PROPHET اور ''یرمیاہ کی نوحہ گری'' کی اصطلاحات رائج ہوئیں۔)

جس شاہی نظام کے متعلق شموئیل نے اپنی قوم کو خبردار کیا تھا وہ اب اسرائیل اور یہودیہ میں صدیوں سے قائم تھا۔ عبرانی سماج حکمراں اور دولت مند طبقے اور پھٹے حال عوام اور غلاموں میں بٹ چکا تھا یاہ ویہہ سے پہلے جس کا مسکن ایک سرخ خیمے کے اندر تھا اب ایک عظیم الشان ہیکل میں مقید تھا جس کے کاہن بعل کے پجاریوں کی طرح حریص اور بے ایمان بن چکے تھے اور ESTABLISHMENT میں شامل تھے۔ اس زمانے میں اسرائیل اور یہودیہ کے غریب طبقے میں متعدد (پیغمبر پیدا ہوئے جنھوں نے عوامی لیڈروں کی حیثیت سے صدائے احتجاج بلند کی۔ مکاہ اور لسعیاہ بنی ''غریبوں کے والی'' کہلائے۔ یہ محنت کش اور خستہ حال انبیا بادشاہوں کے محلوں میں پہنچ کر اُن کو ڈانٹتے پھٹکارتے، قید و بند کی صعوبتیں جھیلتے اکثر قتل کیے جاتے۔ حضرت الیاسؑ چرواہے تھے۔ جو چمڑے کا پھٹا پرانا لباس پہنے ہاتھ میں عصا لیے اچانک کہیں سے نمودار ہو جاتے۔ اسرائیل کی شاہی تقاریب میں پہنچ کر بادشاہ احب کو لعنت ملامت کرتے جس کی فینقی بیوی یزبیل نے بعل کی پرستش رائج کر دی تھی۔ حضرت الیاسؑ بہ حکم خدا یوردن کے پاس نالے میں رہتے تھے اور کوے ان کے لیے صبح شام روٹی اور گوشت لاتے تھے اور وہ نالے میں سے پانی پی لیا کرتے تھے، جب وہ نالہ سوکھ گیا تو وہاں سے چل کھڑے ہوئے اور ایک بیوہ نے ان کی خبر گیری کی اور ملکہ یزبیل نے (جو اپنے وقت کی مادام نو تھی) بہت سے انبیا کو قتل کروا دیا۔ تو باقی ماندہ نبیوں کو شاہ احب کے دین دار وزیر عبدیاہ نے ایک غار میں چھپا دیا جہاں وہ ان کو روٹی پانی

پہنچاتا رہا تب ہی اس کو کہیں راستے میں گھومتے ہوئے حضرت الیاسؑ ملے اور پھر وہ اخب کے پاس پہنچے اور بعل اور عشترت کے کاہنوں سے زبردست مناظرہ کیا۔ ادھر عموس نبی اور ہوسیع نبی نے اسرائیل کے باشندوں کو اشوریوں کی طرف سے خبردار کیا۔ آخر قہر اعظم ٹوٹ کر رہا۔ اشوریہ کے تگلت پلیصر سوئم نے 733 ق م میں اسرائیل کو تاراج کر دیا۔ سامریہ برباد ہو گیا اور اسرائیل میں بسنے والے دس عبرانی قبیلے جلاوطن ہوئے۔ کچھ قید کر کے نینوا لے جائے گئے۔ باقی نہ جانے کہاں کھو گئے[16]۔

اب حضرت یونسؑ نے جو غالبًا بجولاں نینوا لے جائے گئے تھے۔ فرات کے کنارے بسے ہوئے اس عشرت پرست شہر کو راہِ راست پر لانے کی کوشش کی اور وہی شکمِ ماہی اور کدو کی بیل والا قصہ رہا۔ اس قصے کے مطابق ایک بار تو اہلِ نینوا کے توبہ تلا کرنے پر عذاب ٹل گیا۔ مگر تاریخی واقعہ یہ ہے کہ دوسری بار عذاب آ کر رہا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ ماداکے شاہ ہووخ شتر نے بابل کے بنوپلصر کے ساتھ مل کر اشور پر دھاوا بولا۔ نینوا جلا کر راکھ کر دیا گیا اور اشوری سلطنت ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔ زوال اشور سے عبرانی انبیاء جس قدر بھی خوش ہوتے کم تھا۔ لہٰذا سقوطِ نینوا پر شادمانی کلام کا اظہار ناحوم نبی کی زبانی سنیے۔ ''نینوا! دیکھ لوگ کس طرح بھاگے جا رہے ہیں۔ کوئی پکارتا ہے ٹھہرو ٹھہرو۔ پر بھگدڑ میں کوئی مڑ کر بھی نہیں دیکھتا۔ لوٹو۔ چاندی سونا خوب لوٹو۔ جہاں زر و مال کی کچھ انتہا نہ تھی وہ دولت کدے اب سنسان پڑے ہیں۔ دل پگھل گئے گھٹنے ٹکراتے ہیں اور چہرے زرد ہوئے۔ صد حیف اے خونریز شہر! تو جو مالِ غنیمت سے پر ہے اور پھر بھی لوٹ مار سے باز نہ آیا۔ مگر سنو! چابک کی آواز۔ پہیوں کی کھڑکھڑاہٹ۔ گھوڑوں کا اچھلنا۔ رتھوں کے ہچکولے دیکھو! سواروں کا شب خون۔ تلواروں اور بھالوں کی چمک—لاشوں کے انبار—! یہ اس خوب صورت فاحشہ جادوگرنی (نینوا) کی بدکاری کا نتیجہ ہے۔ کیونکہ وہ قوموں کو اپنی بدکاری سے اور خاندانوں کو اپنی جادوگری سے بیچتی ہے۔ تیرے قلعے اب انجیر کے درخت کے مانند ہیں جس کے پکے پھل درخت ہلاتے ہی کھانے والے کے منہ میں گر پڑیں۔ دیکھ تیرے مرد عورتیں بن گئے۔ تیری مملکت کے پھاٹک تیرے دشمنوں کے سامنے کھلے ہیں۔ آگ تیرے اڑبنگوں کو

کھا گئی۔ اپنے محاصرے کے وقت کے لیے پانی بھر لے۔ گڑھے میں اتر کر مٹی تیار کر اور اینٹ کا سانچہ ہاتھ میں لے۔

وہاں آگ تجھے چٹ کر جائے گی۔ تو نے اپنے سوداگروں کو آسمان کے ستاروں کی طرح فراواں کیا۔ اب تیرے امراء ٹلّی اور سردار ٹڈیوں کا ہجوم ہیں جو سردی کے وقت جھاڑی میں رہتی ہیں اور جب آفتاب نکلتا ہے تو اڑ جاتی ہیں اور اس کا کوئی ٹھکانا نہیں جانتا۔ اے شاہ اشور۔ تیرے چرواہے سو گئے تیرے سردار لیٹ رہے۔ تیری رعایا پہاڑوں پر پراگندہ ہوئی۔ تیری شکستگی لاعلاج اور تیرا زخم کاری ہے۔ تیرا حال سن کر لوگ تالیاں بجائیں گے کیونکہ کون ہے جس پر ہمیشہ تیری شرارت کا بار نہ رہا؟" (عہد نامہ قدیم۔ کتاب ناحوم)

ریاست اسرائیل کو اشور نے ختم کیا تھا۔ اشوریہ کی لدانیہ یا بابل نے بیخ کنی کی۔ اب بابل کا مقابلہ دوسری عبرانی ریاست یہودیہ سے ہوا جس کا پایہ تخت یروشلم تھا۔ یہاں بھی لہو ولعب، بت پرستی اور مظالم کی فراوانی تھی اور یہیں ہمیں حزقیل اور یرمیاہ نبی ملتے ہیں۔

حزقیل کا دورِ نبوت 598 ق م سے 571 ق م ہے۔ سقوط یروشلم سے گیارہ سال قبل بخت نصر کے پہلے حملے کے بعد اسیر کر کے بابل لے جائے گئے تھے۔ ان کی پیشن گوئی سنیے۔

"جب میں تل ابیب میں نہر کمار کے کنارے اسیروں کے درمیان بیٹھا تھا تو آسمان کھل گیا اور میں نے خدا کی رویتیں دیکھیں اور میں سات دن تک وہاں پریشان بیٹھا رہا اور مجھ پر وحی آئی کہ اے ابن آدم بنی اسرائیل کی رخ کر اور پیش گوئی کر کہ خاتمہ آن پہنچا۔ ہنگامے کا دن قریب ہے۔ خدا زبردستوں کا غرور مٹائے گا۔ بلا پر بلا اور افواہ پر افواہ آئے گی۔ تب وہ نبی سے رویا تلاش کریں گے لیکن شریعت کاہن سے اور نصیحت بزرگوں سے جاتی رہے گی۔ پھر مجھے (عالم رویا) میں یروشلم کے شمالی پھاٹک کے اندر کا بت خانہ نظر آیا جس میں بنی اسرائیل کے اصنام دیواروں پر منقش تھے اور ستر اشخاص ان کے آگے عوددان لیے کھڑے تھے۔ اور خدا نے کہا اے فانی انسان تو نے دیکھا کہ اسرائیل کے بزرگ اپنے منقش کاشانوں کی تاریکی میں کیا کر رہے ہیں؟ پھر مجھے ہیکل کا اندرونی صحن نظر آیا جس میں لوگ آفتاب کے رخ سجدہ کر رہے تھے۔ اور خدا نے کہا اے

ابنِ آدم اسرائیل اور یہودیہ کی بدکاری بہت عظیم ہے۔ ملک خونریزی اور بے انصافی سے معمور ہو چکا ہے۔ اے ابنِ آدم تو ایک باغی گھرانے میں رہا۔ جن کی آنکھیں ہیں اور دیکھتے نہیں کان ہیں مگر سنتے نہیں۔ لہٰذا اے فانی انسان! رختِ سفر باندھ اور دن کو یہاں سے نکل جا۔ ان لوگوں کے سامنے اپنا سامان مکان سے نکال۔ اسے اپنے کندھے پر رکھ کر اندھیرے میں نکال لے جا اور اپنا چہرہ ڈھانپ لے تاکہ زمین کو نہ دیکھ سکے۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔ تب ندا آئی اے ابنِ آدم کیا میرے باغیوں نے تجھ سے پوچھا کہ تو کیا کرتا ہے؟ ان کو جواب دے کہ یہ سامان یروشلم کے حاکموں اور بنی اسرائیل کے لیے بارِ نبوت ہے۔ جیسا میں نے کہا ویسا ہی ان کے ساتھ ہوگا۔ وہ جلاوطن اور اسیر ہوں گے اور ان کا حاکم شام کے اندھیرے میں اپنا سامان کندھے پر اٹھائے ہوئے نکل جائے گا۔ اے ابنِ آدم تو تھرتھراتے ہوئے روٹی کھا اور فکرمند ہو کر پانی پی اور لوگوں سے کہہ کہ وہ بھی اسی طرح لختِ جگر کھائیں گے اور خونِ دل پئیں گے۔ اے ابنِ آدم کیا اسرائیل میں یہ مثل جاری ہے کہ وقت گزرتا جاتا ہے اور کسی رویا کا نتیجہ نہیں نکلتا؟ تو ان سے کہہ دے کہ ہر رویا کا انجام قریب ہے اے ابنِ آدم! یروشلم کو مخاطب کر کے کہہ: زمین کنعان تیرا مولد ہے۔ تیرا باپ عموری تھا اور ماں حتّی۔ اپنی اس ولادت کی وجہ سے تجھے قابلِ نفریں سمجھ کر پھینک دیا گیا مگر میں نے تجھے چمن کے شگوفوں سے ہزار چند بڑھایا تھا۔ جب تو جوان ہوئی تو تجھے آراستہ کیا۔ تیری ناک میں نتھ اور کانوں میں بالیاں پہنائیں۔ تجھے کتان اور ریشم میں ملبوس کیا اور تو حسین اور اقبال مند لگنے لگی ملکہ بنی۔ مگر تو نے اپنی خوب صورتی پر تکیہ کیا اور اپنی شہرت کے وسیلے سے بدکاری کرنے لگی اور جس کا تیری طرف سے گزر ہوا اسی کی ہو رہی۔ تو نے میرے بچوں کو ذبح کر کے بتوں کے آگے ڈالا۔ تو نے مصریوں، اشوریوں اور قاصیوں کے ساتھ عیاشی کی تو طوائف نہیں بلکہ بدچلن بیوی کی مانند ہے جو شوہر کے عوض غیروں کو قبول کرے۔ تو تو ان کو خود اجرت دیتی ہے۔ تُو تو اپنی بڑی بہن سامریہ اور چھوٹی بہن سدوم سے بھی گئی گزری ہوگئی۔ سامریہ اپنے اشوری ہمسایوں اور اُن کے بتوں پر عاشق ہوئی۔ ان کے سردار اور حاکم دل پسند بانکے نوجوان تھے جو گھوڑوں پر سوار ہوتے اور ارغوانی پوشاک پہنتے تھے۔ چنانچہ میں نے اسے اشوریوں ہی کے حوالے کر دیا۔

تو نے یروشلم کے دیواروں پر شنگرف سے کھینچی ہوئی قاصی جوانوں کی تصویریں دیکھیں جو پٹکے اور رنگین پگڑیاں باندھتے تھے۔ چنانچہ اب میں تجھے اجاڑ دوں گا۔ وہ اسلحہ جنگ اور رتھوں اور خود پوش انبوہ کثیر کے ساتھ تجھے گھیر لیں گے۔ تیرے رنگ محل ڈھادیں گے۔ تیرے ستاروں اور بربطوں کی آواز پھر نہ سنی جائے گی۔"

اب ہم یرمیاہ نبی کی طرف آتے ہیں جن کی نوحہ گری ادب عالیہ کے حسین ترین نمونوں میں سے ایک ہے۔

یرمیاہ نبی ایک نہایت سویٹ بزرگ تھے۔ انھیں اپنی بصریت اور دردمندی کی وجہ سے دورِ جدید کے VISIONARY اور قوم پرست سیاسی قائدین کا پیش رو سمجھا جاسکتا ہے۔ بے حد حساس اور شاعر مزاج یرمیاہ نبی کی تحریریں عہد نامہ قدیم میں پہلی بار صوفیانہ واردات دل، حضورِ قلب اور سوزِ دروں کی نمائندگی کرتی ہیں۔ آپ ایک شعلہ بیان خطیب اور مقرر بھی تھے جن کو حکومت کا دباؤ کبھی خاموش نہ کر سکا۔ خود کاہن تھے مگر اقتدار پرست کاہن ان کے خلاف ہو گئے اور اُن کو غداری کے الزام میں قید کروادیا۔ زنداں میں بھی یرمیاہ نبی کب خاموش بیٹھنے والے تھے وہ اپنی کال کوٹھری سے گویا جوشیلے لیڈنگ آرٹیکل لکھ لکھ کر یہودیہ کے بادشاہ صدقیاہ کو بھجوایا کیے جن کو بادشاہ اطمینان سے بغیر پڑھے نذرِ آتش کرتا رہا۔ انھیں قید خانے کے حوض میں لٹکایا گیا۔ طرح طرح کی ایذا پہنچائی گئی۔ جب وہ قید سے باہر نکلتے تو پبلک ان کا مذاق اڑاتی۔ اس وقت—— وہ فرمایا کرتے—— "اے خدا تو مجھے جانتا ہے۔ مجھ پر کرم فرما۔ اور مجھے ستانے والوں سے میرا انتقام لے کہ میں نے تیری خاطر ملامت اٹھائی ہے۔ میں خوشی منانے والے کی محفل میں بیٹھا اور شادماں نہ ہوا۔ اگر میں باہر میدان میں جاؤں تو وہاں تلوار کے مقتول ہیں۔ میں شہر میں داخل ہوں تو وہاں کال کے مارے ہیں—— خداوندا کیا تو میرے لیے سراب ہو گیا ہے اس پانی کے مانند جسے قیام نہیں؟ خدایا! دن بھر لوگ میرا مذاق اڑاتے ہیں۔ جب میں اپنی تقریر میں تیرے غضب اور ہلاکت کا اعلان کرتا ہوں تو لوگ مجھ پر ہنستے ہیں مگر میں کیوں اس کا ذکر نہ کروں جس کا کلام میرے دل میں آگ کی طرح شعلہ زن ہے۔ میں ضبط کرتے کرتے تھک گیا اور چاروں

طرف دہشت ہے۔"

یرمیاہ بن خفیاہ کے مزید ارشادات سنیے جو" بنیامین کی مملکت کے عنتوتی کاہنوں میں سے تھا۔"

"اور وہ رب الافواج فرماتا ہے (اے نبی یہوداہ) میں نے تو نہایت عمدہ بیج بویا تھا تو کیوں میرے لیے جنگلی انگور بن گئی؟ تیری اپنی تلوار سے تیرے انبیا قتل ہوئے۔ ایک کنواری اپنے زیور اور ایک دلہن اپنے آرائش نہیں بھول سکتی لیکن میرے بندے مجھے بھول بیٹھے (اور یرمیاہ نے کہا) ہائے میرا دل! میرے دل میں درد ہے۔ میرا دل بیتاب ہے۔ میں خاموش نہیں رہ سکتا۔ اے میرے ناتواں جان۔ میں نے نرسنگے کی آواز اور جنگ کی للکار سن لی ہے۔ شکست پر شکست کی خبریں آرہی ہیں۔ ملک برباد ہوگیا۔ میرے خیمے اور پردے غارت کیے گئے۔ میں نے زمین پر نظر کی اور اسے ویران پایا اور آسمان بے نور ہوگیا۔ پہاڑ لرز اٹھے۔ جنگلوں کے طیور اُڑ چکے۔ میں نے دختر صیہون کی آواز سنی ہے جو ہانپتی ہے اور ہاتھ پھیلا کر کہتی ہے ہائے قاتلوں کے سامنے میری جان بیتاب ہے اور رب العالمین فرماتا ہے اے اسرائیل اور یہودیہ کے بے وفا گھرانو! میں ایک قوم تم پر دور سے چڑھالاؤں گا۔ جن کی زبان تم نہیں سمجھو گے جن کے ترکش کھلی قبریں ہیں۔ وہ بلا کے تیرانداز اور نیزہ باز اور غضب کے سنگ دل لوگ ہیں۔ ان کے نعروں کی صدا سمندر کی ایسی مہیب ہے۔ ملک میں جھوٹے نبی دعویٰ کرتے ہیں اور کاہن کے وسیلے سے حکمراں ہیں۔ دن ڈھل رہا ہے اور شام کا سیاہ بڑھتا جاتا ہے۔ یروشلم کے مقابلے میں دمدمے باندھو۔ اے یرمیاہ! کیا تو نہیں دیکھتا کہ یروشلم کے گلی کوچوں میں دیویاں پوجی جارہی ہیں۔ میں پہاڑوں کے لیے گریہ وزاری اور چرواہوں کے لیے نوحہ کروں گا۔ میں یروشلم کو گیدڑوں کا مسکن بنادوں گا۔ غارت گر پہاڑوں پر پہنچ گئے اور کسی بشر کو سلامتی نہیں۔ اے یروشلم اب کون تجھ پر رحم کرے گا؟ میں یہودیہ کو شاہ بابل کے حوالے کردوں گا جو ان کو اسیر کر کے بابل لے جائے گا (اور یرمیاہ نبی نے کہا)

میرا دل اندر سے ٹوٹ گیا۔ میں نے سامریہ کے جھوٹے غیب دانوں کی حماقت دیکھی ہے، جنھوں نے بعل کے نام پر نبوت کی۔"

"وہ وحی جو دسویں برس میں جو بخت نصر کا اٹھارہواں برس تھا یرمیاہ پر نازل ہوئی جب شاہ بابل کے لشکر نے یروشلم کا محاصرہ کر رکھا تھا اور یرمیاہ شاہ یہودیہ صدقیاہ کے محل کے صحن میں مقید تھا اور یرمیاہ کی وحی اس کے منشی نے قلم بند کی اور بادشاہ کو بھیجی اور بادشاہ اپنے زمستانی محل میں آتش دان کے پاس بیٹھا تھا اور اس کے امراء اس کے چوگرد جمع تھے اور یرمیاہ کا صحیفہ اسے پڑھ کر سنایا گیا اور ابھی تین چار ورق پڑھ گئے تھے کہ بادشاہ نے اسے منشی کے قلم تراش سے کاٹا اور آتش دان میں جلا دیا (یرمیاہ نبی نے تین بار اسے اپنے صحیفے بھجوائے اور تینوں بار بادشاہ نے انھیں آگ میں پھینک دیا) فرعون مصر کی فوج نے حملہ کیا اور یرمیاہ یروشلم سے نکلا اور جب وہ بنیامین کے پھاٹک پر پہنچا تو داروغہ نے اس سے کہا تو قاصیوں کی طرف بھاگا جاتا ہے اور یرمیاہ نے کہا یہ سراسر بہتان ہے۔"

قصہ مختصر کسی نے ان کی نہ سنی اور ان کو پابجولاں مصر بھیج دیا گیا اس کے بعد وہ ہماری نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔

طویل محاصرے کے بعد بخت نصر نے 586 ق م میں یروشلم فتح کر لیا۔ شاہ صدقیاہ اور اس کے خاندان کو تلوار کے گھاٹ اتار دیا۔ ہزارہا عبرانی امراء علماء، شہزادے اور کاریگر قید کر کے بابل بھیج دیے گئے۔ یروشلم میں چند نادار، بدحال باقی رہ گئے تھے۔ بخت نصر نے سلیمانؑ کے خزانے لوٹ کر بابل بھجوا دیے اور چونکہ عبرانی مفتوح نبی یہوداہ تھے اور ریاست یہودیہ سے قید ہو کر آئے تھے اس وقت سے عبرانی "یہودی" کہلانے لگے۔

اب یروشلم کا نوحہ سنیے۔ "وہ خاتونِ اقوام بیوہ ہوگئی۔ اس کے دوستوں نے اسے دغا دی۔ یہوداہ جلاوطن ہوا۔ اس کے پھاٹک سنسان ہیں اور کاہن آہیں بھرتے ہیں۔ اس کی کنواریاں مصیبت زدہ ہیں۔ اس کی اولاد کو دشمن اسیری میں ہانک لے گئے۔ دختر صیہون کی شان و شوکت جاتی رہی۔ اس کے امراء ان ہرنوں کے مانند ہیں جنھیں چراگاہ نہیں ملتی اور شکاریوں

کے سامنے عاجز ہو جاتے ہیں۔ اے خداوند مجھ پر نظر کر کہ میں ذلیل ہو گیا۔ تو نے مجھے ان کے حوالے کیا جن سے مقابلے کی مجھ میں تاب نہیں۔ میری کنواریاں اور میرے جوان قید ہو کر چلے گئے۔ میری کاہن اور میرے بزرگ شہر میں کھانا ڈھونڈتے ڈھونڈتے ہلاک ہو گئے۔ باہر تلوار بے اولاد کرتی ہے۔ گھر میں موت کا سامنا ہے۔ خدا نے اسرائیل کے جمال کو آسمان سے زمین پر گرا دیا۔ اور اپنے مذبح کو رد کیا۔ یروشلم کے دروازے زمین میں غرق ہو گئے۔ اور فصیلیں ماتم کرتی ہیں۔ میری آنکھیں روتے روتے دھندلا گئیں۔ اے دختر یروشلم میں تجھے کیا نصیحت کروں اور کس سے تشبیہہ دوں؟ تیرا زخم سمندر سے زیادہ گہرا ہے کیا یہ وہی شہر ہے، جسے لوگ کمال حسن اور فرحتِ جہاں کہتے تھے؟ خدا نے تیرے مخالفوں کا سینگ بلند کیا۔ اٹھ اور پچھلے پہر کو فریاد کر۔ خدا میری گھات میں بیٹھا ریچھ اور کمین گاہ کا شیر ہے۔ اے خدا میں نے زنداں میں تیری دہائی دی تھی۔ مری دختر قوم بیابانی شتر مرغ کی طرح بے رحم ہے۔ اس کی بدکاری سدوم کے گناہ سے بدتر ہے۔ اس کے شرفا جو برف اور دودھ سے زیادہ اجلے تھے اب ان کے کالے چہرے بازار میں پہچانے نہیں جاتے۔ ہماری میراث بے گانوں نے لے لی۔ ہم نے اپنا پانی مول لے کر پیا اور لکڑی دام دے کر خریدی[17]۔ صحرانشینوں کی تلوار کے باعث ہم جان پر کھیل کر روٹی حاصل کرتے ہیں۔ صیہون کی بیٹیوں کو بے حرمت کیا گیا۔ جوانوں نے چکی پیسی اور بچوں نے گرتے پڑتے لکڑیاں ڈھوئیں۔ کوہ صیہون پر اب گیدڑ آوارہ ہیں۔“

بابل پہنچ کر عبرانی شعرا نے حسب معمول جس بے مثال انداز میں اظہار غم کیا وہ لحن نمبر 137 میں ملاحظہ کیجیے۔ ”ہم بابل کے پانیوں کے کنارے بیٹھے اور صیہون کو یاد کر کے روئے۔ وہاں ہم نے بید کے درختوں میں اپنے ستار لٹکا دیے۔ کیونکہ ہمارے صیادوں نے ہمیں گیت گانے کا حکم دیا۔ اے بابل کی بیٹی جو ہلاک ہونے والی ہے مبارک ہو وہ شخص جو تجھے اس سلوک کا بدلہ دے جو تو نے ہمارے ساتھ کیا۔ مبارک ہو وہ شخص جو تیرے بچوں کو اٹھا کر چٹان پر پٹخ دے۔“

بابل کی اسیری کے دور میں ہماری ملاقات ایک اور دل آویز شخصیت سے ہوتی ہے یعنی حضرت دانیالؑ!

"______اور بخت نصر نے بیت اللہ کے طلائی ظروف اپنے بت کدے میں داخل کیے اور اپنے خواجہ سراؤں کے سردار کو حکم دیا کہ مقید بنی اسرائیل کے شرفا اور دانشوروں کو تین سال تک قاصی علوم و زبان کی تعلیم دی جائے تا کہ وہ قصر شاہی میں حاضر ہو کر دربار میں کھڑے ہو سکیں اور ان قیدیوں میں دانیال بھی شامل تھا۔ لیکن اس نے ارادہ کیا کہ وہ شاہی خوراک اور شراب سے خود کو ناپاک نہ کرے گا۔ اس نے خواجہ سرا سے درخواست کی کہ کھانے کو ساگ پات اور پینے کو سادہ پانی اسے مہیا کر دیا جائے اور دانیال رویا اور خوابوں کی تعبیر میں صاحب فہم تھا اور بخت نصر نے اسے ملک کے تمام فال گیروں اور نجومیوں سے بہتر پایا اور وہ بادشاہ کے حضور میں کھڑا رہنے لگا اور دانیال شاہ خورس[18] کے پہلے سال تک زندہ تھا۔"

"اور بخت نصر نے اپنی سلطنت کے دوسرے سال ایسے خواب دیکھے کہ اس کی نیند جاتی رہی اور اس نے نجومیوں اور فال کھولنے والوں اور قاصیوں کو بلایا اور قاصیوں نے اسامی زبان میں کہا۔ اے بادشاہ ابد تک جیتا رہ ہم تیرے خواب کی تعبیر بتائیں گے۔ مگر وہ کچھ نہ بتا سکے۔ اور بخت نصر نے ان کے قتل کا حکم دیا۔ اور تب بادشاہ کا وزیر دانیال کو لے کر آیا اور عرض کی کہ اسیران بابل میں ایک شخص مل گیا ہے جو تعبیر بتا دے گا۔ اور دانیال نے بادشاہ سے کہا۔ حکما اور نجومی اور ساحر کچھ نہیں جانتے مگر آسمان پر ایک خدا ہے جو راز کی باتیں آشکار کرتا ہے۔ تب دانیال نے تعبیر بیان کی کہ اے بادشاہ تو انسانوں میں سے ہانک کر نکال دیا جائے گا اور حیوانوں کی طرح رہے گا بیل کی طرح گھاس کھائے گا اور آسمان کی شبنم سے تر ہو گا اور جب سات دور گزر جائیں گے تب تجھے معلوم ہو گا کہ اصل بادشاہ حق تعالیٰ ہے جو جس کو چاہتا ہے دیتا ہے۔ اس لیے شاہا! میری درخواست قبول کر۔ اپنی خطاؤں اور مظالم کو دور کر تا کہ تیرے دل کو اطمینان میسر ہو۔ ایک سال بعد ایسا ہی ہوا کہ بخت نصر کو آدمیوں میں سے نکال دیا گیا اور پھر یوں ہوا کہ اس کے بیٹے بیلشضر نے ایک ہزار امرا کی دعوت کی اور شراب کے نشے سے مسرور ہو کر حکم دیا کہ وہ مقدس طلائی ظروف جو اس کا باپ یروشلم کے بیت اللہ سے لوٹ لایا تھا۔ نکال کر لائے جائیں تا کہ شاہی

مہمان ان سے مے نوشی کریں۔ چنانچہ امرا اور شہزادیوں نے ان کے برتنوں میں شراب انڈیل کر پی اور اس کے بعد چوبی اور سنگی بتوں کی حمد کی۔ اسی وقت ایک انسانی ہاتھ کی انگلیاں ظاہر ہوئیں اور انھوں نے شمع دان کے مقابل محل کی دیوار کے گچ پر کچھ لکھا اور غائب ہو گئیں۔ بادشاہ کا رنگ فق ہو گیا اور تھر تھر کانپنے لگا۔ اس نے اپنے حکیموں اور نجومیوں کو بلایا وہ کچھ نہ پڑھ سکے۔ تب بادشاہ کی والدہ جشن گاہ میں آئی اور کہا اے بادشاہ تو ابد تک جیتا رہ۔ تیری مملکت میں ایک شخص ہے جس میں قدوس الٰہوں کی روح ہے۔ اسے تیرے باپ نے نجومیوں فال گیروں اور قاسموں کا سردار بنایا تھا۔ اسے بلوا۔ تب دانیال بلایا گیا اور بادشاہ نے اس سے پوچھا کیا تو وہی دانیال ہے جو یہودیہ کے اسیروں میں شامل ہے۔ اس نوشتے کا مطلب بتلا۔ اور دانیال نے پڑھا "منے منے تقیل و فارسین۔" شاہا اس کا مطلب یہ ہے کہ منے یعنی خدا نے تیری مملکت کا حساب کیا اور اسے تمام کر ڈالا۔ تقیل تو ترازو میں تولا گیا اور کم نکلا۔ فارسین۔ تیری سلطنت تقسیم ہوئی اور مادیوں اور فارسیوں کو دی گئی۔ اسی رات بیلشضر قتل ہوا اور دارا مادی[19] نے باسٹھ برس کی عمر میں سلطنت حاصل کی۔" مزید بیلشضر بادشاہ کی سلطنت کے تیسرے سال مجھ کو دانیال نے عالم رویا میں دیکھا جیسے میں قصر سوس میں ہوں جو عیلام میں ہے۔ پھر دیکھا میں دریا کے کنارے موجود ہوں اور کیا دیکھتا ہوں کہ دریا کے پاس ایک مینڈھا کھڑا ہے جس کا ایک سینگ دوسرے سے بڑا ہے اور وہ مغرب و شمال و جنوب کی طرف سینگ مارتا ہے۔ یہاں تک کہ کوئی جانور اس کے سامنے کھڑا نہ رہ سکا اور میں سوچ ہی رہا تھا کہ ایک بکرا مغرب سے آ کر تمام روئے زمین پر پھر گیا اور اس کی آنکھوں کے درمیان ایک عجیب سا سینگ تھا اور مینڈھے پر قہر سے حملہ آور ہوا اور اس کے دونوں سینگ توڑ ڈالے۔ پھر جب وہ نہایت زور میں آیا تو اس کا بڑا سینگ ٹوٹ گیا اور اس کی جگہ چار عجیب سینگ آسمان کی چاروں ہواؤں کی طرف نکلے۔ میں اس کی تعبیر کی فکر میں تھا کہ کیا دیکھتا ہوں جیسے ایک انسان صورت میرے سامنے کھڑا ہے۔ اور پھر ندا آئی کہ اے جبرائیل اس فانی انسان کو اس رویا کے معنی سمجھا دو۔ چنانچہ وہ انسان صورت میرے قریب آیا اور کہا اے ابن آدم سمجھ لے کہ یہ آخری زمانے کے متعلق ہے۔ جب وہ مجھ سے مخاطب تھا میں گہری نیند میں منہ کے

بل زمین پر پڑا تھا۔ لیکن اس نے پکڑ کر مجھے سیدھا کیا اور مجھے سمجھایا یہ دونوں سینگ ماد اور فارس کے بادشاہ ہیں اور وہ جسیم بکرا یونان کا بادشاہ[20] ہے اور اس کے سینگ ٹوٹ جانے کے بعد جو مزید چار سینگ نکلے وہ چار سلطنتیں ہیں جو شاہ یونان کی قوم میں قائم ہوں گی نگران کا اقتدار ان کا جیسا نہ ہوگا۔ لیکن اے ابن آدم تو اس رویا کو بند کر کے رکھ کیونکہ اس کا علاقہ مستقبل بعید سے ہے اور مجھ دانیال کو غش آ گیا اور چند روز بیمار پڑا رہا اور پھر اٹھ کر بادشاہ کے کاروبار میں لگ گیا۔ میں پریشان تھا لیکن کوئی میری پریشانی کی وجہ نہ سمجھ سکا۔

مزید: "دارا ابن اخسویرس جو مادیوں کی نسل سے ہے اور قاصیوں کی مملکت کا بادشاہ ہوا، اس کی سلطنت کے پہلے سال مجھ دانیال نے کتابوں میں ان برسوں کا حساب سمجھایا جن کے متعلق یرمیاہ نبی پر وحی آئی تھی کہ یروشلم کی بربادی کو ستر برس پورے گزریں گے اور میں نے قبلہ رو ہو کر مناجات پڑھی۔ روزہ رکھا اور ٹاٹ اوڑھ کر راکھ پر بیٹھ گیا اور دعا کی کہ خدایا ہم گنہگار تھے اور ہم کو سزا ملی۔ اب اپنا قہر موقوف کر۔ اور تب جبرائیل تیزی سے پرواز کرتا ہوا آیا اور نماز مغرب کے وقت اس نے مجھے چھوا اور کہا اے دانیال میں اس لیے آیا ہوں کہ تجھے دانش و فہم بخشوں تیری مناجات کے شروع ہی میں حکم الٰہی صادر ہوا اور میں یہاں آیا ہوں تا کہ تجھے بتاؤں کیونکہ تو بہت عزیز ہے کہ تیری قوم اور تیرے مقدس شہر کی بحالی کے لیے ستر ہفتے مقرر کیے گئے تا کہ خطا کاری کا خاتمہ ہو اور گناہوں کا کفارہ دیا جائے۔

> "شاہ فارس خورس کے تیسرے سال مجھ دانیال پر ایک بات ظاہر کی اور میں دانیال ہفتوں تک ماتم کرتا رہا اور تین ہفتے بعد میں پہلے ماہ کی چوبیسویں تاریخ کو دجلہ کے کنارے کھڑا تھا کیا دیکھتا ہوں جیسے ایک شخص ہے۔ کتانی پیراہن اور طلائی پٹکا پہنے۔ بدن زبرجد کی مانند۔ چہرہ بجلی ایسا۔ آنکھیں گویا آتشیں چراغ۔ بازو اور پاؤں پیتل کے ایسے اور آواز شور انبوہ کی مانند اور دہشت کے مارے مجھ میں تاب نہ رہی اور طاقت جاتی رہی۔"

قصہ مختصر پھر جبرائیل نے آ کر سمجھایا کہ فارس کے موکل نے اکیس دن میرا مقابلہ کیا اور

میکائیل میری مدد کو پہنچا اور میں شاہان فارس کے پاس رکا رہا۔ اب میں فارس کے موکل سے لڑنے کو جاتا ہوں اور میرے جاتے ہی یونان کا موکل آئے گا لیکن جو کچھ سچائی کے صحیفے میں لکھا ہے تجھے بتاتا ہوں۔ فارس میں ابھی تین بادشاہ اور برپا ہوں گے۔ چوتھا ان سب سے زیادہ دولت مند ہوگا۔ اور جب وہ اپنی دولت سے تقویت پائے گا تو سب کو یونان کے خلاف ابھارے گا۔ لیکن ایک اور زبردست بادشاہ برپا ہوگا جو بڑے تسلط سے حکمراں ہوگا۔ (وغیرہ وغیرہ۔ آگے سکندر کے بعد یونانیوں کی ایشیائی سلطنت کے عروج وزوال کا تذکرہ ہے)۔

> ''تب دانیالؑ نے کیا دیکھا کہ دجلہ کے دونوں کناروں پر دو شخص کھڑے ہیں ایک نے دوسرے سے جو کتانی لباس پہنے تھے اور دریا کے پانی اوپر کھڑا تھا پوچھا کہ ان عجائب کے وقوع پذیر ہونے میں کتنی مدت باقی ہے اور اس نے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر حی القیوم کی قسم کھائی اور کہا ایک دور۔ اور دَور اور نیم دور۔ میں کچھ نہ سمجھ سکا تو اس نے کہا اے دانیالؑ تو اپنی راہ لے۔ کیونکہ یہ باتیں آخری وقت تک سربہ مہر رکھی جائیں گی۔ بہت سے لوگ پاک کیے جائیں گے اور شریر شرارت میں مصروف رہیں گے۔ شریروں میں سے کوئی نہ سمجھے گا لیکن دانش مند سمجھیں گے۔''

بابل پر ایرانی فتح کے متعلق یرمیاہ نبی کی پیشن گوئی:۔شاہ بخت نصر نے مجھے کھالیا مجھے خالی برتن کے مانند کر دیا۔ (لیکن خداوند فرماتا ہے) کہ بابل جو کچھ نگل گیا ہے میں اسے اس کے منہ سے اگلواؤں گا۔ بابل کی فصلیں گر گئیں۔ اس پر سمندر چڑھ گیا اور وہاں سے رونے کی صدا آتی ہے۔ یرمیاہ نے ان سب آفتوں کو جو بابل پر آنے والی تھی قلم بند کیا اور سرایاہ بن یزیاہ بن مسیاہ سے کہا (جو بابل لے جارہا تھا) کہ جب تو اس کتاب کو پڑھ لے تو اسے ایک پتھر سے باندھ کر فرات میں پھینک دیجیو۔ کہ بابل اسی طرح ڈوب جائے گا۔

یسعیاہ نبی کی پیش گوئی:۔ بابل سدوم اور عمورہ کی مانند تباہ ہوگا۔ وہاں عرب خیمے نہ لگائیں گے۔ وہاں پر بن کے درندے اور اُلّو اور شتر مرغ بسیں گے۔ گیدڑ اور بھیڑیے ان کے

رنگ محلوں میں چلائیں گے۔ اے صبح کے روشن ستارے! تو کس طرح آسمان سے گر پڑا! تو جو کہتا تھا کہ میں اپنا تخت کو اکب سے بھی اونچا کروں گا اور بادلوں پر چڑھ جاؤں گا۔ دیکھو اب اُن کے بہادر فریادی ہیں اور سفیر پھوٹ پھوٹ کر روتے ہیں۔ یروشلم آباد ہوگا۔ اور میں اس کے کھنڈر تعمیر کروں گا۔ خداوند فرماتا ہے میں خورس کے حق میں کہتا ہوں کہ وہ میرا چرواہا ہے اور میری مرضی پوری کرے گا۔ خداوند اپنے ممسوح خورس کے حق میں فرماتا ہے کہ میں نے ان کا داہنا ہاتھ پکڑا کہ امتوں کو ان کے سامنے زیر کروں۔ اے کنواری دختر بابل! نیچے اتر آ اور خاک پر بیٹھ اب تو نرم و نازک نازنین نہ کہلائے گی۔ چکی لے اور آٹا پیس۔ نقاب اُتار اور دامن سمیٹ کر ندیاں عبور کر۔ اب تیرا بدن بے پردہ کیا جائے گا۔ اے قاسدیوں کی بیٹی چپ ہو کر بیٹھ اور اندھیرے میں داخل ہو جا۔ اب تو مملکتوں کی خاتون نہ کہلائے گی۔ تو جس نے بوڑھوں پر بھی جوار کھا تھا۔''

538ق م کی اس رات جب شاہی محل میں ایک دعوت ہو رہی تھی (جس کا ذکر اتنے ڈرامائی انداز میں صحیفۂ دانیال میں کیا گیا ہے) بابل کے پھاٹکوں پر سائیرس اعظم کی فوجیں پہنچ چکی تھیں۔ بادشاہ بابل بنونیدس کے ولی عہد بیلشضر نے ایرانی لشکر کا مقابلہ کیا اور مغلوب ہوا۔ اکتوبر کے مہینے میں بابل پر سائیرس اعظم کا قبضہ ہو گیا۔ اس نے یہودی اسیروں کو آزاد کر دیا۔ اور چالیس ہزار یہودی فلسطین واپس چلا گیا۔ فلسطین اب دولت ہخامنشیہ کے بیس صوبوں میں سے اُس پانچویں مغرب صوبے کا ایک حصہ بنا جس کا انتظامی مرکز دمشق میں تھا۔ (اس صوبے میں اشور، فنقیہ اور جزیرۂ قبرص شامل تھے۔ خود فلسطین کا صدر مقام یروشلم رہا۔ سائیرس کے حکم سے ہیکل سلیمانی دوبارہ تعمیر کیا گیا۔ اور عزرا نبی (عربی نام عزیرؑ) نحمیاہ نبی، ذکریاؑ وغیرہ بزرگانِ دین نے ایک نئی یہودی قوم کی تشکیل کی جو جلاوطنی اور صعوبتوں کی وجہ سے کافی سیدھی ہو گئی تھی۔ چنانچہ کوئی وجہ نہ تھی کہ یہودی سائیرس اعظم کو نجات دہندہ اور مسیح نہ سمجھتے۔

ادھر بابل پر ایرانی تسلط کے بعد حضرت دانیال پر کیا گزری۔ یہ بھی سن لیجیے۔ ''اور دارا کو پسند آیا کہ اپنی مملکت پر ایک سو بیس ناظم مقرر کرے۔ ان پر تین وزیر ہوں۔ ان وزیروں میں دانیالؑ بھی تھا جو اپنی دانش مندی کی وجہ سے ناظموں پر سبقت لے گیا اور بادشاہ نے چاہا کہ اسے

اپنی مملکت کا مختار مقرر کردے۔ چنانچہ باقی ناظم اس کے خلاف ہو گئے لیکن دانیالؑ پر سوائے اس کے اور کوئی قصور ثابت نہ کرسکے کہ وہ شریعت موسوی اور احکام خداوندی کا پابند تھا۔ انھوں نے دارا سے کہا کہ "ماد اور فارس کے قوانین اٹل ہیں اور کبھی تبدیل نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا وہ ایک خسروانہ آئین جاری کرے۔ جس کی رو سے ایک مہینے تک جو شخص دارا کے سوا کسی اور معبود سے کوئی درخواست کرے اسے شیروں کے آگے ڈال دیا جائے۔" اور بادشاہ نے مجبوراً اس فرمان پر دستخط کر دیے۔ جب دانیالؑ کو معلوم ہوا کہ نوشتے پر دستخط کر دیے گئے ہیں وہ حسب معمول اپنے گھر گیا اور اس کی کوٹھری کا دریچہ جو بیت المقدس یروشلم کی سمت کھلا تھا اس میں دو زانو ہو کر عبادت کرتا رہا۔ اس کے دشمنوں نے فوراً جا کر بادشاہ سے شکایت کی کہ وہ تیرے فرمان کی پرواہ نہیں کرتا اور حسب معمول دن میں تین بار نماز پڑھ رہا ہے۔ چنانچہ بادشاہ کے حکم سے اسے شیروں کے آگے ڈال دیا گیا اور شیروں نے اسے کوئی گزند نہ پہنچایا اور بادشاہ یہ معجزہ دیکھ کر بہت شادمان ہوا اور دوسرا فرمان جاری کیا کہ میری ساری رعایا دانیالؑ کے خدا پر ایمان لائے۔" پس یہ دانیالؑ دارا مادی اور خورس کی سلطنت میں کامیاب رہا (صحیفہ دانیالؑ)

اس مضمون میں جا بجا عہد نامہ قدیم کے حوالے دیے گئے ہیں۔ سائرسؔ اعظم کے ہم راہ ایران واپس لوٹنے سے قبل ضروری ہے کہ ان کی وضاحت کر دی جائے۔

عبرانی یعنی یہودی انجیل (عہد نامہ قدیم) تقریباً ایک ہزار سال کے عرصے میں قلم بند ہوئی اور کپڑے یا پپائیرس (مصری کاغذ) پر لکھی جاتی رہی۔ اس کا پہلا حصہ "تورا" (عربی تورات) دوسرا "نبیلیم" (عربی نبیین) یعنی صحف انبیا اور تیسرا "کتھم" (عربی "کتب") تھا ("کتھم" میں زبور، ایوبؑ، واعظ، نوحے، غزل الغزلات تواریخ 1 و 2 دانیالؑ، عزرا، نحمیاہ وغیرہ شامل ہیں)

چند پیغمبروں نے اپنے نوشتے آٹھویں صدی قبل مسیح میں لکھنے شروع کیے جو شمال ریاست اسرائیل کے لیے ٹوئنبی کی اصطلاح میں TIME OF TROUBLES تھا۔ ان انبیا کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ ان ہی میں عموس نبی شامل تھے۔ یہ ایک مفلوک الحال گذریے تھے۔ مگر بادشاہوں

کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ حکومت وقت نے انھیں یہودیہ جلا وطن کر دیا۔ آپ کا دورِ نبوت غالباً 765ق م سے 750ق م تک ہے۔ ہوسیع پیغمبر اسرائیل میں تھے (دورِ نبوت 745ق م سے 735ق م ہے) یسعیاہ نبی نے 740ق م سے 701ق م تک پیغمبری کی۔ اور غالباً اُن کو آرے سے چڑوایا گیا۔ یرمیاہ نبی سے ہم پہلے ملاقات کر چکے ہیں۔ جو یسعیاہ نبی کے تقریباً سو سال بعد پیدا ہوئے اور سقوطِ یروشلم کے بعد 586ق م میں مصر جلا وطن کیے گئے۔ حزقیل بخت نصر کے پہلے حملے کے موقع پر آٹھ ہزار یہودیوں کے ساتھ 597ق م میں بابل جلا وطن کیے گئے اور دجلہ کے کنارے خواب دیکھتے اور روتے رہے۔ ان تمام انبیاء کے صحائف متواتر جنگوں اور جلا وطنی کے زمانے میں کچھ کھو گئے کچھ باقی بچ رہے اور ان میں بعد میں اضافے کیے گئے۔ یرمیاہ نبی کے صحیفے سے معلوم ہو چکا ہے کہ بادشاہ صدقیاہ ان کی تحریروں کو غصے کے مارے آگ میں پھینکتا رہا۔ کتاب پیدائش کے دو گمنام مصنف 'ی' اور 'الف' ہیں جو شاید نبی یہودیہ اور نبی افرائیم یعنی جنوبی اور شمالی ریاستوں کے باشندے تھے اور غالباً نویں اور آٹھویں صدی قبل مسیح میں زندہ تھے۔ زوال آدمؑ اور حضرت ابراہیمؑ کی چند حکایات ی نے لکھیں الف نے قصہ یوسفؑ تحریر کیا۔ عہدِ قدیم کے پہلے پانچ حصے یعنی توراۃ جو PENTATEUCH کہلاتے ہیں کیونکہ پانچ صحف پر مشتمل ہیں۔ یعنی پیدائش، خروج، احبار، تعداد یا گنتی اور استثنا۔ استثنا۔ جس میں شریعت موسوی قصہ موسیٰؑ اور آپ کا آخری وعظ درج ہے۔ ایک اور گمنام مصنف دال نے غالباً ساتویں صدی ق م میں لکھی اور حکومتِ وقت کے خوف سے (جو اس وقت پھر احکام موسویؑ سے برگشتہ ہو گئی تھی) اسے کہیں چھپا دیا۔ غالباً اسی تصنیف کو حلقیاہ کاہن نے بیت اللہ کے کسی تاریک کونے میں 621ق م میں پڑا پایا اور اس کی بناء پر شریعت کی تجدید کی گئی۔ اسی وجہ سے اس کے یونانی ترجمے کو DEUTERONOMY (شریعت کی دوسری کتاب) کہا گیا۔

پنج نامہ کا بیشتر حصہ اسیری بابل کے دوران میں تحریر کیا گیا۔ جہاں جلا وطنوں نے اپنے کاتبوں کا ایک باقاعدہ مدرسہ قائم کر لیا تھا۔ کتاب پیدائش کا پہلا باب بابل ہی میں لکھا گیا جہاں تخلیق کائنات کی مختلف اساطیر کا پہلے سے چرچا تھا کہا جاتا ہے کہ بخت نصر کے معلق باغات نے

باغ عدن کا خیال دلایا۔ بابل بلند و بالا میناروں، نہروں اور سنہرے پھاٹکوں کا شہر تھا۔ چنانچہ "مینارہ بابل" کی تفصلات کے لیے اس اونچے مینار کو ماڈل بنایا گیا جو مروک کے مندر کے پاس استادہ تھا۔ طوفانِ نوحؑ کے پس منظر میں داستان گل گامش اور دوسری اور ہری کہانیاں بھی موجود تھیں جن میں ایک عالمگیر طوفان کا ذکر تھا۔ قصہ پیدائش کے ایک اوّلیں نسخے میں گناہ آدم کا تذکرہ موجود نہ تھا۔ (انسان کے "ازلی گناہ" اور اس کے کفارے کے نظریے کو صدیوں بعد مسیحی داعی سینٹ پال نے بے حد اہمیت دی کیونکہ اسی تصور پر "ابن اللہ" کی قربانی اور شفاعت کے فلسفے کی بنیاد رکھی گئی) 600ق م سے قبل یوم آخرت جزم وسزا کا تصور بھی یہودی مذہب میں ناپید ہے (حالانکہ ان کے اجداد صدیوں تک مصر میں رہ چکے تھے جہاں ممیاں حیات بعد الممات کی امید میں دنیا بھر کے ساز وسامان کے ساتھ دفن کی جاتی تھیں) 600ق م کے بعد یہودی "دوزخ" و "بہشت" کے زرتشتی تصورات سے متعارف ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ شیطان یا ابلیس کا تصور یہودیوں نے ایرانی اہرمن سے مستعار لیا۔ ایران قدیم میں سانپ شر اور بدی کا سمبل تھا۔ مارِ ضحاک (ازدھاک کے کندھوں کے سانپ) بھی اسی بدی کے نمائندے تھے۔ انجیل میں ہمیں حوّا کو بہکانے والا شیطان سانپ کے بھیس میں ملتا ہے۔ زرتشتیوں کا پل چنوت (جس پر سے مرنے کے بعد روح کو گزرنا پڑتا ہے) جو کھولتے ہوئے لاوے کے دریا پر معلق ہے۔ پل صراط سے مشابہ تھا۔ روح کا تصور بھی اب تک یہودیوں کے ہاں موجود نہ تھا اور بہت بعد میں وہ زرتشتی رواں اور یونانی SOUL سے آشنا ہوئے۔ دین زرتشت میں بھی فرشتہ سروش موجود تھا۔ جو جبرئیلؑ کے مانند ایرانی عقیدے کے مطابق زرتشت کے پاس آیا جایا کرتا تھا جو آذربائیجان کے ایک پہاڑ پر اہورمزدہ سے ہم کلام ہوئے تھے۔

بابل ہی میں ساؤل بادشاہ سے لے کر آخری عبرانی بادشاہ صدقیاہ تک کے حالات رقم کیے گئے۔ قاضیوں کی حکایات پہلے سے لکھی جا چکی تھیں مگر مدرسہ بابل میں ان کو قضاۃ کے عنوان سے مرتب کیا گیا۔ اب ہم پیغمبروں کی سیاسی پیشین گوئیوں پر آتے ہیں۔ عموس، یسعیاہ نبی یرمیاہ وغیرہم کی پیشن گوئیاں اُن کے عہد کے بعد بڑھائی گئیں۔ حزقیلؑ کے خواب اور رویا کا بھی ان کی

تحریروں میں 300 ق م کے لگ بھگ اضافہ کیا گیا۔ صحیفۂ دانیالؑ کا دوسرا حصہ 165 ق م میں لکھا گیا۔ جس میں گزرے ہوئے تاریخی واقعات کو پیشین گوئی اور رویا کے پیرائے میں پیش کیا گیا یہ طرز بیان یہودی مصنفین نے مصر اور بابل کی رمزیت پرست طرزِ تحریر سے حاصل کیا اور انجیل کے ان ابواب کو APOCRYPHA (مخفی تحریریں) کہا جاتا ہے۔ حضرت دانیالؑ کی رویا میں میڈیہ اور فارس کا سکندر اعظم کے حملے کے ذریعہ خاتمہ اور سکندر کے بعد یونانی سلطنت کا عروج و زوال اس وقت لکھا گیا جب یہودیوں نے یونانی حاکموں کے خلاف ناکام بغاوت کی اور ان کی ہمت افزائی کے لیے گویا حضرت دانیالؑ کی زبانی اس نئی سلطنت کے زوال کی بشارت دی گئی امثال جو داؤدؑ و سلیمانؑ سے منسوب ہیں اُن کا بڑا حصہ مصری کتاب ''آمنوفس کے اقوال'' پر مبنی ہے۔ جس سے سقوط یروشلم کے بعد یرمیاہ نبی کے ساتھ پناہ لینے والے یہودی متعارف ہوئے۔ یہ امثال بھی 300 ق م کے آس پاس لکھی گئیں۔ زبور میں بہت سے لحن واقعی حضرت داؤدؑ کے ہیں جو لوک گیت کی زبانی روایت کی طرح محفوظ تھے۔ بقیہ نغمے بابل سے بیت المقدس واپسی اور نئے ہیکل کی تعمیر کے موقعے پر مرتب کیے گئے۔ غزل الغزلات بھی ولادت مسیح سے صرف تین سو سال قبل ہی موجودہ صورت میں مرتب کی گئی۔ شاید یہودیوں کے شادی بیاہ کے موقعے پر گائے جانے والے گیتوں کا مجموعہ تھا جسے روحانی معنی پہنا دیے گئے۔ لیکن نوحے غالباً اسی شاعر کی تصنیف ہے جس نے 586 ق م میں زوال یروشلم کا نظارہ اپنی آنکھوں سے کیا۔ اسی طرح بابل کے پانیوں کے کنارے بیٹھ کر رونے والے شاعر نے عصری حالات کی سچی تصویر کشی کی تھی ایسِتھر کا قصہ جس میں شہنشاہ ایران خشایارشاہ اپنے دارالسلطنت میں رہنے والی ایک غریب یہودی لڑکی سے شادی کر لیتا ہے۔ غالباً محض افسانہ ہے اور اس افسانے کے ساتھ ہم پھر یہودی دنیا سے رخصت ہو کر سوش اور پسار گادو واپس آتے ہیں۔

اکتوبر 538 ق م میں تسخیر بابل کے وقت تک سائرس اعظم کی حکومت بحیرہ اسود سے لے کر باختر تک پھیل چکی تھی۔ اس نے ایشیائے کوچک کے یونانی شہروں پر بھی قبضہ کیا اور آئندہ کئی صدیوں تک جاری رہنے والی ایرانی اور یونانی کشمکش کی بنیاد پڑی۔ سائرس عہد عتیق کا سب

سے روشن خیال، عدل گستر اور روادار فرماں روا تھا۔ ایرانیوں نے تو اسے اپنا ہی باپ کہا تھا مگر یونانیوں نے اسے قوموں کا باپ، استاد اور قانون ساز پکارا اور عبرانیوں نے اسے پیغمبر سمجھا۔

مسلمانوں نے ہمیشہ سکندر مقدونی کو قرآن شریف کا ذوالقرنین خیال کیا ہے لیکن مولانا ابوالکلام آزاد ترجمان القرآن میں فرماتے ہیں کہ سائیرس ہی غالباً ذوالقرنین تھا کیونکہ وہ یہودیوں میں ذوالقرنین کے لقب سے مشہور تھا۔ عبرانی اور عربی میں قرن کے معنی سینگ کے ہیں۔ اور حضرت دانیالؑ کے خواب میں بھی دو سینگوں والے مینڈھے کی تمثیل بیان کی گئی۔ اس زمانے میں میڈیہ اور ارس کی اقوام ریاستوں کو دو سینگوں[21] سے تشبیہہ دینا عام روایت تھی۔ بقول مولانا آزاد سائیرس اعظم موحدانہ دین زرتشت کا پہلا حکم ران داعی بنا اس وقت تک اس مذہب کو مجوسیوں نے مسخ نہیں کیا تھا اور اسی سائیرس ذوالقرنین نے سیتھین حملوں کی روک تھام کے لیے وہ دیوار بنائی جسے بعد میں سکندر سے منسوب کر دیا گیا۔

سنسان پسارگاد میں سائیرس کے محلات کے کھنڈر میں اس کی نو فٹ اونچی سنگی تصویر موجود ہے جس میں وہ مصری تاج، عیلامی قبا پہنے چار بڑے بڑے پر لگائے (جو قدیم مغربی ایشیا کے فن بت سازی میں ملکوتی صفات اور طاقت کی علامت تھے) اپنی بے نور آنکھوں سے دنیائے فانی کا نظارہ کر رہا ہے۔ اسی ستون پر ''آدم کورش خشایتھیہ ہخامنشیہ'' منقش ہے۔ 528 ق م میں اس عجیب و غریب بادشاہ نے رحلت کی اور پسارگاد میں دفن کیا گیا۔ اس کا مقبرہ اندر سے خالی پڑا بھائیں بھائیں کر رہا ہے۔ سائیرس کی ممی مع زر و جواہرات کے جانے کب کی غائب ہو چکی۔ قدیم یونانی مؤرخوں نے لکھا ہے کہ اس مقبرے پر یہ عبارت منقش تھی: ''میں، سائیرس، شاہوں کا شاہ، یہاں لیٹا ہوں۔''

اور پلوٹارک مندرجہ ذیل کتبے کا ذکر کرتا:

''اے انسان! تو جو کوئی بھی ہے اور جہاں کہیں سے بھی آیا ہے، کیونکہ میں جانتا ہوں کہ ایک نہ ایک روز تو اِدھر سے ضرور گزرے گا، آگاہ ہو کہ میں کوروش ہوں۔ جس نے پارسیوں کی سلطنت قائم کی۔ اس لیے اس ذرا سی مٹی کی خاطر مجھ سے بَیر نہ رکھ جس نے میرے جسم کو ڈھانپ

رکھا ہے——"

کمبوجیہ دوئم سائیرس کا بیٹا اور جانشین تھا۔ اس نے مصر پر حملہ کیا اور فرعون وقت کو پکڑ کر سوش بھیج دیا۔ اور اپنی فوج میں یہودی افسر مقرر کیے جن کے اب ایرانی دورِ حکومت میں بھلے دن آ گئے تھے۔ کمبوجیہ دوئم نے اپنی یہودی رجمنٹ کو خاص مصر ہی میں تعینات کیا اور ابھی ممفس ہی میں تھا کہ ایران میں بغاوت کی اطلاع ملی۔ جہاں گیومرث نامی ایک مجوسی تخت پر چڑھ بیٹھا تھا کمبوجیہ اپنے باپ سے بالکل مختلف اور بڑا جابر بادشاہ تھا۔ اس نے اپنے بھائی بردیا کو قتل کروا کے سائیرس کا تخت و تاج حاصل کیا تھا۔ سنا ہے عوام بھی اس کی فارن پالیسی سے بے زار ہو چکے تھے کیونکہ قرطاجنہ اور حبشہ کے خلاف اس کی لشکر کشی ناکام رہی تھی۔ مقبوضہ مصر میں تو وہ ظاہر ہے ہر دلعزیز ہو ہی نہ سکتا تھا۔ ابھی تک یہ طے نہیں کیا جا سکا کہ بغاوت کی اطلاع ملنے کے بعد اس پر مرگی کا دورہ پڑا جس کا وہ مریض تھا اور 512ق م میں وہ اس دورے میں مر گیا یا خودکشی کی۔ اس طرف ایران میں جو مجوسی گیومرث تخت پر بیٹھا وہ آنجہانی شہزادہ بردیا کا ہم شکل تھا اور اس کے لیے یہ دعویٰ کیا کہ وہ خود ہی بردیا ہے۔ حکومت کی باگ ڈور سنبھالتے ہی تین سال کے لیے ٹیکس معاف کر دیے اور متعدد مندر مسمار کر کے مذہبی اصلاحات نافذ کیں۔ نہ معلوم یہ اصلاحات کس قسم کی تھیں۔ گیومرث بہرحال فوجی جرنیلوں کی حمایت حاصل نہ کر سکا۔ اس کے خلاف سات ہخامنشی شہزادوں نے مل کر سازش کی اور فوج نے ان کا ساتھ دیا۔ اس سازش کا لیڈر ایک ذہین نوجوان شہزادہ دارا تھا۔ روایت یہ ہے کہ گیومرث کا کام تمام کرنے کے بعد ان ساتوں شہزادوں نے طے کیا کہ ان میں سے جس کا گھوڑا طلوعِ آفتاب کے وقت سب سے پہلے ہنہنائے اسے بادشاہ منتخب کر لیا جائے گا اور دارا کے سائیس کی چالاکی سے اس کا گھوڑا سب سے پہلے ہنہنایا!

دارا نے جس پھرتی سے بگڑے ہوئے حالات سنبھالے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ کمبوجیہ دوئم کی خودکشی کے صرف دو ماہ بعد گیومرث قتل کیا جا چکا تھا اور نوجوان حکمران سلطنت کے مختلف حصوں کی بدامنی کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ دارا اوّل کے ساتھ حکومت دوبارہ ہخامنشی خاندان کی اس شاخ کے ہاتھ میں واپس آ گئی جو آریہ رمنا کی اولاد تھی۔ کیونکہ دارا اس ارشام کا پوتا

تھا جسے اس کے کزن کمبوجیہ اوّل نے تخت سے اتار کر پارس پر خود قبضہ کر لیا تھا اور ارشا کے بیٹے (یعنی دارا کے باپ) گشتاسپ کو پارتھیا کا گورنر بنادیا تھا۔ یہ ذرا جھمیلے کی بات ہے اور اس شجرہ نسب سے سلجھ سکے گی۔

ہخامنشی

چش پس

آریہ رمنا	کوروش اوّل (شاہ پرسوش)
ارشا (معزول کیا گیا)	کمبوجیہ اوّل
گشتاسپ (صوبائی گورنر بنایا گیا)	کوروش دوئم (سائیرس اعظم)
داریوش اوّل	کمبوجی دوئم

گیومرٹ یا "نقلی بردیا" کے قتل اور دوسری بغاوتیں کچلنے کے بعد دارا نے کرمان شاہ اور ہمدان کے درمیانی راستے میں کوہ بیثون پر ایک عظیم الشان سنگی تصویر ترشوائی جس میں اہور مزدہ اوپر سے فاتح کو برکت دے رہا ہے اور شاہ شایان کے سامنے وہ آٹھ 'بادشاہ' یا صوبے دار ہاتھ پیچھے باندھے کھڑے ہیں جن کی بغاوتوں کو فرو کیا گیا۔ تصویر کے نیچے قدیم فارسی، بابلی اور عیلامی زبانوں میں دارا نے گیومرٹ کا قصہ خود نقش کروایا ہے:

"بادشاہ بننے کے بعد میں نے یہ کیا: ہمارے خاندان کے کوروش کا لڑکا کمبوجیہ یہاں بادشاہی کرتا تھا۔ اس کمبوجیہ کا ایک سگا بھائی بردیا تھا۔ کمبوجیہ نے اس بردیا کو ہلاک کروادیا لیکن لوگوں کو یہ معلوم نہ تھا کہ بردیا مارڈالا گیا ہے۔ پھر کمبوجیہ مصر چلا گیا۔ کمبوجیہ کے مصر جانے کے بعد پارس اور ماد اور دوسرے ملکوں میں جھوٹ اور دروغ گوئی بہت بڑھ گئی۔

"کہتا ہے داریوش شاہ: ایک مجوسی گیومرٹ نامی نے لوگوں سے کہا کہ وہ ہی بردیا ہے۔ لوگوں نے اس کا ساتھ دیا اور اس نے بادشاہت غصب کرلی۔ اس کے بعد کمبوجیہ مر گیا[22]۔

"کہتا ہے داریوش شاہ: یہ بادشاہت جو گیومرٹ مجوسی نے کمبوجیہ سے چھینی یہ بادشاہت

ہمارے خاندان میں بہت زمانے سے چلی آرہی ہے۔ گیومرث نے پارس اور ماوا اور دوسرے ملکوں کو ہتھیالیا۔

''کہتا ہے داریوش شاہ:۔ کوئی پارسی یا ماوی یا ہمارے خاندان کا کوئی فرد گیومیرث کا مقابلہ نہ کرسکا۔ سب اس سے ڈرتے تھے کہ جو لوگ اصل بردیا سے واقف تھے وہ کہیں اُن کو نہ قتل کردے۔ جب تک میں گیومرث کے مقابلے پر نہ آیا کسی اور کی ہمت نہ تھی کہ اس سے کچھ کہہ سکے۔ پھر میں نے اھورمزدہ سے دعا مانگی اور اھورمزدہ نے میری مدد کی۔ پھر میں نے اور میرے چند ساتھیوں نے گیومرث مجوسی اور اس کے ساتھیوں کو ماوا کے ایک قلعے میں قتل کردیا اور بفضل اھورمزدہ میں بادشاہ بن گیا۔

''کہتا ہے داریوش شاہ: جو بادشاہت ہمارے خاندان سے چھن گئی تھی میں نے واپس لے لی۔ جو مندر گیومرث نے منہدم کروائے تھے میں نے ان کو دوبارہ تعمیر کروایا اور رعایا کو اُن کے گلّے، نوکر چاکر اور مکانات واپس کردیے جو گیومرث مجوسی نے ان سے چھین لیے تھے۔''

گیومرث کے متعلق کچھ مورخوں کا خیال ہے کہ وہ ہی بردیا یعنی کمبوجیہ کا بھائی تھا۔ دارا نے اس کی حکومت چھینی اور دنیا کو دکھانے کے لیے گیومرث مجوسی کا قصہ اپنی طرف سے گھڑ دیا کیونکہ کمبوجیہ لاولد تھا اور اس نے اپنے بھائی کو ہلاک نہیں کروایا ہوگا۔ بہر کیف اس قصے میں کچھ نہ کچھ گھپلا ضرور ہے (ہیروڈوٹس کے بیان کے مطابق دارا نے کمبوجیہ کی لڑکی سے شادی کی جو گیومرث کی بیوہ تھی۔ اور بردیا کی لڑکی کو بھی اپنی ملکہ بنایا) زیادہ تر گیومرث کے متعلق دارا کا بیان صحیح سمجھا جاتا ہے۔

لیکن اب گیومرث کے متعلق ایک اور اُلجھن پیدا ہوتی ہے جس کا تعلق ہخامنشی سلاطین کے مذہبی رجحانات اور دین زروشت سے ہے۔

ظہور زروشت سے قبل اھورمزدہ کے علاوہ (جو ایک قدیم آریہ دیوتا کا نام تھا) ایران میں مترا (سورج) ماہ۔ زم (زمین) آتھر (بعد کا تلفظ آذر یعنی آتش) آب، واہیو (سنسکرت۔

وایو یعنی ہوا) اور زرخیزی اور باروری کی دیبی اناہتا کی پرستش کی جاتی تھی۔ دیوتاؤں کے سامنے خونی قربانیاں پیش کرنے کا دستور بھی تھا۔ مجوسی میڈیہ کے آبائی پروہت تھے جن کے عقائد مجوسیت وآتش پرستی کا تذکرہ پہلے کیا جاچکا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ زردشت یا زرتشت (قدیم تلفظ زرتو خشت) کب اور کہاں پیدا ہوئے؟ روایت کے مطابق دارا اسفندیار یعنی دارا اوّل کے باپ گشتاسپ نے زردشت کی سرپرستی کی اور گشتاسپ شاہ بلخ تھا۔ ایک نظریے کی رو سے زردشت آذربائیجان میں پیدا ہوئے اور ہجرت کرکے بلخ آئے۔ ایک خیال یہ ہے کہ وہ خوراساں (طلوع خورشید کی سرزمین) ہی میں پیدا ہوئے جہاں شاہ بلخ نے ان کا دین قبول کیا۔ تورانی بادشاہ ارجاسپ نے بلخ پر حملہ کیا۔ آتش کدہ آذرنوش کو آگ لگادی گئی اور زردشت بھی قتل ہوئے۔ تاریخی واقعہ غالباً یہ ہے کہ ہخامنشی دور کے آغاز میں متعدد چھوٹی چھوٹی ریاستیں خراساں، باختر وغیرہ یعنی مشرقی ایران یا پارتھیا میں قائم تھیں اور ممکن ہے گشتاسپ ان میں سے کسی ایک کے فرماں روا کا نام رہا ہو۔ ہخامنشی عہد اندازاً اوائل ساتویں صدی ق م سے شروع ہوتا ہے۔ شاید اسی زمانے کے لگ بھگ زردشت پیدا ہوئے۔ اِدھر اپنے ایک کتبے میں جو سوش میں دستیاب ہوا ہے کہتا ہے داریوش شاہ کہ اس کے عہد حکومت کے ابتدائی برسوں میں اس کا باپ گشتاسپ اور دارا (جو پردادا ہونا چاہیے) آریہ رمنا دونوں زندہ تھے۔ اب مزے کی بات یہ ہے کہ آریارمنا کا زمانہ 640ق م سے 590ق م طے کیا گیا ہے۔ دارا اوّل کا سن جلوس 521ق م ہے۔ یہاں بھی کچھ گڑبڑ معلوم ہوتی ہے۔ (یہ بات یاد رکھنا چاہیے کہ قبل از مسیح سنہ الٹی طرف چلتا ہے) بعض مورخین کے نزدیک زردشت کا سن ولادت 660 ق م ہے۔ اور جدید محققوں کا خیال ہے کہ دارا اوّل کا باپ وہ شاہنامے والا روایتی گشتاسپ نہیں ہوسکتا جس نے زردشت کی سرپرستی کی تھی۔ گو یہ بھی ممکن ہے کہ دارا کے والد گشتاسپ صاحب چونکہ پارتھیا کے گورنر تھے عہد قدیم کے کوچہ گردگویوں نے انھیں کسی اپنے ہم نام شاہ بلخ سے گڑبڑا دیا ہو۔ قدیم پارتھین یا خراسانی داستان گوئی کا ذکر بعد میں کیا جائے گا جس کی بنیاد پر شاہنامہ قلم بند کیا گیا۔ اور کیا پتہ "شاہ بلخ گشتاسپ" دراصل پارتھیا کے صوبے دار گشتاسپ ہی کو کہا گیا اور زردشت ان ہی کے زمانے میں پیدا ہوئے۔

قصہ مختصر زرتشت نے اھور مزدہ کا نام خیر کی طاقت کے لیے استعمال کیا۔ لیکن ہخامنشی دور میں زرتشتی عقائد کی پیروی کے ساتھ ساتھ پرانے دیوی دیوتاؤں کی پرستش جاری رہی۔

اس دلچسپ آدمی گیومرث مجوی نے کمبوجیہ دوئم کے خلاف بغاوت کر کے شاہی ''ایاوانہ'' بھی جلا دیا تھا۔ قتل گیومرث کے بعد دارا نے ایاوانہ دوبارہ تعمیر کروایا اور کہا جاتا ہے کہ بے شمار مجوسیوں کو ہلاک کروادیا۔ ایاوانہ (قدیم فارسی = یذ، ماوی = یز= سنسکرت = یگ یا یج ـــــ یعنی عبادت) ہخامنشی سلاطین کے عبادت خانے کو کہتے تھے۔ سائرس اعظم، کمبوجیہ دوئم اور دارا اوّل ایرانی، بابلی مصری معبودوں کے علاوہ عبرانی یاہ و یہہ کے بھی قائل تھے اور ان کے ایاوانہ میں غالباً تمام دیوی دیوتاؤں کی مورتیاں بھی بجی تھیں۔ چنانچہ ہوسکتا ہے کہ گیومرث مجوی نے پرانے خداؤں کی بیخ کنی کر کے خالص دین زرتشت رائج کرنا چاہا ہو۔ اس کے ساتھ دوسرے مجوسیوں کا قتل کا ذکر کرتے ہوئے ہیروڈوٹس گیومرث کا نام اسپنددات (اسفندیار) بتاتا ہے جو زرتشتی ہریو کا نام بھی ہے۔ بعد میں بھی گیومرث کو مجوسیوں نے روایتی گشتاسپ بلخ کے لڑکے اسفندیار سے مماثل کیا۔ اور دارا کے ہاتھوں مجوسیوں کے قتل عام کی روایت اتنی مستحکم ہوگئی کہ اس کی سالانہ برسی منائی جانے لگی[23]۔

اس کے برعکس یہ بھی ممکن ہے کہ خود دارا ہی دین زرتشت کی حمایت کی ہو اور اس لیے مجوی پروہتوں کا زور توڑنا چاہا ہو جنھوں نے پرانے عقائد زندہ رکھے تھے۔ یا یہ قتل محض سیاسی نوعیت کا ہو اور اس کا مذہب سے زیادہ تعلق ہی نہ رہا ہو۔

ان سب باتوں سے بہر حال یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت تک دین زرتشت پوری طرح مرتب اور رائج نہ ہوا تھا۔ دارا بار بار اھور مزدہ کا ذکر کرتا ہے جو اشوری دیوتا اشور مزاش کی مانند (جو شاہان اشور کی سنگی تصاویر کے اوپر سایہ فگن رہتا ہے) ہر جگہ پر پھیلائے گھنگھریالی داڑھی لگا کے بادشاہ کے سر پر مسلط ہے۔ لیکن یہ اھور مزدہ سارے ایرانی معبودوں کا چیف دیوتا تھا۔ گو ممکن ہے کہ شروع کے ہخامنشی سلاطین نے زرتشت کی تعلیمات کو بھی قبول کر لیا ہو۔ دارا اوّل سائرس اعظم کے بعد ہخامنشی خاندان کا دوسرا جلیل القدر فرماں روا ثابت ہوا۔ اس نے ایران کو دنیا کی

سب سے زیادہ طاقتور اور وسیع سلطنت بنا دیا۔ یہی وہ دارا[24] ہے جسے تاریخ عالم نے دارائے اعظم کے لقب سے نوازا اور اس کی شان و شوکت حضرت سلیمانؑ کی دولت و حشمت کی مانند ضرب المثل بن گئی۔

صحیفۂ دانیالؑ میں مذکور ہے کہ شوش میں (اسے بھی سوش، شوش شوشن اور سوسن لکھا جاتا رہا ہے) دارا کا محل تعمیر کرنے کے لیے اہل بابل نے اینٹیں بنائیں۔ لبنان، کرمان اور قندھار سے لکڑی آئی۔ باختر سے سونا۔ سعدیہ سے جواہرات۔ حبشہ و سندھ سے ہاتھی دانت اور خوارزم سے فیروزے منگوائے گئے۔ یونان و لیڈیا سے سنگ تراش اور مصر اور میڈیہ سے سناروں کو بلوایا گیا۔

لیکن یہ قصر سوسن (جس کا انجیل مقدس میں بے انتہا ذکر ہے) کافی نہ تھا۔ (اس سے قبل اشوری سارگون دوئم نے جو قصر بنوایا تھا اس میں صرف دو سو کمرے تھے اور محض 125 ایکڑ زمین پر پھیلا تھا۔) چنانچہ دارا اوّل نے پری پولیس میں اس سے بڑا محل بنوایا (جس میں بعد کے بادشاہوں نے اضافے کیے) اور مشرق میں پنجاب و سندھ اور مغرب میں یونان کی مزید ریاستوں پر قبضہ کیا اور اعلان کر دیا: کہتا ہے داریوش شاہ کو بفضل اھورمزدہ یہ بہت سے شہر میں نے پارس سے دور حاصل کیے۔" (کتبہ نویسی کی روایت ہخامنشیوں نے سلاطین ارارتو سے حاصل کی تھی جو برابر ریکارڈ کرتے جاتے تھے کہ فلاں فلاں فتوحات انھوں نے دیوتا خالدی کے فضل و کرم سے حاصل کیں) دارا اوّل نے بھی یہودیوں کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا اور ان کو بیت المقدس میں ہیکل[25] دوبارہ تعمیر کرنے کی اجازت دی جسے بخت نصر نے 586 ق م میں منہدم کروا دیا تھا۔

490 ق م میں دارائے اعظم نے ایتھنز اور اسپارٹا پر لشکر کشی کی اور اسی سال موسم خزاں میں MARATHON کی جنگ ہوئی۔ (بے حد لمبی دوڑ کے لیے MARATHON RACE کا محاورہ اسی واقعے کی یادگار ہے جب اسپارٹا کی امداد حاصل کرنے کے لیے PHIDIPIDESE نے ڈیڑھ سو میل کا سپاٹا بھرا تھا)۔ ایتھنز کی دس ہزار فوج نے ایک لاکھ ایرانی لشکر کا مقابلہ کیا اور فتح مند رہے۔ اور اس فتح کو یونانی آرٹ، شاعری اور ادب میں طرح طرح سے سراہا گیا۔ ہیرو ڈوٹس کی مانند اہل یورپ آج تک اس جنگ کو مغرب کی مشرق پر اخلاقی برتری کا ثبوت سمجھتے

رہے ہیں۔ ذرا غور فرمایئے ایک انگریز مورخ انیسویں صدی میں کیا لکھتا ہے: "مطلق العنانی اور جمہوریت کا فیصلہ ماراتھون کے محاذ پر ہوا۔ جب یونان نے ایران کو ہرا کے یورپ کو مشرق کے جابرانہ تسلط سے بچایا اور یورپ کو صحیح معنوں میں اعلیٰ تہذیب اور آزادی سے بہرہ ور ہونا ممکن کیا۔"

485ق م میں دارائے بزرگ کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا خشایارشاہ تخت نشین ہوا۔ پانچ سال بعد یعنی 480ق م میں خشایارشاہ اتنی بڑی فوج لے کر یونان فتح کرنے کے ارادے سے چلا جس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ اس فوج میں دولت ہخامنشیہ کی چالیس اقوام کے سپاہی مع پنجابی تیراندازوں کے شامل تھے۔ باسفورس پر کشتیوں کا پل بنایا گیا جس پر سے گذر کر یہ قیامت خیز لشکر تھریس، مقدونیہ اور تھیسلی ہوتا ہوا لشکار روانہ ہوا۔ بارہ سو جہازوں کا ایرانی بیڑہ اس کے ساحل کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ گرمیوں کا زمانہ تھا اور یونان میں اولمپک کھیل شروع ہونے والے تھے جب اچانک یونانیوں کو دفاعی جنگ شروع کرنا پڑی۔ اسپارٹا سپاہیوں نے ایرانی فوج کے پاؤں اُکھاڑ دیے اور بے چارہ نوجوان خشایارشاہ محاذ سے کچھ دور اپنے تخت پر بیٹھا یہ منظر دیکھا کیا۔ اس کے ذاتی باڈی گارڈ کے دس ہزار "لافانی سورما" (یہ ان کا خطاب تھا) بھی پسپا ہوئے۔ شاہ کے دو بھائی مارے گئے۔ لیکن بہت جلد ایرانی لشکر نے آگے بڑھنا شروع کیا۔ تب ایتھنز کی ساری آبادی کا جہازوں کے ذریعے انخلا کر دیا گیا (ان تفصیلات سے ہمیں یورپین کی کارکردگی اور خوش انتظامی کا اندازہ ہوتا ہے) ایرانی فوج نے ایتھنز کو آگ لگا دی۔ اس کے بعد سلامیس کے نزدیک دونوں ملکوں میں بحری جنگ چھڑ گئی۔ یونان کے پاس صرف ساڑھے تین سو جہاز تھے۔ ساحل پر سے خشایارشاہ لڑائی ملاحظہ کر رہا تھا کہ دیکھتے دیکھتے یونانی بحریے نے اپنے سے تین گنا زیادہ بڑی ایرانی نیوی کے چھکے چھڑا دیے۔ ستمبر 480ق م میں اس جنگ سلامیس میں بھی میدان یونانیوں کے ہاتھ رہا۔ چند ماہ بعد 479ق م کے شروع میں ستر ہزار یونانی فوج نے ایرانیوں کو قطعی شکست دے دی۔ ان کا قتلِ عام کیا اور ان کے لشکر کے شاہانہ ساز و سامان اور مال و دولت کو جی بھر کے لوٹا۔ (یہ بھی ایک ٹپکل مشرقی بے وقوفی تھی۔ ایرانیوں کو اس تام جھام کے

ساتھ اتنی دور کے میدانِ جنگ میں جانے کی کیا ضرورت تھی؟) اس شکست سے بقول اسی بے ہودہ انگریز مورّخ ''ایشیائی آمریت اور یونانی آزاد خیالی، مشرق اور مغرب، قدامت و جدیدیت، تاریکی اور روشنی، مشرقی تن آسانی اور مغربی چستی، کمزور اور کمتر اور بینٹ اور یورپ کے درخشاں مستقبل کے درمیان فیصلہ ہوگیا۔ اور یونان نے ایشیا کو بتادیا کہ اسے یورپ کا مقابلہ کرنے کی کبھی ہمت ہی نہ کرنا چاہیے۔'' یونان کی اسی فتح کے بعد وہاں کی تہذیب کا دورِ زرّیں شروع ہوا۔

یونانی مورّخوں نے ایران و یونان کی طویل جنگوں کے متعلق بہت تفصیل سے لکھا ہے۔ خشایارشاہ کی شکست نے یونان میں جس نئی قوم پرستی اور قومی فخر و غرور کی لہر دوڑائی اس کا نمونہ ہمیں اسکائی لس کے مشہور ڈرامے THE PERSIANS میں ملتا ہے۔ اسکائی لس (AESCHYLUS) جو 525ق م میں پیدا ہوا یونان کے تین عظیم ترین ڈرامہ نگاروں میں سے ایک ہے۔ پیشے کے لحاظ سے خود سپاہی تھا۔ دارائے بزرگ کے خلاف ماراتھون کی جنگ میں لڑا اور شیکسپیئر کی مانند اپنے لکھے ہوئے ڈراموں میں خود بھی اداکاری کرتا تھا۔ اسی کا یہ ڈرامہ یعنی ''اہلِ پارس'' یونانی ٹریجڈی میں اس لیے بھی منفرد ہے کہ اس کے تینوں ایرانی کردار تاریخی ہستیاں ہیں۔ ان کے علاوہ کلاسیکل ڈرامے کے سارے کردار فرضی اور اسطواری ہوا کرتے تھے۔ اپنی قوم پرستی کے باوجود اس نے ان تین کرداروں یعنی خشایارشاہ، اس کی ماں اور اس کے باپ ''دارائے بزرگ کی روح'' کو ہمدردی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ڈرامے میں خشایارشاہ جسے یونانی XERXES (زرکسیز) کہتے تھے، 480ق م کی جنگ سلامس کے بعد اسٹیج پر آتا ہے اور ایتھنز کا بحریہ ایرانی بحریے کو بالکل تباہ و برباد کرچکا ہے۔ دارائے اعظم کی بیوہ یعنی خشایارشاہ کی ماں اور ایرانی امرا کے کورس کو ایک پیغامبر مان کر شکست کی مفصل اطلاع دیتا ہے۔ اس سے قبل دارا کی روح (ہملٹ کے باپ کی اولین جھلک) اسٹیج پر آکر کہتی ہے کہ اس کے نوجوان لڑکے کی جذباتیت اور جلد بازی نے یہ دن دکھایا۔ دارا خود ایک عاقل حکمراں دکھایا گیا ہے جسے اپنی فتوحات کے باوجود یہ معلوم تھا کہ حد سے زیادہ بلند حوصلے ہمیشہ خطرناک ہوتے ہیں۔ ملکہ کہتی ہے کہ اس کے بچے کو

مشیر اور صلاح کار غلط ملے۔ اب خشایارشاہ سامنے آتا ہے جو اپنی تباہ حالی اور ہزیمت خوردگی کی وجہ سے کلاسیکل ٹریجڈی کی مجسم تصویر ہے۔ ڈرامے کے پہلے حصے میں اس کی ماں ایک شاندار سلطانہ نظر آتی ہے جو اپنے بیٹے کی معرکہ آرائی کے سلسلے میں کورس کے ایتھنز کے متعلق سوالات کرتی ہے۔ اس عظیم المرتبت شاہ بانو کو یہ بھی معلوم نہیں کہ یہ دور افتادہ پھٹیچر شہر کہاں ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ شہر ایران کی طاقت کا بھلا کیا مقابلہ کر سکے گا۔ شکست کی نا قابل یقین خبر سننے کے بعد وہ اپنے شوہر یعنی دارائے اعظم کی روح بلاتی ہے اور اس سے مشورہ اور دلاسہ چاہتی ہے۔ دارا بھی مشورہ دیتا ہے کہ آئندہ ایران حملے کا ارادہ نہ کرے۔ لیکن دارا کی روح یہ بھی جانتی ہے کہ اس کی رائے پر عمل نہیں کیا جائے گا اور جلد ہی (یعنی اگلے سال 479ق م میں آیا) ایران کو دوبارہ یونان کے ہاتھوں شکست فاش ہو گی۔ اس الم ناک پیشین گوئی کے بعد دارا کی روح اپنے مقبرے میں واپس چلی جاتی ہے۔ لیکن اس کی صلاح پر خوددار اور باوقار ملکہ اپنے محل میں جا کر بہترین پوشاک زیب تن کرتی ہے اور اپنے مصیبت زدہ بیٹے کے بشاش اور باہمت خیر مقدم کے لیے تیار ہو جاتی ہے۔

یہ ڈرامہ جنگ کے صرف سات سال بعد یعنی 472ق م میں اسٹیج کیا گیا اور جس طرح آج کسی قومی ظفریابی کے بعد اس کے متعلق کامیاب فلم بنتے ہیں ایتھنز کے تھیٹر میں (جہاں تیس ہزار تماشائی بیک وقت بیٹھ سکتے تھے) اس نے کھڑکی توڑ ہفتے منائے[26]۔

خشایارشاہ اوّل 465ق م میں مرا اور اس کی جگہ ارتخشیر یا اردشیر اوّل تخت پر بیٹھا۔ اس نے بھی اپنے پیشرو کی مانند پرسی پولس میں مزید محل بنوائے۔ اس کے ایک ایوان کی دیوار پر خط پیکانی میں چار مرتبہ درج ہے— "یہاں جو چیزیں حسین معلوم ہوتی ہیں ہم نے انھیں خدا کی مرضی سے بنایا۔" یہ ایرانی حسن پرستی اور حسن کاری کا گویا اوّلین ریکارڈ ہے! اردشیر کے مرنے کے بعد 424ق م میں خشایارشاہ دوئم صرف تین ماہ حکومت کر سکا۔ جس کے بعد داریوش دوئم نے

404ق م تک راج کیا۔ اردشیر دوئم (404ق م-358ق م) اور اردشیر سوئم (336ق م-331ق م) آخری ہخامنشی حکمراں تھا جس کا سکندر مقدونی نے تختہ الٹ دیا۔

ہخامنشی سلطنت اپنے وقت کی گویا برٹش ایمپائر تھی کہ اس میں دنیا کے سارے براعظم شامل تھے (امریکہ و آسٹریلیا دریافت ہی نہ ہوئے تھے) بادشاہ زمین کا مالک تھا۔ وفادار رعایا ''آزات'' اور ''بزرگ'' میں منقسم تھی۔ بادشاہ جس سے خوش ہوتا اسے جاگیر بخش دیتا۔ اس شاہانہ عادت نے فیوڈل نظام کو جنم دیا۔ گدھوں اور چیلوں کو اپنے مرحومین کو کھلانے کی مجوسی اور باختری رسم بھی رائج تھی مگر شاہانِ ہخامنشیہ کے مقابر بنائے جاتے تھے جہاں ان کی مصری وضع سے تجہیز و تکفین ہوتی تھی کہ بادشاہ کی لاش کو موم میں لپیٹ کر رکھنا شرق اوسط کی قدیم رسم تھی۔ زمانے کے دستور کے مطابق بادشاہ کو الوہی درجہ مل گیا تھا۔ جشن نوروز پر وہ خود پروہت بنتا تھا۔ جشن تاج گزاری اس کے جنم دن پر منعقد کیا جاتا تھا۔ گویا اس نے تاج پہن کر نئے شاہی لقب کے ساتھ حیات نو حاصل کی۔ (اسی ہخامنشی روایت کی بنا پر شاہ محمد رضا پہلوی کا جشن تاج گزاری ان کی سال گرہ کے روز منایا گیا اور پارلیمنٹ نے ان کو نیا لقب شہنشاہ آریہ مہر عطا کیا۔) پسارگاد میں تاج پوشی کے بعد بادشاہ کوروش بزرگ کا جامہ تبرکاً پہنتا تھا۔ جنگ کی دیوی کی پوجا کرتا تھا اور ایک غریب کسان کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتا تھا۔ اس کی موت کے بعد اس کے ذاتی آتش کدے کی آگ ٹھنڈی کر دی جاتی تھی۔ اکثر اس کے اہلِ خاندان اور ملازمین اس کے مرنے کے بعد اظہارِ غم کے طور پر یا خودکشی کر لیتے تھے یا اپنا ایک ہاتھ یا ٹانگ کاٹ ڈالتے تھے (یہ اچھی مصیبت تھی) فرزند اکبر وارث تخت و تاج ہوتا تھا۔ شاہی حرم بے حد وسیع تھے جن میں غیر آریہ بیویاں بھی موجود تھیں۔ آریہ نسل پر فخر کرنا ساسانی دور میں شروع ہوا۔ مصر کی مانند شاہی خاندان کی شادیاں آپس کے بے حد قریبی رشتوں میں کی جاتی تھیں۔ ہخامنشی فوج میں ساری محکوم اقوام کے افراد بھرتی کیے جاتے تھے۔ (جس کا نتیجہ جنگِ یونان میں برا نکلا) خوارزمی سپاہی مصر میں اور مصری افسر بلخ میں تعینات تھے۔ ایک مضبوط مرکزی حکومت کے ماتحت نہایت عمدہ سول سروس کا کام کر رہی تھی، محکمہ ڈاک قابلِ تعریف تھا۔ ہر تین میل کے فاصلے کو ''فرسنگ'' کہا جاتا تھا۔ وشوپتر یا شاہزادے

صوبائی گورنر بنائے جاتے۔ (گو صوبہ یہودیہ کے لیے حضرت عزرا، اور نحمیاہ نبی وغیرہ کو وہاں کا حاکم مقرر کیا گیا تھا) وزیر کا عہدہ شروع میں نہیں تھا۔ بعد میں ''ہزارہ پتی'' یعنی شاہی باڈی گارڈ کے افسرِ اعلیٰ نے وزیرِ اعظم کا عہدہ سنبھالا۔ ہخامنشی سلاطین عموماً مذہبی رواداری برتتے تھے (ورنہ اتنی وسیع سلطنت زیادہ مدت نہ چل پاتی) بعد کی صدیوں میں جب دین زرتشت کو فروغ ہوا اس وقت خیر و شر کے مستحکم عقیدے کی وجہ سے اہلِ پارس اخلاقی پاکیزگی میں ہم عصر اقوام سے ممتاز سمجھے جانے لگے۔ عبرانیوں سے ان کی دوستی کی ایک وجہ بھی یہی تھی کہ مشرق اوسط میں جہاں انسانی قربانیاں ابھی تک رائج تھیں، ''نیک خیالات، نیک الفاظ، نیک اعمال'' کی زرتشتی تعلیم کے ان نئے پیروؤں کو اخلاقی و مذہبی لحاظ سے قید بابل کے بعد والے معقول یہودی اپنے ہم مشرب معلوم ہوتے تھے۔ ہیروڈوٹس لکھتا ہے کہ ایرانی بچوں کا زمانہ تعلیم پانچ سے بیس سال کی عمر تک ہے، جس میں ان کو صرف تین چیزیں سکھلائی جاتی ہیں: شہسواری، تیراندازی اور راست گوئی! ایرانی یونانیوں کے قوی دشمن تھے۔ اس کے باوجود یونانی مورخوں نے ان کی ہمیشہ تعریف کی۔

ہخامنشیوں نے اشوری اور ارارتو فن سنگ تراشی اور طرزِ تعمیر سے بہت کچھ اخذ کیا اور اُن کی ہم عصر موریہ سلطنت کا فن ایک حد تک متاثر ہوا۔ (اشوک کے تین شیروں والے ستون میں جواب ہندوستان کا سرکاری طغریٰ ہے۔ پرسی پولس کے ستونوں کی جھلک نظر آتی ہے) بادشاہوں اور شیروں کی دست بدست لڑائی اشوری سنگ تراشی کا پسندیدہ موضوع تھا۔ ایک اشوری بار ریلیف میں شیر پنجرے سے نکل کر جھپٹ رہے ہیں۔ ان کا رکھولا پنجرے کے اوپر چڑھا بیٹھا ہے اور بادشاہ سلامت سامنے کھڑے تیر سے نشانہ باندھ رہے ہیں۔ اس سنگی تصویر کو دیکھ کر خیال آتا ہے کہ حضرت دانیالؑ کو قطعی اس قسم کے پنجرے میں شیروں کے آگے ڈالا گیا ہوگا۔ شیر، بیل، مینڈھے، گھوڑے اور عقاب، طاقت پرست اشور کے فنِ سنگ تراشی کے محبوب موتیف تھے۔ STYLISED گھنگھریالے پٹے اور گھنگھریالی داڑھی بھی صورت سازی کی خصوصیت تھی۔ حتیٰ کہ بیلوں کے چہروں پر بھی داڑھی لگادی گئی تھی۔ اس زمانہ میں داڑھیوں کا بڑا زور وشور تھا۔ چنانچہ ہر

ایرانی اور اشوری بادشاہ ایک سا نظر آتا ہے۔ یونان و ہند میں داڑھیوں کا فیشن نہیں تھا۔ چنانچہ انڈو گریک فن کاروں نے یونانی دیوتاؤں کی مانند مہاتما بدھ کو بھی کلین شیو دکھایا۔ ورنہ کیا پتہ مہاتما بدھ داڑھی رکھتے ہوں۔ مسلسل گیان دھیان کی مصروفیت میں ان کو شیو کرنے کا وقت ہی کہاں ملتا ہوگا۔ مگر آپ کو ان کا مجسمہ بھی بارلیش نظر نہ آئے گا۔ اس کے برعکس قدیم موئن جو درو والے پروہت کا داڑھی دار مجسمہ شرق اوسط کی روایت میں شامل معلوم ہوتا ہے۔

ہخامنشی زوال دراصل یونان سے خشایارشاہ کی شکست کے بعد ہی شروع ہو گیا تھا۔ جنگ سے واپس آنے کے بعد وہ بے چارہ پرسی پولس میں اپنے حرم کی توسیع اور مزید محل بنوانے میں جٹ گیا تھا۔ دربار میں خواتین کا اثر بڑھتا گیا۔ سازشیں شروع ہوئیں اور اسے قتل کیا گیا۔ یونانی اناطولیہ پر قابض ہو گئے اور مغربی ایشیا میں یونان کا تہذیبی اثر پھیلنا شروع ہوا۔ ادھر قتل، سازش اور جاسوسی ہخامنشی دربار کی روایت بن گئی۔ مصر نے یونان کی اعانت سے بغاوت کر دی اور آزاد ہو گیا۔ یونانی صوبوں میں بغاوتیں جاری رہیں اور ایرانی مرکزی حکومت یونانیوں میں ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' کی پالیسی پر عمل کرتی رہی۔ اردشیر اوّل کے بعد تخت حاصل کرنے کے لیے خانہ جنگی ہوئی۔ اردشیر سوئم نے جو ایک خوں خوار بادشاہ تھا کچھ عرصے تک سلطنت کو مکمل انتشار سے بچائے رکھا۔ مگر اب فلیقوس (فلپ) مقدونی کے زیر اثر یونان متحد ہو چکا تھا۔ اردشیر سوئم کو بھی ایک خواجہ سرا نے زہر دے کر مار ڈالا اور اس کے ایک دور کے رشتے دار یعنی دارا سوئم کو تخت پر بٹھا دیا گیا اور سکندر مقدونی کے ہاتھوں ہخامنشی عظمت کے خاتمے کا وقت آن پہنچا۔

مسلمانوں نے ہمیشہ سکندر کو ذوالقرنین اور خدا کا ایسا نیک بندہ سمجھا جس نے ایک کافر آتش پرست بادشاہ دارا کا قلع قمع کیا۔ چنانچہ پندرھویں صدی عیسوی کی مشہور فارسی تصنیف روضۃ الصفا میں اس کے مصنف خوندمیر نے دارا و سکندر کی نہایت پرلطف اور عبرت آموز خط و کتابت درج کی ہے۔ مورّخ لکھتا ہے کہ جب دارا کو سکندر کی فتوحات کی خبر ملی تو اس نے تہروس کے باشندوں کو حکم دیا ''مابدولت کو روم کے اس چیتھڑ قنات ڈاکو کے متعلق اطلاعات موصول ہوئی ہیں۔ لہٰذا تمھیں چاہیے کہ تم اس لفنگے اور اس کے حواری موالیوں کو اٹھا کر ایک دم سمندر میں پھینک

دو۔"بعدازاں دارا نے سکندر کو مندرجہ ذیل مکتوب بھیجا:

"شہنشاہ عالم کے پایہ تخت سے:

سکندر نامی لٹیرے کو معلوم ہونا چاہیے کہ مابدولت کی اطلاع کے مطابق تم نے چوروں اور قزاقوں کی ایک نامعقول بھیڑ جمع کر کے ہماری سلطنت پر حملہ آور ہونے کا ارادہ کیا ہے۔ اس قسم کی بے ہودگی ظاہر ہے کہ رومیوں ہی کو زیب دیتی ہے۔ اب تم پر لازم ہے کہ یہ فرمان پڑھتے ہی الٹے پاؤں جہاں سے آئے ہو وہیں لوٹ جاؤ۔ مابدولت تم کو ایک سونے سے بھرا صندوق اور گدھے پر لدا تل کا بورا بھیجتے ہیں تا کہ ہمارے مال و دولت کا تمھیں اندازہ ہو جائے جو تل کے دانوں کی مانند بے شمار ہے۔ ساتھ ہی ایک گیند اور ایک عدد کوڑا ارسال ہے۔ تمھارے لونڈھار پن کا تقاضہ ہے کہ تم اس گیند سے کھیلو اور یہ کوڑا تمھاری پٹائی کے لیے ہے۔"

سکندر نے بواپسی ڈاک سے جواب دیا:

"ذوالقرنین کی طرف سے اس شخص کے نام جو خدائی کا دعویٰ کرتا ہے اور عالمگیر حکمرانی کا ڈھونگ رچاتا ہے۔ اتنا بڑا شہنشاہ ایک چیڑ قنات سکندر سے خائف ہو گیا؟ کیا دارا کو علم نہیں کہ خدا جس کو چاہتا ہے طاقت اور عزت دیتا ہے۔ ایک فانی انسان جس کی سلطنت کسی لمحے بھی چھن سکتی ہے خدا کس طرح ہو گیا؟ لیکن ہر فرعون نے پکارا موسیٰ۔ سنو۔ اب میں میدان جنگ ہی میں تم سے ملاقات کروں گا کہ میں خود کو جل شانہٗ کا ایک ادنیٰ اور کمزور بندہ سمجھتا ہوں اور فتح و نصرت اسی پروردگار عالم کی جانب سے ہے۔ تم نے جو اشیاء مجھے بھیجی ہیں میں انھیں ایک نیک شگون سمجھتا ہوں۔ یہ کوڑا خود تمھارے لیے تازیانہ عبرت ثابت ہوگا۔ گیند سے ظاہر ہوا کہ جلد ہی ساری دنیا میرے قبضے میں ہوگی۔ سونے کا صندوق اس بات کی علامت ہے کہ تمھارے خزانے عنقریب میری ملکیت بننے والے ہیں۔ رہی تمھاری بھیجی ہوئی تل کی بوریاں تو گو کہ تل کے دانے بے شمار ہوتے ہیں مگر بڑی آسانی سے مٹھی میں بھی بھرے جاسکتے ہیں۔ جواباً میں تم کو سرسوں ارسال کر رہا ہوں تا کہ تم اپنی شکست کی تلخی کا مزا ابھی سے چکھ لو۔"

چنانچہ گھمسان کی جنگ ہوئی اور سکندر میاں جیت گئے۔ دارا نے فرات کے اس پار جا کر

مزید فوج جمع کی اور صلح کے طور پر اپنی آدھی سلطنت نذر کرنا چاہی۔ مگر بھائی سکندر سارے ایران پر قبضہ کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے مندرجہ ذیل خط دارا کو بھیجا۔

''دارا! اگر مورّخ سچ بولتے ہیں تو اس دارا نے جس کے تم ہم نام ہو، عرصہ گذرا یونانی شہروں اور نو آبادیوں کو تاراج کر دیا تھا۔ گو بحری جنگ میں اسے منہ کی کھانا پڑی مگر اس کے جنرل ماردونیس نے سارے یونان کو تباہ کیا۔ ہمارے شہر اور لہلہاتے ہوئے کھیت اور باغات اجاڑ کر رکھ دیے۔ میں تم کو یہ بھی یاد دلا دوں کہ تم نے میرے والد فلپ کے قاتلوں کو رشوت دی اور حالیہ جنگ بھی بزدلی سے تم نے شروع کی۔ (یہ بات قابلِ غور ہے ہر فریق، فریق ثانی پر جنگ شروع کرنے کا الزام لگاتا ہے اور اسے بزدل کہتا ہے) اور تم نے میرے قتل کے لیے ایک ہزار اشرفیاں قاتلوں کو دینے کا وعدہ کیا۔ چنانچہ یہ جنگ جو میں لڑ رہا ہوں محض دفاعی جنگ ہے اور تمھاری مملکت کے بیشتر حصوں پر میری فتح سے ظاہر ہوتا ہے کہ دیوتا میرے طرفدار ہیں۔ لیکن میں وعدہ کرتا ہوں کہ تم میرے مطیع ہو کر میرے سامنے حاضر ہو تو میں تم کو اور تمھارے بیوی بچوں کو بغیر کسی تاوان کے آزاد کر دوں گا۔ میری فاتحانہ حیثیت کا تمھیں تجربہ ہو چکا ہے اب تم یہ بھی دیکھ لینا کہ میں اپنے مفتوح سے کس عزت کے ساتھ پیش آتا ہوں۔ اس دوران میں مجھے خط لکھو تو یاد رکھنا کہ تم اس سکندر سے مخاطب ہو جو نہ صرف ایک فرماں روا ہے بلکہ تمھارا آقا بھی ہے۔''

ستمبر 331 ق م میں مقدونی لشکر نے فرات عبور کیا اور نینوا کے کھنڈروں سے کچھ دور پر وہ جنگ ہوئی جس نے تاریخ کا رخ بدل دیا۔ بے چارہ دارا میدان چھوڑ کر بھاگا مارا مارا پھرا اور باختر کے صوبے دار کے ہاتھوں قتل ہوا۔ پچیس سالہ سکندر چند روز بعد ای بابل میں فاتح کی حیثیت سے داخل ہوا جہاں دو سو سال قبل دارا سوئم کے پیشرو اور ہخامنشی سلطنت کا بانی سائیرس اعظم اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ وارد ہو کر بخت نصر کی جاہ و ثروت کا وارث بنا تھا۔

بابل سے آگے بڑھ کر سکندر نے سوش اور پرسی پولس کی اطاعت قبول کی اور قصر پرسی پولس میں قیام کیا۔ یہاں اس نے بسلسلہ بین الاقوامی مصالحت خود ایرانی شہزادیوں سے شادیاں کیں۔ قبا پہن کر گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھنا شروع کیا اور اپنے فوجیوں کی شادیاں مقامی خواتین

سے کروائیں۔ ایک ہنگامہ رہا۔ لیکن شراب بہت پیتا تھا۔ ایک شام ضیافت کے دوران ایتھنز سے ہمراہ آئی ہوئی ایک گلیمر گرل تائیس کی مسرور تجویز پر قصر پرسی پولس میں آگ لگوادی۔ پھر سوچا ذرا ایک چکر ہندوستان کا بھی لگا آؤں۔ چنانچہ باختر اور سغد یہ وغیرہ کو جیب میں ڈالتے ہوئے جہلم کے کنارے پہنچ کر اسی مقام پر بھائی پورس کا مقابلہ کیا جہاں کوئی سوا دو ہزار برس بعد ایک اور یورپین فاتح ایک اور پنجابی فوج سے بھڑے گا[27]۔ پھر بلوچستان ہوتے ہوئے سُوش واپس گیا۔ 324 ق م کے موسم بہار میں دوبارہ بابل آ کر سوچتا تھا کہ اسی شہر کو ہیڈ کوارٹرز بنائے کہ سال بھر بعد ہی بخار میں مبتلا رہ کر راہی ملک عدم ہوا۔ اور دنیا کے لیے اپنے افسانے چھوڑ گیا۔ اس کے بعد اس کی سلطنت اس کے سرداروں نے آپس میں بانٹ لی۔ سیلوکس نے ایران کی حکومت سنبھالی اور ہندوستان کا ٹرپ لگایا۔ دریائے سندھ عبور کر کے مہاراجہ چندر گپت موریہ سے ملاقات کی اور معاہدے پر دستخط کیے۔ جس کی تصویریں کھنچیں۔ جن میں دونوں حکمراں مصافحہ کر کے کیمرے کو دیکھتے ہوئے مسکرا رہے ہیں۔ مہاراجہ نے سیلوکس کو پانچ سو ہاتھی بھی بطور تحفہ پیش کیے۔ (آج بھی ہندوستان بسلسلہ خیرسگالی بذریعہ ایران انڈیا بیرونی ممالک کو ہاتھی بھیجتا رہتا ہے۔ یہ ایلیفنٹ ڈپلومیسی کہلاتی ہے) یہ بے حد مفید ہاتھی تھے، کیونکہ سیلوکس کی فوج ان کی وجہ سے اناطولیہ اور شام میں کامیاب ہوئی۔ اب باختر سے لے کر یہودیہ تک کے ممالک سیلوکس اور اس کے جانشینوں کی عمل داری میں آگئے اور ایک یونانی مورّخ نے لکھا "میں تم سے پوچھتا ہوں۔ آج سے پچاس برس قبل پارسیوں یا ان کے تاجدار یا مقدونیہ کے کسی دیوتا نے یہ پیشن گوئی کی ہوتی کہ آج کے دور میں یعنی جبکہ ہم زندہ ہیں اہلِ پارس کا نام ونشان تک مٹ چکا ہوگا جو ایک وقت تھا کہ ساری دنیا کے مالک تھے اور اہلِ مقدونیہ جو پہلے گمنام تھے آج سارے عالم کے فرماں روا ہوں گے۔۔۔ تو کوئی یقین کرتا؟"

سیلوکس کے علاوہ دوسرا یونانی سردار جس نے سکندر کے بعد اپنی حکومت قائم کی بطلیموس تھا جو فرعونِ مصر بن بیٹھا اور تین سو سال تک اس کی اولاد وادیٔ نیل پر راج کرتی رہی۔ اسی زمانے میں ہم ایک بار پھر یہودیوں سے ملاقات کرتے ہیں۔

ہنحا منشی دور میں یہودیوں نے مدتوں بعد اطمینان کا سانس لیا تھا۔ تب ہی بابل سے لوٹ کر آلِ ابراہیمؑ نے مذہبی اصلاحات نافذ کیں۔ تورات کے قوانین رائج ہوئے اور انجیل کے وہ ابواب لکھے گئے جن کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ یہودیہ اب بطلیموسی فراعنہ کا ایک صوبہ تھا لیکن حصول اقتدار کے لیے بطلیموس اور سیلوکسی خاندانوں میں لڑائیاں شروع ہوئیں اور یہودیہ پر مختلف اوقات میں شام اور مصر کا تصرف رہا۔ بطلیموسی حکمراں یہودیوں کے دوست ثابت ہوئے۔ بطلیموس اوّل نے اسکندریہ بسا کر اس میں یہودیوں کی نوآبادی قائم کی اور اسکندریہ یونانی اور یہودی علماء و فضلاء کا مرکز بن گیا۔ بطلیموس اوّل ہی نے اس شہر کی مشہور لائبریری اور میوزیم[28] تعمیر کروایا۔ بطلیموس دوئم نے اسکندریہ کے قریب روشنی کا وہ مینار بنوایا جو دنیا کے سات عجائبات میں شمار کیا جاتا تھا۔ بطلیموس سوئم ایران جا کر وہ قدیم مصری نوادر اور دیوتاؤں کے بت واپس لے آیا جو ہنحا منشی فاتح مصر کمبوجیہ دوئم یہاں سے سوش لے گیا تھا۔ اسکندریہ ہی میں ستر یہودی عالموں نے انجیل مقدس کا ترجمہ عبرانی سے یونانی میں کیا لیکن دوسری صدی قبل مسیح میں ایران و شام کے سلوکی حکمراں انطیوکس چہارم نے (جسے نسلاً اپنے یورپین ہونے پر بے حد فخر تھا) اپنی ایشیائی رعایا کو ''مہذب'' کرنے کا بیڑا اٹھایا اس وقت یہودیہ شام کے قبضے میں تھا۔ چنانچہ سرکاری حکم سے یروشلم میں جمنزیم قائم ہوا۔ یونانی نام رائج کیے گئے اور ایتھنز سے ایک فلسفی عوام کو یہ سمجھانے کے لیے بلایا گیا کہ یاہ ویہہ دراصل جیوپیٹر دیوتا ہی کا نام ہے۔ ہیکل میں یونانی دیوتاؤں کے بت سجا دیے گئے اور دین موسویؑ کی پابندی جرم قرار پائی۔ اسی زمانے میں غصے کے مارے یہودی مصنفین نے صحیفہ دانیالؑ میں زوال یونان کی پیشن گوئی کا اضافہ کیا جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ کچھ عرصے بعد سلطنت یونان کے بھی برے دن آ گئے اور مغرب میں اس کی جگہ روم نے لے لی۔ جس نے یہودیہ پر تسلط جما کر اس کا نام فلسطین رکھ دیا۔ اِدھر تیرھویں بطلیموس کی لڑکی ملکہ مصر ایلزبتھ ٹیلر نے رچرڈ برٹن اور ریکس ہیریسن دونوں کے ساتھ بیک وقت فلرٹ کیا اور 30 ق م میں اپنی جان گنوائی۔ اس کی موت کے بعد مصر بھی روم کا ایک صوبہ بن گیا۔ فلسطین کے رومی گورنر کے دور میں حضرت عیسیٰؑ کی ولادت ہوئی۔ اس وقت عوام کی حالت بے حد خستہ ہو چکی تھی۔

حضرت عیسیٰ نے بھی قدیم عبرانی پیغمبروں کی روایت کے مطابق جابر حکومت اور حکومت کے پٹھو کاہنوں کی مخالفت کی اور ان کو صلیب پر پہنچایا گیا۔ چند سال بعد ہی یہودی بغاوت زیادہ شدید ہوئی، جسے فرو کرنے کے لیے رومی فوج نے بیت المقدس پر دھاوا بولا اور 70 عیسوی میں تقریباً اسی روز جب آج سے ساڑھے چھ سو سال قبل بخت نصر نے ہیکل کو تباہ کیا تھا، رومیوں نے اس نئے ہیکل کو جو دارائے اعظم کے حکم سے دوبارہ بنایا گیا تھا، نذر آتش کر دیا۔

رومن عہد میں یہودی ایک بار پھر جلاوطن ہوئے اور فلسطین سے نکل کر سارے مغربی ایشیا شمالی افریقہ اور یورپ میں بکھر گئے۔

سیلوکی یونانی اقتدار مغرب میں روم اور مشرق میں وسط ایشیائی قبائل کے ہاتھوں ختم ہوا۔ باختر میں سیلوکی تسلط سے علاحدہ ایک یونانی باختری حکومت قائم ہوگئی جس نے اپنا دائرۂ اقتدار شمالی مغربی ہند تک پھیلایا۔ دوسری طرف جنگجو شہسواروں کے پارنی قبیلے نے سیلوکی آقاؤں سے بغاوت کر دی۔ اس قبیلے کے سردار بھائی ارشک اور تیرداد تھے جنھوں نے 250 ق م کے لگ بھگ ایران میں پارتھین یا اشکانی عہد کی بنیاد رکھی۔ معلوم پارتھین خود اپنے آپ کو کیا کہتے تھے۔ بہر حال یونانیوں نے ان کے علاقے مشرقی ایران یا خراسان کو پارتھیا کہا۔ سیلوکی حکومت بہت تیزی سے تتر بتر ہونے لگی اور سو سال کے اندر اندر پارتھین حکمران مہرداد اوّل نے فرات سے لے کر ہرات تک اپنے تصرف میں لے لیا۔ مہرداد پنجاب جا کر وہاں کی باختری حکومت کا تیاپانچہ بھی کرتا آیا۔ اس نے دجلہ کے کنارے ایک وسیع فوجی چھاؤنی قائم کی جو بعد میں پارتھین دارالسلطنت تیسفون کہلائی۔ مہرداد کے لڑکے فرہاد نے 129 ق م میں سیلوکی حکمران انطیوکس چہارم کو زبردست شکست دی اور تاریخ سے گویا ایشیا میں ہیلینی یونانی اقتدار کا خاتمہ ہوگیا۔

اس طرف ایک وسط ایشیائی قبیلے شاکا نے افغانستان اور مشرقی ایران کے خطوں پر قبضہ جما رکھا تھا جس کی وجہ سے ان جگہوں کو شاکستان یا سیستان کہا جاتا تھا۔ یونانیوں نے ان کو سیتھیا کہا سارے وسط ایشیائی قبائل کو عام طور سے سیتھین ہی کہا جاتا تھا) پھر اہل پارتھیا نے سیستان پر قبضہ کیا اور سیتھین اور پارتھین سب آپس میں گڈمڈ ہو گئے۔ اسی دوران میں یہ حضرات ہندوستان

میں براجتے نظر آتے ہیں۔اوران کے ناموں اورنسلوں اور مختلف حکومتوں میں بڑا سخت کنفیوژن ہے۔مثلاً یہ شاکا پہلوا اور انڈ و پارتھین یا ستھین پارتھین سبھی کچھ کہلاتے ہیں۔اور کچھ پتہ نہیں چلتا کہ کون کیا ہے۔پھران ہی میں باختری یونانی اور بعد میں یو چی یاتو خاری مزید جھمیلے پیدا کرنے کے لیے شامل ہیں۔ گتھی کچھ اس طرح سلجھ سکتی ہے کہ شاکا لوگوں نے ہندوستان پر یلغار کی اور حکومت قائم کرنا اتنی آسان بات معلوم ہوتی ہے کہ جسے دیکھئے اس نے حکومت قائم کرلی۔چنانچہ انھوں نے ہندوستان میں بھی یہی حرکت کی اور یہاں سات عدد ''کھشتر اپ'' اور ''مہا کھشتر اپ'' قائم کر لیے۔پہلی صدی عیسوی میں یہاں باختری یونانی ریاستیں تو تھوڑی سی رہ گئی تھیں۔شاکا صاحبان متھرا میں ڈٹے ہوئے تھے۔اب پھر کچھ گھپلا ہوتا ہے اور یہ ''شاکا پہلوا'' بن جاتے ہیں یعنی ان میں ایران کے پارتھی پہلوان شامل ہوجاتے ہیں اوران کا بڑا بھاری بادشاہ GONDOPHARES ہے اوراس کے متعلق بہت سے افسانے مشہور ہیں۔اسے مسیحی حکایت کے ان تین مشرقی بادشاہوں میں سے ایک سے مماثل کیا گیا ہے جو حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش پر تحفے تحائف لے کر بیت لحم گئے تھے۔دوسری مسیحی روایت کے مطابق اس نے اپنا ایک سفیر ملک شام بھیجا تا کہ وہاں سے چند معمار چنڈی گڑھ کی قسم کا ایک نیا شہر تعمیر کرنے کے لیے منگوائے۔یہ سفیر کسی مستند آرکی ٹیکٹ کے بجائے حضرت عیسیٰؑ کے حواری سینٹ طامس کو ساتھ لے آیا۔سینٹ طامس نے اس شاکا پہلوا بادشاہ سے کہا کہ اے بادشاہ تو ابد تک جیتا رہ میں ایک ایسے شہر کی تجھے خوشخبری دیتا ہوں جسے انسانی ہاتھوں نے نہیں بنایا۔بالفاظ دیگر یہ کہ اے بادشاہ تو سیدھے سیدھے عیسائی ہوجا۔چنانچہ بادشاہ (جس کا نام دوبارہ لکھنا بہت طوالت ہے) مع اپنے اہل وعیال و دربار کے کرسچین ہوگیا اوراس کے بعد سینٹ طامس نے ساؤتھ انڈیا جاکر وہاں تبلیغ کی۔بہرحال ان انڈو پارتھین پہلوانوں نے مالوہ، کاٹھیاواڑ، گجرات، ٹیکسلا، متھرا اور شمالی دکن وغیرہ پر مدتوں حکومت کی اور مقامی آبادی میں مدغم ہوگئے (کاٹھیاواڑ کے ہندو کسان آج تک یونانی وضع کی کرتیاں پہنتے ہیں اور پیچ دار پگڑیاں اور گھیر دار شلوار نما دھوتیاں باندھتے ہیں) بعدازاں چینی ترکستان سے یو چی یاتو خاری صاحبان وارد ہوئے۔انھوں نے ہند کے باختری یونانیوں اور شاکا

پہلو اونوں کا صفایا کیا اور کشان سلطنت مشہور و معروف قائم کی۔ چنانچہ کنشک اوّل وہ زبردست شخص تھا جس نے باختر سے لے کر بنارس تک راج کیا اور بدھ مت کی جو سرپرستی کی وہ الگ۔ یہ یوچی یا کشان بھی شاکاؤں کی طرح ایرانی خاندان سے تعلق رکھنے والی زبان بولتے تھے۔ گو چہرے مہرے سے اقوام زرد پوست کی مانند تھے۔ مہاراجہ کنشک جس کی راجدھانی پشاور تھی خود نسلاً شاکا نہیں تھا مگر ناموں کے اسی کنفیوژن کی وجہ سے وہ کیلنڈر جو اس سے منسوب ہے شاکا کہلاتا ہے (یہ 78 عیسوی سے شروع ہوتا ہے اور جنوبی ہند ہوتا ہوا یہی کیلنڈر جنوبی مشرقی ایشیا پہنچا)۔

اسی راجہ کنشک والی یوچی قوم نے ایران پہنچ کر بھی تباہی مچائی اور وہاں کا پارتھین بادشاہ مہرداد دوئم ان سے نپٹتا رہا۔ فرہاد دوئم اور مہرداد سوئم روم سے لڑنے جھگڑنے میں مشغول رہے۔ دونوں نئی طاقتوں کے درمیان فساد آرمینیہ نے کھڑا کروایا تھا جس نے رومن اور پارتھین سلطنتوں کی درمیانی BUFFER ریاست کی حیثیت سے بڑی پیچیدہ سازشیں شروع کر رکھی تھیں بالآخر 53 ق م میں پارتھیا نے روم کو وہ زبردست شکست دی کہ ایک بار پھر ایک یورپین سلطنت کو ایران کا لوہا ماننا پڑا۔ ایرانی شہسواروں نے روم کی پیادہ فوج کا بھرتہ بنا دیا۔ اِدھر روم کی سام النسل محکوم اقوام یعنی یہودی اور عرب قبائل ایک مرتبہ پھر ایران کو اپنا نجات دہندہ سمجھنے لگے اور انجیل مقدس کے ابواب میں پارتھین شہسواروں کی فتح کی پیشن گوئی کا اضافہ بھی کر دیا گیا۔ فرہاد چہارم اور مارک انطونی کی افواج میں گھمسان کا رن پڑا۔ مارک انطونی کو پسپا ہونا پڑا اور فرہاد نے مارے خوشی کے مالِ غنیمت میں جو روی سکے ہاتھ آئے تھے ان کے اوپر "انطونی اور کلیوپیٹرا" کے ناموں کے اوپر اپنے نام کا اضافہ کروا دیا۔ سیزر آگسٹس نے جو سکندر کے جانشین کی حیثیت سے تسخیر ایشیا کے خواب دیکھ رہا تھا اپنا ارادہ بدل دیا اور فرہاد چہارم سے دوستی کر لی۔ لیکن ہخامنشیوں کے دور انحطاط کی مانند اشکانی سلاطین کے ہاں بھی خانہ جنگیاں اور سازشیں شروع ہو گئیں اور اسٹیج پر ساسانیوں کے نمودار ہونے کا وقت آ گیا۔

پارتھین سلاطین پہلے یونانی اور بعد میں رومی تمدن سے بہت متاثر تھے۔ ان کے شہزادے اکثر سیاسی یا کلچرل کانفرنسوں میں شامل ہونے کے لیے اٹلی جایا کرتے۔ لیکن اس کے

باوجود اشکانی دور میں ایرانی کلچر کی تجدید ہوئی۔ اشکانی سماج بنیادی طور پر دلاور سورماؤں کا سماج تھا۔ قدیم ہنحامنشیوں کی طرح ان کے ہاں بھی ایک نوع کا فیوڈل نظام قائم ہوا۔ رزمیہ داستان گوئی فیوڈل سماج کا خاصہ ہے۔ پارتھین اشکانی سورما پہلوان کہلاتے تھے اور ان پہلوانوں کی داستانیں درباروں میں سنائی جاتی تھیں۔ زیادہ تر ان ہی قصوں پر ایران کے قومی رزمیہ شاہنامے کی بنیاد دیکھی گئی۔ اہل پارتھیا کی زبان ہنحامنشی فارسی سے مشابہہ تھی۔ اور چونکہ پہلوانوں کی زبان تھی اس لیے پہلوی کہلائی سیستان کے مشرق یعنی توران کے یوچی یا توخاری قبیلے سے اہل پارتھیا کی مسلسل جنگوں نے افراسیاب تورانی اور رستم سیستانی کی جنگ کی روایت تیار کی۔ (قصہ رستم کا کچھ حصہ سغدی زبان میں لکھا ہوا چینی ترکستان میں بھی دستیاب ہوا ہے)۔ پارتھین سماج جاگیرداروں، آزاتان (آزادان) وزرکان (بندگان) اور پہلوانوں یعنی فوجی سرداروں پر مشتمل تھا۔ یونانی اور رومی اثر کی وجہ سے ہرقلیس پہلوان کا بھی بہت چرچا تھا۔ (پہلوانی اکھاڑے آج تک اہل ایران کی محبوب تفریح گاہ ہیں) دین زرتشت نے بھی خراساں ہی میں جنم لیا تھا۔ چنانچہ قدیم حکایات، مذہبی روایتوں اور دلاوری کے قصوں نے ایک قومی دیومالا کی تخلیق کی۔ گھوڑا ایک نہایت قابل قدر جانور تھا۔ بہترین گھوڑے کا مالک ہونا دلاور کا ایک وصف تھا۔ چنانچہ داستانوں میں لہرسپ (تیز گھوڑے کا مالک) طہماسپ (زورمند گھوڑے کا مالک) اور جاسپ (قیمتی گھوڑے کا املک) وغیرہ ناموں کی افراط دیکھ لیجیے۔ پارتھین مذہب کے معاملے میں روادار تھے۔ یہودیوں سے ان کی دوستی کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ پارتھین دور میں بابل یہودیوں کا علمی مرکز قائم ہوا۔ رومیوں کے خلاف یہودی بغاوت میں بھی اشکانیوں نے بنی اسرائیل کی مدد کی (اور فلسطین میں یہ کہاوت مشہور ہوئی کہ جب تمھیں ایک پارتھین گھوڑا کسی سنگ حزار سے بندھا کھڑا نظر آئے تو جان لو کہ ظہور مسیح کا وقت آن پہنچا) پہلی صدی عیسوی میں ایرانی، یونانی اور پرتھین فنی امتزاج سے ایران کے درباری آرٹ نے جنم لیا۔ اپنی تہذیبی اور سیاسی عظمت کے ایک نئے دور کے خیر مقدم کے لیے تیار ہو چکا تھا۔

پارتھین دور کے خاتمے اور آل ساسان کے عروج کے درمیانی وقفے میں ایک نئی سیاسی

پیچیدگی پیدا ہوئی جس کی وجہ یہ تھی کہ کرسٹان لوگ عالم وجود میں آ چکے تھے۔ حضرت عیسیٰؑ کے بعد ایک محنت کش یہودی جو خیمے بنانے کا کام کرتے تھے اور جن کا اصل نام سال تھا اور پھر عیسائی ہو کر سینٹ پال کہلائے زور شور سے اپنے تبلیغی سفر پر نکلے اور اناطولیہ ایشیائے کوچک اور یونان میں کلیسا قائم کیے۔ اٹلی پہنچے وہاں ان کو قید کر لیا گیا۔ روم والے نیرو نے (جسے سارنگی پر بے وقت کی راگنی چھیڑنے کا بہت شوق تھا) انھیں بہت ستایا اور 67 عیسوی میں ان کا انتقال ہوا۔ سینٹ پال نے شریعت موسویؑ کے بہت سے قوانین منسوخ کیے اور یورپین عیسائیوں کو پورک کھاتے رہنے کی اجازت دے دی لیکن سب سے زیادہ عیسائی سب سے پہلے مصر میں ہوئے جو قبطی کہلائے۔ (COPT-GOPT=EGYPT) قبطیوں ہی نے رہبانیت کا سلسلہ شروع کیا۔ ایک قبطی بزرگ سینٹ انطونی (غالباً 251 عیسوی-356 عیسوی) نے مصر میں سب سے پہلی خانقاہ قائم کی اور بہت جلد سارے صحرائے مصر و شام میں ان گنت خانقاہیں بن گئیں جن کے راہب ہندو سادھوؤں کی طرح عجیب عجیب طریقوں سے تزکیہ نفس کرتے ایک مقبول عام طریقہ اونچے اونچے ستونوں پر چڑھ کر بیٹھ رہنے کا تھا۔ تیسری صدی عیسوی تک نظریہ تثلیث زیادہ رائج نہیں ہوا تھا۔ لیکن اسکندریہ میں یونانی فلسفے کا زور تھا۔ وہاں یونانی LOGOS کے نظریے کے زیر اثر ''کلمہ جو خدا کے ساتھ تھا اس نے یسوعؑ کے روپ میں اوتار لیا (دین زرتشت میں بھی کلمہ تخلیق کائنات سے قبل موجود تھا) اب ''ایک'' اور ''تین'' والے عیسائیوں میں سخت جھگڑا شروع ہوا۔ تثلیث والے کہتے تھے کہ مسیحؑ کی ذات بشریت اور الوہیت کا مجموعہ ہے۔ یہ مسیحؑ کی وحدت فطرت کے حامی کہلائے۔ قبطی ہزار ہا سال سے دیوی اِسس کی مورتیاں پوجتے آئے تھے جن میں وہ اپنے بچے یعنی دیوتا ہورس کو دودھ پلاتی دکھائی جاتی تھی اور چونکہ مسیحؑ کی وحدت فطرت کے قائل ہو چکے تھے لہٰذا حضرت مریمؑ لامحالہ ''مادرِ خداوند'' ہو گئیں۔ اِسس اور ہورس کی جگہ عیسیٰؑ و مریم کے مجسموں نے بآسانی لے لی۔ اس طرح قیصر روم قسطنطین نے عیسائی ہو کر 326 عیسوی میں قسطنطنیہ بسایا اور روم سے علاحدہ بازنطیم کی حکومت قائم کی۔ (بازنطیم اس جگہ پر عہد قدیم میں ایک یونانی شہری ریاست کا نام تھا) اور مسیحیت اناطولیہ اور آرمینیہ میں بھی پھیل گئی۔ ''ایک'' اور ''تین'' والوں کا

جھگڑا زیادہ شدید ہوتا جا رہا تھا۔ چنانچہ کلیسا کی جنرل کونسل نے جو عیسیا (اناطولیہ) میں منعقد ہوئی 325 عیسوی میں بالاتفاق رائے یہ ریزولیوشن پاس کر دیا کہ باپ بیٹا اور روح القدس تین خدا ہیں۔ جو ایک بھی ہیں۔ تھیوڈوسیس اعظم شہنشاہِ بازنطیم نے 381 عیسوی میں اپنے فرمان کے ذریعے ہمیشہ کے لیے فیصلہ کر دیا کہ خدا قطعی تین ہیں۔ عبرانی انبیا نے ایمان بالغیب اور توحید کے پرچار کے لیے پچھلے دو ہزار سال تک جدوجہد کی تھی اور یہودی اب صدیوں سے توحید کے بڑی شدت سے قائل تھے۔ تثلیث اور اوتار کے عقیدے کے اس فروغ نے پیغمبروں کی ان ساری کوششوں پر پانی پھیر دیا۔ انبیا اور یہودی علما نے گردوپیش کی بت پرستی سے کسی قیمت پر سمجھوتہ نہیں کیا تھا۔ عیسائیت نے مصر اور یونان و روم کے اساطیری تصورات سے بھی سمجھوتہ کر لیا۔ چنانچہ ردِعمل کے طور پر یہودیوں نے حضرت عیسیٰؑ کو پیغمبر تک ماننے سے قطعی انکار کر دیا۔ ادھر عیسائیوں نے یہودیوں کو "قاتلانِ مسیحؑ [29]" کہہ کر ان پر جور و تشدد شروع کیا اور آئندہ دو ہزار سال تک یورپ میں ان کا بھرتہ بناتے رہے۔ مصری کلیسا حد سے زیادہ کٹر ثابت ہوا۔ اوائل پانچویں صدی میں اسکندریہ کے عیسائیوں نے یہودیوں کا قتلِ عام شروع کر دیا اور یہودیت اور یونانی عقلیت پرستی دونوں کے خلاف محاذ قائم کیا گیا۔ اس زمانے کا سب سے الم ناک واقعہ یونانی فلسفی اور ماہر ریاضی خاتون ہائی پیشا [30] ادھر اسکندریہ کے اسقفِ اعظم سرل کو معلوم ہوتا ہے کہ یہودی عیسائیوں کو مارنے کی فکر میں ہیں۔ چنانچہ عیسائی یہودیوں پر حملہ کر دیتے ہیں یعنی بڑا سخت فرقہ وارانہ فساد ہوتا ہے۔ بھائی فلیمن بھی مارا ماری میں شامل ہو کر یہودیوں کا صفایا کرنے میں جٹ جاتے ہیں۔ آپ ہائی پیشا سے بھی بے حد متاثر ہیں۔ جو ابھی تک یونانی دیوتاؤں کی قائل ہے لہٰذا فلیمن پر ارتداد کا الزام لگایا جاتا ہے رفائیل بن عزرا ایک امیر یہودی نوجوان بھی ہائی پیشیا کا شاگرد ہے مگر وہ عیسائی ہو جاتا ہے۔ فلیمن کی بہن ملچیا ایک حسین طوائف ہے جو بعد میں صحرا میں جا کر تائیس کی طرح راہبہ بن جاتی ہے اور بطریق سرل کے راہب ہائی پیشیا کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے ہیں۔) کا قتل ہے۔ جسے بشپ سرل کے حکم سے رتھ کے پہیے سے باندھ کر انتہائی بربریت کے ساتھ ہلاک کیا گیا۔ 414 عیسوی میں یہودیوں کو اسکندریہ سے بھی

جلاوطن کر دیا گیا۔ (ان کارناموں کی وجہ سے بشپ سرل کو مرنے کے بعد کلیسا نے سینٹ سرل بنا دیا) گو خود کلیسا کے اندر مختلف فرقے بڑھتے گئے۔ نسطور یس بطریق قسطنطنیہ نے 428 عیسوی میں اعلان کر دیا کہ مسیح کی فطرت میں الوہی اور انسانی صفات علاحدہ علاحدہ تھیں۔ چنانچہ پھر تخت تکرار ہوئی اور نسطوری کلیسا علاحدہ ہو گیا بازنطیم کا کلیسا ''مشرق قدامت پرست'' یا ''یونانی قدامت پرست'' کلیسا کے نام سے بہت طاقتور ہو گیا (اور بعد کی صدیوں میں روس تک پھیلا) اسی زمانے میں ڈالمیشیا کے سینٹ جیروم نے انجیل مقدس کا ترجمہ لاطینی میں کیا) لیکن اب مسیحی بازنطیم کو مشرق میں ایک نئے اور زبردست حریف کا سامنا کرنا پڑا۔ یعنی آتش پرست ساسانی ایران۔!

پہلوی کتاب کارنامک اردشیر کا کہنا ہے (اور یہ بھی سائیرس اعظم کی پیدائش کی حکایت سے مشابہہ ہے) کہ پرسی پولس کے نزدیک شاہ پاپک حاکم شہر کے ہاں ایک گڈریہ ملازم تھا جس کا نام ساسان تھا یہ ساسان دراصل شاہان ہخامنشیہ کی نسل سے تھا۔ (سلطنت کے بانی کا شاہی نسل سے ہونا ضروری ہے۔ اسی طرح آل ارشک اپنا سلسلہ نسب اردشیر سوئم سے ملاتے تھے) مگر کسی کو یہ بات معلوم نہ تھی، پاپک نے خواب میں دیکھا کہ ساسان کا بیٹا ساری دنیا کا بادشاہ ہوگا۔ چنانچہ پاپک نے اپنی لڑکی کی شادی اس گڈریے سے کر دی اور اردشیر پیدا ہوا۔ ایک اور حکایت کے مطابق ساسان اصطخر کے مندر کا پروہت تھا۔ اس کے بیٹے پاپک——— نے مقامی شہزادے گوچہر کی لڑکی سے شادی کی اور اس سے زبردستی حکومت چھین لی۔ (یاد کیجیے اسی طرح سائرس اعظم نے اپنے نانا سے میڈیا کا تخت چھین لیا تھا) ایک رومن مورخ نے لکھا کہ پاپک ایک جوتشی اور منجم تھا۔ اس کے گھر میں ساسان نامی ایک سپاہی مہمان ٹھہرا۔ اس کی بلند بختی کا اندازہ لگا کر پاپک نے اپنی بیٹی اس سے بیاہ دی اور اردشیر پیدا ہوا۔ چند اور روایات کے مطابق ساسان فارس کا ایک امیر زادہ تھا۔ پاپک اس کا بیٹا اور اردشیر پوتا تھا اور غالباً یہی صحیح ہے کیونکہ پرسی پولس میں شاہ پور اول کے کتبے سے قیاس کیا گیا ہے ساسان ایک امیر، اور شاہ پاپک کا پرکھ تھا اور پاپک شاہ شاہ پور کا دادا تھا۔ بہر حال اسی پاپک (جو غالباً فارس کا گورنر تھا) کے لڑکے

اردشیر نے اشکانی بادشاہ اردوان پنجم سے 225 ق م جنگ کر کے تیسفون پر قبضہ کرلیا اور کشان سلطنت، بین النہرین اور آرمینیہ کے علاقوں پر تسلط جمایا۔ اس کے بیٹے شاہ پور اوّل نے 260 ق م میں قیصر روم ویلیرین کو شکست دے کر ستر ہزار رومی سپاہ کو قید کیا۔ رومی بہترین انجینئر تھے (آج تک ''اٹلی والے انجینئرنگ میں لاثانی ہیں) چنانچہ انہی اطالوی جنگی قیدیوں سے ایرانیوں نے فنِ تعمیر میں بہت کچھ سیکھا۔ شاہ پور دوئم کے عہد میں کشان سلطنت بھی ایران کا ایک حصہ بن گئی اور بلخ اس کا مستقر قرار پایا۔ بازنطیم کا شہنشاہ قسطنطین شاہ پور اوّل کا ہم عصر تھا۔ چونکہ ارمنی عیسائی ہو چکے تھے حکومتِ ایران نے ان کو بازنطیم کا جاسوس سمجھنا شروع کر دیا لیکن اسی زمانے سے زرتشتی اور مسیح عقائد کی تبلیغ شروع ہوئی۔ ایرانی مصور مانی نے یونان کے غناسی، مسیحی، زرتشتی اور بودھ تصوّرات کو ملا جلا کر ایک نیا کشادہ مشرب مذہب ایجاد کیا عالمگیر اخوت جس کی اساس تھی۔ اسی وجہ سے مانی کو دین بہائیہ کا پیش رو کہا جاتا ہے۔ مانی کی ماں روایت کے مطابق اشکانی خاندان سے تعلق رکھتی تھی اور یہ کنبہ ہجرت کر کے ہمدان سے بابل چلا گیا تھا۔ دین مانی دور دور روم و چین تک پھیل گیا اور روم میں پیروانِ مانی کو ایران کا جاسوس سمجھا جانے لگا۔ قرونِ اولیٰ کے عظیم مسیحی مفکر سینٹ آگسٹین جو شمالی افریقہ کے باشندے تھے شروع میں مانوی عقائد کے پیرو رہے۔ مانی کو غالبًا بہرام اوّل کے حکم سے 274 عیسوی میں قتل کیا گیا۔ بہرام گور اور کواد اوّل (عربی= قباد) کے دور میں مجوسی موبدوں اور امرا کا زور بہت بڑھ گیا۔ جاگیرداروں نے کسانوں پر ظلم توڑنے شروع کیے اور مزدک خراسانی نے اپنی سوشلزم کا پرچار کیا۔ مزدکیت دین مانی کی ترقی یافتہ شکل تھی۔ چنانچہ قباد اوّل نے مزدکیوں کا قلع قمع کیا اور بائیں بازو کی تحریک کو کچلنے کی رسم کا اجرا ہوا۔ مگر خسرو اوّل یعنی نوشیرواں عادل (530 عیسوی-576 عیسوی) نے موبدوں اور امیرزادوں کو مطیع کر کے مزدکیوں کی سرپرستی کی اور قیصرِ روم سے لڑ کر شام پر اپنا جھنڈا لہرایا۔ بہ عہد نوشیروانِ عادل محمد رسول اللہ 570 عیسوی میں پیدا ہوئے۔

نوشیرواں کا بیٹا ہرمز چہارم (579 عیسوی-590 عیسوی) بے حد ذہین اور بہت پڑھا لکھا انسان تھا۔ اس نے بھی اپنے والد کی طرح جاگیرداروں اور موبدوں کو قابو میں رکھنا چاہا۔

(اقتدار کے لیے بادشاہ کا طبقہ امراؤ اور مذہبی قائدین سے کش مکش ایران کا پرانا مسئلہ ہے جو موجودہ شہنشاہ ایران کی لائی ہوئی اصلاحات سے قبل تک باقی تھا)۔ اپنی حمایت کے لیے اس نے اپنی عیسائی رعایا کا سہارا لیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ موبد اس کے اور زیادہ خلاف ہو گئے۔ بہرام چوبیں ایرانی فوج کا سپہ سالار تھا جس نے شمال کے ترکستانی قبائل کے دانت کھٹے کر دیے تھے۔ لیکن بازنطیم کے مقابلے میں اسے متواتر ہارنا پڑا۔ اسی وجہ سے ہرمز نے ناخوش ہوکر اسے اپنے عہدے سے معزول کرنا چاہا۔ بہرام چوبیں فوج اور عوام میں بے حد مقبول تھا۔ اس نے بغاوت کر دی۔ امراء نے اس کا ساتھ دیا۔ ہرمز کو زنداں میں ڈال دیا گیا اور اس کے لڑکے خسرو پرویز دوئم کو تاج شاہی پہنا دیا گیا۔ لیکن بہرام چوبیں جو اشکانی امرا کے ارفع ترین خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اشکانی بادشاہت کی تجدید کا آرزومند تھا۔ فوج کی اعانت حاصل کر کے اس نے دارالسلطنت اور ایوان شاہی پر قبضہ کر لیا اور سال بھر تک حکومت کی۔ خسرو پرویز نے بھاگ کر بازنطیم میں پناہ لی جہاں شاہ جسٹین نے اسے اپنا بیٹا بنا لیا اور ایک بازنطینی شہزادی ماریا سے اس کی شادی کر دی (جو نظامی گنجوی کی مثنوی ''خسرو شیریں'' میں مریم کے نام سے جلوہ گر ہے۔ ادھر بہرام چوبیں کو بھی ایک عوامی ہیرو کا درجہ مل گیا) بازنطیم سے فوجی امداد لے کر خسرو پرویز وطن لوٹا اور بہرام چوبیں کو قتل کر کے اپنی شاہی وراثت کا مالک بنا۔ کچھ عرصے بعد بازنطیم میں بھی بغاوت ہوئی اور ایک صوبے دار ہرقل نے قسطنطنیہ پر قبضہ کر لیا۔ اب 603 عیسوی میں خسرو پرویز نے ہرقل کے خلاف قسطنطنیہ پر چڑھائی کر دی اور فلسطین سمیت متعدد بازنطینی صوبوں پر قابض ہو گیا۔ بیت المقدس یہودی بازنطینی حکومت سے پہلے ہی سخت نالاں تھے۔ انھوں نے حسب معمول ایک بار پھر ایرانیوں کو اپنا نجات دہندہ سمجھ کر ان کا ساتھ دیا۔ اس صلیب کو جس پر مسیحی عقیدے کے مطابق حضرت عیسیٰؑ کو مصلوب کیا گیا تھا خسرو پرویز اکھاڑ کر ایران لے گیا اور یہودیوں نے خوب بغلیں بجائیں۔ بعد ازاں خسرو نے مصر پر حملہ کیا اور طرابلس کو اُجاڑا۔ ہرقل کی اس سے کنارد جلہ اسی جگہ جہاں سکندر دارا سوم سے بھڑا تھا، بڑی بھیانک جنگ ہوئی۔ اب ہرقل بغلیں بجاتا ایران جا کر صلیب واپس لے آیا اور جب یروشلم میں داخل ہوا ہے تو عیسائیوں نے

اس کی راہ میں قالین بچھائے۔

خسرو پرویز نے سلطنت کو بے حد وسعت دی تھی۔ لیکن شان وشوکت عیش وعشرت کا دل دادہ اور سخت فضول خرچی اور بد دماغ بادشاہ تھا (اسی کو رسول اللہ نے دعوت اسلام دی تھی اور وہ مسلمان قاصدوں سے انتہائی بدتمیزی اور گستاخی کے ساتھ پیش آیا تھا)۔ بے حد رومینٹک بھی تھا۔ چنانچہ ارمنی شہزادی شیریں پر عاشق ہوا۔ اور بازنطینی ماریا کی وفات کے بعد اس سے شادی کی۔ شیریں سے اس شادی میں عشق ومحبت سے قطع نظر اس کے وزیر شاپور کی مصلحت یہ بھی تھی کہ آرمینیہ جو مدتوں سے ایران کے لیے درد سر بنا ہوا تھا سلطنت میں شامل ہو جائے۔ خسرو پرویز کے لیے ہرقل سکندر ثابت ہوا۔ اس نے کوہ قاف کے قبائل سے اتحاد کر کے وادی دجلہ کو تاراج کیا اور تیسفون کا محاصرہ کرلیا۔ خسرو نے فرار ہونا چاہا لیکن اس کی اپنی باغی فوج نے اسے قید کرلیا۔ اسی وقت دجلہ میں قہرناک سیلاب آیا جس کی وجہ سے تخت کسریٰ کا ایک حصہ تباہ ہو گیا۔ خسرو پرویز قید میں بیمار پڑ گیا۔ ان سب آفتوں کے باوجود اس نے ہرقل سے صلح کرنے سے انکار کیا۔ فروری 628 عیسوی میں خود اپنے سفاک بیٹے کے ہاتھوں (جو ملکہ ماریا کے بطن سے تھا) موت کے گھاٹ اُترا۔ ساسانی ایران جو خسرو کے دور میں اپنی سطوت کے نکتہ عروج پر پہنچ چکا تھا اس افسانوی تاجدار کے عبرت ناک انجام کے ساتھ ہی ہمیشہ کے لیے فنا ہو گیا۔ اگلے پانچ برسوں میں بارہ سلاطین تخت پر چڑھے اور اترے۔ (یہی آخری منظر ہم ہخامنشی اور اشکانی ڈراموں میں دیکھ چکے ہیں) عوام خسرو پرویز کے لگائے ہوئے بھاری ٹیکسوں سے نالاں تھے۔ سرحد پر ترکستانی قبائل حسب عادت اودھم مچا رہے تھے۔ ملک کے اندر مجوسی موبدوں کا زور حد سے زیادہ بڑھ چکا تھا۔ عیسائی رعایا الگ تباہ حال تھی اور اخلاقی تنزلی سماجی بے انصافی اور سیاسی بے چینی کا یہ دور اپنے ابراہیم کی تلاش میں تھا۔

مجھے ہے حکم اذاں ـــــ!

642 عیسوی میں کوہ البرز کے دامن میں تاریخ کی ایک اور فیصلہ کن جنگ ہوئی۔ نہاوند کے محاذ پر یزدگرد سوئم مغلوب ہوا۔ صحرا بہ صحرا مارا مارا پھرا۔ اور دور افتادہ ترکستان میں ایک پنسہارے کے جھونپڑے کے اندر بے کسی کے عالم میں قتل کیا گیا۔ تقریباً ایک ہزار سال قبل یہی حشر دارا سوئم کا ہوا تھا۔ ایک تھکی ماندی، بوڑھی تہذیب ایک ترقی پسند، جوشیلے، تازہ دم نظام کے آگے دوبارہ سرنگوں ہوگئی۔

سید امیر علی لکھتے ہیں کہ جب تیسفون سے حاصل کیا ہوا مالِ غنیمت مدینہ پہنچا ہے تو حضرت عمرؓ رونے لگے اور فرمایا کہ مجھے اس مال و دولت میں امت کی تباہی کی جھلک دکھائی دے رہی ہے۔

چنانچہ یہی ہوا۔ اسلام نے ملوکیت کا مخالف نظام حیات پیش کیا تھا۔ مگر اس کے پیرو بہت جلد عجمی شہنشاہیت کے طور طریق اختیار کرنے والے تھے۔

عہدِ عتیق کے ان تمام سیاسی انقلابات کے ساتھ ساتھ بڑا سخت لنگویج پرابلم بھی چل رہا تھا۔ مصر قدیم کے تصویری رسم الخط کے بعد دوسری اسٹیج آئیڈوگرافی کی تھی جس میں تصاویر اشیا کے علاوہ خیالات کی نمائندگی بھی کرنے لگیں۔ یہ ''عبوری'' اسٹیج تھی۔ کلاسیکل مصری رسم الخط اور عروق کا خطِ میخی مخلوط تصویری اور صوتی طرزِ تحریر تھا۔ (چین جاپان میں آج تک اسی قسم کا ''عبوری'' رسم الخط رائج ہے) اہلِ عروق نے گاؤدم مثلث شکل کا ''خطِ میخی'' اس لیے ایجاد کیا کہ وہ مٹی کی الواح پر نوکیلے قلم یعنی اسٹائلس سے اپنے افسانے لکھتے تھے اور ادیب لوگ ایک دوسرے کے ''اسٹائل'' کے متعلق تبادلہ خیال کرتے تھے۔ اس زمانے میں سومیری اور اکادی بین الاقوامی ڈپلومیسی کی زبانیں تھیں اور ارادر نینوا اور عیلام اور ممفس کے سفارتی ڈنرز کے مواقع پر سب فرفر اکاڈی بولتے تھے فنیقی تاجروں نے بہی کھاتے رکھنے کے لیے کوئی ڈیڑھ ہزار سال قبل مسیح عبوری طرزِ تحریر ترک کر کے ایک قسم کا شارٹ ہینڈ ایجاد کرلیا۔ اس کی مختصر علامتیں تعداد میں غالباً بائیس تھیں۔ بنی اسرائیل نے کنعان میں آباد ہونے کے بعد یہی حروف اختیار کر لیے۔ فنیقی رسم الخط بہت جلد مقبول ہوگیا۔ اس کی کئی وجوہ تھیں ایک تو یہ ان کا شہر بائبلوس پچھلے دو ڈھائی ہزار برس سے مصر

سے تجارت کر رہا تھا۔ مصر میں دریائی نرسلوں سے پپائرس بنایا جاتا تھا۔ بائبلوس میں بھی اس کی فیکٹریاں کھل گئیں۔ یعنی غور فرمائیے کہ بائبلوس میں پیپرس یعنی بائبل کا پیپر یعنی کتاب کا کاغذ تیار ہونے لگا۔ کاغذ پر ابجد لکھنا اس سے کہیں زیادہ آسان تھا کہ بیٹھے لوح و قلم لیے خون دل میں انگلیاں ڈبو رہے ہیں۔ چنانچہ بائبلوس کی انارکلی میں بے شمار ناشرین کی دکانیں کھل گئیں۔

سامی النسل فنیقیوں کے اس رسم الخط کی لگ بھگ ایک ہزار سال قبل مسیح کئی شاخیں ہوگئیں (1) شمالی سامی: (الف) کنعانی جو ابتدائی عبرانی رسم الخط میں تبدیل ہوئی۔ (ب) فنقی جو قرطاجنہ میں بھی رائج ہوئی (جو شمالی افریقہ میں فنقی نوآبادی تھی) شمالی سامی کی دوسری شاخ آرامی کہلائی جس نے عربی، سریانی، ارمنی اور جارجین تحریروں کو جنم دیا۔ لیکن جدید عبرانی کی لتاں حوا کنعانی کے بجائے آرامی تھی۔ (2) جنوبی سامی جو جزیرہ نمائے عرب میں محدود رہی مگر اس کی ایک شاخ نے ایتھوپین رسم الخط کو جنم دیا۔ (3) یونانی۔

یونانی انڈو یورپین زبان ہے اس نے سامی رسم الخط کیسے اختیار کر لیا؟ اس کا قصہ یوں ہے کہ یونانی لوگ فلسفے وغیرہ کے چکر میں پڑنے کا ارادہ کر رہے تھے۔ انھوں نے اپنی بندرگاہوں پر آنے والے فنقی تاجروں سے ان کے نرم و نازک حروفِ تہجی الف بیتھ جیمل، دالیتھ، زین، کاف، لامید، میم، نون، پے ماریش، ح، واؤ، ط وغیرہ مستعار لے کر انھیں لکوتوڑ الفا، بیٹا، ڈیلٹا، گاما وغیرہ بنا لیا۔ چند حروف اپنی طرف سے شامل کیے اور اس طرح ایک انڈو یورپین زبان میں فنقی حروفِ تہجی میں اپنے سامی ناموں سمیت داخل ہوگئے (شروع میں یونانی بھی سامی دستور کے مطابق دائیں سے بائیں طرف لکھی جاتی تھی) فنیقیوں سے لکھا پڑھی سیکھ کر اہلِ یونان اب دنیا کے سمندروں اور بازاروں میں اپنے استادوں کے بھی کان کاٹنے لگے۔ (آج تک یہ بتانا مشکل ہے کہ مشرقِ قریب کے یونانی اور لبنانی تاجروں میں کون زیادہ تیز ہے)۔

آرامی شمالی سامی زبان تھی جس میں کلدانی اور سریانی شامل تھیں۔ حضرت ابراہیمؑ (جو کلدانیہ کے پایہ تخت اُر میں پیدا ہوئے تھے) کی زبان ''عرب اری[31]'' تھی۔ کیونکہ بنی ارم دراصل صحرائے عرب کے باشندے تھے اور چراگاہوں کی تلاش میں ہجرت کر کے وادیٔ دجلہ میں

جا بسے تھے۔ کلدانیہ سے ہجرت کر کے کنعان میں آباد ہونے کے بعد آلِ ابراہیم کی "عرب اری" زبان پر مقامی کنعانی بولی کا اثر پڑا اور اس ابتدائی عرب اری اور کنعانی لسانی اختلاط نے اس قدیم عبرانی کو جنم دیا جس میں تورات صحف انبیا اور بعد میں تلمود (عربی = تلمیذ) اور ترگم (عربی = ترجمہ) یعنی اس کی تفاسیر لکھی گئیں نسبتاً جمہوری سماج انہی ممالک میں پیدا ہوا۔ (فنیقیہ، اسرائیل، یونان و روم) جہاں حروف تہجی کی وجہ سے یہ لکھنے پڑھنے میں آسانی ہوگئی تھی۔ اشور۔ مصر۔ بابل۔ عیلام وغیرہ کے آمریت پرست معاشروں میں "عبوری" طرز تحریر کی وجہ سے تعلیم محدود اور کاتبوں اور کاہنوں کے اجارے میں رہی۔ بعد کی صدیوں میں کاغذ یا چھال پر لکھی جانے والی ترقی پذیر آرامی مصر سے لے کر ایران تک رائج ہوگئی۔

سامی زبانوں میں معبود کے لیے لفظ اِل کا تذکرہ کیا جا چکا ہے۔ یہی اِل ہمیں الہٰ، الوہی، اللہ کی مختلف اشکال میں اور انجیل کے ناموں میں نظر آتا ہے۔ (ہر مغربی نام جو ایل پر ختم ہوتا ہے اسی عبرانی اِل سے مشتق ہے۔ مثلاً ڈینئل (دانی ایل = اللہ میرا منصف ہے) یُوایل (اللہ آقا ہے) ایمونئل (اللہ ہمارے ساتھ ہے) رفائیل (اللہ شافی و کافی ہے) مائیکل (اللہ کی مانند) گیبرئیل (قدرت اللہ) وغیرہ۔ اسی طرح ایلزبتھ خدا کو سونپی ہوئی یعنی اللہ رکھی! اب یاہ و یہہ والے نام لیجیے۔ ایلیاہ (الیاس) یعنی یاہ و یہہ خدا ہے۔ ذکریاہ (خدا نے یاد کیا یا ذکر کیا) اور یاہ (خدا کا شعلہ) میتھو (خدا کا تحفہ) یرمیاہ (خدا کا برگزیدہ)۔ اب ایک اور بے حد عام انگریزی نام JOHN پر آئیے۔ بعل فنیقیوں اور کنعانیوں کا سب سے بڑا دیوتا تھا۔ حنی بعل یعنی بعل کی برکت ایک عام کنعانی نام تھا۔ (ایک مشہور و معروف حنی بعل صاحب وہ تھے جنھوں نے قرطاجنہ سے نکل کر روم پر دھاوا بولا تھا) عبرانیوں نے بعل کے بجائے حنایہ اور یوحنا اپنے نام رکھے یعنی یاہ و یہہ کی برکت۔ یہی یوحنا ہمارے مسٹر جان JOHN حضرت عیسیٰؑ آرامی زبان بولتے تھے۔ آپ نے صلیب پر جانکنی کے عالم میں پکارا۔ "الوہی۔ الوہی۔ لبا۔ لبا۔ مجھے تو نے کیوں چھوڑ دیا۔" اسی ابا یعنی باپ سے بزرگ ترین مسیحی راہب کے لیے انگریزی لفظ ABBOT فرنچ ABBE اور مسیحی خانقاہ کے لیے ABBEY نکلا۔ قدیم عبرانی الفاظ سمع۔ ملکہ۔ ملک۔ کتاب۔ تحت۔ کبیر۔ امت۔

ارض وسما۔ عبد۔ حکمہ۔ خلیل۔ رب۔ کفارہ قربان۔ اربع۔ ظہر۔ نبی۔ سلام وغیرہ عربی میں موجود ہیں اور ہماری اپنی روزمرہ کی بول چال میں شامل ہیں۔ بیت یعنی گھر اَمت شمس وغیرہ قدیم ترین اشوری الفاظ ہیں۔ عبرانی لفظ برک (برکت) لاطینی BENEDICO اور انگریزی BLESS میں منتقل ہو چکا ہے۔ یونانی میں فرشتہ کا تصور نا پید تھا۔ ANGELOS پیغامبر کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ عبرانی ''ملائکہ'' نے لفظ ANGEL کو جنم دیا۔ قدیم میڈین بادشاہوں کے باغات ''فردوس'' کہلاتے تھے۔ یونانیوں نے اسے PARADEISOS بنایا۔ انجیل کے یونانی ترجمے میں یہ لفظ جنت اور ''باغ عدن'' کے لیے استعمال کیا گیا اور انگریزی میں PARADISE بنا۔ خود باغ عدن کا سراغ لگایئے تو معلوم ہوگا کہ جیسے کہ پہلے کہا گیا۔ باب پیدائش وغیرہ کا کچھ حصہ بابل میں لکھا گیا جہاں قدیم اساطیر 32 کا پس منظر موجود تھا۔ بابل سے واپسی کے بعد عربی نے ایک عالمگیر تہذیبی زبان کا درجہ حاصل کیا۔ لیکن ایران میں اس کی وجہ سے ایک نیا لینگویج پرابلم پیدا ہو گیا جو ''عربی فارسی کا جھگڑا'' کہلایا۔

معرکہ نہاوند کے بعد آریہ ایران پر آلِ ابراہیمؑ کی دوسری شاخ یعنی اسمٰعیل یعنی مسلمان عربوں کی بالفاظ دیگر ایک سامی قوم کی حکومت قائم ہوئی۔ 642 عیسوی میں فاروق اعظمؓ کا انتقال ہوا۔ جنگ جمل کے بعد کوفہ دارالخلافہ قرار پایا۔ شیعان علیؓ اور خوارج کے تفرقے پیدا ہوئے۔ 661ء میں ایک خارجی ابن ملجم نے جناب امیرؓ کو شہید کیا۔ 681 عیسوی میں حسینؓ ابن علیؓ نے دشتِ کربلا جامِ شہادت نوش فرمایا۔ رسولؐ اللہ نے اپنے آخری خطبے میں فرمایا تھا: ''یہ تم کو میری آخری نصیحت ہے کہ تم سب آپس میں بھائی بھائی بن کر رہو۔'' اس نصیحت پر عمل کس طرح کیا گیا وہ سب کو معلوم ہے۔

دارالاسلام کے نئے معاشرے میں موالی یعنی غیر عرب مسلمان اور ذمی یعنی غیر مسلم بڑی تعداد میں شامل تھے۔ لیکن حکمراں طبقہ عرب تھا۔ موالی اور عربوں کے درمیان سماجی اور اقتصادی تفاوت بڑھتا گیا اور عرب و عجم کی کشمکش شروع ہوئی۔ اسی وجہ سے شیعہ تحریک نے ایرانی یعنی موالی آبادی میں زیادہ مقبولیت حاصل کی۔ ایران کے زرتشتی جاگیردار طبقے کے بیشتر افراد فتح

اسلام کے بعد مازندران کے پہاڑوں میں جا چھپے تھے۔ رفتہ رفتہ وہ سب مسلمان ہو گئے اور اپنے طبقاتی مفاد کی خاطر عرب حکومت کے وفادار رہے۔ موالی شیعوں نے جن میں زیادہ تر غریب ایرانی عوام شامل تھے ظہور مہدیؑ کا انتظار شروع کیا۔ انواع و اقسام کے نقلی ''مہدیؑ'' سیاسی ہنگاموں کی قیادت کے لیے سامنے آئے۔ خراسان گویا ایران کا بنگال تھا کہ عموماً تشدد پسند تحریکیں یہیں سے شروع ہوتیں۔ بہت جلد ان تحریکوں نے ایرانی قوم پرستی کی شکل اختیار کر لی۔ خلفائے بنو اُمیہ کے بے پناہ مظالم کے خلاف جب ابو مسلم خراسانی نے علم بغاوت بلند کیا تو اس نے (وہی خود کو قصہ رستم کے پہلوان گودرز کیانی کی اولاد بتاتا تھا) یہ کہہ کر امام محمدؒ کے سوگ میں اپنی فوج کی وردی سیاہ بنوائی کہ گودرز نے بے گناہ سیاوش کے غم میں سیاہ پوشی اختیار کی تھی۔ (اس کے بعد دولتِ عباسیہ کا سرکاری لباس بھی سیاہ ہو گیا) ابو مسلم کے ہاتھوں اگست 750 عیسوی میں اموی خلافت کا خاتمہ ہو گیا مگر بدامنی ختم نہ ہوئی۔ برمکی خاندان نے جو قبول اسلام سے قبل بلخ کے آتش کدہ نوبہار کے موبدوں کا گھرانا تھا بغداد میں اقتدار حاصل کیا۔ ساسانی وزیر کا عہدہ مع آداب و رسوم شاہانہ وجود میں آیا۔ امیر المومنین اب ساسانی بادشاہوں کی طرح دربار میں پردے کے پیچھے بیٹھتے تھے! اور انھوں نے اب جی بھر کے بنو اُمیہ پر ظلم توڑے!!

جیسے جیسے عرب مرکز کمزور پڑا ایران میں خود مختار حکومتیں قائم ہونا شروع ہوئیں۔ طاہریہ خاندان کے بانی کو خلیفہ المامون نے 801 عیسوی میں خراساں کا گورنر بنایا تھا۔ انھوں نے موقع پاتے ہی اپنی ریاست قائم کر لی اور 820 عیسوی سے 870 عیسوی تک نیشاپور میں ٹھاٹھ کیے۔ اسی زمانے میں سیستان میں یعقوب بن لیث صفاری نے جو ایک لوہار کا لڑکا تھا طاہری حکمران کو معزول کر کے خراساں پر قبضہ جمایا۔ اسی نے قومی احیا کا باقاعدہ آغاز کیا۔ عربی کے بجائے فارسی سرکاری زبان قرار دی اور نئے فارسی ادب کی سرپرستی کی داغ بیل ڈالی۔ شاہ ایران محمد رضا پہلوی کے جشن تاج گذاری کے موقع پر ایران قدیم و جدید کے متعلق جو بے انتہا نفیس باتصویر کتابیں انگریزی، فرانسیسی اور جرمن وغیرہ میں مغربی اور دوسرے غیر ملکی مہمانوں اور نامہ نگاروں کو پیش کی گئیں ان میں سے ایک میں یعقوب صفاری کے لیے لکھا ہے ''یعقوب بن لیث خصوصیت سے

قابلِ ذکر ہے کیونکہ اس نے خلیفہ وقت سے بغاوت کی اور عباسی سفیر سے کہا۔ جاؤ اور جا کر اپنے آقا سے کہہ دو کہ اگر میں زندہ رہا تو تلوار ہمارے درمیان فیصلہ کرے گی۔ اگر میں جیت گیا تو جو میرے دل میں آئے گا کروں گا۔ اگر تم کامیاب رہے تو روٹی اور پیاز ہی میری قسمت میں لکھے ہیں۔ لیکن تم یا قسمت دونوں ایسے انسان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے جسے روکھی سوکھی روٹی پیاز کھانے کی عادت ہے۔" آگے چل کر اسی کتب میں مرقوم ہے: "گو عرب تسلط کی وجہ سے ایران نے کئی صدیوں کے لیے اپنی آزادی کھودی مگر ایرانی قوم کا جذبہ حریت فاتہ ہوسکا۔ اسلام ایران میں آیا مگر یہاں پہنچ کر پہلے جیسا نہ رہا۔ ایران ایک مسلم ریاست بنا لیکن عرب ریاست نہ بن سکا۔ نئے مذہب سے مطابقت ایرانیوں کے لیے ولولہ انگیز ذہنی تحریک بنی۔ لیکن یہ مطابقت ابتدا ہی سے پیدا ہوئی جب اہلِ ایران نے اپنا رشتہ وفا البیت رسول ﷺ یعنی جناب زہراؑ اور ان کے شوہر حضرت علیؓ (جو رسولؐ اللہ کے کزن بھی تھے) سے استوار کیا اور شیعیت کی بنیاد اسی وفاداری پر قائم ہے جو عربوں کے سُنی عقائد سے مختلف ہے۔ دراصل ایران میں شیعیت نے اسلام کے استقلال کے ساتھ ہی ساتھ عرب روحانی تسلط کا قیام ناممکن بنانے کا دوہرا فریضہ انجام دیا۔ سیاسی لحاظ سے گو ایرانی اب محکوم تھے لیکن بہت جلد ان کو حکومت میں شامل کرلیا گیا کیونکہ عرب امورِ مملکت سے بالکل نابلد اور انتظامی معاملات میں ناتجربہ کار تھے اور ملکی امور کے سلسلے میں ایرانیوں ہی کے دستِ نگر تھے۔ چنانچہ روایت ہے کہ خلیفہ سلیمان نے کہا: ایرانیوں نے ایک ہزار سال تک ساری دنیا پر حکومت کی لیکن دوسری اقوام کے تعاون کے محتاج نہ رہے۔ افسوس کہ ہمیں روزانہ امورِ سلطنت میں ایرانیوں کے مشوروں اور تعاون کی حاجت رہتی ہے، عربوں نے ساسانی طرزِ حکومت کو تبدیل نہیں کیا۔ عرصے تک پہلوی رسم الخط سرکاری کاروبار کے لیے استعمال کیا گیا اور آخری ساسانی بادشاہ یزدگرد سوئم کے سکے بھی ٹکسال میں ڈھالے جاتے رہے۔ بعد میں عربی الفاظ فارسی میں داخل ہوئے جس طرح المانوی زبانوں میں یونانی اور لاطینی الفاظ شامل ہوگئے تھے۔ لسانی لحاظ سے عرب سلطنت میں جو بحرِ ہند سے بحر اطلانتک تک پھیلی تھی ایران ہی واحد ملک تھا جس نے اپنی قومی زبان برقرار رکھی۔ ورنہ باقی سارے ممالک میں عرب تسلط کے بعد وہاں کی مقامی زبانیں فنا

ہوگئیں۔ لیکن ایران میں جو عربی الفاظ فارسی میں داخل ہوئے ہیں ان کے تلفظ اور معنی مختلف ہوگئے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ عرب تسلط کے صرف دو سو برس بعد ایران میں وہ حیرت انگیز تہذیبی گہما گہمی اور ادب، فلسفہ، آرٹ، سائنس اور کلچر کا وہ فروغ ہوا جو بہت صدیوں بعد اٹلی اور یورپ کے نشاۃ ثانیہ میں ظہور میں آیا۔ گو درجنوں ایرانی دانشوروں نے عربی میں لکھا جو سرکاری ''انٹلکچوئیل'' زبان تھی مگر آج جسے اسلامی تہذیب کہا جاتا ہے اور وہ درحقیقت ایرانی تہذیب ہی ہے۔ ابن سینا، رازی، فارابی، خیام، طوسی وغیرہ وغیرہ سب ایرانی تھے[33]۔

اس طویل اقتباس کے بعد زندہ رود یعنی وقت کی بھی سن لیجیے کیا کہتا ہے:

بعد مدت چشم خود برخود کشاد — لیکن اندر حلقہ دامے فتاد
کشتۂ ناز بتان شوخ و شنگ — خالق تہذیب و تقلید فرنگ
کارآں وارفتہ ملک و نسب — ذکر شاپور و تحقیر عرب!
باوطن پیوست داز خرد درگذشت — دل بہ رُستم وادواز حیدرؓ گذشت
پیریٔ ایراں نہ مانِ یزد جرد — چہرہ اوبے فروغ از خون سرد
موج مے درشیشہ تاکش نبود — یک شرر در تو دہ خاکش بنود
تاز صحرائے رسیدش محشرے — آنکہ واد اور احیات دیگرے
ایں چنین ازحشر ازعنایات خدااست — پارس باقی! رومتہ الکبریٰ کجاست؟
آنکہ رفت از پیکر او جانِ پاک — بے قیامت برنمی آید زخاک
مردِ صحرائی بایراں جاں دمید — باز سوئے ریگ زار خود رمید
کہنہ را از لوح ما بُسترد و رفت — برگ و ساز عصر نو آورد و رفت!

آہ احسانِ عرب نشنا ختنہ
زآتش افرنگیاں بگدا ختند![34]

زندہ رود کے ہمراہ پھر یعقوب صفاری کے ہاں واپس چلیے جس کی اولاد 902ء تک ہی حکمرانی کرسکی اور اس کی جگہ ترمز کے ساسان نے لے لی جنھوں نے خراساں اور ماورالنہر کے

علاقے صفاریوں سے چھین کر 874 سے 999 عیسوی تک بڑی دھوم دھام سے حکومت کی اور بخارا پر اپنا پایہ تخت بنایا۔ دوسری طرف زیاری خاندان 932 سے 1042 عیسوی تک طبرستان (موجودہ مازندران) میں اپنا ڈنکا بجواتا رہا۔ بحیرہ کیسپین کے قریبی علاقے میں دیلمی خاندان نے اپنی آزادی کا اعلان کر دیا۔ ان لوگوں نے جو آلِ بویہ کہلائے 932 سے 1055 عیسوی تک وسطی اور مغربی ایران کو اپنے زیرِ نگیں رکھا اور ان کا اقتدار اتنا بڑھا کہ 945 عیسوی تک میں انھوں نے عین بغداد پر اپنا تسلط جما لیا اور عباسی خلیفہ وقت کو پنشن دینے لگے۔

ان ساری ایرانی ریاستوں کے بانی قدیم ارسٹوکریسی سے تعلق رکھتے تھے اور سب مارے قوم پرستی کے اپنا رشتہ قدیم شاہانِ عجم سے ملاتے تھے۔ ابومسلم خراسانی نے خود کو گودرز کیانی کی اولاد بتایا اور اسے نوشیرواں عادل کے شہرۂ آفاق وزیر حکیم بزرجمہر کے اخلاف سے بھی منسلک کیا گیا۔ ساسان نے بہرام چوبیں اور زیاری حکمرانوں نے انوشیروان عادل سے اپنے اپنے شجرے ملائے اور یہ سب شاہی گھرانے آپس میں ایک دوسرے سے لڑتے بھڑتے رہے۔

ان خاندانی ریاستوں کی خانہ جنگیوں کے ساتھ ساتھ سیاسی اور مذہبی شورشیں بھی جاری تھیں جو سب ابومسلم خراسانی کی تحریک کی آل اولاد تھیں۔ معاشی اور سیاسی بے اطمینانی نے حسبِ معمول مزدکی اور انتہا پسند شیعہ یا خارجی احتجاج کا جامہ پہنا۔ 749 عیسوی میں نیشاپور میں بہہ آفرید نے سر اٹھایا تھا۔ یہ صاحب اپنے آپ کو اصلاح پسند زرتشتی پیغمبر بتلاتے تھے خود زرتشتی موبدوں کے کہنے پر نئی عباسی حکومت نے ان کا اور ان کے پیرووٗں کا قصہ پاک کیا۔ ابومسلم کے مرنے کے بعد اس کے انتہا پسند پیرووٗں نے کسان بغاوتوں کی قیادت کی اور دعویٰ کیا کہ ابومسلم بھی امام مہدی القائم ال منتظرؑ کی طرح روپوش ہے۔ 755 عیسوی میں ابومسلم کے ایک ساتھی سالار فیروز یا سن باد نے جو غالباً خود بھی مزدکی تھا۔ ہنگامہ کھڑا کیا۔ مغربی ایران کے کسان اور زرتشتی منافع اور مسلمان بدعتی اپنے جھنڈے تلے جمع کر لیے اور متعدد شہروں میں گویا اپنی آزاد سرکار قائم کی۔ اُن کی خلیفہ منصور کی افواج نے سرکوبی کی۔ پھر ''اسحٰق ترک'' کی باری آئی جن کو ابومسلم نے اپنے عقائد کی تبلیغ کے لیے ترکستان بھیجا تھا۔ 758 عیسوی میں ان کی بغاوت فرو کی

گئی۔اس کے بعد مقنع صاحب اپنا سنہرا بیچا پہنے تشریف لائے۔ مرو کے باشندے تھے۔آپ نے حلول کے عقیدے کا پرچار کیا اور سالار فیروز کی مانند اعلان کردیا کہ ابو مسلم دراصل خدا تھا۔ المقنع کی عوامی تحریک خراساں اور ماوراالنہر میں پھیل گئی اور بڑی ہلچل مچی۔ مقنع ذات کے دھوبی تھے مگر کس قدر حیرت انگیز شخصیت تھی کہ آج تک لوگوں کو نہیں بھولے۔ ملاؤں کا مذاق اڑانے کے لیے اس نے شہر نخشب کے پاس ایک کنویں میں ایک طاس پارے سے بھر کر رکھوایا اور انعکاس شعاع قمر کا ایسا عمل کیا کہ وہ چاند آسمان پر نظر آنے لگا۔ کمال ہے بھئی۔ (طامس مور کی مشہور ''لالہ رُخ'' میں ''خراساں کا نقاب پوش پیغمبر'' موصوف ہی ہیں)۔ بہر حال زابلستان بخارا وغیرہ میں اس کے بے شمار مرید ہو گئے۔ اہل ترکستان نے مقنع کا ساتھ دیا۔ سب نے مل کر خوب لوٹ مار مچائی اور کوہستانی قلعوں پر قبضہ کیا۔ مقنع سرکاری افواج کا مستقل مقابلہ کرتا رہا۔ بالآخر جب قلعہ کش کا محاصرہ ہوا ہے تو مقنع کو ہار ماننا پڑی۔ پھر بھی اس کی ٹیس نہیں گئی۔ اپنے بی بی بچوں کو زہر پلا کر خود مع رفقا کے چتا میں کود گیا۔ مقنع اپنے زمانے کا بڑا زبردست انقلابی اور ANTI-ESTABLISHMENT لیڈر تھا جس کے رول کو دورِ حاضرہ کے بمصر زیادہ بہتر طریقے سے سمجھ سکتے ہیں۔

مقنع کی تحریک 775 سے 779 عیسوی تک جاری رہی۔ پھر بابک خرمی کا ہنگامہ کھڑا ہوا۔ بابک بھی ایک سنسنی خیز بدعتی لیڈر تھا اور مجوسیوں کے اس فرقے سے تعلق رکھتا تھا جو تناسخ ارواح اور NIHILISM کے قائل تھے۔816 عیسوی میں اس نے آذربائیجان کے علاقے میں ایک بے حد منظم کسان بغاوت شروع کروائی۔ یہ بغاوت جنوبی مغربی ایران، آرمینیہ اور شمالی صوبوں میں پھیلی اور دہقان یعنی پرانے زمیندار طبقے نے بھی اس کا ساتھ دیا کیونکہ زیادہ تر دہقان اپنا پرانا طمطراق کھونے کے بعد معمولی کاشت کار رہ گئے تھے۔ سات برس میں مسلح بابکی گروہوں نے خلیفہ المامون کے چار جنرلوں کو شکست دی۔ بازنطیم سے بھی سازباز کی۔ لیکن خلیفہ معتصم کے زمانے میں انھیں تہ تیغ کردیا گیا۔ چند برس بعد فلسطین میں نقاب پوش مبرقع صاحب نمودار ہوئے۔ جو ایک اموی کی حیثیت سے عباسیوں سے انتقام لینے کی فکر میں تھے۔ انھوں نے بھی بے شمار مرید جمع کر لیے۔ خلیفہ واثق نے اُن کو قید کروایا۔ سب سے زیادہ اہم سیاسی ہنگامہ حبشی

غلاموں کا تھا جو کانوں، بحری بیڑوں اور کھیتوں پر کام کر رہے تھے اور مسلمانوں کے نئے سرمایہ دار طبقے کی اہم ملکیت تھے۔ بصرے میں ہزار ہا بدحال زنگی غلام نمک نکالنے اور ساحلی دلدلیں خشک کرنے کی جان لیوا محنت میں لگے ہوئے تھے۔ ان کی حالت بے حد دگرگوں تھی۔ ان کو بھی دسمبر 866 عیسوی میں علیؓ بن محمد نامی ایک ایرانی ہی نے باقاعدہ منظم کیا۔ اور پرولتاری بغاوت شروع ہوگئی۔ سرکاری فوج جوان کی گوشمالی کے لیے بھیجی گئی۔ اس کے حبشی سپاہی اپنے بھائی بندوں سے جاملے۔ کسانوں نے بھی حبشیوں کا ساتھ دیا۔ (علیؓ بن محمد کے دو نائبوں میں سے ایک آٹا پیسنے والا اور ایک شربت فروش تھا) باغی حبشیوں نے سرکاری لشکر کے چھکے چھڑا دیے۔ جنوبی مغربی ایران پر یلغار کی۔ بصرے پر حملہ کیا اور 859 عیسوی میں وہ بغداد سے سترہ میل کے فاصلے پر پہنچ چکے تھے۔ فروری 881 عیسوی میں بالآخر حکومت عباسیہ کا پلّہ بھاری رہا اور زنگیوں کو پسپا ہونا پڑا۔ علیؓ بن محمد نے معافی چاہنے اور سرکاری پنشن لے کر سیاست سے دست بردار ہو جانے کی پیش کش مسترد کر دی اور نومبر 883 عیسوی میں نوک علم پر اس کا سر بغداد لایا گیا۔ کوئی منظم پروگرام اور واضح مقاصد سامنے نہ رکھنے کی وجہ سے جمہوری انقلاب آج بھی بری طرح ناکام رہتے ہیں۔ تو اس وقت بھلا کیا ہو پاتا۔ زنگیوں کے بعد بڑا بھاری فتنہ اسمٰعیلیوں اور قرامطیوں کا تھا۔ جس نے سارا معاشرہ تہہ و بالا کر کے رکھ دیا۔ عالمِ اسلام میں اب ان گنت مذہبی فرقے پیدا ہو چکے تھے اور قتل و غارت کا بازار گرم تھا۔

لیکن ایران کی خاندانی ریاستوں کو جو ایک دوسرے سے لڑنے بھڑنے میں اور ان سیاسی اور مذہبی ہنگاموں کا سامنا کرنے میں مصروف تھیں جلد ہی ایک نئے غنیم یعنی اپنے پرانے دشمن تورانیوں کا مقابلہ کرنا پڑا جو اب غزنویوں اور ان کے بعد سلجوقیوں کے روپ میں سرحد پر نمودار ہو رہے تھے۔

پیدائش مسیح سے قبل کے ایک ہزار سال میں وسط ایشیا اور جنوبی روس کی چراگاہوں پر سیتھین غالب رہے تھے۔ پہلی پانچ عیسوی صدیوں میں ہُن اقوام کا ہنگامہ رہا۔ ان لوگوں نے کشان اور گپتا[35] سلطنتوں کا شیرازہ بکھیرا۔ پھر ایک طرف چین اور دوسری طرف یورپ میں آفت جوتی اور ہالی ووڈ پہنچ کر ''اٹلا دی ہن'' نامی رنگین فلم بنوایا۔ ہن حضرات سمرقند و بخارا و

سغد یہ کے نخلستانوں سے اٹھے تھے اور ساری متمدن دنیا پر اس طرح چھائے کہ ان کا نام خونخوار کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ چھٹی صدی عیسوی میں ترک سامنے آئے۔ دراصل وسط ایشیا میں ایرانی النسل اور ترک التائی نسلیں کافی گڈمڈ تھیں۔ یہ سارے خانہ بدوش جنگجو قبائل ایرانی اور التائی اور یورالی زبانیں بولتے تھے۔ رفتہ رفتہ ترک باقی سب پر غالب آتے گئے۔ انھوں نے چین کی شمالی سرحد سے لے کر بحیرۂ اسود تک اپنی دھاک بٹھادی۔ بتدریج آسمان پرستی، شامانیت، بدھ مت اور عیسائیت اختیار کی۔ آغازِ خلافت کے وقت ایران سے اوپر یہ ترک اقوام اناطولیہ سے لے کر منگولیا تک پھیلی ہوئی تھیں۔ ان کا سب سے طاقتور سردار خان کاشغر تھا۔ وسط ایشیا پر اسلامی تسلط کے بعد ان لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ ایرانیوں کا اثر کم کرنے کے لیے خلیفہ منصور نے ترکمان سخت کوش کو فوج میں بھرتی کیا اور اسلامی معاشرے میں بقول پروفیسر مجیب [36] ترکوں کی وہی حیثیت ہوگئی جو ہندوستان میں کھشتریوں یعنی راجپوتوں کی تھی۔ خلافت کا شیرازہ سرعت سے منتشر ہو رہا تھا۔ اس وقت سیاسی فوقیت حاصل کرنے کی جدوجہد میں ایرانیوں کو ان ہی اہلِ سیف تورانیوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ ایڈمنسٹریشن اور علم و ادب کا میدان ایرانیوں کے ہاتھ میں تھا۔ بالآخر اہلِ سیف اہلِ قلم پر غالب آئے۔

الپتگین ایک ترکستانی غلام تھا جسے خاندان سامانیہ کی طرف سے خراساں کا گورنر مقرر کیا گیا تھا۔ سامانی امیروں کے تنزل سے فائدہ اُٹھا کر اس نے 960 عیسوی میں غزنی میں اپنی حکومت قائم کرلی اور اپنے غلام سبکتگین کو جو اس کا داماد بھی تھا وہاں کا فرماں روا بنا دیا۔ سبکتگین کے بیٹے محمود نے سامانیہ، زیاریوں، ویلمیوں وغیرہ سب کو راستے سے ہٹایا اور سارے ملک پر چھا گیا۔ ہندوستان کا رُخ کیا اور اس کے ذریعے فارسی زبان و تہذیب پنجاب [37] پہنچی۔

چنانچہ اب اسلامی سیاست و تمدن میں تین نسلی اور لسانی عناصر ایک دوسرے کے خلاف جنگ و جدال میں مشغول تھے۔ عرب ایرانی اور ترک! اور بعل نغمہ سرا تھا۔

در جہاں باز آمد ایام طرب ‌‌ ‌‌ ‌‌ عربی ہزیمت خورد از ملک و نسب [38]

عجمی شہنشاہیت کا رعب دلوں پر اس قدر طاری تھا اور اپنے آپ کو تاجداران فارس کی

اولاد ظاہر کرنے کی ہوا ایسی چلی تھی کہ بقول فرشتہ محمود بھی خود کو آل ساسان میں سے سمجھتا تھا۔ مصنف منہاج السراج کے حوالے سے فرشتہ لکھتا ہے کہ جب یزدگرد سوئم مرو میں ہلاک کیا گیا ہے اس کے تابعین اور اولاد ترکستان فرار ہوئی اور وہاں ترکوں سے شادیاں کیں۔ چنانچہ "سبکتگین بن جوقان بن قرا الحکم بن قزل ارسلان بن قرا نامان بن فیروز بن یزدگرد۔ (شہزادہ فیروز کے بارے میں یہ روایت بھی ہے کہ وہ بھاگ کر چین چلا گیا تھا) محمود بہرحال تاریخ اسلام کا پہلا فرماں روا ہے جس نے سلطان کا لقب اختیار کیا۔ اور نئی شہنشاہی کی بنیاد ڈالی۔ اور اس کے دربار کے چار سو شعرا میں سے اکثر نے بادشاہوں کے مضمون پر طبع آزمائی کی۔ اسدی نے کرشاسپ نامہ اور فردوسی نے شاہنامہ لکھا۔

شاہنامہ فردوسی کے پس منظر میں ایران قدیم کی نیم اسطوری لسانی اور مذہبی تاریخ پنہاں ہے۔ اس لیے ہم ایک بار پھر ماضی کی سیر کے لیے روانہ ہوتے ہیں۔

قدیم ترین ابتدائی انڈو یورپین زبان کی بیٹی وہ آرین یا انڈیا و ایرانی تھی جس کی دو شاخیں امادی اور ہخامنشی کہلائیں۔ ان دونوں کی تیسری بہن ویدک سنسکرت تھی۔ اس وقت متمدن دنیا میں سومیری اور اکاڈی رائج تھیں۔ ایران میں آریہ قبائل یعنی مادیوں اور پارسیوں کی آمد سے قبل عیلام میں یہی سامی زبانیں مستعمل تھیں۔ ہخامنشی سلطنت میں آرامی سرکاری زبان بن گئی۔ قدیم ہخامنشی کتبات ہمیں بیک وقت عیلامی اکادی، قدیم فارسی اور آرامی[39] میں لکھے ملتے ہیں۔ مادا کے مجوسی پروہتوں نے دین زرتشت کی تعلیمات کو گاتھا (سنسکرت گیتا) کے عنوان سے منظوم کیا اور اپنے مذہبی قوانین کو قلم بند کر کے اس مجموعے کا نام بشتہار رکھا۔ کچھ عرصے بعد گاتھا اور بشتہا کو ملا کر اوستا کہا جانے لگا (اوستا میں مجوسی پروہت کے لیے لفظ آذروان استعمال کیا گیا ہے)۔ اوستا کے ایک اشلوک اور اس کے سنسکرت ترجمے کی مماثلت ملاحظہ ہو۔ اوستا: تم امہ وتم یزتم سپنورم دام ہو۔ سوشتم مہترم یزائے زوتر۔

سنسکرت: تم امہ وتم بجتم سورم دھام سو۔ سوشتم ہترم یجائے ہوتر[40]۔ سلوکی دور میں یونانی رائج ہوئی۔ اشکانی عہد میں رستم وغیرہ پارتھین پہلوانوں کی داستانیں مقبول ہوئیں۔ ایرانی زبان

آسان ہوتی گئی۔ پہلوانوں کی یہ زبان یعنی پہلوی ہخامنشی فارسی سے بہت مشابہہ تھی۔ ساسان شاہی میں اسے مزید ترقی حاصل ہوئی۔ عربی الفاظ میں ساسانی پہلوی میں داخل ہوئے۔ یہ ایرانی تجدیدیت تھا۔ لہٰذا قومی روایات، اساطیر اور دین زرتشت کی باقاعدہ تشکیل کی گئی۔ مجوسی مصنفین اوستا میں قدیم انڈو ایرانی دیومالا شامل کر چکے تھے۔ چنانچہ وید میں منو اور یم دوشوت (سورج) کے توام بیٹے ہیں منو آریہ نسل کا باپ اور قانون ساز ہے۔ اوستا میں یم دونگت کا لڑکا ہے جسے خدا پیغمبری عطا کرتا ہے مگر وہ مارے انکسار کے قبول نہیں کرتا بعد میں زرتشت قبول کر لیتے ہیں۔ جس طرح منو ہندی نوحؑ ہیں یم ایران میں یہی رول ادا کرتا ہے۔ طوفان سے قبل وہ اھورمزدہ کے حکم سے ایک زیر زمین محل تیار کرتا ہے۔ یہی یم جمشید ہے۔ [یم اور خشیت (بادشاہ کا مرکب = جمشید]۔ ہندو دیومالا میں ایک صاحب ترےتن نے راکھشوں کو زیر کیا تھا۔ یہی بزرگ اوستا میں ترائے تاؤنا کے نام سے موجود ہیں۔ آپ نے دھاک نامی اژدھے[41] کا کام تمام کیا۔ ہندستانی سوم رس کا رکھوالا گندھرو اوستا میں گندریپ دیو ہے جسے کیرساسپا قتل کرتا ہے۔ کیرساسپا ایک نہایت کروک قسم کی پیریکا یعنی پری کے دام میں پھنس جاتے ہیں جو دراصل اہرمن کی ایجنٹ ہے۔ (بعد میں شاہنامے میں یہ سب خواتین و حضرات نئے تلفظ والے ناموں کے ساتھ نمودار ہوتے ہیں۔ ترتیا جس نے دھاک مارا فریدوں بن جاتا ہے جس نے ضحاک کا قصہ پاک کیا۔ ترتیا کے تین لڑکے سیریما، تورا اور آریو، سلم تور اور ایرج بن جاتے ہیں۔ کیرساسپا اور نریمانو وغیرہ گرشاسپ اور نریمان میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ منوش چھتر منوچہر کا روپ دھارتا ہے۔ ہاؤشینگھا اور تخمہ اروپا ہوشنگ اور طہمورس کا بھیس بدلتے ہیں۔ تین سر والا بھیانک اژدہا یعنی اژی دھاک اہرمن نے خاص طور پر ایرانی قوم کو ستانے کے لیے پیدا کیا تھا۔ اس کی دو حسین بیویاں شہری ناز اور ارنواز تھیں۔ شاہنامے میں ضحاک جشید کی بہنوں شہرناز اور ارنواز سے بیاہ رچاتا ہے اور فریدوں اس کا کچومر نکال کر اسے کوہ دماوند[42] قید کر دیتا ہے۔

لیکن ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ ایک ہی آریائی لفظ ہندوستان اور ایران میں دو مختلف

معنوں میں استعمال ہونے لگا۔ ساری انڈو یورپین زبانوں میں ''دیو'' یا اس کے ہم شکل الفاظ خدا کے لیے مستعمل ہیں۔ ایران میں دیو عفریت بن گیا۔'' وید کا اندرا وستا میں انگر یا اہرمن ہے۔ یم ہند میں موت کا دیوتا ہے۔ اوستا میں یہ زندگی کی نمو بنا یعنی یم یا جم جس سے ہم ابھی ابھی جمشید کے روپ میں متعارف ہو چکے ہیں۔

اوستا مجوسیوں کی مادری زبان میڈین یا مادی میں لکھی گئی تھی۔ اشکانی اور ساسانی زبانوں میں جب قدیم ہخامنشی فارسی کو آسان بنایا جارہا تھا اور وہ مڈل پرشین یعنی پہلوی میں تبدیل ہورہی تھی اس وقت بھی موبدوں نے تندہی سے اوستا کی زبان کی حفاظت کی تاکہ مذہب پر ان کی اجارہ داری باقی رہ سکے۔ شاہان ساسانیہ نے دین زرتشت کی ترویج و ترقی کا بیڑہ اُٹھایا اور عوام کی تربیت کے لیے اوستا کی تفسیر لکھی گئی جو ژند کہلائی۔ جس طرح گاتھا اور یشتہا کو ملا کر اوستا تیار ہوئی تھی اسی طرح اوستا اور اس کی تفسیر کا مجموعہ ژند اوستا اور اس کے قاری ژندیک کہلائے (جسے عربوں نے زندیق کرلیا) سیلوکی اور پارتھین ادوار میں اوستا کے ذریعے قدیم انڈو ایرانی ہخامنشی سُورماؤں کو زندہ رکھا گیا۔ ساسانی قوم پرستی کے زیرِ اثر یہ اسطوری کردار تاریخی مشاہیر سمجھے جانے لگے۔ اسی اسطوری چوکھٹے میں پارتھین رزمیہ داستانیں، تاریخی واقعات یعنی اشوری حاکموں کے مظالم، تورانی حملے، یونان وروم و بازنطیم سے معرکہ آرائیاں، ڈرامائی انداز سے شامل ہوگئیں۔ مجوسیوں نے اسرائیلی کاہنوں اور ہندستانی برہمنوں کی مانند اپنی پیشہ ورانہ اہمیت تاریخ کے نشیب و فراز کے باوجود بڑی شد و مد کے ساتھ برقرار رکھی تھی۔ انھوں نے اپنی قدیم زبان مادی اور رسوم و رواج باقی رکھ کر اپنے طبقے کو بیرونی تبدیلیوں سے بچائے رکھا[43]۔ مجوسیوں کے نزدیک ضحاک اور افراسیاب کی مانند سکندر بھی اہرمن کا خاص چیلا تھا۔ جس کے حملے کے بعد بہت عرصے کے لیے ان کی طاقت ختم ہوگئی۔ پارتھین دور میں بھی ان کی پہلی سی اہمیت نہ تھی کیونکہ اشکانی گو آتش و آفتاب پرست تھے مگر وہ یونانی بابلی سبھی دیوی دیوتاؤں کے قائل ہوگئے تھے۔ ساسانی ایران میں مجوسیوں کو ایک بار پھر اپنا کھویا ہوا وقار اور رعب داب واپس ملا۔ زمانہ قدیم سے ان کے اہم مراکز رے، شیز اور بلخ تھے۔ (ہم دیکھ چکے ہیں کہ دورِ عباسیہ میں آل برامکہ نے

جو پہلے بلخ کے موبد تھے ایک دوسرے روپ میں اقتدار حاصل کیا۔) شیز آذربائیجان کی جنوبی سرحد پر واقع تھا یہاں کے آتش کدے کی زیارت کے لیے (جس کے متعلق مشہور تھا کہ خود زرتشت نے قائم کیا تھا) شاہان ایران پیدل جایا کرتے تھے۔

کہا جاتا ہے کہ اوستا کا اصل نسخہ جو پری پولس کے دبیر خانے میں محفوظ تھا سکندر کی لگوائی ہوئی آگ میں محل کے ساتھ جل کر راکھ ہو گیا تھا۔ اوّلیں ساسانی حکمراں اردشیر کو از سرِ نو مرتب کروایا۔ شاہ پور دوئم کے موبد آزرباد مارسپنداں نے صحیفے کی نئی انداز سے پہلوی میں ترتیب کی اور یہ خوردہ اوستا کہلایا۔ اس کتاب میں اوقات پنجگانہ اور کشتی اور تن درستی کی دعائیں درج ہیں[44] (کشتی بستن یعنی کمر کے گرد مقدس دھاگہ باندھنے کی آریائی رسم ہندوؤں کے ہاں جنیؤ کے نام سے مروّج تھی) اسی کشتی کی رعایت سے پہلواؤں کا کشتی گرفتن نکلا یعنی پہلوان اس دھاگے کی مانند ایک دوسرے کی کمر کے گرد ہاتھ ڈالتے تھے۔ (ذرا غور فرمائیے کہ کشتی لڑنے کا محاورہ کہاں سے آیا ہے!) خوردہ اوستا عیسائی مشنریوں کے اثر سے عوام کو بچانے کے لیے لکھی گئی تھی جو انطاکیہ اور آرمینیہ سے ایران پہنچ چکے تھے اسی طرح ردِّ مزدکیت کے طور پر اوستا میں مزید اضافے کروائے گئے۔ ساسانی عہد کے آخری دنوں میں ژند اوستا کی تفسیر پاژند کے نام سے قلم بند کی گئی یہ ساری کتابیں مذہب کی اشاعت کی غرض سے مروّجہ پہلوی میں ترجمہ کی گئی تھیں۔ سنسکرت، قدیم مادی یعنی اوستا کی زبان، ہخامنشی فارسی یعنی اولڈ پرشین۔ پہلوی یعنی مڈل پرشین اور فارسی جدید کے چند الفاظ سے زبان کے ارتقا کا اندازہ ہوتا ہے۔ سنسکرت کا اسور امیدہ، مادی کا اھور مزدہ جدید فارسی کا ہرمزد یا ہرمز ہے۔ سنسکرت کا سوادھاتا مادی کا خاداتا جدید فارسی میں خدا ہے۔ سنسکرت کا کیشا، مادی کا گیسا فارسی جدید میں گیسو بنا۔ پاتیا خش یعنی نائب حکمراں سے غالباً "پادشاہ" نکلا دری یعنی سونا زرین گیا لیکن دری سے گھڑا ہوا سکہ درہم اسی صورت میں باقی رہا۔

اب ہمارے پرانے اور عزیز دوست دارائے اعظم کا نقشِ رستم والا ایک کتبہ ہخامنشی فارسی میں ملاحظہ فرمائیے:

ژات ی	داری وش	خشاے ژ ی	وشنا اُرم زُداہا
کہتا ہے	داریوش	شاہ	خواہش اھورمزدہ
امِا	دھائی ار	ث ی ا	آدم
یہ	بہت سے دیہہ	کہ	میں
آگ زب ای م	(دیہہ بمعنی شہر) اُپ ت رَم	دربدج ا	پارس
گرب یعنی پکڑے	پَرے ذُور	از	پارس

ژات داریوش خشاے ژی دشنا اھورمزدہ امادھاوَ تا آدم اگر یہ ایم اپترم مچہ پارس—

کہتا ہے داریوش شاہ۔ بخواہش اھورمزدہ یہ بہت سے شہر کہ میں نے پارس سے دور حاصل کیے۔45

اب پہلوی ایک عبارت اس کا جدید فارسی ترجمہ دیکھئے:

پہلوی: -او ہرمزد پنخو دات کو سپیتماں زرتو خشت ماہ فرور دین روچ می ہرودت گان می گیہانیکاں دات ہم۔

فارسی جدید: - ہرمزد پانچ داد کہ سپیتماں زردشت ماہ فرور دیں روز خورداد جان جہانیاں وادم46

ساسانی عہد میں ہخامنشی فارسی اسی حد تک متروک ہو چکی تھی جیسے آج ہم چاسر یا ولی دکنی کی زبان استعمال نہیں کرتے۔ مذہبی کتابوں کے پہلوی تراجم نے مروجہ نئی زبان کی ترقی میں بہت مدد کی۔ الہامی صحف کا تصور یہودی اور مسیحی اناجیل کی مقبولیت کی وجہ سے ہر جگہ واضح ہو چکا تھا۔ ممکن ہے اس نے بھی ساسانی حکمرانوں کو اپنا باضابطہ مذہبی ادب مرتب کروانے کی ترغیب دلائی ہو۔ شاہ بہرام ودیم (276-296 عیسوی) نے مسیحیت کے نئے میلان کو سختی سے کچل کر جارحانہ زرتشتیت کو فروغ دیا۔ ساری سلطنت میں ''چہار طاق'' یعنی چھوٹی چھوٹی چوکور عمارتیں تعمیر ہوئیں جن کے اندر آتش بہرام روشن کی گئی۔ اس شہنشاہ کے بے حد طاقت ور و متعصب موبد

موبدان یعنی چیف اگنی ہوتری کی لکھوائی ہوئی پہلوی عبارتوں میں جو پری پولس کے قریب نقش رستم اور کعبہ زرتشت وغیرہ کی دیواروں پر موجود ہیں بتلایا گیا ہے کہ آتش بہرام ایران سے باہر سلطنت کے کون کون سے ممالک ہیں روشن کی گئی۔ کعبہ زرتشت کی تحریر کی دسویں سطر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس موبد موبدان کے حکم سے سلطنت میں بسنے والے ''یہودی وساماں[47] و براماں[48] ولصرے[49] وکرستیاں ازندیک[50] پر حملے کیے گئے اور اُن کے معبدوں کو مسمار کر دیا گیا[51]۔ مذہبی کتب کے علاوہ پہلوی میں دوسرے مضامین پر بھی طبع آزمائی ہوئی۔ یونانی کتابوں کے ترجمے کیے گئے۔ انوشیرواں عادل کے دربار میں یونانی حکما کا اجتماع اور سنسکرت کتابوں خصوصاً پنچ تنتر وغیرہ کے پہلوی میں تراجم مشہور روایات ہیں جن کو دہرانا لاحاصل ہے لیکن زیادہ زور بادشاہوں کے نسب ناموں اور نیم استوری تواریخ پر تھا۔ ساسانی دوبار اور صوبائی حکومتوں میں نکھرتی ہوئی فارسی رائج تھی پہلوی رسم الخط میں لکھی جاتی تھی۔

عہد عباسیہ کے فارس میں تین زبانیں موجود رہیں۔ عربی جو سرکاری اور علمی زبان تھی۔ پہلوی جس میں زرتشتی صحف محفوظ تھے اور جو اب عوام کی سمجھ سے بالاتر ہو چکی تھی اور جدید فارسی جو عربی الفاظ کی شمولیت کی وجہ سے زیادہ مالا مال اور شستہ ہوتی جا رہی تھی اور پہلوی سے مختلف ہو چکی تھی۔ باقی سارے ایران میں مقامی بولیاں رائج تھیں۔ نویں اور دسویں صدی عیسوی میں زرتشتی سماج میں بھی ادبی سرگرمیاں شروع ہوئیں۔ یہ نئی ذہن پرستی اور آزاد خیالی کا دور تھا۔ ہر طرف اسلام کے مختلف فرقوں کے دانشور فلسفیانہ مباحثوں اور مناظروں میں مصروف تھے۔ زرتشتیوں نے بھی جو اب سیاسی طاقت بالکل کھو چکے تھے۔ تحریر کے ذریعے مذہبی مدافعت کی کوشش کی۔ اس کے علاابن امندیم جن پہلوی کتابوں کے عربی تراجم کا ذکر کرتا ہے ان میں غیر مذہبی تراجم کا ذکر کرتا ہے ان میں غیر مذہبی مضامین بھی شامل ہیں۔ ساسان شاہی میں لکھنا پڑھنا بہر حال انہی موبدوں ' ا اگنی ہوتریوں تک محدود تھا اور یوں بھی تحریر کے بجائے اب تک زبانی روایت کی اہمیت زیادہ تھی۔ عربوں کی لائی ہوئی نئی اور روشن علمی فضا سے زرتشتی بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ایک مرتبہ اس سے بہت قبل ان کو اناجیل کی مقبولیت تصنیف و تالیف کی طرف

راغب کیا تھا۔ موجودہ دور میں تو عربوں نے دنیا کے علوم وفنون کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا تھا۔ قصہ یہ کہ زرتشتی 979 عیسوی سے قبل تک (جب ان کی خاصی بڑی تعداد نے ہندوستان ہجرت کی) پہلوی میں متواتر لکھتے رہے۔ جواب بول چال کی زبان نہیں رہی تھی۔ اسی وجہ سے ماہرین لسانیات اس عہد کی زبان کو کتابی پہلوی کہتے ہیں۔

('نقوش'، لاہور، اپریل- جون، 1966)

حواشی:

1. مصر میں حضرت موسیٰؑ کی پیدائش اور پیغمبری ملنے سے پہلے کے حالات دہرانے کی یہاں ضرورت نہیں۔ اسلام کے مطابق حضرت موسیٰؑ کے خسر یعنی جناب صفورہ کے والد حضرت شعیبؑ تھے جو مدین کے نبی تھے۔ کلیم اللہ کا اپنا نام موشے مصری تھا۔
2. مصر آفتاب پرستی کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ رع کی عبادت کے مشہور مرکز ہیلیو پولیس (یعنی سورج کا شہر) کا علاقہ آج بھی اسی نام سے قاہرہ کے فیشن ایبل مضافات میں شامل ہے۔
3. قصص الانبیا میں لکھا ہے کہ حق تعالیٰ نے موسیٰؑ سے وعدہ کیا تھا کہ میں شام تم کو دوں گا۔ تم جباروں کو مار کر وہاں سے نکال دو۔ موسیٰؑ نے بارہ سردار نقیب کر کے شام کے اطراف میں بھیجے کہ احوال جباروں کا دریافت کر کے آویں۔ جب عوج بن عنق کے پاس گئے تو دیکھا کہ قد اس کا تینتیس (33) ہزار گز لمبا تھا (اور موصوف ان سب کو مٹھی میں اٹھا کر اپنی بی بی کے پاس لے گئے اور کہا سنتی ہو یہ مجھ سے لڑنے کو آئے ہیں اور مسز عوج بن عنق نے کہا کہ چھوڑ دے۔ وے ضعیف و ناتواں ہیں۔ واپس چلے جاویں گے۔
4. موجودہ اسرائیلی سامراج ان ہی د ، و کے خواب دیکھ رہا ہے۔
5. یعنی منصب داری سسٹم شروع ہو جائے گا۔
6. کتاب شموئیل باب 8

7. امریکہ کا یہودی پریس آج کل بڑے فخر سے اسرائیلی عرب جنگ کو داؤڈ اور جالوت کی لڑائی کہہ رہا ہے۔
8. روس۔
9. کتاب حزقیل باب 38
10. کتاب یرمیاہ باب 4 اور 5
11. اس ریاست میں حضرت یعقوبؑ کے چوتھے فرزند یہودہ کی اولاد یعنی بنی یہود آباد تھے۔
12. شہر بابل کا نام دراصل باب ایل تھا یعنی خدا کا پھاٹک۔ چنانچہ قدیم بابل اور یوپی کا شہر الٰہ آباد تقریباً ہم معنی ہیں۔
13. جاوید نامہ
14. پروفیسر فلپ ہٹی اور دوسرے مغربی مورخین کا خیال یہ بھی ہے کہ حضرت موسیٰ نے صحرانوردی کے دوران میں جس عرب لڑکی سے شادی کی تھی اس کے قبیلے کا نام یاہ ویہہ تھا۔ یہ دیوتا ایک سرخ خیمے کے اندر رہتا تھا۔ اور اسے جڑی بوٹیوں کی دھونی دی جاتی تھی۔ چنانچہ یہودی عبادت خانے کی قربان گاہ ''سوختنی قربانی'' ''خیمہ اجتماع'' جس میں تورات کا مقدس صندوق رکھا جاتا تھا، سب اسی عہد کہن کی یادگاریں ہیں جن کو حضرت موسیٰ نے برقرار رکھا۔
15. اسی طرح ہندوستان میں جب برہما یعنی ان دیکھے خالق کا تصور بہت مشکل معلوم ہوا تو عوام نے ''حریم ذات'' کو اپنی پہنچ سے باہر سمجھ کر ''بت کدہ صفات'' آراستہ کرلیا۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ہندوستان میں برہما کی مورتیاں شاذ و نادر ہی بنائی گئیں اور آج تک برہما کا مندر ایک آدھ جگہ پر ہی موجود ہے۔ پچھلی صدی کے بنگالی ہندو موحدین نے برہما ہی کی پرستش شروع کی اور اپنی جماعت کا نام برہمو سماج رکھا۔ ان کی عبادت گاہوں میں صرف اوم کا نشان ہوتا ہے۔ آریہ ساجیوں نے بھی یہ کہہ کر مورتی پوجا کی شدید مخالفت کی کہ قدیم ویدک دھرم میں بت پرستی نہیں تھی۔

16. اسرائیل کے ان ہی گمشدہ قبیلوں کے لیے یہ روایت تیار ہوئی کہ افغان اور کشمیران کی اولادیں ہیں۔
17. بخت نصر کی افواج کے طویل محاصرہ کی وجہ سے۔
18. سائیرس اعظم۔
19. بیلشضر بخت نصر کا پوتا اور بابل کے آخری بادشاہ بنودی لس کا لڑکا تھا۔ تسخیر بابل کے بعد سائیرس اعظم نے اپنے ماموں دارا کو جو ایک میڈین شہزادہ تھا، بابل کے تخت پر بٹھادیا۔
20. سکندر اعظم۔
21. طاقت کے پجاری کے اشور کی فن سنگ تراشی میں سینگ ایک اہم علامت تھی۔ مینڈھوں، بارہ سنگھوں اور پہاڑی بکروں کے سینگ اشوری اور بابلی آرٹ کے پسندیدہ موتیف تھے۔ مردک دیوتا کے مقدس فرضی درندے کے سر پر دو خوفناک سینگ تھے (اس درندے کا بت لوور پیرس میں موجود ہے) اشوری فوج میں ایک قسم کا ''ٹینک'' تھا جس کے اندر بیٹھ کر دو سپاہی دو سینگ نما ہتھیاروں کو ''کنٹرول'' کرتے تھے جن کے ذریعے غنیم کی شہر پناہ کو دھکے دے دے کر توڑا جاتا تھا۔ علاوہ ازیں عبرانی مذہب میں نرسنگا یا قرنا مقدس حیثیت رکھتا تھا اسے آج بھی عبادت کے وقت پھونکا جاتا ہے۔ انجیل میں خداوند خدا جابجا اپنے نبیوں سے کہتا ہے کہ تو اپنے سینگ میں تیل بھر اور فلاں فلاں کو ممسوس کرنے کے لیے جا!
22. یہاں کمبوجیہ کی موت کے لیے قدیم فارسی لفظ ''ہوامر شیوش'' جو دارا نے استعمال کیا ہے اس کا ترجمہ ''خودکشی'' بھی کیا گیا ہے۔
23. یہ قدیم روایت اتنی پائیدار تھی کہ 1511 عیسوی میں بعہد شاہ اسمٰعیل صفوی ایران کے بچے کھچے زرتشتیوں نے اپنے ہم مذہب ایرانیوں کو جو ہندوستان میں بس چکے تھے خط لکھا کہ گیومرث کے زمانے کے بعد سے آج تک ہم کو اتنے کڑے مصائب

نہیں جھیلنے پڑے)۔

24. اصل نام دارایوش یا داریوش (داریات ۂ وش۔ دولت رکھنے والا داراب۔

25. حضرت سلیمانؑ کا تعمیر کردہ ہیکل اشوری طرزِ تعمیر کا نمائندہ تھا اینٹوں کی کئی منزلہ عمارت جس کی خصوصیت تھی۔ یہی مینارہ بابل کا اسٹائل بھی تھا۔ ہیکل سلیمانی کی تعمیر سے قبل اس جگہ پر ایک چٹان تھی جس پر پہلے کبھی اناج پھٹکا جاتا تھا۔ حضرت داؤدؑ نے اس پر قربان گاہ بنائی۔ عبرانی روایت کے مطابق اسی چٹان پر حضرت ابراہیمؑ نے اپنے فرزند کی قربانی کا ارادہ کیا تھا۔

26. روایت ہے کہ ایتھنز میں ڈرامہ نگاری کے ایک مقابلے میں اسکائی لس کے بجائے اس کے کم عمر معاصر سوفوکلز کو ادبی انعام دے دیا گیا۔ جب غصے میں آکر وہ سسلی چلا گیا جہاں اُس نے 456 ق م میں انتقال کیا۔

27. انگریزوں اور سکھوں کا معرکہ چلیاں والا۔ 1849 عیسوی

28. یہ لفظ اب عجائب خانے کے لیے استعمال ہوتا ہے لیکن یہ دراصل فنونِ لطیفہ کی 9 یونانی دیویوں یعنی MUSES کا مندر تھا جس میں دارالعلوم آرٹ گیلریاں وغیرہ شامل تھیں۔

29. کمیونزم کے خلاف مذاہب کے اتحاد اور عالمی سیاست کی دوسری مصلحتوں کی خاطر حال ہی میں پاپائے روم نے اپنے فرمان کے ذریعے یہودیوں کو ''قتلِ مسیحؑ'' کے جرم سے بری کر دیا ہے۔ ادھر عرب قوم پرستی کے خلاف مغرب کے عیسائی اور یہودی سب ایک ہو چکے ہیں جو دراصل خود کو برتر سمجھنے والی مغربی اقوام کا مشرق نشاۃ ثانیہ کے خلاف اتحاد ہے۔ چنانچہ اب مغرب کی یہودی مصنف ''عیسائی یہودی غلط فہمیوں'' کا ازالہ کرنے میں جٹے ہیں۔

30. وکٹورین مصنف چارلز کنگز لے کے ناول ہائی پیشیا میں بیان کیا گیا ہے کہ فلیمن نامی ایک نوجوان راہب صحرا سے نکل کر سکندریہ کی زندگی دیکھنے شہر آتا ہے۔ (اسی طرح اناطول

فرانس کے ناول میں ایک صحرائی راہب شہر آ کر طوائف تائیس کو راہِ راست پر لانا چاہتا ہے اور خود اس کے چکر میں پڑ جاتا ہے۔

.31 حضرت موسیٰ کے آخری وعظ کے مؤثر الفاظ یاد کیجیے۔ "تمھارا باپ ایک بے خانداں ارمی تھا جو مصر جا کر ایک طاقتور قوم بن گیا۔"

.32 یہودی روایات میں تاریخی واقعات کے علاوہ جو اسطوری عناصر شامل ہو گئے تھے ان کے معجون مرکب سے بعض مسلمان راویوں نے حکایات تیار کیں جن کی بنیاد پر قصص الانبیاء وغیرہ کی عوج بن عنق، جنت شداد، چاہ بابل وغیرہ کی محیر العقول داستانیں قلمبند کی گئیں جو یونانی اور ہندو دیومالاؤں سے کسی طرح کم نہیں۔

.33 Profile of Iran ص-27،28۔ Printed by Offset Press Inc Tehran.

.34 جاوید نامہ۔

.35 ہند میں ہن حکومت کے صدر مقام سیالکوٹ اور مالوہ تھے۔ مہر گل نامی ہن راجہ کا بڑا زور رہا۔ رفتہ رفتہ پچھلے شاکاؤں وغیرہ کی طرح ہن بھی راجپوت آبادی میں گھل مل گئے۔

.36 سلطان محمود غزنوی۔ از پروفیسر محمد مجیب۔ مطبوعہ ہندستانی اکیڈمی۔ الہ آباد-1940ء

.37 آٹھویں صدی عیسوی تک سیاسی اور تہذیبی لحاظ سے افغانستان ہندوستان میں شامل سمجھا جاتا تھا جس کی آبادی میں پارتھین سیتھین تورانی سب خلط ملط تھے۔ کابل میں اب "سیتھی ترکوں" کی "ترک شاہی" قائم تھی جس کا بانی برہتا گین اپنا سلسلہ نسب مہاراجہ کنشک سے ملاتا تھا۔ اور مذہبا بودھ تھا۔ اس خاندان کے آخری حکمران کو معزول کر کے اس کے برہمن وزیر کلار نے "ہندو شاہی" قائم کی۔ یہی زمانہ تھا جب سارے ہندوستان میں بدھ مت کو زوال اور برہمنیت کو عروج حاصل ہوا۔ کلار ہی کو نسل کے راجہ جے پال اور آنند پال پنجاب کے فرمانروا تھے جو سبکتگین اور محمود سے لڑے۔

.38 جاوید نامہ۔

.39 اشوک کے قندھاری کتبات بھی یونانی اور آرامی دونوں میں موجود ہیں۔ شمال مغربی ہند

میں 200 ق م کے لگ بھگ آرامی رسم الخط کی جگہ خروشتی نے لے لی۔

40. بحوالہ ایران صدیوں کے آئینہ میں از ڈاکٹر منوہر لعل عشرت۔

41. اژدھا چین سے لے کر یورپ تک خاص اسطوری کردار تھا۔ مغربی حکایات میں سینٹ جارج نے DRAGON پر فتح پائی۔ ہندوستان میں سری کرشن نے ایک مہیب ناگ کو تسخیر کیا۔

42. قتل ضحاک کی حکایت اتنی دیرپا ہے کہ ہندوستان میں راون پھونکنے کے تہوار کی مانند شہر دماوند کے باشندے زمانہ حال تک ضحاک کے جہنم رسید ہونے کی خوشی میں "عید گردی" مناتے ہیں۔

43. ان کی اولاد یعنی ہندوستان کا پارسی موبد اور دستور آج بھی بڑی شدت سے قدامت پرست ہے۔

44. ہر پارسی روزانہ بلاناغہ اپنی کشتی جو اب کستی کہلاتی ہے میں عناصر اربعہ کے نام پر چار گرہیں ڈال کر خوردہ اوستا کی ملی لی مادی اور پہلوی زبان کی دعائیں پڑھتا ہے۔

45-46. بحوالہ "ایران صدیوں کے آئینے میں" از ڈاکٹر منوہر لعل عشرت۔

47. غالباً وسط ایشیائی شامانیت اور بدھ مت کے پیرو۔

48. برہمن۔

49. غالباً نسطوری عیسائی۔

50. پیروان مانی کو اب زندیک کہا جارہا تھا۔ بعد میں عربوں نے بھی یہ لفظ HERETICS کے لیے استعمال کیا۔

51. ان سختیوں کے باوجود بڑی تعداد میں ایرانی اکابر و معززین عیسائی ہوتے رہے۔ مسیحی روم (بازنطیم سے مسلسل جنگ رہتی تھی اور وہاں سے قیدی لائے جاتے تھے جنھوں نے ایران میں عیسائیت پھیلائی۔ آرمینیہ کے قرب کی وجہ سے نسطوریت کا بول بالا ہوا۔ چھٹی صدی عیسوی میں سیرین عیسائی راہب ہندوستان کی سیر کے لیے آیا اور اس نے

لکھا کہ مالا بار اور لنکا کے گرجاؤں کو ایران کے نسطوری پادری چلا رہے ہیں فتح اسلام کے بعد ایران میں نسطوری کلیسا کا زور گھٹ گیا۔ لہٰذا جنوبی ہند کے عیسائیوں نے اپنا تعلق انطاکیہ کے بطریق سے قائم کیا۔ اسی وجہ سے ان کا کلیسا اب ایرانی کے بجائے سیرین چرچ کہلاتا ہے لیکن مدراس اور کیرل کے دو قدیم گرجاؤں کی صلیبوں پر پہلوی زبان کی لکھی ہوئی عبارتیں آج تک موجود ہیں۔

گُلگشت

جب برف پگھلی

جون 1974 ۔ دریچے کے باہر ماسکو یونیورسٹی کے سرسبز کیمپس پر موسلا دھار بارش ہو رہی ہے۔ سلادا نے دیوان سے اٹھ کر فلور لیمپ جلایا۔ دیوار پر آویزاں ایک شفق رنگ یوکرینی لینڈ اسکیپ اچانک روشن ہو گیا۔ سرخ و سیاہ دھاری دار یوکرینی غالیچے پر آنکھیں موندے بلی اس پولش شوربے کی بوٹیوں کے خواب دیکھ رہی ہے جو نتاشا تیار کرنے میں مصروف ہے۔ فون کی گھنٹی بجتی ہے ''رام تھا'' نتاشا باورچی خانے سے باہر آ کر کہتی ہے ''رام'' پچھلے پندرہ برس سے نتاشا کے تخلیق کردہ روسی ڈرامے ''رامائن'' کا ہیرو ہے۔ نامور انڈولوجسٹ اور انتھیر وپولوجسٹ اور ماہر لسانیات نتاشا گیسوا کی پردادی ایک پولش کاؤنٹس تھی۔ پولینڈ یوکرین کا پڑوسی ہے۔ ڈاکٹر سلادا پوچنکو نتاشا کا شوہر اور مشہور آرٹسٹ یوکرینی ہے۔ جگِ سائپرل کے مختلف ٹکرے۔

لنچ کے بعد نتاشا ایک الماری سے پہلے گول رنگین چوبی پٹاری برآمد کرتی ہے پھر بازی گر کی طرح اس میں ایسٹر کے رنگین چوبی انڈے۔ پٹاری اور انڈے مخصوص روسی رنگ برنگی فوک

آرٹ کی گلکاری سے مزین ہیں۔ "یہ انڈے ایسٹر کے زمانے میں ہماری کسان عورتیں شہر لا کر فروخت کرتی ہیں۔" نتاشا کہتی ہے۔ "اب بھی؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔ "اب بھی بہ طور ایک کلچرل موٹیف"۔

سلادا دوسرے کمرے سے ایک انگریزی مضمون کا تراشہ لا کر دیتا ہے۔ "یہ حسین کو دے دینا"۔ میں نے ان کے متعلق لکھا تھا۔ حسین ہندو دیومالا اور عراقی شیعہ ایتھوس کی علامتیں، پنجے، علم اور گھوڑے اپنے موٹیف بناتے ہیں۔ خالی ہمارے ملک میں کلچر موٹیفوں اور ایتھوسوں کے سلسلے میں خون خرابہ ہوتا ہے۔ ادھر سبطِ حسن اور ڈاکٹر جمیل جالبی اور انتظار حسین اپنے ایتھوس اور کلچر موٹیف کی فکر میں غلطاں اور پیچاں ہیں۔ تو یہ مذہبی خون خرابہ مغرب میں بھی ہوتا تھا۔ مگر صدیوں پہلے۔ ایک مرتبہ نوجوان روسی نقاد انوشا زیریف نے ماسکو سے باہر ایک خانقاہ کے سامنے سے گزرتے ہوئے مجھے بتلایا تھا کہ سترھویں صدی میں روسی پادریوں کے دو گروہوں کے درمیان بڑا خون خچر اس معاملہ پر ہوا کہ صلیب کا نشان دو انگلیوں سے بنایا جائے یا ایک سے۔ سینکڑوں اہلِ ایمان مارے گئے۔ اور یروان میں مینارِ شہدا استادہ ہے کہ ترکوں نے آرمینوں کا خون بہایا اور داغستان میں زار روس کی فوجوں نے قتلِ عام کیا تھا اور آذربائیجان میں ـــ

ہزاروں برس قبل اگر برف نہ پگھلی ہوتی تو کیا برا تھا؟ نتاشا نے گیلری میں جا کر وارڈ روب کھولا۔ اور گرم موزے اور دستانے اور فل بوٹ نکال کر لائی۔ "شمالی علاقوں میں" اس نے کہا "شدید سردی ہوگی۔ ساتھ لے جانا۔" "اگر برف نہ پگھلتی"۔ میں نے بہ آواز بلند دہرایا۔ "تو تم اور ہم اس وقت یہاں موجود نہ ہوتے" نتاشا نے جواب دیا۔ "آدھی رات کا سورج جیسا سرد ہوتا ہے ایسے ہی وہ رفتہ رفتہ بالکل ٹھنڈا ہو جائے گا تو زندگی ختم ہو جائے گی۔" اس نے کہا "مگر اطمینان کی بات یہ ہے کہ اس وقت میں موجود نہ ہوں گی۔"

"معاف کیجیے گا آپ انتہائی قنوطی گفتگو کر رہی ہیں"۔ سلادا نے اچانک فصیح و بلیغ اردو میں ارشاد کیا۔ میں نے دریچے میں جا کر باہر جھانکا۔ شاندار تناور درخت مینہ کی بوچھاڑ میں مضبوطی سے سیدھے کھڑے تھے۔

''لاکھوں برس بارش ہی ہوا کی۔ ہر کام اللہ میاں نے انتہائی فرصت سے کیا۔'' میں نے پلٹ کر اطلاع دی وہ لاکھوں برس ڈینوسار گھومتے پھرے۔ فرض کرو اس وقت اس جنگل سے ایک ڈینوسار زندہ ہو کر نکل آئے اور ان ساری تجربہ گاہوں اور عمارتوں کو روندتا ہوا جنگل میں واپس چلا جائے۔ جنگل ازلی اور ابدی ہے۔ جب برف پگھلی اور جنگل نمودار ہوئے اور ڈینوسار— جیولوجیکل وقت لاکھوں برس اور مہذب انسان کا تاریخی وقت صرف دس ہزار برس مسخرہ پن ہے۔ صرف آٹھ ہزار سال پہلے یوریشیا کے جنگلوں میں جو سفید فام انسان آباد تھا اسے تم اینتھروپولوجی والے ''فن'' کہتے ہو۔ اور تم کہتے ہو کہ وہ انسان والگا کی وادی میں کھیتی باڑی کرتا تھا اور لکڑی کے جھونپڑے بناتا تھا اور سمور اوڑھتا تھا۔'' ''ہاں''۔ نتاشا نے کہا'' اور اپنے مردے دفن کرتا تھا اور ان پر تبرکا سرخ رنگ چھڑکتا تھا۔'' ''تو تمھاری آرین تھیوری کے مطابق کیا یہ آرین سینڈور کا اوریجن تھا؟'' میں نے پوچھا ''ہوسکتا ہے'' ڈاکٹر نتاشا گیسوا نے کہا۔ اور برستی بارش کو دیکھنے لگی۔ پھر ایک بک شیلف کی طرف گئی اور ایک انگریزی کتابچہ نکالا۔ ''میری تازہ تصنیف جین فلسفہ''۔

''جین فلسفہ''۔ میں نے غصے سے کہا'' یہاں ابھی اوریجن کے متعلق ہی طے نہیں ہو پایا اور تم جین فلسفہ پر پہنچ گئیں۔ یہ سنہری چوٹیاں گوندھے۔ چوبی جھونپڑوں میں رہنے والی تمھاری کسان عورتیں جو اپریل میں چوبی انڈے تراش کر ان کو رنگتی ہیں۔ آٹھ ہزار سال پہلے چوبی مورتیاں بنا کر ان کو رنگ رہی تھی۔''

''چوبی مورتیاں بھی چار چار سَروں اور دس دس ہاتھوں والی۔'' نتاشا نے ہاتھ پھیلا کر جواب دیا۔ ''بالٹک سلاو علاقے اور یوگوسلاویہ میں ایسی مورتیاں کھدائی میں نکلی ہیں۔ ویدک دیوی اور دیوتاؤں کی کزن۔ اور یہ قدیم ترین انڈو یورپین لوگ جنوب مشرق روس کے اسٹیپ یعنی بحیرۂ اسود کوہستان قفقاز اور بحیرۂ خرزر کے شمالی علاقہ میں آباد تھے۔''

''روسی یا سلاو اور انڈو آریائی زبانوں کے بعض کی مماثلت اسی دور کی یادگار ہے۔'' سلاوا بولا۔

''میرے اجداد اس وقت کہیں صحرائے عرب میں قدیم ترین سامی زبان بولتے پھر

رہے ہوں گے۔" میں نے کہا۔

"عیسیٰ سے سات سو سال پہلے۔" نتاشا نے بلی کو گود میں اٹھا کر کہا۔ "ایک نئی الثائی یالو تورانی قوم سنٹرل ایشیا میں ابھری اور جنوب روس سے ہنگری تک پھیل گئی۔"

"چنانچہ ہنگری والوں کی ترک تازی دیکھو۔" میں نے کہا۔

"ہاں اور جنوبی روس کے قبائل گھوڑوں پر سوار ہو کر ایلام اور وادی سندھ اور دجلہ وفرات کے شہروں پر نازل ہوئے اور بڑی تباہی مچائی۔"

"اس زمانے کے شہر ہی کتنے بڑے تھے۔" میں نے کہا۔ "نینوا جو اس وقت کا نیویارک تھا۔" اس کی آبادی صرف ستر ہزار تھی۔ اس اجنبی شمالی لمبے تڑنگے لوگوں کی یلغار بڑی دہشتناک لگتی ہوگی۔ اسی لیے میرے عرب عبرانی اب وجد نے تم کو یاجوج ماجوج کہا تھا۔"

لوگوں کو فوراً منع کرو کہ اس عمارت کو کوئی گزند نہ پہنچے۔ اسی طرح سیراپری پولس کلچرل۔
فیسٹیول میں جہاں ساری دنیا کے نامی فن کار جمع ہوتے ہیں، ایران کا روایتی PASSTONPLAY (تعزیہ جس میں واقعہ کربلا بطور تمثیل پیش کیا جاتا تھا) جدید ترین اسٹیج ٹیکنیک سمیت ایک یونانی ٹریجڈی کی لرزہ خیز عظمت کے ساتھ ایرانی اداکار۔

ہولی مدر رشا

"یاجوج ماجوج" کی اولاد نے عبرانی روایات کس طرح اختیار کرلیں؟ جگ ساپزل کی اور تصویر۔ ڈاکٹر سلاواپوٹبنکو کی مورثِ اعلیٰ قدیم سلاؤنسل نے خانہ بدوشی اور جنگلی جانوروں کا شکار ترک کر کے سب سے پہلے زرخیز یوکرین میں کاشت کاری شروع کی تھی۔ ولادت مسیح کے بعد قرون وسطیٰ تک پہنچتے پہنچتے ڈینپر کے کنارے روستوو اور کیو اچھے خاصے بڑے شہر بن چکے تھے۔ یوکرین بڑا دولت مند علاقہ تھا۔ لہٰذا سب سے پہلے مغرب کے گوتھ اور فرینک اپنی فوجیں لے کر اس پر آپڑے اس طرح گویا یورپین کامن مارکیٹ روسی تاجروں کے لیے کھل گئی۔ اسی زمانے میں ایک ترکستانی قبیلے خزار نے والگا کے کنارے شہر اٹل بسا کر یہودی مذہب اختیار کیا۔ یہودی نژاد مصنف آرتھر کویسلر نے اپنی تازہ کتاب میں ثابت کیا ہے کہ روس، یورپ اور امریکہ کے سارے اشک تازی دراصل ان خزار یہودیوں کی اولاد ہیں۔

جنوبی روس کے امیر کاروباری عموماً ناروے کے پیشہ ور سپاہیوں کو اپنے گوداموں کی چوکیداری کے لیے ملازم رکھتے تھے۔ ایک ذہین نارویجین سردار یورک نے نارویجین سپاہیوں اور چوکیداروں کی مدد سے 822 عیسوی میں نوواگراڈ اور کیو پر قبضہ کرلیا۔

یہ شخص ریورک موجودہ ملک روس کا باوا آدم ہے۔ اس کے مرنے کے بعد اس کے کمسن بچے کے والی اولیگ نے کیو میں باقاعدہ اپنا دربار قائم کیا۔ ریورک کے اخلاف میں کیو کا ایک حاکم آرچ ڈیوک ولادی میر اوّل تھا جو لتھونیا، بلغاریہ اور کرائمیا کو اپنا مطیع کرنے کے بعد کیو میں مزے سے دندناتا تھا اور روڈی، سوروگ وغیرہ دیوتاؤں کی پوجا پاٹ کیا کرتا تھا۔ (جن کے ہم وزن رودرا اور سورگ وغیرہ ویدک نام تھے)

کہ اچانک اسے ترقی یافتہ مذاہب میں دلچسپی پیدا ہوگئی۔ ولادی میر امرائے بخارا آل

سامانی کا ہم عصر تھا۔ مغرب میں بازنطین کی عظیم الشان مسیحی سلطنت کا ڈنکا بج رہا تھا۔ روم اور بازنطین کے مذہبی تفرقے کو پیدا ہوئے صدیاں گزر چکی تھیں۔ اہل قسطنطنیہ اور روم کے کلیسا جداگانہ تھے اور قسطنطنیہ "مشرقی روم" کہلا رہا تھا (اسی وجہ سے پورا عالم بازنطین کو "روم" کہتا تھا) مسلمان صوفیاء اور عرب وعجم کے تاجر کنار والگا کے بلغاریوں کو کلمہ پڑھا چکے تھے۔ بازنطینی اور یونانی تاجر اور خزار یہودی کیو میں موجود تھے۔ ذہین ولادی میر کو ان غیر روسی اجنبی مذاہب کی کریدلگ گئی۔

اتلاور کیو کی مساجد میں بعد نماز جمعہ بلغاریوں اور غیر ملکی مسلمان تاجروں اور مولویوں تک خبر پہنچی کہ بت پرست آرچ ڈیوک اپنے آبائی مذہب سے برگشتہ ہو چکا ہے۔

چند مولوی صاحبان فوراً کیو کے دربار میں پہنچے۔ روسی سردار کو جوان کے خیال میں نوح علیہ السلام کے فرزند یافث کی اولاد اور یاجوج ماجوج کی نسل سے تھا۔ فوراً دعوت اسلام دی۔ ولادی میر نے اس مذہب سے متعلق سوالات کیے۔ کلمہ پڑھنے کے لیے تیار ہوا مگر سنت ابراہیمی کے اتباع، لحم خنزیر اور ووڈکا سے اجتناب کی شرائط پر بدک گیا۔ (سینٹ پال اتنا کیہ سے آگے جا کر سنت ابراہیمی، لحم خنزیر اور شراب نوشی کی عبرانی روایات کو مسترد کرنے کے بعد ساری رومن ایمپائر یعنی یورپ کو کب کے عیسائی کر چکے تھے۔)

علمائے دین مایوس ہو کر واپس گئے۔ اب یہودی ربائیوں کا ایک وفد صحیفۂ تورات سنبھالے دربار کیو میں وارد ہوا مگر وہی سنت ابراہیمی کا اتباع اور لحم خنزیر سے اجتناب۔ ولادی میر نے اکتا کر یہودیوں کو بھی رخصت کیا۔ اب بازنطینی یونانی پادری عیسیٰ و مریم کا جگمگاتا بازنطینی آئیکن اٹھائے جلوس کی صورت دربار میں داخل ہوئے۔ بے چارہ ولادی میر مسلمان اور یہودی مبلغین کی کڑی شرائط سے اس قدر خائف ہو چکا تھا کہ اس نے پادریوں کی تقریر کو دھیان سے نہیں سنا۔ مزید برآں وہاں ایک ہی خدا تھا یہاں تین تین اور وہی جنت وجہنم گناہ و ثواب جزاو سزا۔

"پیارے بیٹے یسوع تمھارا منجی ہے۔" پادری نے کہا۔

''ٹھیک ہے''۔ مگر تمہارے مذہب میں داخل ہونے کا MODUS ORERANDI کیا ہے۔

''صرف مقدس پانی کے چند چھینٹے۔''

''اور کچھ نہیں؟ آر یو شیور—''؟ (یہ اس نے روسی زبان میں پوچھا تھا)

ولادی میر کوئی رسک لینے کے لیے تیار نہ تھا۔ اس نے عیسائیت کے بالکل صحیح کوائف معلوم کرنے کے لیے اپنا سفیر کیو سے قسطنطنیہ کی طرف روانہ کیا۔ یہ واقعہ 1099 عیسوی کا ہے۔

روسی سفیر کا وفد بازنطینی چرچ کی شان و شوکت سے بے انتہا مرعوب و متاثر ہو کر کیو واپس آیا۔ چنانچہ آرچ ڈیوک ولادی میر اوّل نے گریک آرتھوڈوکس چرچ کی رسوم کے مطابق بپتسمہ حاصل کیا۔ (کلیسائے قسطنطنیہ کے حریف پاپائے روم کو یہ اطلاع ملی۔ وہ بہت مایوس ہوئے کہ وہ خود اس وسیع اور دولت مند ملک روس کے فرماں رواؤں کو اپنے چرچ میں شامل کرنا چاہتے تھے۔)

بعد ازاں ولادی میر نے ایک بازنطینی شہزادی سے بیاہ رچایا اور ایسا پکا عیسائی ثابت ہوا کہ مرنے کے بعد بازنطینی نے اسے باضابطہ ولی قرار دیا اور اب وہ سینٹ ولادی میر کہلاتا ہے۔

جب ولادیمیر بازنطینی عیسائی ہوا اس روز سے مادرِ روس نے اپنا رخ روم اور مغرب کی طرف موڑا اور بازنطین اور مشرق سے اپنا روحانی اور تہذیبی ناتہ جوڑا۔ یہ صورت حال ایک ہزار سال بعد آج بھی تقریباً ویسی ہی موجود ہے۔

ولادی میر عیسائی ہوا اس کی روسی رعایا بھی دھڑا دھڑ بپتسمہ حاصل کرنے لگی۔ کیو میں دریائے نیپر کے کنارے گھنے درختوں کے درمیان ایک بہت اونچا مجسمہ ولادی میر کا استادہ ہے۔ ہاتھ میں صلیب لیے اس جگہ وہ اپنی رعایا کو قدیم مسیحی رسم کے مطابق دریا میں ڈبکیاں لگوا لگوا کر بپتسمہ دلواتا تھا۔ ولادی میر کے عہد سے سارے ملک میں حسین ترین گرجا اور خانقاہیں تعمیر کی گئیں۔ طلائی فریموں والی ہیروں سے مرصع مذہبی تصاویر ICONS سے ان عبادت خانوں کو ایسا سجایا کہ رومن کیتھولک یورپ میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔

ریورک کی اولاد اب ایک عرصے سے روس کی حاکم تھی۔ مگر تاتاری اور روسی دستور کے مطابق ایک سردار کے مرنے کے بعد ریاست اس کے سارے بھائی بھتیجوں میں تقسیم کر دی جاتی تھی۔ لہٰذا مسلسل حصوں بخروں اور وراثت کے قضیوں کی وجہ سے کیو کی حکومت کمزور پڑتی گئی اور بہ آسانی منگولوں کے قبضے میں آ گئی۔

1154 عیسوی میں یوری ڈولگورکی کیو کا آرچ ڈیوک بنا۔ اس کے لڑکے نے شہر ولادی میر بسایا۔ اس کی مملکت کی آبادی زیادہ تر شمالی فن قبائل اور نووگراڈ کے باشندوں پر مشتمل تھی۔ بارھویں صدی میں یورش تاتار سے بچنے کے لیے وادی ڈنیپر کے باشندے اس طرف آن بسے۔ ان سب نے آپس میں شادی بیاہ کیے اور وہ روسی قوم پیدا ہوئی جو سارے یورپین روس میں پھیلی۔

یہ بڑی ذہین، بہادر، جفاکش، آرٹسٹک اور نفاست پرست قوم ثابت ہوئی۔ 1147 عیسوی میں یوری ڈولگورکی نے ماسکو آباد کیا۔ ہر شہر میں یوری نے پہلے ایک خوب صورت طلائی یا نقرئی پیاز نما بازنطینی گنبدوں والا گرجا تعمیر کروایا۔ 1158 عیسوی میں شہر ولادی میر کے لیے مریم و عیسیٰ کا وہ آئیکن تیار کیا گیا جو ساری دنیا میں Our Lady of Vladimir کے نام سے مشہور ہے۔

ماسکو ایک تجارتی منڈی کی حیثیت سے آباد ہوا تھا۔ آرچ ڈیوک کے خاندان نے منڈی کے قریب اپنی رہائش کے لیے ایک کریملن یعنی قلعہ اور اس کے احاطے میں عالی شان عبادت خانے بنوائے۔ قلعے کی فصیل کے نیچے ماسکو دریا بہہ رہا تھا۔ سامنے منڈی کا چوک تھا (وہ چوک آج ریڈ اسکوائر ہے۔)

خوانینِ اردوئے معطلّا

ابھی یہ ماسکو ایک چھوٹی سی بستی تھی جب 1227 عیسوی میں خانِ اعظم چنگیز خاں کا انتقال ہوا۔ اس کی وسیع سلطنت اس کے چاروں بیٹوں اور غتائی، چغتائی، جوجی اور طولوئ میں تقسیم کی گئی اور غتائی اور اس کے خلاف چین کے خاقانِ اعظم کہلائے۔ چغتائی، جوجی خان طولوئ اور ان کی آل و اولاد نے منگولیا، سائبیریا، وسط ایشیا، ایران، کرائمیا، بلغاریہ وغیرہ وغیرہ کی بادشاہتیں سنبھالیں۔ جوجی خاں کے بیٹے باتو خاں نے وادی والگا میں ریاست کازان قائم کی اور اردوئے معطلا GOLDEN HORDE کا خانِ اعظم بنا۔

منگولوں نے جنھیں اب تاتاری کہا جا رہا تھا، اسلام قبول کیا اور روس پر تین سو برس حکمراں رہے۔ مسکوی یعنی ماسکو کے گرینڈ ڈیوک ان کے باج گذار تھے اور بہ طور خراج اپنی شہزادیاں منگول خواتین کی خدمت میں شہر سرائے بھیجتے تھے جو والگا کے کنارے اردوئے معطلا کا زبردست دارالسلطنت تھا۔ مستقبل بعید کا اسٹالن گراڈ اور اس کے بعد والگوگراڈ تاتاریوں نے شمالی روس سے لے کر وادی سیحول وجیحون تک شاندار مساجد، مدارس، مقابر اور خانقاہیں تعمیر کیں۔ روسی نو عیسائیوں کا منبع فنِ یونان و بازنطین تھا۔ جس نے ''روسی بازنطینی'' فنِ تعمیر اور آرٹ کو جنم دیا۔ تاتاری نومسلموں کا آئیڈیل ایران جس نے ''تاتاری ایرانی'' طرزِ تعمیر اور آرٹ کی تخلیق کی۔

ازبک خان جو 1313 عیسوی سے لے کر 1340 عیسوی تک اردوئے معطلا کا خانِ اعظم تھا (اور جس کے نام پر ایک پوری قوم ازبک کہلائی) روسی کلیسا کے اسقفِ اعظم پیٹر کو مندرجہ ذیل چارٹر روانہ کرتا ہے۔

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ازبک کی جانب سے اس کے تمام مختلف المراتب شاہزادوں کے نام:- واضح ہو کہ کوئی

شخص اس کلیسا کی توہین نہیں کرسکتا جس کا اسقف پطرس ہے۔ ما بدولت اعلان کرتے ہیں کہ ہم، ہماری اولاد اور اولاد کی اولاد اور ہماری سلطنت کے شاہ زادگان اور ہمارے صوبہ جات کے حکام اعلیٰ، کلیسا اور اس کی وسیع جائیداد اور اوقاف کے معاملات میں کبھی مداخلت نہ کریں گے۔"

خوانین سرائے کے ترک رشتے دار۔ اُمودریا سے لے کر ڈینیوب تک پھیل چکے تھے۔ انھوں نے اناطولیہ، ایشیائے کوچک (جو ان کی وجہ سے اب ترکی کہلا رہا تھا) اور آذربائیجان اور آرمینیہ اور ایران اور شمالی ہندوستان اور وسط ایشیا میں اپنی حکومتیں قائم کرلی تھیں۔ 1492 عیسوی میں ترک سردار عثمان بے کی اولاد سلطان محمد نے قسطنطنیہ فتح کیا اور محمد فاتح کہلایا۔ دولتِ عثمانیہ بازنطین کی وارث ریاست بنی اور "روم ثانی" یعنی قسطنطنیہ کے زوال کے بعد ماسکو نے بازنطین کے روحانی وارث کی حیثیت سے "روم ثالث" کا لقب اختیار کیا۔

سارے روسوں کا زار

روس کے تاتاری مسلم حکمرانوں کے انحطاط کے ساتھ ساتھ ماسکو کے آرچ ڈیوک طاقت پکڑتے جا رہے تھے۔ اب وہ ''زار'' یعنی بادشاہ کہلانے لگے۔ مغرب کے تاریخی عوامل کے دھاروں سے علاحدہ ''مقدس سلطنت روس'' اور ''ہولی مدر رشا'' اپنا ڈیڑھ اینٹ کا گرجا الگ بنائے یورپ کے ریفارمیشن، نشاۃ ثانیہ، صنعتی انقلاب سے بے بہرہ اور غیر متاثر رہی۔ مغرب میں پارلیمنٹیں اور نمائندہ حکومتیں ظہور میں آ رہی تھیں۔ یہاں انواع و اقسام کے زاروں کی ریل پیل تھی۔ سائبیریا اور استراخان اور کرائمیا کے مسلمان بادشاہ بھی زار کہلاتے تھے اور سب ایک دوسرے سے لڑتے بھڑتے تھے۔ بالآخر مسکوی کے زار سب سے زیادہ طاقتور ثابت ہوئے۔ ایوان چہارم (جو خوفناک کہلاتا تھا) نے 1552 عیسوی میں کازان کی ہمسایہ مسلمان ریاست پر قبضہ کیا۔ پولینڈ کو شکست دی اور ''تمام روسوں کے زار'' (CZAR OF ALL THE RUSSIAS) کی حیثیت سے ماسکو کریملن میں دھوم دھام سے اس کی تاج پوشی ہوئی۔

1613 عیسوی میں زار مائیکل فیودورچ نے رومنوف شاہی خاندان کی بنیاد رکھی۔ مائیکل کا غیر معمولی بیٹا پیٹر جدید ریاست روس کا بانی ہے۔

پیٹر اعظم نے ماسکو سے مرکز حکومت سینٹ پیٹرز برگ منتقل کرنے کے بعد ایک طاقتور بحریہ تیار کیا۔ دریائے ڈون کے کنارے آباد عثمانی ترکوں کے فوجی مستقر ازوف پر قبضہ جمایا اور مغرب سے پروفیسر، سائنس داں اور ماہرین فنون روس بلائے۔

ایک نیم مشرقی معاشرہ تھا۔ تاتاری مسلم تسلط اور مسلم سماجی ماحول کے اثر سے روسی عورتیں نیم پردے میں رہتی تھیں۔ مرد لمبی داڑھیاں رکھتے تھے۔ پیٹر نے مردوں کی داڑھیاں زبردستی منڈوائیں، عورتوں کو باہر نکالا اور حکم دیا کہ یورپین طور طریقے اختیار کریں۔ وہ پہلا روسی

زار ہے جس نے Emperor of All the Russias کا لقب اختیار کیا۔ ڈیوک سے آرچ ڈیوک پھر زار پھر ایمپرر۔

پیٹر اعظم وہ زار تھا جس نے ملک کو یورپین علوم اور عقلیت پرستی سے روشناس کرا کے اپنے وطن کی تقدیر بدل ڈالی۔ 1727 عیسوی میں وہ مرا۔ اس وقت ہندوستان کی سلطنت مغلیہ اور سلطنت ایران اور مغرب میں دولت عثمانیہ کا زوال شروع ہو چکا تھا۔ اور اقوام یورپ کا عروج۔

پیٹر کے بعد روس کی دوسری زبردست حکمراں ایک عورت تھی۔ کیتھرین دوئم۔ اس نے سلطان ترکی سے ٹکر لی جو اس وقت تک بحر و بر پر روس کا سب سے زیادہ طاقتور اور عظیم المرتبت حریف تھا۔ سولھویں اور سترھویں صدی میں عثمانی بحیرے کی طاقت اور اقتدار کا یہ عالم تھا کہ ترک بحیرہ روم کو ایک معمولی ترکی جھیل تصور کرتے تھے۔ اور انگلستان اور یورپ کے حکمرانوں کے درباروں میں اپنے سفیر تعینات کرنا اپنی کسر شان سمجھتے تھے۔ بحیرۂ روم ان کا تھا، بحیرۂ اسود، خلیج فارس، بحیرۂ احمر، ایک تہائی یورپ، ایران کے سوا سارا مغربی ایشیا اور سارا شمالی افریقہ۔

لیکن قسطنطنیہ اور قاہرہ اور دمشق اور بغداد اور ٹیونس اور بلغراد اور صوفیہ اور ترانہ اور بخارسٹ میں پیرس اور اوکسفرڈ اور کیمبرج اور برلن کی طرز کی جدید یونیورسٹیاں اور تجربہ گاہیں قائم نہیں کی گئی تھیں۔ یورپین نشاۃ ثانیہ میں ترکوں کا کوئی حصہ نہیں۔ انجام ظاہر ہے۔

ایک خوں ریز جنگ کے بعد زارینہ کیتھرین نے باب عالی سے بحیرہ اسود میں جہاز رانی کے حقوق حاصل کیے (اس تاریخ سے ترکیہ کا انحطاط شروع ہوتا ہے) بعد ازاں اس باجبروت ملکہ نے کرائمیا اور روون والگا کے علاقے کے مسلمان خوانین کی وسیع اور متمول ریاستیں ان سے چھین کر کوہستان قفقاز کی مسلم ریاستوں میں روسی اثر بڑھایا۔ کرائمیا کی حکومت جوجی خاں ابن چنگیز کے سب سے چھوٹے لڑکے تغا تیمور کی اولاد کے قبضے میں رہی۔ ان میں سے ایک سردار الغ محمد نے حکومت کازان کو ماسکو کے پڑوس میں ایک طاقتور ریاست بنا دیا تھا (جسے خوفناک ایوان چہارم نے ختم کیا)۔ الغ محمد کے پوتے زار قاسم نے ریاست کازیموف کی بنیاد ڈالی (قاسم سے قاسموف یا کازیموف) مسلم حکمرانوں کی ایک دوسرے سے تباہ کن جنگیں تاریخ اسلام کا خاصہ

ہیں۔ روس کی یہ ساری مسلمان حکومتیں بھی ایک دوسرے سے مصروف پیکار رہ کر برباد ہوئیں۔ خوانین کاریموف خوانین کازان سے لڑا کیے اور وہ سب ایک دوسرے کے خلاف ماسکو کا ساتھ دیتے تھے۔ 1678 عیسوی میں کازیموف بھی سیمی روس میں جذب کرلیا گیا۔

الغ محمد کے بھائی تاش تیمور نے کریمیا کی وقیع سلطنت قائم کی تھی۔ کریمیا روس اور سلطنت ترکی کے درمیان ایک بفراسٹیٹ تھا۔ ترکی اسے اپنی سرحدی چوکی بنانا چاہتا تھا مگر سلاطین کریمیا 1783 عیسوی میں سینٹ پیٹرزبرگ سے بھی ساز باز کررہے تھے۔ 1783 عیسوی میں کیتھرین اور باب عالی کے مابین ایک معاہدہ ہوا جس کی رو سے کریمیا کی آزاد مغلیہ حکومت کا بھی خاتمہ ہوگیا۔ زار شاہین گرائی کرائمیا کا آخری مسلمان تاجدار تھا۔ کرائمیا سلطنت کو روس میں شامل کرلیا گیا۔

مملکت ازبک اور خاندان شیبان یعنی سائبیریا اور ماوراالنہر کی تاتاری حکومتوں کا تختہ زار شاہی روس نے انیسویں صدی میں الٹا اور مزید جنگیں لڑ کر بیس اربیا، مولدیو یا رومانیہ، مشرقی آرینہ وغیرہ خلیفۃ المسلمین سلطان ترکی سے اور جارجیا اور آذربائیجان ایران کے شاہان قاچار سے چھین لیے اب انھیں ڈھونڈ — الخ

روس اب تک باقتدار وسیع امپریل طاقت بن چکا تھا۔ ایک کٹر اور طاقتور کلیسا، مطلق العنان زار، جابر زمیندار مظلوم اور نیم غلام کسانوں کے اس معاشرے نے روس کی اس غمگین DARK AND BROODING روح کو جنم دیا جس نے ایک عظیم الشان ادب تخلیق کیا کہ ''معجزہ فن کی ہے خون جگر سے نمود''۔

ایشیا میں امپریلزم کی بساط پر روس اور برطانیہ اب ایک دوسرے کے زبردست حریف تھے۔ جنرل کاف مین ہندوستان پر حملے کا منصوبہ تیار کرچکا تھا۔ یہاں تک کہا جاتا تھا کہ 1857 عیسوی کی بغاوت بھی روسی ایجنٹوں نے کروائی۔ سنٹرل ایشیا پر روس کے قبضے کے بعد روس ریچھ مرو تک پہنچ گیا تھا اور لارڈ نارتھ برود ک، سیلبری، کرزن، لٹن سمیت برطانیہ کے سارے مدبروں اور انڈین گورنمنٹ کو خدشہ تھا کہ درۂ خیبر کے ذریعے ہندوستان پر حملہ کرنے والا ہے۔ اس وجہ

سے دوسری اینگلو افغان جنگ لڑی گئی کہ امیر کابل شیر علی روسیوں کا اثر اپنے ہاں نہ بڑھنے دیں۔ 1870 عیسوی میں ولادی میر ای لچ لینن کنار والگا کے شمالی تاتاری علاقے کے ایک خوابیدہ شہر میں پیدا ہوا۔

پندرھویں صدی عیسوی میں والگا کے کنارے دشت قپچاق میں ازبک قوم کا ظہور ہوا تھا۔ (ان کے سردار شیبانی خاں ازبک نے ماوراالنہر کی سلطنت تیموریہ کو فتح کیا تھا جس کے بعد ازبک لوگ ترکستان میں آ کر بسے) تو مرزا غالب کے اجداد اسی دشت قپچاق میں گھوڑے دوڑاتے پھرتے تھے۔ جب ازبکوں کو زار روس کے جنرل کاف مین نے تاشقند و سمرقند و بخارا میں مطیع کیا ہے۔ مرزا غالب نے جو کہ اردوئے معلٰی کے خان اعظم تھے، تسخیر سمرقند و بخارا کی خبر ضرور خراب آباد دہلی کے اردو اخباروں میں پڑھی ہو گی۔ مارچ 1868 عیسوی میں بخارا کے امیر مظفر الدین نے روس کے خلاف اعلان جہاد کیا اور ناکام رہے۔ اہل مغرب 1857 عیسوی میں برطانیہ کے خلاف اہل دہلی و لکھنؤ کے اعلان جہاد کا حشر دیکھ چکے تھے۔ (1873 عیسوی میں خیوا کا فیصلہ ہوا۔ جنرل کاف مین کے صلح نامے پر سید محمد رحیم خاں امیر خیوا نے لکھا کہ وہ شہنشاہ روس کا ایک ادنیٰ ملازم ہے)۔

ہندوستان اور آبائی وطن ترکستان کے یہ انقلابات دیکھنے اور ان کے متعلق سننے کے بعد اس مغل بچے نے جس کا نام مرزا اسداللہ خاں غالب تھا شاہجہاں آباد میں رحلت کی سو برس بعد اس کی 'صدی' دھوم دھام سے ہندوستان پاکستان اور مرزا کے آبائی شہر سمرقند میں منائی گئی۔ اس گہما گہمی کے کچھ عرصے بعد پہلی بار جانا راقم الحروف کا ملک روس ہوا۔

افق تا افق

جون 1969 عیسوی۔ کہرے کے نیچے سے ہرات گذر گیا۔ بلخ، مرد، بدخشاں ترمذ، کوہستان پامیر پر بادل نازک نازک سے گذر رہے ہیں۔ چینی واٹر کلرز کی طرح۔ ڈون قزاقوں اور قراقلی پوش ترکمان شہسواروں اور سمور پوش سائبیرین شکاریوں سے بھرے گھنے جنگلوں اور سبزہ زاروں کے اوپر سے گذرتے ہوئے سکوت اور وسعت کا احساس، کتنی وسعت نہ اور نہ چھور۔ شمال میں سردی پڑ رہی ہے جنوب میں موسم بہار آچکا۔ مشرقی روس میں جس وقت سورج نکلتا ہے وہی مغربی سوویت یونین میں غروب آفتاب کا وقت ہے۔ اور ایک سو سے زیادہ اقوام اور اتنی ہی زبانیں، افق تا افق نیلا آسمان زمردیں اور سیاہ زمین، خوں خوار بھیڑیوں سے پُر گھنے جنگل، عظیم دریا سب اس لرزہ خیز بے آواز پھیلاؤ میں گم۔

گھنے سر سبز جنگلوں سے گھرا ماسکو، نیچے چمکیلے دریا پر ایک روکٹ کشتی زن سے نکل گئی۔ فوجی جیٹ طیاروں کا ایک جوڑا نیلی لکیریں چھوڑتا آسمان کی نیلاہٹ میں غائب ہو رہا ہے۔

انٹرنیشنل ایرپورٹ سے لے کر شہر تک شاہراہ کے دونوں طرف صنوبر اور برچ اور سفیدے اور شاہ بلوط کے جنگل، راستے کے کنارے جنگ سے پہلے کے چوبی کاٹج اور واچا پھر جدید رہائشی بلاک، خاموش وسیع شہر، چوڑی خاموش سڑکیں، تجارتی اشتہارات، بھیڑ بھڑ کا شور مفقود گویا سنیما اسکوپ پر ایک سائیلنٹ فلم۔

گورکی اسٹریٹ۔ شعرا اور ادبا کے مجسمے فرنچ وضع کی عمارات، جدید ترین ہوٹل روسیہ سامنے ریڈ اسکوائر، بے ضرر پر سکون گھریلو سا وسیع چوک، جو کریملن کی سُرخ فصیل کے نیچے پھیلا ہوا ہے۔ ایک طرف سینٹ باسل کا رنگین گنبدوں والا فینٹیسی سا گرجا ہو ہوٹل روسیہ کے مقابل بالکل کرسمس کارڈ معلوم ہوتا ہے۔ ہوٹل کے نیچے ماسکو دریا پر سے روکٹ کشتیاں گذر رہی ہیں۔ ہر

منزل پر مستعد فلور منیجر خواتین اور کیفے ٹیریا، روم سروس مفقود، کیفے ٹیریا کے کاؤنٹرز پر بچوں کی گنتی سیکھنے والی منکوں کے فریم، کاؤنٹر والی عورتیں منکے ادھر سے ادھر سرکا کر قیمت بتاتی ہیں جانے یہ کیا چکر ہے۔ بغیر دودھ کی چائے جو چائے ہی کہلاتی ہے۔

ہوٹل کے وسیع و عریض پلیٹ گلاس پکچر ونڈوز میں سے کریملن اور ریڈ اسکوائر سینما اسکوپ اسکرین پر ایک کلوزاپ کی طرح سامنے موجود۔ امریکی سیاح کریملن کی تصویریں کھینچنے میں مصروف اور اسٹالن اور جان فاسٹر ڈلز اپنی اپنی قبروں میں کروٹ بدلتے ہیں۔

ماسکو ماہ جون کی پرسکون دھوپ ہے۔ فضا میں شاہ بلوط کی روئیں دار کلیاں برف کے گالوں کے مانند اڑتی پھر رہی ہیں۔ ہوٹل میں اور سڑکوں پر منی اسکرٹ پہنے اسمارٹ اور فیشن ایبل روسی لڑکیاں۔ روسی ٹریکٹر ڈرائیور عورت کے روایتی تصور سے مختلف ریڈ اسکوائر میں اہل شہر اور غیر ملکی سیاح اور دوسری جمہوریتوں سے آئے ہوئے لوگ ٹہلتے پھر رہے ہیں۔

لینن کے مقبرے کے سامنے طویل قطار، سنگ سرخ کا چوکور مقبرہ کریملن کی دیوار کے نیچے استادہ ہے۔ زائرین کی یہ قطار صبح سے شام تک موجود رہتی ہے۔ ایک غیر ملکی دوست نے بتایا کہ انھوں نے ایک بار ایک بوڑھے روسی کسان جوڑے کو تابوت کے پاس سے گذرتے ہوئے صلیب کا نشان بناتے دیکھا۔

کل ایک نیا بیاہا جوڑا کسی پیلس آف ویڈنگ سے آکر زائرین کی قطار کے پاس پہنچا۔ لوگوں نے جو گھنٹوں سے کیو میں کھڑے تھے انھیں بہ خوشی آگے جانے دیا۔ دونوں نے مقبرے کے بیرونی چبوترے پر جہاں گل دستوں کا انبار موجود تھا اپنا گل دستہ چڑھایا اور ٹیکسی کی طرف واپس بھاگے۔ دلہا دلہن کا لینن کے مقبرے پر گل دستہ چڑھانا قومی فریضہ ہے۔ روسی پولیس افسر اور زائرین ہم تین ہندستانیوں کو تپاک سے آگے بڑھاتے جا رہے ہیں۔ قطار کی طویل لکیر گم ڈپارٹمنٹ اسٹور کے سامنے سے شروع ہو کر روسی میوزیم کا چکر کاٹتی کریملن کے بڑے پھاٹک کے سامنے سے گذرتی مقبرے تک پہنچتی ہے۔

مقبرے کے دروازے پر نیلی وردیوں میں ملبوس بالکل ہم شکل دونوں سپاہی ساکت و

صامت بت بنے کھڑے ہیں۔ ریڈ اسکوائر کے سارے ہجوم کی نظریں کریملن کے گھنٹہ گھر پر جمی ہوئی ہیں۔ صبح کے گیارہ بجنے والے ہیں۔ ہر ایک گھنٹے بعد یہ دونوں لڑکے مشین کی سی سرعت سے دوسرے دو پہرے داروں کو جگہ دیتے ہیں۔ دیکھنے والوں کو پتہ بھی نہیں چلتا کہ گارڈ کب تبدیل ہوئی۔ اس منظر کو دیکھنے کے لیے لوگ دور دور سے آتے ہیں۔ کریملن بریگیڈ کے اس دستے کو خاص ٹریننگ دی جاتی ہے۔ چلّے کے جاڑے اور برف باری میں بھی رات کے ہر گھنٹے پر گارڈ اسی طرح تبدیل ہوتے ہیں۔ دوران جنگ میں بھی اس رسم میں ایک منٹ کا فرق نہ آیا۔

جوں ہی گھنٹہ گھر کی سوئی ساڑھے گیارہ پر پہنچی دو فوجی افسر رپ رپ کرتے اپنے کمانڈر کی قیادت میں مقبرے کے بائیں جانب سے نمودار ہوئے، مارچ کرتے ہوئے سیڑھیاں چڑھے اور پلک جھپکتے میں وہ دونوں دروازے پر اس طرح سنگینیں اٹھائے بت بنے کھڑے تھے اور پہلے والے دونوں لڑکے سیڑھیاں اتر رہے تھے۔ یہ دونوں بھی ہم شکل تھے اور ایک سا قد۔ کمال ہے واقعی۔

مقبرہ کے اندر سنگ اسود جھلملا رہا ہے۔ مکمل خاموشی، گیلریوں میں اس طرح بت بنے فوجی پہرے دار۔ تہ خانے میں ایک شیشے کے بکس میں لینن با قاعدہ سوٹ پہنے زائرین قطار اندر قطار پاس سے گذرتے دوسرے دروازے سے باہر آجاتے ہیں۔ تابوت کے چاروں کونوں پر چار فوجی اٹینشن کھڑے ہیں۔

مقبرے کے باہر کریملن کی دیوار سوویٹ مشاہیر کا قبرستان ہے۔ جب اخباروں میں پڑھتی تھی کہ فلاں فلاں سوویٹ لیڈر یا ہیرو کا انتقال ہوا اور اسے کریملن وال میں دفن کیا گیا تو سمجھ میں نہ آتا تھا کہ دیوار میں کس طرح دفن کرتے ہوں گے۔ یہ عقدہ اب جا کے کھلا۔ کرتے یوں ہیں کہ متوفی کی راکھ کا مرتبان کریملن کی دیوار کی چند اینٹیں نکال کر اس میں رکھ دیتے ہیں اور پھر اسے بند کر کے اوپر نام کی تختی لگا دیتے ہیں۔ وہیں پہلے خلائی انسان حوانمرگ یوری گاگارن کی تختی لگی تھی — دیوار کے نیچے سرو کے درختوں کے سائے میں با قاعدہ قبریں تھیں۔ ان میں سے ایک قبر آنجہانی اسٹالین کی تھی۔ دیوار کے نیچے بھی ڈھیروں پھولوں کی ٹوکریاں اور گل دستے رکھے

تھے اور قبروں پر بھی لٹا اسٹالین کی قبر کے جو سنسان پڑی تھی مگر اس پر بھی کسی بگڑے دل نے ایک گل دستہ رکھ دیا تھا۔ اسٹالین اندر لینن کے برابر ایک بلوریں تابوت میں خوابیدہ تھے بعد زوال ان کو مقبرہ بدر کیا گیا۔

کریملن کے پہلو میں شاہی باغ ہے جس میں زار لوگ ٹہلتے تھے۔ اب جنتا ٹہل رہی ہے اور آئس کریم کھا رہی ہے۔ یہیں قلعے کی فصیل کے نیچے سنگ مرمر کے وسیع چبوترے پر ''ابدی شعلہ'' فروزاں ہے اور مرمریں کتبوں پر ''لینن گراڈ''، ''اڈیسہ''، ''والگوگراڈ''، ''کیو'' اور دوسری Hero Cities کے نام کندہ ہیں جن کے لاکھوں شہری نازی حملہ آوروں کا مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہوئے۔ لوگ آتے ہیں خاموشی سے کسی ایک کتبے کے نزدیک گل دستہ رکھ کر چلے آتے ہیں۔

''آج کیا قومی شہدا کی یاد منانے کا دن ہے؟'' میں نے اپنی ترجمان لیوبا سے پوچھا۔ ''نہیں لوگ سال بھر روزانہ پھول لاتے رہتے ہیں ہر روسی کنبے کا کم از کم ایک فرد جنگ میں کام آیا ہے۔ ان سب لوگوں کا کوئی نہ کوئی عزیز ان شہروں میں سے کسی ایک کی دفاع میں شہید ہوا ہوگا۔''

شاہی باغ میں ہر فرد بشر آئس کریم کھا رہا ہے۔ ساری روسی قوم ہمہ وقت یا آئس کریم کھاتی ہے یا ثقیل کتابیں پڑھتی ہے۔

کریملن کے اندر گرجاؤں میں امریکن سیاحوں کا ہجوم ہے۔

باہر ایک فصیل کے نیچے ایونیو کے برابر ماسکو دریا بہہ رہا ہے۔ اس پار عین مقابل میں برطانوی سفارت خانہ جیمز بونڈ کے لیے آئیڈیل لوکیشن۔

سوویٹ رائٹرز یونین جس محل میں واقع ہے وہ ٹالسٹائی کے جنگ اور امن والے کاونٹ راسٹوف کا مکان تھا۔ اس کے پڑوس میں رائٹرز یونین کلب کی عمارت انقلاب سے قبل فری میزری کی گرینڈ لاج تھی۔ روسی زبان کے مترجموں کی بین الاقوامی کانفرنس اسی مکان میں ہو رہی ہے۔ پوچھیے آپ کہاں کی روسی مترجم ہیں تو اس کا ماجرا یوں ہے کہ چند سال قبل مکتبہ جامعہ نئی دہلی

نے چند روسی ناولوں میخائل شولوخوف وغیرہ کے انگریزی ترجمے بھیجے تھے کہ ان کو اردو میں منتقل کر دیجیے۔ کر دیے۔ اچانک ایک روز ماسکو سے اطلاع ملی کہ آپ کو سوویٹ لینڈ نہرو ایوارڈ دیا جائے گا۔ برائے تراجم اور اس کے ساتھ روس کی سیر۔ جہاں چاہیے جائیے۔ ہم نے کہا "ضرور جائیں گے۔ لہٰذا آ گئے۔" مع ملیام اور گجراتی کی ایوارڈ یافتہ شاعر اور ادیبہ مسز نمبودری اور مسز جیا ٹھاکر جو احمد آباد کے کسی کالج میں انگریزی پڑھاتی تھیں۔ سیدھی سادی ہاؤس وائف ذرا اونچا سنتی تھیں۔ روس کا دوسرا سفر تھا مگر مستقل حواس باختہ رہتی تھیں۔ شری نمبودری ایک معمر اسکول ٹیچر روس کی ہر چیز پر عش عش کر رہے تھے۔ ہوٹل روسیہ کے ایک طعام خانے میں بھائی نمبودری ایک روز لحم گاؤ کھاتے نظر آئے۔ میں نے سمجھایا شاید ان کو معلوم نہیں آگاہ کیا۔ مختصراً جواب دیا "کمیونسٹ گائے ہے"۔

مسٹر نمبودری بعض دفعہ بڑی المناک بات کرتے تھے۔ وہ ایک غریب مدرس تھے اور پہلی مرتبہ اپنے صوبے کیرالہ سے باہر نکلے تھے۔ ایک شام ہوٹل ماسکو میں نمبودری صاحب نے بڑے ٹھاٹھ سے لیوبا کو حکم دیا "میرے لیے شمپین منگواؤ، میں نے ساری عمر انگریزی لٹریچر میں شمپین کا تذکرہ پڑھا ہے۔ چکھ کر دیکھنا چاہتا ہوں کیسی ہوتی ہے۔"

وانگا بوٹ مین کا گیت

کانفرنس میں چونتیس (34) ممالک کے ایک سو بیس (120) ادبا و مترجمین مع برطانیہ، فرانس، اٹلی وغیرہ کے نمائندوں کے۔ یہ لوگ سب روسی کلاسیکس اور احمد وا۔ شولوخوف، یوتیشنکو اور وزنینکی کے اپنے ہاں ترجمے کرتے ہیں۔ ماسکو سے الیانوسک جاتے ہوئے طیارے میں نیو یارک کی ایک روسی نژاد اور پبلشر خاتون جس کا ادارہ صرف روسی تراجم شائع کرتا ہے۔ ایک نارویجین سے بزبان فرنچ مصروف گفتگو ہیں۔ میرے برابر بیٹھی سلور گرے بالوں والی ایک بی بی انگریزی میں مجھ سے اپنا تعارف کرا رہی تھیں "میرا نام کلارا سوچی ہے۔ بوڈاپسٹ میں میری والدہ اور امرت شیر گل کی ماں بچپن کی ہجولیاں تھیں۔"

کلارا کے خسر جنگ سے قبل سے پیرس میں آباد ہو چکے ہیں۔ ان سے ملنے وہ ہنگری سے اکثر فرانس جاتی رہتی ہیں۔ اور روسی، فرنچ اور انگریزی روانی سے بولتی ہیں۔

ہم جنوب مشرق کی طرف پرواز کر رہے ہیں جہاں خوانین چغتائیہ کی سرزمین پر سے بہتا ہوا عظیم وانگا بحر خزر کی طرف رواں ہے۔ اس کے ایک کنارے پر شہر سرائے واقع ہے اور دہانے پر استراخان مغل دنیا میں کہاں کہاں نہیں پہنچے۔ اور پھر صفحۂ ہستی سے ایک دم غائب۔

اولیانوسک کے مضافات میں یکساں وضع کے رہائشی بلاک، سب کی بالکنیاں، تیز نیلے بھدے رنگ میں رنگی ہوئی۔ یہ جانے اتنے خوش ذوق روسیوں کو بیٹھے بٹھائے کیا ہو جاتا ہے۔ ایک بالکنی پر شکستہ سائیکل رکھی ہے۔ بچے کی گاڑی رسی سے لٹک رہی ہے۔ منظر و فضا بے حد Human ہو گیا۔ ہر اجنبی شہر مانوس شہر ہے۔ ہر جگہ ایک سے انسان بستے ہیں۔ خواہ وہ اٹلی ہو یا امریکہ یا برازیل یا شمالی روس۔

ایک ٹرک پر لدے "ینگ پانیر" بچے ہنستے کھلکھلاتے زن سے نکل گئے۔ دوسرا ٹرک،

تیسرا ٹرک، سرخ ٹوپیاں، سرخ رومال، خواتین چغتائیہ کی اولاد، لینن کا چہرہ مہرہ بھی تاتاری تھا۔

''منگولوں نے ہم پر تین سو سال حکومت کی''۔ کوچ میں برابر کی سیٹ پر بیٹھا الوشا مجھے یاد دلاتا ہے (الوشا زیرشیف یورپین روسی ہے ماسکو کے اہم ادبی رسالے کا نائب مدیر اور جدید انگریزی ادب کا ایکسپرٹ)۔

الیانوسک۔ والگا کے کنارے چھوٹا سا شہر، چوبی مکانات، سایہ دار سڑکیں، ہمارے ہوٹل کے کچھ فاصلے پر والگا بہہ رہا ہے، رات ہوئی، گھپ اندھیری رات، والگا کے کنارے بہت تیز ہوا چل رہی ہے۔ رومانیہ سے آئے ہوئے چند ادیب خواتین وحضرات کے ساتھ میں ساحل پر ٹہلتی ہوئی بہت دور چلی گئی۔ شاید تاریکی میں کہیں دور لہروں پر سے ''والگا بوٹ مین کا گیت'' سنائی دے جائے۔ صبح کو ہم لوگ لینن کے مکان میں جاتے ہیں جس میں وہ پیدا ہوئے تھے۔ سڑک کے دونوں طرف چوبی بنگلے، لینن کے مکان کی چوبی دیوار کے باہر فٹ پاتھ پر درختوں کے زرد پھول گر رہے ہیں۔ زائرین اور اسکول کے بچوں کا ہجوم، احاطے میں اونچی اونچی گھاس ایک طرف کنواں، لکڑی کا ڈول، چرخی، رسی۔ یہاں لینن کی ماں پانی بھرتی تھی، باپ اسکول انسپکٹر تھا مگر ایک معمولی انسپکٹر آف اسکولز کا معیارِ زندگی نئے امپیریل روس میں کتنا بلند ہو چکا تھا۔ ڈرائنگ روم میں پیانو، فوٹو گراف، وکٹورین فرنیچر۔ والدۂ لینن کے کمرے میں وکٹورین سنگھار میز پر ان کی اون اور سلائیاں اسی طرح رکھی ہیں۔ وکٹورین تہذیب ہمہ گیر تھی۔ یہ ساز و سامان، لیمپ، قلم دان، برتن، سائیڈ بورڈ صوفے، آرام کرسیاں۔ یہ روسی مکان نہیں تھا۔ ایک اجنبی تاتاری صوبے میں انیسویں صدی کا ایک مڈل کلاس روسی وہی چیزیں استعمال کر رہا تھا جو برطانوی ہند کے شہریوں کی سول لائنز میں مستعمل تھیں۔ 1870 عیسوی کے زارشاہی روس میں والگا کے کنارے کے اس مکان اور 1870 عیسوی میں گنگا کنارے آباد کسی کوٹھی میں زیادہ فرق نہ تھا۔

دو منزلہ اسکول۔ لینن کا ڈیسک جس پر نئے طالب علم کو پہلے روز بہ طور نیک شگون بٹھایا جاتا ہے!

اسکول سے کچھ فاصلہ پر نشیب میں والگا بہہ رہا تھا، سڑک پر دھول اڑ رہی تھی۔ ایک فوجی دستہ مارچ کرتا ہوا بولیوار پر سے گذر گیا۔ پتھر کے اطالوی جنگلے کے کنارے کنارے بولیوار پر الیانوسک کے شہری چہل قدمی کر رہے تھے۔ جنگلے کے نیچے سرسبز ڈھلوان پر دور دور تک چوبی کاٹج کھڑے تھے۔ اس کے بعد عظیم والگا جس پر اسٹیمر چل رہے تھے اور لکڑیوں کے گٹھے لادے جہاز اور تجارتی بجرے اور فولادی بیڑے۔ حد نظر تک والگا تھا۔

دوسری رات۔ پیلس آف کلچر کی جھاڑ فانوس اور قالینوں سے آراستہ عظیم الشان عمارت کے ہال میں تاتاری ادیبوں کا مجمع۔ اسٹیج پر بیٹھے ایک صاحب کا نام قاسموف ہے۔ شکل سے ایرانی لگتے ہیں یا آذربائیجانی یا اگر شیروانی پہنا دی جائے تو ایرانی نژاد لکھنوی نام سید قاسم حسین رضوی بی اے علیگ ہو سکتا ہے کیا پتہ کامریڈ قاسموف کے والد کا نام سید کاظم حسین رضوی ہی رہا ہو۔ اور شیروانی پر یاد آیا کہ یہ لباس کیا شیروان (آذربائیجان) سے ہمارے ہاں پہنچا تھا؟ بہر حال یہ قاسموف صاحب شکلاً تاتاری نہیں یقیناً آذری ہوں گے۔ آذربائیجانی ہی نکلے۔

طویل تقریریں جاری ہیں کیمروں کی فلیش لائٹ بار بار چمک رہی ہے۔ میں اٹھ کر باہر آ جاتی ہوں۔ پیلس آف کلچر کی شہ نشین کا رخ والگا کی جانب ہے۔ تاریک رات دور دور تک پھیلی ہوئی ہے۔ دریا پر روشنیاں جھلملا رہی ہیں۔ والگا کے دوسرے سرے پر یہاں سے بہت فاصلے پر کازان ہے۔ جنوب میں اردوئے معلا کا سرائے۔

......دو مرتبہ درمیان الیشان کار بات عظیم در پیوست و تموچن ظفر یافت در چہل و نہ سالگی و بقولے در پنجاہ سالگی در رمضان پانصد و نود و نہم بدولت سلطنت و جہانداری کامران شد و چوں مدت سہ سال از فرماں روائی و جہانبانی او گذشت بت تنکری[1] کہ از مبشران عالم غیب و مژدہ رسانان درگاہ کبریا بود بالہام ربانی تموچن را بخطاب چنگیز خان مخاطب ساخت یعنی شاہ شاہان روز بروز نجم سعادتش فروزاں تر می شد۔ وسال بہ سال برق دولتش سوزاں تر می گشت بر تمام خطائے و ختن و چین و ماچین و دشت قپچاق و سقسین و بلغار و روس و آلان وغیرہ آں سروری یافت او را چہار فرزند بود۔ جوجی چغتائی، اوکدائی، تولی، ترتیب بزم بزم و شکار تعلق بجوجی داشت[2]۔

''ہلو۔ کیا ہو رہا ہے۔''

میں نے چونک کر دیکھا۔ ایک انگریز دان داغستانی تاتار شاعرہ جنگلے سے ٹک کر سگریٹ سلگا رہی تھی۔ ''موسم گرما کی راتیں'' اس نے کہا۔ ''والگا کے کنارے نہایت خوش گوار ہوتی ہیں۔ آپ کو خود مختار جمہوریہ داغستان کی سیاحت ضرور کرنی چاہیے۔ والگا پر جہاز کے ذریعے یہاں سے والگو گراڈ تک کا سفر۔''

والگو گراڈ یعنی چغتائیوں کا سرائے۔

حواشی

1. ترکی زبان میں خدا کا نام
2. اکبر نامہ

آدھی رات کا سورج

ہوٹل لینن گراڈ جنگ سے پہلے کی عمارت ہے، جمے ہوئے انگریزوں کی سڑک جس پر سے گذرتی ٹرامیں عورتیں چلا رہی ہیں۔ سرمئی دومنزلہ عمارتیں کچھ کچھ پرانے لندن کی جھلک۔ لینن گراڈ، پیٹروگراڈ، سینٹ پیٹرز برگ۔ روس کے بجائے مغربی شہر ہے جسے 1703 عیسوی میں پیٹر اعظم نے جرمنی اور فرانس سے معمار بلوا کر تعمیر کروایا تھا۔ اس کا نام بھی خالص جرمن رکھا۔ سینٹ پیٹرز برگ۔ جرمن ہی اس شہر پر ڈھائی سو سال بعد قیامت ڈھانے والے تھے۔

خالص یورپین شہر جو شمال کا وینس کہلاتا ہے اور دریائے نیوا کے دہانے پر ایک سو جزیروں پر آباد ہے۔ ان گنت نہریں، چھ سو پل رفیع الشان عمارتیں۔

طعام شب کے بعد اپنی فلور پر جا کر میں نے اپنے کمرے کے دریچوں کے سیاہ پردے برابر کیے تا کہ قطب شمالی کے سورج کا اجالا معدوم ہو جائے۔

جب آنکھ کھلی اور اٹھ کر پردے کھینچے۔ باہر دن کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ پیٹر اعظم کے سمر پیلس پیٹر ہاف جانے کے لیے بندرگاہ روانہ ہونے کا وقت صبح نو بجے کا تھا۔ فوراً تیار ہو کر باہر گئی۔ گیلری میں سناٹا۔ بہت دیر ہو گئی۔ سب لوگ بریک فاسٹ کے لیے نیچے جا چکے ہوں گے۔ نیچے ڈائننگ ہال سنسان۔ لے بھیا، لوگ باگ ناشتہ کر کے بندرگاہ چلے بھی گئے۔ باہر چوکیدار اسٹول پر بیٹھا تھا۔ اشاروں میں پوچھا کیا لوگ جا چکے ہیں؟ اس نے نہایت مبہم انداز میں سر ہلایا۔

باہر نکل کر ٹیکسی ڈھونڈوں مگر ڈرائیور کو کیسے سمجھاؤں کہ بندرگاہ جانا ہے۔ سڑک پر سناٹا۔ عجیب ماجرا ہے۔ لوگ سب کارخانوں اور دفتروں کو جا چکے ہیں۔ کم از کم صبح کا دس بجا ہوگا۔ آسمان سورج کی روشنی سے معمور۔ اچھا ٹیکسی کر کے پہلے رائٹرز یونین جاؤں وہاں سے وہ لوگ بندرگاہ

پہنچادیں گے۔ مگر رائٹرز یونین کا پتہ کسے معلوم ہے۔ ٹیلی فون بوتھ سے فون کیا جائے۔ لیکن یہاں ٹیلی فون ڈائریکٹریاں ہی نہیں ہوتیں۔ کچھ سڑک پر اِدھر اُدھر گھوم کر ہوٹل واپس۔

ایک انفارمیشن ڈیسک پر ایک لڑکی بیٹھی کچھ پڑھ رہی تھی۔ اس نے سر اٹھا کر تعجب سے دیکھا۔ اسے انگریزی آتی تھی۔ میں نے واقعہ بتایا کہنے لگی ابھی تو صبح کے صرف تین بجے ہیں۔

FINNISH BAY کی سمت جو لکڑی اسٹیمر جا رہا ہے اس میں اور مغربی یورپ کے کسی جہاز میں ذرا فرق نہیں للا اس کے کہ ڈرائنگ روم میں مارکس اور لینن کے مجسمے سجے ہیں۔ اور اسٹیمر کا نام شوچنکو ہے جو یوکرین کا قومی شاعر تھا۔ اور مسافر سنجیدگی سے شطرنج کھیلنے میں محو ہیں۔ سطح سمندر پر سے شہر کی اسکائی لائین اور گرجا کے منارے نظر آ رہے ہیں۔ شالی یورپین فضائی۔ کلارا سوچی اور ان کا ہنگرین ساتھی ڈاکٹر زولٹن (سلطان رومانیہ کی طرح ہنگری پر ترکی سابقہ تسلط کا لسانی اثر) جہاز کے ایک ریسٹوران میں دریچے کے پاس کیویار کھا رہے۔ باہر ایک دوکان پر ایک لبنانی عیسائی شاعر اپنے بچوں کے لیے کھلونے خرید رہا ہے۔ سامنے سے گذرتا ایک مصری اسے مخاطب کرتا ہے۔

''السلام علیکم''۔

''رحمتہ اللہ''۔ وہ تپاک سے جواب دیتا ہے۔ کھلونے خرید کر ڈیک پر چلا آتا ہے جہاں جیہ بین اکتائی ہوئی کھڑی ہیں۔ ''میں تو اپنے کیبن میں جا کر سوتی ہوں جب پیٹر ہاف آئے مجھے جگا دینا۔'' انھوں نے مجھ سے کہا۔

''آپ کو سمندر اچھا نہیں لگ رہا؟''

''اس میں کیا خاص بات ہے؟ بہت سارا پانی ہی تو ہے۔'' وہ جمائی لیتی اپنے کیبن کی سمت روانہ ہو جاتی ہیں۔ لبنانی شاعر اب ریلنگ پر جھکا سمندر کو تک رہا ہے۔ وہ عرب اسرائیل سیاست کا تذکرہ چھیڑ دیتا ہے۔

''آپ عرب لوگ——'' میں کہنا شروع کرتی ہوں۔

''میں عرب نہیں ہوں۔'' وہ برا مان کر کہتا ہے۔ ''فنیقی ہوں۔'' پھر وہ عربوں کی شکایتیں

شروع کرتا ہے۔

بہت ممکن ہے وہ بیروت کی خانہ جنگی میں اب تک مارا گیا ہو بے چارہ اپنے بچوں کے لیے کس شوق سے کھلونے خرید رہا تھا۔

سمندر پر سردی بڑھتی جا رہی ہے۔ ایک سرخ رنگ کی چھت والے مکان کی وضع کی کشتی سامنے سے گذرتی ہے۔

دور سے پیٹر ہاف نظر آنے لگا۔ ایک بلغاری شاعر جو شکل سے فلم ایکٹر لگتا ہے ریلنگ پر جھک کر شکستہ فرنچ میں کہتا ہے۔ ''بالکل ورسائی کی قسم کا محل ہے''

یہ واقعہ ہے کہ ان سب یورپین اقوام کا تہذیبی ورثہ ایک ہے۔ پیٹر ہاف کی سنسان جیٹی پر ایک موٹی روسی عورت پختہ عمر، سر پر رومال باندھے، پھرتی سے آگے بڑھی، کیا طاقت ور خاتون تھی۔ یہ موٹا رسا اٹھا کر اس نے جہاز کو کھونٹے سے باندھ دیا۔ گھاٹ کے دفتر میں ایک لڑکی اپنی ڈیوٹی پر چوکس بیٹھی تھی۔ سیلانی روسیوں سے بھری طیارہ نما جیٹ کشتیاں آ آ کر جیٹی سے لگ رہی تھیں۔ یہ اتوار کا دن تھا۔

ایک طویل پُل کے اختتام پر وہ مشہور عالم والر گارڈنیز جن کے نادر برنجی مجسمے جرمنوں نے تباہ کر دیے تھے۔ سب دوبارہ بنالیے گئے۔ باغ کی سیڑھیاں چڑھ کر زار کا محل۔ ایک سرپولیین کے نیچے بالٹک لہریں مار رہا ہے۔ اس چوبی بنگلے کی دیواریں بیش قیمت تصاویر سے مزین ہیں۔ ایک کمرے میں نادر چینی ظروف اور ایرانی میناتور، ایرانی تصاویر، روسی جنرل قاچاری ایران کے خلاف جنگوں میں ظفریاب ہونے کے بعد وہاں سے لا کر زاروں کو پیش کرتے ہوں گے۔ اسی طرح مغل نوادر انگلستان پہنچے۔

زار پیٹر کا یہ روسی ڈچ وضع کا محل بھی جرمن معماروں نے تعمیر کیا تھا اور جرمنوں ہی نے اسے 1941 عیسوی میں تاراج کیا۔ وسیع باورچی خانے (جہاں پیٹر اعظم زیادہ وقت گذارتا تھا) دریچے بھی بالٹک پر کھلتے ہیں۔ محل کے باغات، فوارے اور آبشار ورسائی کی طرز کے ہیں ''آبی باغات'' میں پیٹر نے Joke Fountains لگوائے۔ ان زمین دوز خفیہ فواروں پر زار کے

مہمان پاؤں رکھتے اور پانی اچھل کر ان کو شرابور کر دیتا۔ پیٹر بے حد محظوظ ہوتا۔ اس کا حس مزاح مشرقی سلاطین کا سا ہے۔ مغل بادشاہوں کی طرح وہ بھی پانی اور فواروں کا شائق تھا۔ چودہ میل دور تک پیٹر ہاف کے لیے پانی کے پائپ پھیلائے گئے تھے۔ یہ ڈھائی ہزار پائپ دس ہزار گیلن پانی فی سکنڈ چشموں سے لاتے تاکہ پیٹر کے واٹر گارڈنز کے فوارے مسلسل چلتے رہیں۔

اب دھوپ سڑک اور ساحل پر اتر آئی ہے۔ پیٹر کے آبی باغ میں بچے اچھلتے کودتے پھر رہے ہیں۔ کہیں پاؤں رکھو دو ایک خفیہ فوارے کا پانی اچھل کر شرابور کر جاتا ہے۔ فضا مسرور قہقہوں سے معمور ہے۔ ڈھلوان پر شاندار جنگل سمندر ہوائیں سائیں سائیں کر رہی ہیں۔ ساحل پر ایک درخت کے نیچے بیٹھا ایک روسی مصور — جو یورپ کے کسی بھی ملک کا مصور ہو سکتا ہے — فرنچ بیرے — فرنچ کٹ داڑھی — چوری سیاہ بوٹائی — ایزل پر تصویر بنا رہا ہے۔ اس نے سر اٹھا کر پاس سے گذرتے ہم لوگوں کو دیکھا تک نہیں۔

وہ سارا زمانہ سمندر میں واپس آ گیا۔

پیٹر یقیناً ہندوستان کے شاہانِ مغلیہ کی طرح دارا حشم اور عیش پسند تھا۔ (اس قسم کی روسی اور ہندی مغل شان و شوکت کو صنعتی انقلاب سے قبل یورپین سیاح BAR BARIC SPLENDOUR کہتے تھے۔) لیکن فرق یہ تھا کہ ہمارے بادشاہ اپنے حال میں مگن رہے۔

اورنگ زیب کے ہم عصر پیٹر نے خود مغربی یورپ جا کر جہاز سازی کے کارخانوں میں کام سیکھا اور مغربی ماہرین بلوا کر اپنے ملک کو ترقی کے راستے پر لگا گیا ورنہ ایک زمانہ تھا کہ روسی زار اپنے تاتاری آقاؤں سے ہمسری کا دعویٰ نہ کر سکتے تھے اور ان سے ملنے سے کتراتے تھے۔ تاتاری سلاطین ان کو اجڈ اور گنوار سمجھتے تھے — دربار میں نقالوں، مسخروں اور پہلوانوں کے تماشے اور دنگل روسی خواص و عوام کی تفریحات تھیں۔ شاہی جشن دیہاتی زمینداروں کی تقریبات سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے تھے۔

پیٹر اعظم نے ماسکو میں تھیٹر تعمیر کروایا۔ بیلے کو ترقی دی۔ سوئیڈن سے جنگ جیتا تو جنگی قیدیوں کو حکم دیا کہ درباریوں کو مغربی رقص سکھائیں۔ پیٹر اپنے تین عظیم حریفوں سوئیڈن، ترکی اور

ایران کے خلاف جدال کرنے کے ساتھ ساتھ روس کو موڈرن بنانے کے درپے رہا۔ جب اس نے روسی عورتوں کو پردہ ترک کرنے اور مردوں کو داڑھیاں منڈوانے کا حکم دیا ہے اس کے کچھ عرصے بعد باب عالی میں متعین برطانوی سفیر لارڈ پجیٹ نے جولائی 1701 عیسوی میں اپنی ڈائری میں لکھا "روسی سفیر اور اس کے افسر سلطان ترکی کے دربار میں ایسا حلیہ بدل کر پہنچے ہیں کہ ترک اچنبھے میں ہیں سارے روسیوں نے فرانسیسی پوشاک پہن رکھی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی سونے چاندی کے جھالروں سے مزین ہیں۔ ترک سب سے زیادہ متعجب اس بات پر ہیں۔ ان سارے تازہ وارد روسیوں کی داڑھیاں غائب یا مظہر العجائب، مغرب میں عبادت کے وقت ٹوپی اتارنے کا دستور ہے۔ جبکہ مشرق میں سر ڈھانپ کر نماز پڑھی جاتی ہے۔ روسی بھی اب تک سر ڈھانپ کر عبادت کرتے تھے۔ پیٹر اعظم کے نئے دربار کے یہ نئے روسی جو ترکی آئے ہیں انھوں نے اور یا نوبل کے گرجا میں ماس کے وقت مارے مغربیت کے جوش کے ٹوپیاں تو ٹوپیاں وگ تک اتار دیے۔"

اسی مغربیت زدگی کی وجہ سے روس کے طبقہ امرا کو عیش پرستی اور اچھے مکانوں اور اعلیٰ طرز آرائش کا شوق چرایا ورنہ اس سے قبل عام مشرقیوں اور دیہاتی زمینداروں کی طرح یوں ہی اپنے گھاس پھوس پڑے رہتے تھے۔ اب چوبی مکانوں کے بجائے پتھر اور اینٹ کے محل دو محلے تعمیر کیے گئے۔ پیٹر کے شہر میں روسی جگمگاہٹ، ڈچ روف لائن فرنچ لے آؤٹ اور جرمن سجاوٹ نظر آتی ہے۔

لینن گراڈ کے چپے چپے سے پیٹر کی روح جھلکتی ہے۔ وہ روس کا آج بھی ہیرو ہے اور اسے عوام دوست حکمراں سمجھا جاتا ہے۔ بڑا عجیب وغریب شخص رہا ہوگا۔ بے تحاشہ لمبا تھا۔ اس کا ماڈل خود اسی کی پوشاک میں ملبوس ارمتاژ کے میوزیم میں موجود ہے۔ سر پر اس کے اصل بال جو مرتے وقت کاٹ دیے گئے تھے۔ لگائے گئے ہیں۔ سرخ بال، نیلی سرد آنکھیں پُر جلال شخصیت، دیوکا دیو، سات فٹا، ایک گلاس کیس میں کرسی پر بیٹھا ہے۔ یہ محل ونٹر پیلس اس کی بیٹی بنوا گئی۔ زار پیٹر کے بعد روس پر تین زارنیہ حکمراں رہیں۔ تینوں ایک سے ایک تیز فہم اور دانا۔ پیٹر کی لڑکی ایلزبتھ اوّل 1741 عیسوی میں تخت نشیں ہوئی اس کے عہد میں جرمنی اور ہالینڈ کے بجائے فرانس اور روسیوں کا تہذیبی آئیڈیل بنا۔ وہ بھی باپ کی طرح نفاست پسند اور عیش پرست تھی۔ اس نے

اور زیادہ بڑھیا عمارتیں بنوائیں اور کاخ زمستان جو یورپ کا سب سے بڑا محل ہے۔ ڈیڑھ ہزار کمرے 1945 دریچے ایک سوستر زینے پھر اس نے دریائے نیوا کی منجمد سطح پر برف کی سلوں کا ایک تھیٹر بنوایا اسی کے عہد میں تھیٹر اور بیلے کا فروغ ہوا۔ اس کی بیٹی کیتھرین دوئم (1762 عیسوی تا 1796 عیسوی) کے عہد میں فرانسیسی ادب کا چرچا ہوا جس نے روسی ذہن کی تربیت کا آغاز کیا۔ نئے سیاسی تصورات، والٹیر، سیاسی آزادی وغیرہ کی باتیں روسی مصنفین اور شعرا نے شروع کیں۔ ساتھ ہی اپنے روسی ماضی پر ناز کا احساس پیدا ہوا۔ کیتھرین دی گریٹ نے اسلامی حکومتوں کو زیر کیا اور نئے مقبوضات روسیوں کے ہاتھ لگے۔ انھیں سیر وسیاحت کا شوق پیدا ہوا۔ کتب خانے قائم کیے گئے۔ امرا نے ذاتی لائبریریاں جمع کرنی شروع کیں۔ تعلیم اب تک مذہبی اسکالرشپ اور گرجاؤں، خانقاہوں اور راہبوں تک محدود تھی۔ اب طرز جدید کی یونیورسٹیاں قائم ہوئیں۔ یورپین کتابوں کے ترجمے کیے گئے۔ رومن نیوکلاسکی یا جارجین طرز تعمیر جو اس وقت یورپ اور انگلستان میں رائج تھا (اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیر اثر ہندوستان میں بھی پھیل رہا تھا) روس میں اس کا رواج ہوا۔ کیتھرین کبیر جو نہایت دل پھینک اور عاشق مزاج عورت تھی۔ یورپین اور انگریز ماہرین فن تعمیر اور مصوروں، موسیقاروں وغیرہ سے رومان بھی لڑاتی رہی۔ اطالوی مصوروں کو روس مدعو کیا۔ اب تک بازنطینی مذہبی مصوری رائج تھی۔ ان اطالوی مصوروں نے مغربی طرز مصوری کو روس میں فروغ دیا۔

کیتھرین نے 1796 عیسوی میں وفات پائی۔ اس کا بیٹا پال ایک انتہائی ظالم وجابر زار ثابت ہوا۔ 1801 عیسوی میں اس کی موت کے بعد اس کا بیٹا الیگزنڈر اوّل تخت نشین ہوا۔ یہ خاصا روشن خیال تھا اور اس نے SERF DOM کے خاتمے اور اصلاحات کے منصوبے بنائے مگر اس وقت تک نپولین روس پر چڑھائی کا پروگرام بنا رہا تھا۔ لہٰذا الیگزنڈر اوّل ریفارم ملتوی کر کے ملک کی اسلحہ بندی پر جٹ گیا۔ روس اور فرانس کی جنگ 1812 عیسوی میں ہوئی۔ نپولین پر روسیوں کی فتح ایک معجزہ تھی۔ الیگزنڈر کو خیال آیا کہ فتح محض مدد الٰہی کی وجہ سے ہوئی لہٰذا وہ کاروبار سلطنت کاؤنٹ اراکشیف کو سونپ کر خود تصوف اور عبادت میں مصروف ہو گیا یہ کاؤنٹ بے حد

ظالم نکلا۔ اس کے مظالم کی وجہ سے ملک میں اصلاحات کا مطالبہ شروع ہوا۔ چند فوجی افسروں اور دانشوروں نے مل کر ایک انقلابی جماعت کی تشکیل کی۔

1812 عیسوی میں فرانسیسی حملے نے ماسکو تاراج کر دیا تھا۔ الیگزینڈر اوّل نے شہر دوبارہ تعمیر کروایا۔ نیا طرز تعمیر "نیا روسی ایمپائر اسٹائل" کہلایا۔ اس میں ساسانی، اولین اسلامی ایرانی اور کلاسیکل یورپین طرز تعمیر کی ہلکی سی جھلک موجود تھی۔ 1825 عیسوی میں سیاسی فسادات بپا ہوئے جبھی زار الیگزینڈر اوّل نے انتقال کیا۔ اس کے بیٹے اور جانشین زار نکولس اوّل نے سیاسی تحریک کو نہایت بے رحمی سے کچلا۔ روسی شاعر الیگزینڈر پشکن اسی زمانے کا حریت پسند شاعر تھا۔ بہت سے انقلابی لیڈر قتل کیے گئے۔ باقی سائبیریا بھیج دیے گئے۔ یہ زیادہ تر تعلق امرا سے رکھتے تھے۔ اس وجہ سے زار نکولس اوّل نے ارسٹوکریسی کی طرف سے بدگمان ہو کر نئی مڈل کلاس کو اپنا وفادار بنانا چاہا اور انھیں بہت سی مراعات دیں۔ یہ نئی مڈل کلاس بہت جلد خود ایک عیش پسند متمول طبقے میں تبدیل ہوئی چنانچہ اس میں مزید انقلابی لیڈر پیدا ہوئے۔

زاروں نے اپنی مطلق العنانی میں مشرقی حکمرانوں کو مات کر رکھا تھا۔ (اس وجہ سے اہل مغرب کہتے تھے کہ ان کی یہ ستم کوشی ان کے نیم مشرقی خون اور نیم ایشیائی تمدن کا ورثہ ہے شہسواری، ڈنگل، رقص و سرود، واٹر کارنیول سینٹ پیٹرز برگ کی ارسٹوکریسی کے مشاغل تھے۔ زارنیہ کیتھرین کبیر چوبیس ہزار درباری ساتھ لے کر سفر پر نکلتی تھی۔ 1761 میں اس کے پاس فقط پندرہ ہزار لباس تھے۔ قصر سرما کے ارمتاژ (یعنی راہب خانہ) میں ذاتی نوادر جمع کرنے شروع کیے۔ دو سو پچیس تصاویر خریدیں پھر خریدتی ہی چلی گئی۔ وغیرہ وغیرہ)۔ سینٹ پیٹرز برگ انیسویں صدی میں شاعروں، مصوّروں اور موسیقاروں کا شہر تھا۔ ایک محلے میں نکڑ پر دستووسکی کا مکان موجود ہے۔ وہ ہمیشہ نکڑ کے مکانوں میں رہنا پسند کرتا تھا اور اس کے پچھواڑے وہ تنگ و تاریک محلّہ جس کا انٹریر دستووسکی کے ناولوں کا داخلی ماحول ہے جرم و سزا سے متعلق جگہیں۔

پشکن کا گھر زار شاہی امرا کے ایک محلّے میں نہر کنارے واقع ہے۔ سجا سجایا مکان، لائبریری، وہ صوفہ جس پر ڈوئیل لڑنے کے بعد زخمی ہو کر اس نے دم توڑا۔ بیوی کے پارلر میں اس

کی میز پر درزی کے بل۔ ''پشکن کی بیوی بالکل DUMB تھی فضول خرچ، فیشن کی شوقین اور اسی کے عشق میں پشکن نے اپنی جان دی۔'' کلارا آہستہ سے اس انداز سے کہتی ہیں گویا ہم عصر عورت کے متعلق شکایت کر رہی ہوں۔ یعنی ذرا دیکھو تو سہی مادام پشکن کتنی کم عقل ہیں۔

دریا کے کنارے روسی مصنفین کا میوزیم۔

سارا لینن گراڈ ایک اوپن ایر میوزیم ہے اور موسیقاروں اور اداکاروں کا شہر۔ ہم لوگ رات گئے تک ''سپید راتوں'' کی ان سڑکوں پر گھومتے رہتے ہیں۔ وہ پل جس پر دوستووسکی کے کردار ان ''سپید راتوں'' میں ایک دوسرے سے ملا کرتے تھے۔ آدھی رات کا سورج پانی پر جھلملا رہا ہے۔ سہانی دودھیا روشنی سارے خوابیدہ شہر پر چھائی ہوئی ہے۔ نہروں کا پانی رات کی دھوپ میں چاندنی کی طرح چمک رہا ہے۔

ایک روز ونٹر پیلس کی سمت جاتے ہوئے مجھے درختوں سے نکلتا ایک مسجد کا گنبد نظر آیا۔ ارمتاژ سے باہر آ کر میں نے کلارا سے کہا اب مجھے اس مسجد کی ٹوہ لگی ہے چل کر اسے دیکھنا چاہیے۔ میں اور کلارا ایک ٹیکسی لے کر تاتاری مسجد روانہ ہو گئے۔

ایک ہرے بھرے پارک کے سامنے سینٹ پیٹرز برگ کے شمالی مغربی ماحول میں اچانک ایک وسط ایشیائی بیضوی گنبد۔ ایرانی موزیک، آیات قرآنی سے منقش محراب۔ مسجد سنسان پڑی تھی۔

''سوال یہ ہے کہ یہ مسجد ونٹر پیلس کے اتنے نزدیک کیوں بنائی گئی۔'' میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

''غالباً اس لیے کہ نماز کے بعد لوگ اگر کوئی خفیہ سیاسی میٹنگیں کریں تو زار کو فوراً اطلاع ہو جائے۔'' کلارا نے کہا۔

احاطے کا پھاٹک مقفل تھا۔ ہم لوگ چکر لگا کر دوسری طرف پہنچے۔ دو ادھیڑ عمر کے آدمی مسجد کے جنگلے سے لگے کھڑے تھے۔ (دونوں شکل سے بھائی بھائی معلوم ہوتے تھے)۔ کلارا نے روسی میں ان سے بات شروع کی۔ وہ دونوں سگے بھائی داغستانی تھے۔ نماز عصر کے بعد گھر جانے

والے تھے۔ ان میں سے ایک نے محاصرہ لینن گراڈ میں حصّہ لیا تھا اور یہیں رہ ایک روسی عورت سے شادی کر لی تھی۔ دوسرا بھائی بھی لینن گراڈ میں ملازم تھا۔ اس نے موٹے شیشوں اور ٹوٹی کمانی کی عینک لگا رکھی تھی۔ شاید دونوں مزدور تھے۔ لینن گراڈ میں تیس ہزار مسلمان رہتے ہیں۔

ان داغستانی بھائیوں کی مادری زبان آوار تھی جو غالباً التائی ترکی لسانی خاندان کی ایک شاخ سے تعلق رکھتی ہے۔

''مسجد تو بند ہے واپس چلیں۔'' میں نے مایوسی سے کہا۔ اتنے میں احاطے میں سے باہر ایک صاحب آتے نظر آئے۔ انھوں نے پھاٹک کا تالا اندر سے کھولا۔ اور مسکرائے نفیس پتلون اور کوٹ میں ملبوس۔ سنہری داڑھی، ہاتھ میں بریف کیس، وضع قطع سے کسی دفتر کے اعلیٰ ایگزیکیٹو معلوم ہو رہے تھے۔ پتہ چلا پیش امام ہیں۔ کلارا نے فوراً مدعا بیان کیا۔ خوشی سے کھل گئے۔ ''بدرالدین تاتار۔ رئیس المسجد''۔ عربی رسم الخط میں اپنا نام کارڈ پر لکھ کر مجھے دیا اور تپاک سے اندر لے گئے۔ احاطے کے دومنزلہ عمارات میں شمالی جمہوریہ تاتار کے مسلمانوں کے مرکزی دینی دفاتر۔ ایک طرف ایک بورڈ پر لکھا تھا 'خاتون لار طہاری خانہ سی' عورتوں کا وضو کرنے کا کمرہ۔ سارے بورڈ ترکی زبان اور عربی رسم الخط میں تھے۔

مسجد کے اندر داخل ہو کر باتیں کرتے کرتے دفعتاً طمد کلارا نے تقدس کے غیر شعوری احساس کے ساتھ اپنی آواز نیچی کر لی۔ سرگوشی میں بولتی رہی اور چندے کے بکس میں چند کوپک ڈالے۔

داغستانی مزدور خوش قسمت تھا کہ محاصرہ لینن گراڈ سے زندہ بچ نکلا۔ شہر سے چند میل کے فاصلے پر پسکاریوف قبرستان کی پانچ ہزار اجتماعی قبروں میں لینن گراڈ کے وہ پانچ لاکھ مرد و زن دفن ہیں جو 1941 عیسوی سے 1944 عیسوی کے دوران جرمن محاصرے میں ہلاک ہوئے۔ کئی ایکڑ پر پھیلا ہوا پارک، اونچی دیواریں، سنگ سرخ کے پرشکوہ مجسمے مکمل سکوت، درختوں میں مدہم موسیقی بج رہی ہے۔ گھاس کے چوکور قطعات کے نیچے پانچ پانچ ہزار شہدا کی ہڈیاں اکٹھی دفن ہیں۔ ہر قطعے پر تر و تازہ گل دستے جانے کتنے ہزار خاندان اپنے چہیتوں کو یاد کرنے ان گم نام

قبروں پر آتے ہوں گے۔ سامنے وسیع چبوترے پر "ابدی شعلہ" فروزاں ہے اور مزید گل دستے اور ریتھ۔

دیوار پر روسی میں مختلف عبارتیں کندہ ہیں۔ کلارا مجھے پڑھ کر سناتی ہے۔ "ان بہادر مردوں اور عورتوں اور بچوں نے نوسودن محصور رہ کر ناکہ بندی قحط اور کڑکڑاتے جاڑے اور شدید بمباری کو جھیلتے ہوئے اپنے شہر کا دفاع کیا۔

"تم میں سے کسی ایک کی زندگی بھلائی نہیں جائے گی۔ مادر وطن اور ہیروسٹی تمھارے سامنے سر جھکاتے ہیں۔"

کلارا پڑھتے پڑھتے رک گئی اور بولی "تمھیں معلوم ہے ـــ بدقسمتی سے محاصرے کے ان تین برسوں کا جاڑا پچھلے ڈیڑھ سو برس کا سرد ترین موسم تھا۔ ناکہ بندی کی وجہ سے لوگوں نے کمروں میں چسپاں وال پیپرز اکھاڑ کر گوند چاٹا، چمڑا چبایا، چوہے، کتے، بلی اُبال اُبال کر کھائے اور ہزاروں نے بھوک اور فاقے سے جان دی۔ 27 جنوری 1944 عیسوی کے روز محاصرہ ختم ہوا۔ اس وقت سرخ فوج برلن کی طرف مارچ کر رہی تھی۔" وہ چپ ہوگئی۔

ہم لوگ چبوترے پر ادھر اُدھر مبہوت اور ساکت کھڑے تھے۔ کچھ دیر بعد کلارا نے سنگلاخ دیوار پر کندہ ایک روسی عبارت پڑھ کر نیچی آواز میں مجھے سنائی۔

LET NO ONE FORGET, LET NOTHING BE FOR GOTTEN

درختوں میں چیکووسکی کا ایک اداس نغمہ مدھم سروں میں بج رہا ہے۔

شہر کے ایک اوپیرا ہاؤس میں خوش پوش بشاش تماشائیوں کا ہجوم۔ صحن میں فوارے چل رہے ہیں۔ ایوننگ گاؤن پہنے اوپیرا گلاس ہاتھ میں سنبھالے فیشن ایبل خواتین برآمدوں میں ٹہل رہی ہیں۔ اس وقت اس مجمع کو دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ان میں سے بہت سے اور ان کے ماں باپ اور رشتے دار محاصرہ کے ناقابل برداشت مصائب جھیل چکے ہیں۔ انسان کی

RESILENCE اور ہمت تعجب خیز ہے۔

شہر کا لینن میوزیم اس محل میں ہے جو کیتھرین دوئم نے تعمیر کروایا تھا۔ اکتوبر انقلاب سے قبل اس میں رئیس زادیوں کا کالج تھا۔ ایک بالائی منزل پر لینن کا کمرہ، پلنگ، منہ دھونے کی چلمچی، دیواروں پر انقلابی لیڈروں کی تصاویر۔

نچلی منزل کے ہال میں زار شاہی روس کی امیر زادیاں رقص کرتی تھیں۔ ونٹر پیلس پر قبضہ کرنے کے بعد انقلابیوں نے یہاں آ کر اس ہال میں اپنی پہلی میٹنگ کی۔

نیچے صحن میں ایک بکتر بند موٹر چبوترے پر کھڑی ہے۔ سینٹ پیٹرز برگ کے فن لینڈ ریلوے اسٹیشن پر اتر کر لینن اس موٹر پر سوار ہوئے تھے۔ موٹر کے قریب دیوار کے نیچے ایک بنچ پر دو نوعمر لڑکے بیٹھے ہیں۔ لمبے بال، انداز میں کاہلی اور بے نیازی۔

''یہ ہمارے ہاں کے ہپی ہیں۔'' لیوبا کہتی ہے '' لیکن یہ چرس گانجہ نہیں پیتے۔ ہمارے یہاں دستیاب ہی نہیں ہوتا۔ بس اسی طرح بال بکھرائے گٹار بجاتے گھوما کرتے ہیں۔''

محل کے دریچوں کے عین نیچے سمندر جیسا وسیع دریائے نیوا بہہ رہا ہے۔ تیز رفتار کشتیاں چمکیلی سطح آب پر سے گذرتی جا رہی ہیں۔

یہ حسین شہر پچھلی جنگ میں کس طرح برباد ہوا اور دوبارہ اس طرح تعمیر کیا گیا کہ معلوم ہی نہیں ہوتا۔ صرف چوبیس پچیس سال قبل اس پر اتنی بڑی قیامت گذر چکی ہے۔

کلارا نے مجھ سے کہا ''میں نے لینن گراڈ کے لیے کسی کتاب میں پڑھا ہے۔''

BE BEATIFUL, CITY OF PETER, STAY
AS UNSHAKABLE AS RASSIA AND
LET NO VAIN WARTH TROUBLE THE
ETERNAL DREAM OF PETER

شطرنج کے کھلاڑی

جھاڑ فانوس سے سجے لینن گراڈ ریلوے اسٹیشن سے سرخ تیز لکڑی ٹرین ماسکو کی سمت چھٹی۔ اسٹیورڈ لڑکیاں کوریڈور میں رکھے ساداروں میں سے چائے نکال نکال کر مسافروں کو پیش کر رہی ہیں۔ تمام حضرات ٹرین کے شراب خانوں میں بیٹھ کر ووڈکا نوشی میں مصروف ہیں۔ بیشتر خواتین اپنے اپنے کمروں میں چلی گئی ہیں۔ امریکن پبلشر خاتون کوریڈور کے ایک دریچے سے لگی باہر دیکھ رہی ہے۔ خوش منظر دیہات سامنے سے گذرتے جا رہے ہیں "میرے والدین" وہ آہستہ آہستہ کہتی ہے۔ "انقلاب سے پہلے اسی علاقے سے جان بچا کر بھاگے تھے میرے والد بہت بڑے زمیندار تھے شاید وہ انہی میں سے کسی گاؤں میں رہتے ہوں گے۔" وہ متحیر آنکھوں سے سامنے دیکھ رہی ہے۔

طامس وولف نے امریکہ کی ایک ٹرین کے سفر کے بارے میں کہیں لکھا ہے کہ "الٹاموںٹ سے نیویارک تک سات سو میل اور بیس گھنٹے کے سفر میں انسان ایک پوری زندگی گذار لیتا ہے۔ شہر غائب ہو جاتا ہے پھر پہاڑی راستے۔ درے۔ خزاں کے پگھلے ہوئے تانبے کے رنگ۔ برف کے منظر۔ تنہا پہاڑ۔ پرشور ندیاں۔ کالج۔ کسی سڑک پر سے گذرتی اکیلی عورت۔ لگتا ہے یہ سب ہمیشہ سے ہیں ہمیشہ سے دوست ہیں۔ زندگی کا تلخ معجزہ۔ رات کے عمیق اندھیرے میں کچھ لوگ کسی اجنبی گمنام اسٹیشن پر اتر جاتے ہیں۔ ٹرین کسی اور پلیٹ فارم پر رکتی ہے۔ روشنی میں زرد چہرے۔ باتیں کرتے خدا حافظ کہتے لوگ۔ بیک وقت اجنبی اور مانوس۔ یہ لوگ سب معدوم ہو جائیں گے اور آجائیں گے عظیم امریکن ٹرینیں اس عظیم و وسیع سرزمین پر رات کے اندھیرے میں اس طرح چلتی رہیں گی۔ زمین ابدی ہے۔"

اسی ریلوے لائن پر سینٹ پیٹرزبرگ اور ماسکو کے درمیان زار کی رائل ٹرین چلا کرتی تھی۔ وہ شکلیں، چہرے، آواز لباس سب کے سب معدوم ہو گئے اور اس سے پہلے اسٹیج کوچ اور سلیج

اوراس سے پہلے نمدے کے پیسے دار چغتائی خیمے۔ کیا وہ سب لوگ واقعی موجود تھے، یا سب افسانہ ہی افسانہ ہے۔ ہزاروں روشنیاں دیکھیں۔ ہزاروں موسم، ہزاروں سڑکیں اور ایک تیز نیلی روشنی کی صراطِ مستقیم اور گیس لائٹ اور پلش اور بانات اور چمڑے کی کرسیاں اور تمباکو کی مہک اور اور ینٹ اکسپریس اور دیگوں لی۔

اور ایک مرتبہ ہم لوگ یو پی میں کہیں سے کہیں جاتے تھے۔ برطانوی عہد کی چوڑی ٹرین۔ صاف ستھرے کمپارٹمنٹ۔ اس ٹرین میں ایک کوریڈور بھی تھا۔ اور وہ اچانک ایک گھنے جنگل میں رک گئی تھی اور کزن رشید بھائی نے آکر بتایا تھا کہ انجن کے سامنے بھینسا آ گیا تھا اور رات کو ٹرین کہیں رکتی تھی تو اس کے عملے کے آدمی سیاہ یونیفارم پہنے سرخ لالٹین ہاتھ میں لیے اندھیری پٹریوں کو دیکھتے بھالتے بہت پراسرار معلوم ہوتے تھے۔ اور عجب بات ہے طامس وولف نے ایک جگہ تقریباً یہی واقعہ بیان کیا ہے۔

سرخ تیرنامی ٹرین رات کی دودھیاں روشنی میں ماسکو کی سمت بھاگی جاتی ہے۔

ماسکو میں الوشا کا دفتر ایک خاموش سڑک پر ایک چھوٹی سی عمارت میں ہے۔ گھریلو سا جیسا کہ ایک معقول ادبی رسالے کا دفتر ہونا چاہیے۔ مصیبت یہ ہے کہ معقول ادب کی بھی دنیا میں الگ الگ توضیحات ہیں۔ ''برف پگھلنے'' کے بعد سے مغرب کے ''رجعت پسند'' شعرا و ادبا کے تراجم بھی اب روس میں شروع ہو چکے ہیں۔ خود الوشا عصری مغربی ادب پر تنقیدی مضامین لکھتا ہے۔ یوتیشنکو کے اس عہد میں تھوڑا سا ''ادبی انحراف'' بھی شروع ہو چکا ہے۔ پرانی سلاو قوم پرستی جو بین الاقوامی اشتمالیت کے لیے جگہ خالی کر چکی تھی پھر واپس آرہی ہے۔ انیسویں صدی کے روسی ذہن پرستوں کے دو کیمپ بن گئے تھے سلاو نیشلسٹ ''خالص روسی تہذیب'' کے علم بردار تھے۔ اس کے برعکس ''مغرب پرست'' انٹلکچوئل روسی ذہن کو یورپ کے قریب لانے کے خواہاں تھے۔ مشرق و مغرب کی یہ کشمکش آج بعد از اسٹالین سوویٹ یونین انٹلکچوئیلز کے سامنے پھر موجود ہے۔ یہ آویزش کٹر کمیونزم اور نئی لبرلزم سے منسلک ہے۔

رائٹرز یونین کلب میں لوگ باگ حسب معمول شطرنج کھیلنے میں مشغول ہیں۔ ایک سہ

پھر ایک کرسی پر خالی بیٹھے میں نے سامنے رکھی بساط پر مہرے جمانے شروع کر دیے اس ملک کا غالبًا یہ دستور ہے کہ کسی پبلک جگہ پر بچھی ہوئی بساط پر آپ مہریں جما دیں تو اس کا مطلب ہے کہ آپ کسی بھی اجنبی کے ساتھ بلا تعارف شطرنج کھیلنے کے لیے تیار ہیں۔ چنانچہ فی الفور ایک صاحب سامنے آ کر بیٹھ گئے اور پیادہ چلے۔ ان استاد لوگوں کے ساتھ کھیل! ناچار اپنا مہرہ بڑھایا۔ وہ روسی ادیب بازی میں مستغرق ہو چکے تھے۔ گول موٹے شیشوں کی عینک، مانوس سی شکل شاید یہی اناطولی کنر نیٹوف صاحب تھے۔ چالیں سوچتے شاید یہ بھی غور و خوض کر رہے تھے کہ روس سے مغرب کس طرح فرار ہوں۔ (یہ ماہ جولائی کا واقعہ ہے۔ چند روز بعد ہی آپ بحیرہ اسود میں کود کر تیرتے ہوئے دوسری طرف نکل گئے) اگر یہ وہی تھے۔

کھیل میرے لیے خاصا برا جا رہا تھا۔ الوشا ٹہلتا ہوا آیا۔ کھڑے ہو کر دیکھنے لگا۔ بولا "تم بہت بُری طرح گھر گئی ہو۔ دھیان سے کھیلو۔"

حریف شاطر نے ایک اور مہرہ پیٹا۔ میں اپنے بچاؤ کی فکر میں لگی کہ اتنے میں کرسی کے پیچھے آہٹ ہوئی۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ ڈاکٹر ملک راج آنند۔ گویا روح کارل مارکس نے ایک فرشتہ رحمت بھیجا جو مجھے یہ بازی جاری رکھنے سے بچائے۔ میں نے حریف سے معذرت چاہی انھوں نے متانت سے سر ہلایا۔ گویا کہتے ہوں جاؤ معاف کیا۔ بہر حال یہ میری سوویٹ یونین میں آخری بازی ہے۔ میرے کرسی سے اٹھتے ہی ایک اور صاحب میری جگہ آن بیٹھے اور کھیل جاری رکھا۔

ملک اپنی جماعت کے ساتھ قاہرہ سے آئے ہوئے تھے۔ چند مصری اور افریقی اور عراقی رائیٹر لوگ کے ساتھ ہوٹل یوکرین میں مقیم تھے کہنے لگے "میں چار دن سے ماسکو میں ہوں اور تم کو تلاش کر رہا ہوں۔"

"میں ذرا لینن گراڈ گئی تھی ایک ہفتے کے لیے" میں نے اس بے نیازی سے کہا گویا ماسکو سے لینن گراڈ آئے دن جاتی رہتی ہوں۔ ملک نے حسب عادت کوئی لمبا قصہ چھیڑ دیا پھر کہا "چلو کل صبح ٹالسٹائی کی کنٹری اسٹیٹ چلتے ہیں۔ میں پچیسوں بار روس آ چکا ہوں پہلی بار شاید 1962 عیسوی میں آیا تھا مگر آج تک یاسنایا پولیانہ جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔"

ایک صوفی کا مزار

ملک مع اپنے مریدوں کے ہوٹل یوکرین میں ٹھہرے ہیں جو بھائی اسٹالین نے امریکی اسکائی اسکریپر طرز کا بنوایا تھا۔ اتوار کے روز صبح منہ اندھیرے کوچ ہوٹل سے روانہ ہوئی ہے۔ تقریباً خالی۔ صرف ملک الوشا اور چودہ پندرہ مصری لبنانی افریقی ادیب، شہر سے باہر خوب صورت جنگلوں میں پکنک منانے والوں کی ٹولیاں جمع ہو رہی ہیں۔ شاہراہ کے کنارے بچے خودرو پھول اکٹھے کرنے میں مشغول ہیں۔ دریاؤں پر کشتی رانی کے مقابلے کیے جا رہے ہیں۔ درختوں کے نیچے موٹریں کھڑی تھیں۔

اسی میل کا فاصلہ طے کر کے کوچ کاؤنٹ لیو ٹالسٹائی کی خاندانی ریاست کی حدود میں داخل ہوئی۔ سیاحوں کا جم غفیر آئس کریم کھانے میں مصروف۔ جھیل پر بطخیں تیر رہی ہیں۔ زمینداری کے کچے راستے۔ اصطبل، درختوں کے نیچے بچوں کو ٹالسٹائی کے متعلق لکچر دیے جا رہے ہیں۔ کینٹری ہاؤس کے باہر مزید سیاح۔ گریک اور تھوڈکس پادریوں کی ایک ٹولی جو سائپرس سے آئی ہے۔ بہت سے مقامی پادری۔ چند افریقی۔ دو عدد لاما۔

ٹالسٹائی کے کنٹری ہاؤس میں کمرے ان کے ذاتی سامان سے آراستہ ہیں۔ لائبریری میں استاد بزرگ کی اپنی کتابیں برآمدے میں رولنگ چیئر۔

سارا دن ہم لوگوں نے ٹالسٹائی کی زمینداری پر گذار دیا۔ سورج ڈوبنے لگا اور اونچے تناور درختوں کے جنگل میں سے گذرتے ہوئے ایک طویل کچا راستہ طے کر کے ایک خاموش خوب صورت کنج میں پہنچے۔ جہاں دفعتاً ٹالسٹائی کی کچی قبر نظر آئی۔ قبر پر گھاس اگی ہوئی تھی۔ اس پر بڑے بڑے سفید اور زرد گلابوں کے گچھے دھرے ہوئے تھے۔ ایک صوفی کا مزار۔ سورج کی کرنیں بلند و بالا درختوں میں سے چھن چھن کر منظر کو شفق رنگ کر رہی تھیں۔ شام کا بسیرا لینے

والے پرندوں نے اچانک زور زور سے چہچہانا شروع کر دیا وہ نظارہ اس قدر پرفسوں تھا کہ تقریباً غیر حقیقی معلوم ہو رہا تھا۔

یاسنایا پولیانہ سے انسان کو بہت عجز اور احساس پاکیزگی اور مسرت اور اداسی کے ساتھ واپس آنا چاہیے۔

اور دن کے وقت ٹالسٹائی کے روس کی آخری جھلک۔ ماسکو سے باہر ایک عظیم الشان فنکشنگ چرچ۔ چاروں طرف صنوبر کا جنگل۔ اندر ایک بوڑھی عورت سیڑھی پر چڑھی ایک آئیکن کو بڑی محبت کے ساتھ جھاڑن سے صاف کر رہی ہے اور زیر لب گریگورین حمد گنگناتی جاتی ہے۔ سنسان، وسیع ہال، شمعوں اور طلائی اور مرصع دینی تصاویر سے جھلملا رہا ہے۔ چند نوجوان عورتیں ایک تابوت اٹھائے اندر آتی ہیں۔ تابوت کا ڈھکنا کھلا ہوا ہے۔ جس کے اندر سفید اطلسی گدے پر ایک بوڑھی عورت ابدی نیند سو رہی ہے۔ چوبی تابوت مخصوص روسی گل کاری سے مزین ہے۔ یہ ضعیفہ اتنی نازک اور ہوائی سی ہے کہ بالکل ڈریسڈن چائینا کی مورتی معلوم ہوتی ہے۔ یہ بوڑھی عورت ٹالسٹائی کے روس میں ایک نوجوان حسین لڑکی رہی ہوگی۔

پس ماندگان تابوت کو اونچے شمع دان کے سامنے رکھ دیتی ہے۔ چند منٹ بعد ایک اور جنازہ اندر لایا جاتا ہے اسے بھی عورتوں نے اٹھا رکھا ہے۔ اس کے اندر بھی ایک ضعیفہ لیٹی ہے۔ یہ کم از کم سو برس کی ہو کر مری ہے کیونکہ بے چاری کے جھریوں سے بھرے چہرے پر کرب سوت کے گہرے نقوش منجمد ہو گئے ہیں۔ اس کا ایک ادھیڑ عمر کا رشتے دار — غالباً بیٹا — ٹوپی ہاتھ میں سنبھالے خاموش کھڑا ہے۔ کچھ دیر بعد وہ لیوبا سے کہتا ہے کہ مجھ سے کہہ دے کہ انسان ہر طرح کی مصیبتوں، پریشانیوں میں مبتلا ہوتا ہے دکھ اٹھاتا ہے کامیابی کا مزہ چکھتا ہے۔ محبت اور نفرت کرتا ہے اور آخر انجام یہی ہے کہ بس مر جاتا ہے۔

چھوٹے چھوٹے مصور کارڈوں پر چھپی دعائیں یا شاید مقدس تثلیث کے نام عفو و بخشش کی درخواستیں دونوں مرحومین کے تابوت میں رکھی جا رہی ہیں ابھی پادری نہیں آیا ہے۔ عورتیں ساری رسوم ادا کر رہی ہیں۔

سوسالہ متوفیہ کا عزیز جس نے مجھ سے بات کی تھی، بے انتہا غم زدہ نظر آرہا ہے۔ یقیناً مرحومہ کا بیٹا ہے۔ یہ شخص بھی لینن گراڈ کی مسجد والے دیندار داغستانی بھائیوں کے مانند مزدور یا کاشت کار ہے اور بہت معمولی کپڑوں میں ملبوس ہے۔

صدر دروازے کے باہر کاؤنٹر پر بیٹھی ایک معمر عورت مذہبی تصاویر اور موم بتیاں فروخت کررہی ہے۔ میں ایک روبل میں اس سے OUR LADY OF VALADIMIR کے دو پرنٹ خرید لیتی ہوں۔

ایک اتوار کی شام ایک مشہور قدیم خانقاہ کے گرجا میں عورتوں کا کوایر گریگورین CHANTS الاپ رہا ہے۔ گریک اور تھوڈوکس کلیسا کی مخصوص منفرد سحر آگیں گریگورین موسیقی۔ خانقاہ کے باغ میں (یہ ایک ہمفنی کا نام ہوسکتا ہے)۔ ایک سیاہ پوش جوان پادری ایلم کے درختوں کے نیچے ٹہلتا گذر جاتا ہے۔ (نوجوان نسل میں سے اکادکا دیندار باقاعدہ پادری بھی بن جاتے ہیں۔ تعجب) اسپردس کے ایک کنج میں چار پانچ مصور اپنے اپنے ایزل سامنے رکھے دنیا و مافیہا سے بے خبر تصویریں بنانے میں محو ہیں۔ دفعتاً ہوا میں سردی کی تیز لہر دوڑ گئی۔ سرد ہوائیں خانقاہ کی سنگلاخ بھوری دیواروں اور تاریک برجیوں اور تاریک خاموشیوں سے ٹکرا رہی ہیں۔ اندر پکچر گیلری میں یونیورسٹی کے نوجوان لڑکے لڑکیاں قدیم بازنطینی تصاویر کو دیکھتے پھر رہے ہیں۔

پورنماشی کے چاند کی روشنی میں ساری خانقاہ گویا واگنر کی ایک گمبھیر تخلیق میں ڈھل گئی۔ کچھ فاصلے پر سوویٹ یونین کے جگمگاتے دارالسلطنت کے ایک الٹرا موڈرن ہوٹل میں امریکن خلاباز فرینک بورمین کو روسی خلاباز ڈنر کھلا رہے ہیں۔

آرمینیہ کا چاند

شہر ماسکو سے باہر مختلف جمہوریتوں کو جانے والے فضائی راستوں کے لیے الگ الگ ایئرپورٹ ہیں۔ آرمینیہ والے ایرپورٹ پر پہنچتے ہی ایسا معلوم ہوا جیسے کوہ قاف یہیں سے شروع ہوگیا۔ تین چار طویل القامت نوجوان اور بے انتہا خوب صورت سیاہ پوش ارمنی پادری نہایت وقار سے چلتے ہوئے لاؤنج میں داخل ہوئے۔ چند ارمنی مسافروں نے فوراً بڑی عقیدت کے ساتھ ان کے ہاتھ چومے۔ دو انجنوں والا طیارہ ارمنی پائلٹ اڑا رہے ہیں۔ سیاہ چشم ارمنی ایر ہوسٹسوں نے طویل بندے پہن رکھے تھے اور ارمنی زبان میں اناؤنسمنٹ کر رہی ہیں۔

آسمان بھی مختلف ہے۔ یورپین روس کے خنک، شفاف سپید اور نیلے آسمان بدلنے لگا۔ تیز نیلا، گرم، لاجوردی، گہرا قرمزی، مخملیں، سیاہ۔ ایشیا پہنچتے پہنچتے رات ہوگئی۔ کالے اطلسی آسمان پر کلابتونی چاند جگمگانے لگا۔ مشرقی تیز، زرد، گرم، یورپ کے سرد، پیلے چاند سے مختلف۔

یروان ایرپورٹ پر آرمینین رائیٹرز یونین کے دو دُبلے پتلے لمبے نوجوان ادیب موجود ہیں جنھوں نے دو دن سے شیو نہیں کیا۔ ہم یقیناً مشرق واپس آگئے ہیں۔

شہر کی سمت جانے والی سڑک کے دو رویہ ٹروپیکل درخت، ہوا میں سوندھی مٹی کی مہک فضا میں کچھ اضمحلال سا آگیا۔ مغرب کی ہوا ہی انسان کو چاق و چوبند بناتی ہے۔

ہوٹل آرمینیہ کناٹ پیلس کی وضع کے دائرے میں واقع ہے۔ عمارتوں کا اسٹائل رومن ارمنی۔ واضح ہو کہ عہد عتیق کی آرمینیہ یعنی ارارتو کے فن تعمیر نے ساختمان ہائے ایران قدیم کو متاثر کیا تھا۔

ہوٹل میں ہر طرف ارمنی۔ کسی نے دو دن سے شیو نہیں کیا تھا۔ عورتیں کچھ پارسین سی معلوم ہو رہی ہیں۔ تو واضح ہو کہ قدیم آرمینیہ اور قدیم ایران میں کافی نسلی گھپلا ہوا تھا۔ افق پر برف پوش کوہ ارارات دھوپ میں جگمگا رہا ہے اسی کے سائے میں ولادت مسیح سے آٹھ سو برس قبل

اہل آرمینیہ نے اشوریہ اور بابل کے تسلط سے آزادی حاصل کی تھی پھر ہنحامنشی ایران نے ان کو اپنا غلام بنایا۔ پھر آزاد ہوئے۔ 303 عیسوی میں قبول عیسائیت، ساسانیوں سے جنگ۔ پانچویں صدی عیسوی میں ارمنی سینٹ میزروب نے حروف تہجی ایجاد کیے جو یونانی اور سریانی رسم الخط سے متاثر تھے اور آج تک وہی مستعمل ہیں۔ سینٹ میزروب نے ایک دارالترجمہ قائم کیا اور ارمنی ادب پر یونانی لٹریچر کی گہری چھاپ پڑی۔ ارمنی بہت پڑھی لکھی قوم ہے۔

آرمینیہ کا ایک بادشاہ تغ بڑا جاہ وجلال والا تھا۔ ہم عصر ساسانی ایران نے اس کے بعد کے بادشاہوں کو تغ کا بیٹا کہا۔ عربوں نے اسے تغفور کر دیا یہ میرا خیال ہے۔ میں ہمیشہ سوچا کرتی ہوں کہ قرون وسطی کے مسلمان شاہان چین کو فغفور کیوں کہتے تھے تو یہ عقدہ ذرا غور و فکر کے بعد یوں کھلا — چین کے فرماں روا اپنے آپ کو SON OF HEAVEN کہلواتے تھے۔ قدیم فارسی میں جنت کو فردوس یا باغ کہا جاتا تھا۔ چنانچہ ساسانیوں نے چین کے ہم عصر بادشاہوں کو باغ پور کے لقب سے یاد کیا۔ یعنی فرزند جنت، ایران پر مسلم عرب تسلط کے بعد یہ باغ پور عربی میں فغفور ہو گیا۔ تغفور آرمینیہ فغفور چین۔

گیارھویں صدی میں آل سلجوق آرمینیہ کے تغفوروں پر حاوی ہوئے اس کے بعد آل عثمان۔

ترکوں کے خلاف ارمنی جدوجہد آزادی اٹھارھویں صدی میں شروع ہوئی سلطنت عثمانیہ کی بیشتر تجارت آرمینیوں کے ہاتھوں میں تھی۔ اسی زمانے میں سینکڑوں ارمنی تاجر مدراس، کلکتہ اور ڈھاکہ میں آباد ہوئے۔ مدراس میں اپنا ارمنی پریس قائم کیا۔ کلکتہ کی مشہور ہفت زبان مغلیہ گوہر جان ایک ارمنی یہودن تھی۔

ہم مذہبی کے ناتے ارمنی برابر مسیحی یورپ کی طرف دیکھتے تھے۔ زار شاہی روس، فرانس اور برطانیہ ترکوں کے خلاف درپردہ ان کو امداد کرنے میں مصروف تھے۔

1710 عیسوی میں ارمنی راہب پیٹر میکتار نے قسطنطنیہ میں ایک مدرسہ قائم کیا تھا جہاں اپنے وطن سے آ کر ارمنی مغربی علوم پڑھتے تھے مگر خود حاکم قوم ترک ان علوم سے بے نیاز رہی۔

ترکی مظالم — عجیب بات ہے۔ اسی دور کے متعلق پروفیسر آرنلڈ ٹوئنبی اپنی دس جلدوں

والی تاریخ میں لکھتا ہے کہ عثانی حکومت اپنی اقلیتوں کے ساتھ بہت ہی اچھا سلوک کرتی تھی۔ استنبول کی سیر کرتے ہوئے شیخ عبدالقادر 1906 عیسوی میں لکھتے ہیں "سامنے سے ایک ارمنی پادری آرہا ہے۔ سیاہ چوغہ۔ کھلی آستین۔ سیاہ اونچی ٹوپی بہت بڑی داڑھی اور بال لمبے۔ جنھیں وہ چوٹی کی طرح لپیٹ کر پیچھے لٹکائے ہوئے ہے۔ یہ نئی چیز دیکھنے میں آئی۔ یہی وہ عالی جناب ہیں جو اکثر چپکے چپکے بکھیڑے کھڑے کر دیا کرتے ہیں۔ اس وقت تو بہت بھولے بھالے غریب سے نظر آرہے ہیں اور نہایت امن پسندی سے جا رہے ہیں مگر طرفہ معجون مرکّب۔ عادات میں مشرقی۔ تعصب میں مغربی۔ آزادی کی اہلیت کم۔ شوق زیادہ[1]"

دلچسپ نکتہ اس میں یہ بھی ہے کہ جس طرح انگریز کہتے تھے کہ اہل ہند میں آزادی کی اہلیت کم، شوق زیادہ ہے۔ بالکل اس سلطنت عثانیہ کے ایک مداح بہی خواہ اور ہم مذہب ہندی مسلمان شیخ عبدالقادر ارمینیوں کے لیے یہی الفاظ استعمال کر رہے تھے۔

سوویت آرمینیہ کی سرحد کے ادھر پہلوی سلطنت ایران واقع ہے وہاں شہر اصفہان سے کچھ فاصلے پر جلفا ایک ارمنی بستی ہے۔ اس میں عہد شاہ عباس صفوی کا ایک عالیشان ارمنی گرجا موجود ہے۔ دو سال قبل میں نے یہ گرجا دیکھا تھا۔ ہماری ٹولی میں زیادہ تر مغربی جرنلسٹ شامل تھے۔ اور ایک ترک صحافی لڑکا اور لڑکی۔ ہم لوگ گرجا کے اندر چلے گئے۔ ترک لڑکا اور لڑکی باہر سڑک پر کوچ میں بیٹھے رہے۔ میں نے بعد میں ان سے پوچھا وہ نوجوان ترک کہنے لگے۔۔ "ارمینیوں نے ہمارے دشمنوں سے مل کر ہمارے ساتھ غداری کی۔ جبکہ سلطنت عثانیہ کی بیشتر دولت اور تجارت انہی کے ہاتھ میں تھی۔"

"لیکن وہ قتل عام جو تم لوگوں نے کیے۔ ارمینیوں کے۔۔"

لڑکا ہنس پڑا۔ "زیادہ تر یورپین اور برطانوی پروپگنڈہ تھا۔ وہ ہمیں یورپ کا مرد بیمار کہتے تھے اور ہمیں ختم کرنے کے درپے تھے اور اس میں کامیاب ہوئے۔"

"لیکن ایک امپریل آقا کے خلاف ایک محکوم قوم کی جدوجہد آزادی بالکل جائز ہے۔" میں نے کہا۔ "آخر عرب بھی تو تمھارے خلاف ہو گئے تھے جو تمھارے ہم مذہب تھے۔ سلطنت

عثمانیہ ہمیشہ ایک ملٹری سوسائٹی رہی۔ اگر اس نے زمانے کے ساتھ ساتھ نظریاتی ترقی کی ہوتی تو ہمارے ہاں نوجوان ترک تحریک ہی پیدا نہ ہوتی۔"

1967 عیسوی کے دونوں نوجوان ترک چپ چاپ باہر دیکھتے رہے۔ وہ جذباتی طور پر بہت مضطرب نظر آتے تھے۔

اور پہلوی سلطنت ایران کی سرحد کے ادھر سوویت آرمینیہ کے شہر یروان میں ایک فلک بوس مخروطی سنگلاخ مینار کے نیچے "ابدی شعلہ" فروزاں ہے۔

"ترکوں نے جو قتل عام کیا تھا اس میں مارے جانے والے اسی ہزار ارمنی شہدا کی یادگار"۔ ایک ارمنی ادیب نے مجھ سے کہا۔

میں نے خود کو چہرہ پھیر کر دوسری طرف دیکھتے پایا۔ پھر میں نے اپنے اس ردعمل کا تجزیہ کیا۔ ترکوں سے ہم مذہبی اور ہمدردی وغیرہ کے ناتے میں اس ارمنی کی بات سننے کے لیے بھی تیار نہیں۔ وہ قتل عام کی تفصیل بتا تا رہا۔ "1895-1915 عیسوی پھر روس نے ہمیں آزادی دلائی۔"

"زار شاہی روس نے—" میں نے جواب دیا۔ "آپ عثمانی شہنشاہیت سے نکل کر شاہی شہنشاہیت میں شامل ہو گئے—استنبول کے بجائے سینٹ پیٹرز برگ کیونکہ روسی آپ کے ہم مذہب تھے۔"

وہ خاموش ہو گیا۔ ہم پہاڑی سے اترنے لگے۔

ہر ملک اور قوم کے تاریخی تجربات اس کے اپنے تجربات ہیں۔ دوسرے ان کو نہیں سمجھ سکتے۔ غالباً ترک اور ارمنی، ترک اور یونانی، ترک اور روسی، ترک اور عرب اپنی اپنی جگہ سب کے قومی تجربات Valid ہیں۔

ایک اور میوزیم میں ترک طرز معاشرت کی یادگاریں۔ جس قوم نے آپ کے اوپر آٹھ سو برس حکومت کی ہو۔ اس کے کلچر کا گہرا اثر ناگزیر ہے—— معزز ارمنی خواجہ کے لقب سے یاد کیے جاتے تھے مثلاً ایک بڑی تصویر میں خواجہ پطرس رشیدیان ترکی قبا پہنے گاؤ تکیے سے لگے مسند پر بیٹھے ہیں۔

ولیم سیر ردیاں نے اپنے کزن مراد گار دغلیان کے نام کی یوں تشریح کی ہے۔

''یہ ارمنی نام دو تر کی لفظوں کا مرکب ہے۔گار۔سیاہ اور اوغلان ـــــ فرزند۔''

اسکر پٹوریم کی سات منزلہ مدوّر جہازی عمارت میں ارمنی کے دس ہزار مخطوطات مصور نسخے اور عربی فارسی کتب۔ 451 عیسوی کے لکھے ہوئے ایک مصور صحیفے میں ہاتھیوں پر سوار ساسانی لشکر آرمینیہ پر حملہ کر رہا ہے۔

اس متاعِ نادراں کی ہر منزل ارمنی خانقاہوں کے ایوان کے طرز پر تعمیر کی گئی ہے۔

قومی پکچر گیلری ـــــ ''قلعہ یروان کا محاصرہ'' ـــــ 1827۔ جب یہ روسی لشکر نے ارمنی تعاون کے ساتھ ایرانیوں سے چھینا۔''

جنگ روس و ترکی 1878 جس میں ارمنی سپاہی ترکوں کے خلاف لڑے۔'' ترکی پرچم زمین پر پڑا ہے۔ روسی اور ارمنی چاروں طرف خوش کھڑے ہیں۔ اس جنگ کے صلح نامے کی رو سے صرف مغربی آرمینیہ ترکی کے پاس باقی بچا۔ باقی ملک روس میں شامل ہو گیا۔ پہلی جنگ عظیم میں آرمینیہ روس کی حمایت سے ترکی کے خلاف لڑا۔ جب 1919 میں سلطنت عثمانیہ کے حصے بخرے کیے گئے۔ امریکہ نے تجویز کی کہ آرمینیہ امریکن تحفظ میں ایک خود مختار ریاست بنادی جائے۔ اتاترکؒ نے یہ منصوبہ کامیاب نہ ہونے دیا۔ 1920 میں آرمینیہ سودیت یونین میں شامل ہو گیا۔

ایک قدیم گرجا گھر کے پھاٹک پر بوڑھا چوکیدار کرسی پر خاموش بیٹھا ہے۔ اندر پورچ میں اس کی گدڑی رکھی ہے (روس میں فنکشنگ گرجا اور مساجد دیندار لوگوں کے چندے سے قائم ہیں) تہہ خانے میں ایک نوجوان ولیہ کے مزار پر شمعیں روشن ہیں۔ باہر باغ میں درخت پھلوں سے لدے کھڑے ہیں۔ چوکیدار کے لڑکے نے چند پھل توڑ کر مجھے پیش کیے۔

یہ گرمیوں کا موسم ہے۔ بوڑھا اور اس کا لڑکا پورچ کے فرش پر گدڑی بچھا کر سوتے ہیں۔

پھاٹک کے باہر گلبار درختوں کے نیچے چند بچے ننگے پاؤں خاموش سڑک پر کھیل رہے ہیں۔

ایک الیکٹرونکس فیکٹری میں مزدور عورتوں کا بیوٹی پارلر ـــــ سفید کوٹ پہنے نوجوان مشاطائیں مزدور لڑکیوں کا سنگھار پٹار کرنے میں مصروف ہیں۔

بیس لاکھ ارمنی دوسرے ملکوں میں جابسا ہے۔ تھوڑے سے واپس آچکے ہیں۔ ہوٹل میں

ایک ارمنی امریکن جوڑا مقیم ہے۔ وہ بھی ولیم سیرویاں کے سان فرانسسکو سے مدر کنٹری کی زیارت کے لیے آئے تھے۔

جب وہ دونوں باہر نکلتے ہیں۔ نیٹو ارمنی ان کو گھیر لیتے ہیں۔

ارمنی ایک ذہین، طباع اور آرٹسٹک قوم ہیں شاید اس وجہ سے شیو نہیں کرتے۔

کیا کشتی نوح واقعی موجود ہے؟ گناہ گار آنکھوں نے اسے دیکھا۔ آرمینیہ کے اسقف اعظم کے محل کی ایک الماری میں سونے کے فریم میں جڑا لکڑی کا نم سا ٹکڑا۔

دریچے کے باہر کوہ ارارات جگمگا رہا تھا—— کلیساؤں کے باغات میں شاندار خوش شکل کم عمر پادری باوقار انداز سے روشوں پر سے گزر رہے ہیں۔

یروان ایرپورٹ کے باغ میں ایک بنچ پر ایک ارمنی جوڑا بیٹھا اپنے طیارے کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ انگریزی داں نکلے (سوویت یونین میں غیر زبانیں جاننے والوں کی تعداد حیرت انگیز ہے) سامنے کچھ فاصلے پر تیز روشن نیلے آسمان کے نیچے سرزمین ترکیہ پر کوہ ارارات چمک رہا ہے۔ میں نے خوشی سے کہا—— "ترکی یہاں سے کتنا قریب ہے۔ یہیں سے نظر آ رہا ہے۔"

ارمنی جوڑے نے فوراً ناگواری سے مجھے دیکھا۔ پھر مرد بولا "یہ آرمینیہ کا پہاڑ ہے ترکی نے اسے ہم سے چھین لیا۔"

شاید ارمنی اور ترک کبھی ایک دوسرے کو معاف نہیں کریں گے۔

آرمینیہ سے واپس آنے کے بعد سمجھ میں آتا ہے ولیم سیرویاں کے انکل خسرو۔ انکل ملک، کزن ارام—— کیلی فورنیا کے تاکستانوں میں کام کرنے والے مہاجر ارمنی اتنے اداس اور جذباتی اور فلسفی قسم کے کردار کیوں ہیں۔

حواشی:

1. مخزن، لاہور، اکتوبر 1906

گلِ سُرخ بر طاقِ نیلوفری

کیسپین یا خزرر جسے اہل ایران دریائے مازندران کہتے ہیں۔ تیز نیلی سطح آب۔ اچانک آذر بائیجان۔ زرد زمین۔ حد نظر تک تیل کے چشموں کے میناروں کا جنگل۔ چٹیل میدان اور ہزاروں ہزار تیل کا کنواں۔ ایرپورٹ کی دکانوں میں مرصّع چھوٹے چھوٹے خنجر، مرصع پستول، رنگین رومالوں پر شہسواروں کی تصویریں ہم بانکے آذری ترک سورماؤں کی سرزمین پر موجود ہیں۔ یہودی نژاد سادہ لوح لیوبا کے بجائے ایک نوجوان بے حد ذہین اور خوب صورت ترجمان یہودی نژاد آدا ہمارے ساتھ ماسکو سے آئی ہے۔ ایرپورٹ پر دو آذر بائیجانی ادیب استقبال کے لیے موجود، ایک صاحب کا نام سلطان اوغلی ہے۔ نقاد اور فلم ڈائرکٹر۔ نہایت خوش خلقی سے مسکرائے۔ میں نے بھی مسکرا کر سر ہلایا۔ من ترکی نمی دانم۔

بذریعہ کار باکو۔ راستے میں سپاٹ میدان۔ ٹیلے اور جھاڑیاں اور جگہ جگہ پچھلی صدی کی نہایت کھٹارا قسم کی دقیانوسی مشینیں گھڑ گھڑ کر رہی تھیں۔ ان کو بہ طور تاریخی یادگار نہ صرف برقرار رکھا گیا ہے بلکہ تکلفاً چلایا بھی جاتا ہے۔ جب یہ علاقہ مملکت ایران میں تھا تو شاہان قاچار کی عقل میں نہ آیا کہ پٹرولیم کشید کیا جائے۔ زار روس نے اسے ایران سے چھین کر فوراً اس کا تیل نکالنا شروع کر دیا۔ جب مسلمان اقوام اتنی نالائق ہوگئی تھیں تو یورپین لوگ کیوں نہ توڑتے ان کے زجاج۔

دور افق پر ایک عمارت نظر آئی۔

''فیر فیتھ کا عبادت خانہ ہے۔'' آدا نے سلطان اوغلی سے پوچھ کر بتایا۔

''فیر فیتھ کیا بلا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''فیر فیتھ —— فیر فیتھ ——'' آدا نے دہرایا۔

"سلطان اوغلی سے کہو ترکی میں بتائیں۔ شاید میں سمجھ جاؤں۔"

"اوغلی صاحب نے جو فرفر آذری بولی تو "زرتشت" کان میں پڑا۔" اوہو۔ فیر فیتھ" میں نے کہا۔

آذربائیجان میں جگہ جگہ فاسفورس رات کو چمکتی تھی اور تیل کی گیس کے شعلے لپکتے تھے سب سے پہلے آتش پرستی یہیں شروع ہوئی۔

میڈین پروہت یہ بہہ دین ساتھ لے کر آٹھویں صدی قبل مسیح ایران گئے تھے۔ زرتشت نے اس رسم کو یزداں کے زمینی مظہر کی حیثیت سے برقرار رکھا۔ عہد عتیق میں یہ سارا علاقہ جس میں اصفہان اور تہران تک شمالی ایران شامل تھا ماؤ کہلاتا تھا جسے یونانیوں نے میڈیا کہا۔ ہیروڈوٹس نے باکو کے "ابدی شعلوں" کا ذکر کیا تھا۔ ترک ساتویں صدی عیسوی سے براہ دربند آنا شروع ہوئے۔ بارھویں تیرھویں صدی تک اکا دکا آتش کدے باقی تھے۔ ہلاکو خاں کے حملے کی وجہ سے باقی ماندہ مجوسی ہندوستان بھاگے۔ لیکن یہ عبادت خانہ جو دور دھوپ میں چمک رہا تھا۔ پارسیوں کا فائر ٹمپل نہیں تھا اس میں سے سنسکرت اور گورمکھی کی تختیاں برآمد ہوئی ہیں۔ یہ ان سندھی اور پنجابی ہندو تاجروں کا جوالا مکھی دیوی کا مندر تھا جو اٹھارھویں انیسویں صدی میں براہ ایران یہاں چائے شکر اور کپڑے کے کاروبار کے لیے آتے تھے۔ کمال ہے۔ میرے خیال میں یہ قدیم مجوسی آتش کدہ ہی رہا ہوگا۔ ویران پڑا ہوگا۔ آگ کی مناسبت سے ہمارے سندھی تاجروں نے اسے جوالا مکھی دیوی کا مندر بنا دیا۔

باکو دنیا کے حسین ترین شہروں میں سے ہے۔ اونچی عمارتوں کی شہ نشینوں پر انگور کی بیلیں۔ گلیوں کی دیواروں پر انگور کی بیلیں عظیم الشان۔ بندرگاہ چوراہے کے اوپر بہت بلندی پر استادہ شیشے کے کوائسک میں بیٹھی پولیس یونیفارم میں ملبوس ایک حسین آذری لڑکی اطمینان اور شگفتگی کے ساتھ ٹریفک کنٹرول کر رہی ہے۔

ہوٹل پہنچتے پہنچتے بادل گھر آئے اچانک اندھیرا چھا گیا۔

میرے کمرے کے سامنے چوڑی بالکنی ہے۔ دور جہازوں کے بیڑے نظر آ رہے ہیں۔

لنچ کے وقت ڈائننگ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا ہے۔ ایک میز پر چند سیاہ پوش معمر خواتین بیٹھی ہیں۔

"یہ لوگ کون؟" میں نے سلطان اوغلی سے پوچھا۔

"پچھلی نسل کی چند مذہبی خواتین کوئی مذہبی سوگ منا رہی ہیں۔ اوغلی صاحب نے ذرا جھینپ کر جواب دیا (غالباً وہ کسی اثنا عشری امام کی شہادت کا دن تھا)۔

آرکیسٹرا نے مغربی دھن بجانی شروع کی۔ دریچوں کے باہر سیاہ بادل کیسپین کی موجوں میں گھل مل گئے۔ چند ہندستانی پنجابی لڑکے جو یہاں تیل کی انجینئرنگ کی ٹریننگ لے رہے ہیں، رات کو ہماری میز پر آئے۔ "یہاں ہندستانی اتنے شاذ و نادر آتے ہیں۔ آپ لوگوں کی آمد کی اطلاع پورے شہر کو ہو گئی ہے۔ کافی اکسائٹمنٹ تھا۔" انھوں نے کہا۔

صبح کی دھوپ نکل آئی۔ سمندر پر بندھے کئی میل لمبے اور پتلے چوبی پل پر سے گزر کر ہم لوگ اس جگہ پہنچے جہاں سے تیل نکالا جاتا ہے۔

چیف انجینئر صاحب ہمارے منتظر تھے۔ مجھے تیل کی مشینوں سے کیا غرض میں دلچسپی سے ان سب انسانوں کی شکلیں دیکھا کی۔ ساری دنیا کے مستریوں کی طرح آذری فورمین کی کلائیاں بھی گدی ہوئی خوش باش۔ زبان سے مجبور۔ مگر ہمیں دیکھ دیکھ کر باچھیں کھلی جاری ہیں۔ سمندر پر تختے باندھ کر انجینئروں کا پورا شہر آباد کر دیا گیا ہے۔

ایک تنہا کیبن کے اندر طرح طرح کے ڈائل اور میٹر اور جانے کیا کیا محیر العقول مشینیں لگی تھیں۔ چیف انجینئر صاحب کا خیال تھا۔ مجھے ان کو ملاحظہ کر کے بہت خوشی ہو گی۔ بڑے تپاک سے مجھے تنہا اندر بھیج دیا۔ باقی سب لوگ باہر کافی فاصلے پر ایک پلیٹ فارم پر جمع تھے۔

اب سمندر کے بیچوں بیچ ایک کوٹھری۔ انواع و اقسام کی پراسرار مشینوں سے پُر۔ اور میں وہاں فقد دم اکیلی موجود۔ سوچا اگر جو اسی لمحے چھڑ گئی امریکہ اور روس کے درمیان لڑائی۔ تیسری عالمی جنگ —— تو کیا ہوگا۔ جتنے یہ کیا وبال ہے۔ اس کیبن میں ایٹمی راز ہوں۔ روس کا پراسرار ملک اور یہ خفیہ رازوں سے لبریز تیل کے کارخانے۔ اور ہم یہاں بے

وقوفوں کی طرح اکیلے کھڑے ہیں۔ اتنے میں اسی کمرے کے برابر دوسرا کمرہ نظر آیا جس میں ایک نوجوان آذربائیجانی خاتون انجینئر اپنی ڈیوٹی پر مستعد بیٹھی مسکرا رہی تھی۔ زبان حال سے خانم کو بتایا کہ میں ان کے وطنِ عزیز کے اس حیرت انگیز سائنسی ترقی سے باغ باغ ہوں۔ اور باہر آئی۔

اب گلِ سرخ طاقِ نیلوفری[1] میں تیزی سے چمک رہا ہے۔ شہر سے بہت دور ایک تفریحی ساحل پر ٹو پیس کوسٹیوم پہنے آذری عورتوں کا جم غفیر ـــــ ایک سمندری ریسٹوران پل کے ذریعے ساحل سے ملحق ہے۔ وہ بھی لوگوں سے پُر۔ میزوں پر پھلوں اور شراب کی بوتلوں کے انبار۔ ہم لوگ ایک میز پر جاکر بیٹھے۔ کچھ دیر بعد ویٹر ایک ٹوکری فواکہات اور شراب کی بوتلوں کی لے کر آیا کہ اس میز سے بھجوائی گئی ہے۔ ہم نے مڑ کر دیکھا۔ ایک معمر خانم مع کنبے بیٹھی تھیں۔ ''اوہو یہ تو ہماری مشہور سرجن ظریفہ خانم ہیں۔'' سلطان اوغلی نے کہا۔ میں نے آدا کے ساتھ جاکر ڈاکٹر ظریفہ خانم کا شکریہ ادا کیا۔ جواباً ڈاکٹر صاحب نے ہمارے جام صحت نوش کرنے شروع کیے مجھے جام پیش کیا۔ آدا نے ان کو سمجھایا کہ میں اس نعمت سے محروم ہوں۔ میں نے مسٹر نمبو دری کو ظریفہ خانم کی میز پر بھیج دیا۔ ان کی پانچوں انگلیاں گھی میں اور سر کڑھائی میں۔

آذربائیجانی اپنی گرم جوشی خلوص اور مہمان نوازی میں اپنے کزن ترکوں سے مشابہہ ہیں۔ رستہ چلتے دوستی کریں گے۔ اپنے گھر مدعو کریں گے اور خاطر کریں گے۔

مشہور فوٹوگرافر بلدیو راہیجا کو ہماری روسی سیاحت کی تصاویر کھینچنے کے لیے دہلی سے بھیجا گیا ہے۔ پوری سودیت قوم راج کپور پر عاشق۔ اور بے چارے بلدیو صاحب کی شکل راج کپور سے کافی ملتی ہے۔ دو ساری پوش خواتین اور ایک ہم شکل راج کپور۔ لہٰذا سڑکوں اور بازاروں میں زبردست بھیڑ اکٹھا ہونا روز کا معمول۔

اتوار کے روز جیابین، نمبو دری، بلدیو، آدا اور میں سمندر کے کنارے والی تفریحی سڑک پر مٹرگشتی کر رہے تھے۔ ایک آئس کریم والے کے سامنے ٹھٹھکے۔ اب جو سر اٹھا کر دیکھا ہمارے گرد کوئی دو تین سو آذریوں نے بلدیو کو گھیر رکھا تھا۔ بلدیو اطمینان سے تصویریں کھینچتے رہے۔

سنتری نے ان کو منع کیا۔ بلدیو نے سر ہلایا اور اپنے کام میں مشغول رہے۔ سنتری مجمع میں سے کسی انگریزی داں کو بلا لایا۔ اس دوران میں ہجوم بڑھتا گیا۔ اب بہت سے آذری گردنیں بڑھا بڑھا کر ٹوٹی پھوٹی انگریزی بولنے لگے۔ ادھر ہمارے گرد مجمع جو مجھے اور جیا بین کو گھیرے ہوئے تھا، نہرو ---- گاندھی ---- اندرا گاندھی ---- نرگس ---- اللہ اکبر'' کا وظیفہ شروع کیا۔ غور کیجیے ان الفاظ میں کیا مناسبت تھی۔ بھیڑ اتنی بڑھ گئی کہ دم گھٹا جا رہا تھا۔ اتنے میں ایک ہیٹ پوش صاحب نے ایک لڑکی سے آذری میں کچھ کہا۔ لڑکی میرے قریب آکر انگریزی میں ان سب کی ترجمانی کرنے لگی۔ اس کا نام شفیقہ اسماعیل تھا۔ یونیورسٹی میں انگریزی ادب میں ایم اے کر رہی تھی۔ بھیڑ چھٹنے کے بعد پتہ چلا کہ آوا پولیس مین کو سمجھانے گئی تھی کہ بلدیو صاحب سرکاری فوٹو گرافر ہیں۔ وہ ادھر سے شاداں و فرحاں تشریف لائے۔ ہم لوگ ہوٹل واپس چلے۔ شفیقہ اور اس کا شوہر بھی ہمارے ساتھ ہو لیے۔ بارش شروع ہو گئی۔ راستہ ایک جنگل نما پارک میں سے گزرتا تھا۔ ایک تناور درخت کے نیچے ایک پکچر یسک سا چائے خانہ نظر آیا۔ ہم لوگ بارش سے بچنے کے لیے اس میں گھس گئے۔ چوبی چائے خانے میں کرسیوں کے بجائے درختوں کے تنے رکھے تھے۔ ایک مونچھیل آذری سماوار کے پاس بیٹھا تھا۔ اس نے خوف خاطریں کیں اور چاء اور سموسوں کے دام نہیں لیے۔ چائے خانے میں ہم لوگوں کے علاوہ اس وقت صرف ایک شخص ایک کونے میں بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ دفعتاً وہ اٹھ کھڑا ہوا اور امریکہ کے خلاف دھواں دھار تقریر بہ زبان انگریزی شروع کر دی۔ مونچھیل چائے خانے والا اسے سمجھا بجھا کر باہر چھوڑ آیا اور آکر ہم سے کہا ''بے چارہ نشے میں تھا۔''

باہر پارک کے فلک بوس درخت سمندری ہوا میں سرسرا رہے تھے۔ بارش تھم گئی تھی۔ عورتیں بچوں کی گاڑیاں دھکیلتی روشوں پر سے گزر رہی تھیں اور دور سمندر پر دُھند جمع ہو رہی تھی۔

شام کو ہم لوگ ایک کونسرٹ میں گئے۔ ایک نظر فریب باغ کے وسط میں بے حد عالیشان عمارت، آذریوں کی بھیڑ، ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ میں اپنی سیٹ پر جا کر بیٹھی پیچھے دیکھا تو شفیقہ اور اسماعیل۔ شفیقہ کہنے لگی آپ نے بتایا تھا کہ شام کو یہاں آئیں گی ہم لوگ بھی آگئے کہ آپ سے

ایک دفعہ اور ملاقات ہو جائے۔

پردہ اٹھا۔ جناب محمود سلمانوف نے گانا شروع کیا۔ ترکی اور فارسی کے معجون مرکب میں چند الفاظ پلّے پڑے جن میں لفظ محبت پر بہت زور تھا اور جب محبت ح کے بجائے خ کے تلفظ سے ادا کی جائے یعنی مخبت تو زیادہ زوردار ہو جاتی ہے۔ خوب خوب مرکیاں اور تان پلٹے انھوں نے لیے۔ آذربائیجانی کلاسیکل موسیقی بھی بحر ذخار ہوگا۔ اس کے بعد بروکیڈ کے ایوننگ گاؤن میں ملبوس خانم تبسم اسمٰعیلوا نے حافظ کی غزلیں گائیں۔ ایک نوعمر مغنی نے آذری میں امریکن کاؤ بوائے گیت سنایا۔ گٹار کے ساتھ۔

باکو کا میڈیول شہر گرینڈ اوپیرا کا عظیم الشان سیٹ معلوم ہوتا ہے۔ سلجوقی طرز تعمیر کے محلات مساجد، حمام، مقابر، سات منزلہ مینار جو ایک خاں نے اپنی محبوبہ کے لیے بنوایا تھا۔ قلعہ جو معمار عبدالمجید بن مسعود نے 1203 عیسوی میں تعمیر کیا۔ دیوان خانے اور شیروان شاہ کے محل اور مساجد کے احاطے میں ترکی قبوں والے مزارات۔ گیارھویں سے پندرھویں صدی تک بنی ہوئی شیروان شاہوں کی عمارات۔ ایک تہہ خانے میں مزید قبور۔ ایک کتبہ کہیں کہیں سے پڑھا جا سکتا ہے۔ یا مجیب الدعوات ـــــ زین العابدین ابن ابو ـــــ شیروانی۔ تہہ خانے کا دروازہ سمندر کے رُخ کھلتا ہے اور سارے احاطے میں ہوائیں منڈلا رہی ہیں۔ باکو ـــــ باداالکوبا ـــــ ہواؤں کا شہر۔

نظامی تھیٹر میں شیریں وخسرو اور لیلیٰ و مجنوں کے اوپیرا اسٹیج کیے جا رہے ہیں۔ پرانے باکو کی اینٹوں کے فرش کی صاف ستھری گلیوں میں گھومتے ہوئے پرانے نوادر کی ایک دکان میں گئی۔ ایک بوڑھا آذری نوادر میں گھرا چپ چاپ بیٹھا تھا۔ نجانے یہ سامان کن کن پرانے آذری آغاؤں اور پاشاؤں کے گھروں سے نکلا ہوگا۔ باہر خاموش سڑک پر ایک معمر آذری ''اولڈ اسکول جنٹلمین'' سر پہ پورک پائی ہیٹ، پورا سوٹ مع واسکٹ چین والی جیبی گھڑی۔ ہاتھ میں چھڑی۔ ٹہلتا ہوا ایک پرانی افسانوی سی ڈیوڑھی میں داخل ہو کر غائب ہو گیا۔ جس کے اوپر انگور کی بیلیں پھیلی ہوئی تھیں۔

اور نیا آذر بائیجان۔ فیوٹی کلر ٹرین شہتوت کے پیڑوں سے ڈھکی ایک پہاڑی پر چڑھتی ہے جہاں بچوں کے پارک کا ایک ملازم بچوں کو برقی موٹروں میں بٹھا کر اس پیار سے کھلا رہا ہے گویا وہ اس کے ہی لخت جگر ہیں۔ پہاڑی کے نیچے بولوار میں پرانی وضع کی آذری پوشاک میں ملبوس کوچوان گھوڑا گاڑیاں لیے سیاحوں کے منتظر ہیں۔

سمندر کے قریب نہروں کے پارک میں جگہ جگہ خوب صورت پُل۔ دو طرفہ ریستوران اور پویلین۔ شام کو یہاں درختوں میں چراغاں کیا جاتا ہے۔ موسیقی بجتی ہے لوگ باگ تیز رفتار کشتیوں پر سوار ہو کر سیر کرتے ہیں۔ آخری شام حسب معمول آذریوں کا ہجوم ہمارے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ موٹر بوٹ چلانے والے نوجوانوں نے ہمیں سیر کے لیے مدعو کیا اور کرایہ لینے سے انکار کیا۔ چار پانچ لوگ مارے دوستی کے ہمارے ساتھ کشتی میں سوار ہو گئے۔ لڑکے نے موٹر بوٹ نہروں پر دوڑانا شروع کی۔ آذری دوستوں نے ہمیں خوش کرنے کے لیے چند ہندستانی فلمی گانے سنائے۔ دھنیں جانی پہچانی تھیں۔ اردو الفاظ آذری میں ترجمہ کر لیے گئے تھے۔ نہروں کے دونوں طرف درختوں میں جاپانی قندیلیں جگمگا رہی تھیں اور گھنے باغات میں پوشیدہ کوشکوں اور چائے خانے میں موسیقی بج رہی تھی۔ بہ ہر بج گاہے دراں مرغزار۔ روانہ شدہ چشمۂ خوشگوار۔ ہوائے خوش و بیشہ ہائے فراخ درختاں بار آور و سر سبز شاخ۔ رواں آب در سبزۂ آب خورد چو سیماب بر پیکر لاجورد[2]

روانگی کے وقت آذری تحائف سے لدے سلطان اوغلی صاحب اور دوسرے آذری دوستوں کی آنکھوں میں ایک ایسی محبت شعار قوم میں بھی دنیا میں موجود ہیں۔ باکو کبھی بھولے گا نہیں۔

دو انجنوں والا طیارہ بحیرہ کیسپین پر نیچا نیچا اڑتا مڈل ایشیا کی سمت چلا۔ ترکمانی کسانوں کا ایک کنبہ پوٹلیاں اور گٹھریاں سنبھالے باکو سے سوار ہوا تھا۔ وہ شاید عشق آباد جا رہے تھے۔ بارش

مولانا، ان کی شلوار پوش بیوی اور بہو۔ تین چار بچے جو مستقبل رو رہے تھے۔ حلیے سے بالکل پشاوری کنبہ معلوم ہو رہا تھا۔ چند روسی فوجی نوجوان۔ ایک جوان خاتون سیاہ فراک میں ملبوس۔ سیاہ جالی کا نقاب جو مغرب میں سوگ کی نشانی ہے اور سرمئی لپ اسٹک آنکھیں روتے روتے سرخ ہو رہی تھیں۔ اس آنجہانی کی تصویر انھوں نے بروچ کی طرح سیاہ فراک کے کالر پر لگا رکھی تھی۔ آنجہانی ادھیڑ عمر کا خوش شکل سا شخص تھا۔ نجانے اس بے چاری کا شوہر تھا یا کوئی اور قریبی عزیز۔ لیکن وہ سوگوار خاتون جس انداز سے نظریں سامنے جمائے ناک پر رومال رکھے باکو سے طیارے پر سوار ہوئی۔ تاشقند تک بالکل اسی منجمد پوز میں بیٹھی رہی۔

ترکمان مولانا اور ان کی بیوی بالکل میرے پیچھے فروکش تھیں۔ آدا ہوائی سفر سے دہشت زدہ سارے وقت آنکھیں میچے بیٹھی رہتی تھی۔ اس وقت بھی وہ دور ایک کرسی پر آنکھیں بند کیے بیٹھی تھی۔ جیابین نمبودری اور بلدیو قریب کی کرسیوں پر براجمان تھے۔ اتنے میں یورپین روسی ایرہوسٹس لنچ لے کر آئی۔ ایک پلیٹ میں کولڈ کٹس کا انبار۔ آدا بے حال بیٹھی تھی۔ اسے جگانا میں نے مناسب نہ سمجھا۔ اب کس طرح معلوم کیا جائے کہ کولڈ کٹس کے انبار میں کون کون سے جناور کا گوشت ہے۔ اگر سور ہے تو میرے لیے بے کار۔ اگر گائے ہے تو مسٹر بلدیو اور جیابین نہیں کھا سکتے۔ سارے ہوائی جہاز میں کسی کو ایک لفظ انگریزی کا نہ آئے۔ میں نے ایرہوسٹس سے پوچھنے کی کوشش کی اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ روسی قوم چونکہ ایک بے تکلف اور خوش باش قوم ہے سارے طیارے میں خبر پھیل گئی کہ میرے سامنے ایک مسئلہ درپیش ہے۔ مسافروں نے اٹھ اٹھ کر امداد کے لیے آنا شروع کیا۔ فوجی افسر لڑکوں نے مدد کی کوشش کی۔ سب بے حد خوش اور ایک تفریح۔ آخر میں نے کاغذ کے نیپکین پر سور کی تصویر بنائی۔ اس وقت جہاز نے زور سے غچہ کھایا اور سور گائے بن گیا۔ وہ نیپکین ایرہوسٹس اور سارے مسافروں نے باری باری ملاحظہ کیا سمجھ میں نہ آیا۔ بحیرۂ کیسپین کے اوپر گہرائے بادل تھے بادوباراں میں طیارہ مستقل غچے کھا رہا تھا اسی عالم میں میں نے نیپکین پر دوسری تصویر گائے کی بنائی جہاز نے ایسی قلابازی کھائی کہ گائے سور بن گئی۔ اس وقت تک سارے مسافر اپنا اپنا لنچ ملتوی کر کے گائے اور سور کا پرابلم حل کرنے میں مصروف

تھے۔اچانک مجھے ترکمان مولانا کا خیال آیا۔

''مولانا۔ السلام علیکم'' میں نے گوشت کی پلیٹ ان کو دکھا کر پوچھا ''لحم خنزیر۔۔؟''
انھوں نے نفی میں سر ہلایا۔ میں نے پوچھا ''لحم بقر۔۔؟'' انھوں نے ترکمانی میں کچھ کہا اور اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے کہا۔۔ ''مسلمان ہستم''۔فوراً خوش ہوکر فرمایا ''الحمداللہ''۔

میں نے بلدیو اور جیا بین سے کہا اب تم لوگ سلاد کھاؤ۔ میں تو آرام سے بھوجن کرتی ہوں۔

حواشی:

1. نظامی گنجوی
2. نظامی گنجوی۔سکندرنامہ

وادیٔ زرفشاں

عشق آباد (ترکمانیہ) میں طیارہ میری وجہ سے آدھ گھنٹہ لیٹ ہوا کیونکہ ــــ میں ایک دکان سے چینی پیالے نکلوانے میں منہمک تھی۔ فرغنہ کی سرسبز وادیوں پر نیچا نیچا اڑتا طیارہ تاشقند پہنچا جو روس کا ایک اہم ہوائی اور ریلوے جنکشن ہے۔

باہر ٹیکسی میں بیٹھتے ہی گول ٹوپی والے ازبک ڈرائیور نے کہا "السلام علیکم"۔ شہر کی کچھ شمالی ہند جیسی۔ ہوٹل تاشقند کے سامنے سے دھاری دار ریشمی لبادوں اور گول ٹوپیوں والی عورتوں اور لڑکیوں کے غول گزر رہے ہیں۔ ہوٹل کی دکان میں علی شیر نوائی اور پہلے بڑے چغتائی ترکی مصنف ظہیر الدین بابر کے مجسمے (یہ مصنف ہندوستان بھی آیا تھا) ہر ازبک فل بوٹ پہنتا ہے۔ طہران میوزیم میں بادشاہ مہرگل کا مجسمہ دیکھا تو وہ بھی فل بوٹ پہنے کھڑا ہے۔ جنے کیا مصیبت ہے۔ ازبک علما مولانا سب فل بوٹ میں اس وقت نہ بارش ہورہی ہے نہ برف باری۔ نہ یہ شہسوار ہیں۔ حد یہ کہ ضعیف خواتین شلواروں پر فل بوٹ ڈانٹے چلی آرہی ہیں۔ پرانا تاشقند۔ صاف ستھری گلیوں کے اندر چائے خانوں میں لوگ باگ تخت پر آلتی پالتی مارے بیٹھے ہیں۔ جامع مسجد کے صحن میں گلاب کھلے ہیں۔ ایک بوڑھا ازبک ایک برآمدے میں اکیلا بیٹھا وضو کررہا ہے۔ مسجد سے ملحق عمارت پر "الادارۃ الدینیہ المسلمی آسیا الوسطی۔ اورتا، آسیا قازاخستان مسلمانیزی دینی باشعاری مدی" اور جانے کیا کیا لکھا ہے ــــ میں نے دروازے کے شیشوں میں سے جھانک کر دیکھا یورپین اسٹائل لنچ کی میز پر سجی ہوئی تھی۔ جورڈن کے گرینڈ مفتی آنے والے تھے۔ اور ازبک مولانا لوگ ان کو یہاں کھانا کھلا رہے تھے۔

بوڑھے ازبک مالی نے مجھے چند گلاب توڑ کر دیے۔ "رحمت" میں نے کہا جو ازبک میں شکریہ ہے۔ شہر کے پرانے بازار میں ہنگامہ سودا بیچنے والوں کی چیخ پکار (چھوٹے پیمانے پر ذاتی

تجارت کرنے کی اجازت ہے)ایک نان فروش اپنے گاہک سے جھگڑ رہا تھا۔ بازار میں ہماری آمد سے ہنگامے میں اضافہ ہوگیا۔ چند لڑکیوں نے گھیر کر شستہ انگیزی میں پوچھا "انڈین سنیما آرٹسٹ؟"

چھینٹ کی شلواریں پہن کر بوڑھی ازبک عورتیں زمین پر بیٹھی ترکاری بیچ رہی ہیں۔ تاشقند سے باہر ایک چمن زار یعنی شہتوت کا باغ ایک اجتماعی فارم۔ چند مکان۔ بوسیدہ ہر صحن کے اندر پھلوں کا باغ۔ ایک جگہ موٹر روک کر اجتماعی فارم کے ازبک ڈائرکٹر نے کہا آپ یہاں جس ڈیوڑھی کے اندر چاہیے چلی جائیے۔

ایک دہلیز پر ایک بوڑھی عورت چھینٹ کی شلوار قمیص پہنے۔ موٹے شیشوں کی عینک لگائے۔ چپ چاپ بیٹھی تھی میں نے اسی مکان کا رخ کیا۔

ڈیوڑھی کے اندر بھوسہ پڑا اور ایک تخت اندر بڑا سا مکان لکڑی کا پورچ دوسرے سرے پر باورچی خانہ گودام اور اصطبل۔ کسان کی بیوی گائے کی سانی میں مصروف۔ بے شمار بچے۔ کمرہ نشست میں دبیز قالین۔ ایک طرف ریشمی لحافوں توشکوں کے انبار۔ الماری میں چینی کے برتن۔ ایک کونے میں ٹیلی ویژن۔ باورچی خانے میں گیس کا چولہا۔ صحن میں جنگلے دار تخت جو ہر ازبک گھر میں ہوتا ہے۔ کسان کے بچے نے دلربا پر ایک گیت سنایا۔ بوڑھی دادی اماں ڈیوڑھی سے آکر برآمدے میں تخت پر بیٹھ گئیں۔ سامنے رحل میں ان کا قرآن شریف رکھا تھا۔ ان کا بیٹا یعنی صاحب خانہ کیمونسٹ پارٹی کا اور پوتے پوتیاں ینگ کیمونسٹ لیگ کے ممبر تھے۔

ایک گاؤں میں جہاں ایک تیز روندی دونوں طرف سفیدے کے درخت کھڑے تھے کسانوں کے ریسٹ ہوم میں لنچ۔ نہروں کے پانی پر بنے ہوئے پویلین بابر کو ہندوستان میں یاد آئے۔ اور یہی ایرانی اور مغل مینا توروں میں نظر آتے ہیں۔

ایک پویلین میں لنچ کے لیے میز سجی تھی۔ فواکہات کے انبار۔ نان اور دوسری نعمتیں تیز روندی ہمارے کرسیوں کے نیچے سے بہتی جا رہی تھی۔

سمرقند نے مایوس اور ملول کیا۔ ریگستان اسکوائر بی بی خانم کا مقبرہ اور مسجد۔ گمنام نقش بندی خانقاہیں۔ شاہ زندہؒ کے مقبرے میں سرخ رومالوں والے ازبک ینگ پائنیر بچوں کا گروہ اپنی

استانی کے ساتھ گھومتا پھر رہا تھا۔ الغ بیگ کی رصدگاہ۔ سمرقند میوزیم میں خوانین بخارا کے فارسی فرامین۔ شیبانی خان کی تصویر جو ازبک ہیرو ہے (اس نے بابر کو ہندوستان بھگایا) افراسیاب کی یادگاریں۔ رستم ایران کا کلچر ہیرو ہے تو افراسیاب توران کا کلچر ہیرو کیوں نہ ہو۔

گورمیر کی مرمت کی جارہی ہے۔ اندر عجیب ہیبت سی طاری تھی۔ سنگ سیاہ لمبا مزار تیمور۔ آس پاس شہزادوں اور ان کی خانموں کی قبریں۔ باہر سڑکوں پر بوڑھے ازبک سیخ کباب بیچ رہے ہیں۔ ایک بازار سے گزرتے ہوئے لتا منگیشکر کی آواز سنائی دی سمرقند کے بازار میں لتا کا فلمی گیت! تو گولڈن سمرقند کا حصہ ماضی سمجھو۔

اب ہوائی اڈے پر گھنٹوں سے انتظار کر رہے ہیں۔ جو چھوٹا طیارہ ہمیں ماسکو لے جانے والا ہے اسے بلانے کے لیے الماتا تار دیا جا چکا ہے۔ وہ وقت پر نہیں آیا۔ دوسرا طیارہ جو اس وقت ماسکو جارہا ہے اس میں جگہ نہیں ہے۔ ہمارے میزبان عطاء اللہ صاحب دوڑ دھوپ میں مصروف ہیں۔ آپ لوگوں نے اتنی حیرت انگیز ترقی کر لی اور پھر یہ کنفیوژن۔ میں نے ان عطاء اللہ شاہ بخاری سے جھنجھلا کر کہا (یہاں کام چلاؤ فارسی میں کام چل جاتا ہے) عطاء اللہ صاحب جھینپ کر سرخ ہو گئے۔ پھر انھوں نے ماسکو جانے والے پانچ روسی مسافروں کو ہماری خاطر اتروایا۔

''ارے آپ نے یہ کیوں کیا''۔ میں نے پوچھا۔

''آپ ہماری معزز مہمان جو ہیں۔'' عطاء اللہ شاہ بخاری نے کہا۔

طیارہ پر پھیلا کر وادئ زرفشاں سے ماسکو کی طرف اڑا ـــــ

بلیک ٹیولپ

مئی۔ جون 1974 تیز نیلی خلیج فارس۔ سعودی عرب کی زرد آؤٹ لائن۔ جنوبی ایران کے خشک پہاڑوں کا مون اسکیپ۔ فرودگاہ مہرآباد طہران۔ اچانک خوش گوار خنکی۔ سامنے کوہ دماوند۔ لحہ لحہ فوجی طیارے پرواز کر رہے ہیں۔ کوہ البرز۔ جنوبی روس۔ ماسکو۔

میرے ساتھ مراٹھی ڈرامہ نگار وجے تندولکر اور ہندی نقاد ڈاکٹر وجے پال سنگھ دہلی سے آئے ہیں۔

''ایرپورٹ پر ہمیں لینے کوئی موجود نہیں۔ یہاں سے لیٹویا کیسے جائیں گے؟'' دونوں حضرات نے گھبرا کر کہا۔ میں نے بحیثیت روس کی ایک ویسٹرن سیاح ان کو دلاسہ دیا اتنے میں ایک ماہ رو روسی لڑکی سموری ٹوپی پہنے گل دستہ سنبھالے ایک بیرونی دریچے سے جھانکتی نظر آئی ـــــ

''عینی ـــــ؟ آداب عرض ہے۔'' اس نے اردو میں کہا۔

وجے تندولکر اور ڈاکٹر سنگھ نے حیرت سے اس کو دیکھا۔ اب وہ یوں گویا ہوئی۔ ''میرا نام ایرا میکووا ہے۔ میں آپ کی ترجمان ہوں۔ ہم لوگ دو گھنٹے بعد سیدھے ریگا جائیں گے۔ پہلے شہر چل کر لنچ کھا لیجیے۔''

میں ایرا سے پہلے کبھی نہیں ملی تھی۔ وجے تندولکر نے پوچھا ''مس حیدر کو آپ کیسے پہچان گئیں؟''

''میں آگ کا دریا پر ماسکو یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کے لیے کام کر رہی ہوں۔''

میں نے فوراً طے کیا اس شریف لڑکی کو اس ریسرچ سے باز رکھنے کی کوشش کروں گی۔ کوئی بہتر کام کرے۔

آج 12 مئی تھی۔ 7 مئی کو میرے پاس منسٹری آف کلچر نئی دہلی کا تار پہنچا۔ "کیا آپ ریگا میں منعقد ہونے والی روسی، ہندستانی، پاکستانی اور بنگلہ دیشی ادیبوں کی کانفرنس میں ہندوستان کی طرف سے شرکت کرنا پسند کریں گی؟ فوراً دہلی پہنچئے"۔ دہلی پہنچ کر مجھے وجے تندولکر اور مسٹر سنگھ کو معلوم ہوا کہ لٹھویا میں کانفرنس شروع ہو چکی اور 12 مئی کو اس کا آخری سیشن ہے۔

ایرپورٹ سے ماسکو کے راستے میں بارش شروع ہو گئی۔ رائیٹرز یونین کے خوش منظر محلے میں پہنچتے پہنچتے سڑکوں پر پانی ہی پانی تھا۔

کلب کے برابر کاؤنٹ روستوف والا زرد محل پانی میں بھیگ رہا تھا۔ ڈرائیور نے کار احاطے میں چیری کے درخت کے نیچے کھڑی کردی۔ ہم لوگ ایک پہلو کے دروازے سے رائیٹرز کلب میں چلے گئے۔ کھانے کا وقت تھا۔ سارے کمرے لوگوں سے بھرے ہوئے تھے۔ ایرا بھاگ کر ایک فرانسیسی ترجمان لڑکی کو بلالائی اور خود ریگا کے لیے روبلز کا انتظام کرنے کاؤنٹ روستوف کے محل بھاگی ——— فرنچ ترجمان خاتون کی انگریزی واجبی تھی۔ میری فرنچ واجبی نہیں۔ میں نے انھیں بتایا کہ ڈاکٹر سنگھ کون کون سی ممنوع اشیا نہ کھائیں گے۔ کمرہ قہوے اور گرم کھانوں کی بھاپ سے معمور تھا۔ باہر بارش کی دھند امن اور تحفظ کا وہ احساس جو مغرب کے طعام خانوں میں ایسے موسم میں ہوتا ہے۔ جب باہر مینہ برستا ہو برف پڑتی ہو یا گہری دھند چھائی ہو۔

شمال مغرب کی طرف جانے والے طیاروں کے ایرپورٹ پہنچتے پہنچتے سورج نکل آیا۔ لٹھویا کا ہوائی جہاز بہت دور میدان میں کھڑا دھوپ میں چمک رہا تھا۔

شمالی یورپ کی سرزمین۔ شمالی جرمنی سے ملتی جلتی۔ لینڈ اسکیپ بدل گیا۔ شہر ریگا سے بیس میل دور مشہور صحت گاہ یرملا کے راستے میں پرانے کنٹری ہاؤس جن میں پہلے لٹھوین کاؤنٹ رہا کرتے ہوں گے۔ جھیلیں، خوب صورت مکانات، رومن رسم الخط میں سائن بورڈ سلاوروسی تہذیب کے بجائے ٹیوٹنک جرمن کلچر کی چھاپ۔

بالٹک کے کنارے شاہ بلوط اور صنوبروں میں گھری شاندار الٹرا ماڈرن عمارت۔ رائیٹرز ہوم۔ باغ میں سیاہ لالہ کے تختے۔ ایک وسیع ہال میں جس کی تین طرف دیواریں پلیٹ گلاس کی

ہیں۔ کانفرنس کا آخری اجلاس بھی ختم ہونے والا تھا۔ فیض صاحب طویل بیضوی میز کے سرے پر چرمی کرسی پر بیٹھے اطمینان سے سگریٹ کا دھواں اڑا رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر حسب عادت بڑے اطمینان سے پوچھا "ارے بھئی تم بہت دیر میں آئیں۔"

"آداب فیض صاحب اور کون کون آیا ہے پاکستان سے؟"

"ہم آئے ہیں۔ کیا ہم کافی نہیں؟"

میں اپنے نام کی تختی کے سامنے والی کرسی پر جا بیٹھی۔ سامنے قطب شمالی کا سرخ سورج بہت نزدیک سے میز پر جھانک رہا تھا۔ میں نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ اس وقت شام کے چھ بجے تھے۔ آج صبح چار بجے میں دہلی میں تھی بیچ میں تین چار گھنٹے ماسکو ٹھہرتے ہوئے شام کے چھ بجے ملک لیتھونیا۔ ایک زمانہ ایسا آئے گا جب زمین کی طنابیں کھنچ جائیں گی سورج سوا نیزے پر اتر آئے گا۔ الحاد کا بول بالا ہوگا اور بھائی بھائی کو نہ پہچانے گا۔

بنگلہ دیشی ادبا کی قطار فیض صاحب کے مقابل میں بیٹھی تھی۔ ان کے قائد نے اپنی طویل تقریر جاری رکھی۔ ملیالم مصنف پلّے کے نزدیک بنگلہ دیشی خاتون بیٹھی تھیں۔ نیلی کارچوبی ساڑی، بڑا سا جوڑا، ماتھے پر سرخ بندی۔ نام بدرالنسا عبداللہ ان کے بعد ازبک تاتار تاجیک، منگلو، کرغز اور روسی ادیب لوگ۔ بنگلہ دیشی لیڈر ڈاکٹر مظہر الاسلام کی تقریر کے بعد پاک و ہند و بنگلہ دیش کے مابین امن و مفاہمت کی اشد و فوری ضرورت پر ایک مختصر بھاشن فی البدیہہ دینے کے لیے میں نے سامنے رکھا مائیک قریب کھسکایا۔ فربہ انگریزی مترجم فوراً میرے پیچھے آن بیٹھا۔ فیض صاحب بدستور مہاتما بدھ کی طرح بیٹھے سگریٹ پیتے رہے۔ غلط۔ مہاتما بدھ سگریٹ نہیں پیتے تھے۔

میرے کمرے کے نیچے گہرا نیلا بالٹک صنوبر کے جنگل۔ ساحل۔ افق پر میڈیول گرجاؤں کے فلک بوس برج کمرے میں ہر شئے موجود۔ میز کاغذ۔ ٹائپ رائیٹر۔ ریفرنس کی کتابیں۔ فریجڈیر میں پھل فروٹ۔ چاکلیٹ۔ آرام نال رہو بالٹک سمندر دا نظارہ کرو تے لکھو۔

اب رات کے نو بجے ہیں۔ سورج اسی تیزی سے چمک رہا ہے۔ ایک خوابناک کلیسا میں

ایک فرانسیسی ارغنوں نواز (بالکل حجاب امتیاز علی کا جملہ ہوگیا) ارغنو بجانے میں مصروف ہے۔ گرجا کے مال اور چوک میں جم غفیر ریگا ایک موسیقی پرست شہر ہے۔ دنیا کا دوسرا سب سے بڑا یعنی عظیم الجثہ ارگن جو بارھویں صدی کے اس کلیسا میں موجود ہے۔ اس پر اب لادینی موسیقی بجائی جاتی ہے۔ جہاں لاٹ پادری کھڑا ہو کر وعظ کہتا تھا وہاں ایل۔ پی ریکارڈ بک رہے ہیں۔ اوپر بالکنی میں جہاں شاہان لیٹویا عبادت کرتے تھے۔ ہم جنتا کے لوگ بیٹھے چاکلیٹ کھا رہے ہیں۔ آدھ گھنٹے تک ارغنوں بہت اچھا لگا اس کے بعد اکتاہٹ شروع ہوئی۔ میں نے اس ساز موسیقی کی گہرائی، پھیلاؤ وغیرہ پر غور کرنے کی کوشش کی پھر چاروں طرف نظریں دوڑا کر میڈیویل لیٹوین گوتھک طرز تعمیر افریسکوز وغیرہ پر سوچ بچار کیا۔ اس دوران میں ڈاکٹر مظہر الاسلام آف بنگلہ دیش اور وجے پال سنگھ بہ آواز بلند خراٹے لے رہے تھے۔ میں نیچے ہال میں بیٹھے ہزار ہا سامعین کو دیکھ کر متاثر ہوئی کہ کس قدر کلچر پرست قوم ہے۔ پیچھے نظر ڈالی تو سنگلاخ دیوار کے کونے میں ایک سرنگ نظر آئی۔ چپکے سے اٹھ کر دیکھا سرنگ کے اندر جا کر کوٹھریاں، خفیہ گیلری اور چور زینہ نظر آیا۔ قرون وسطیٰ میں یہاں بادشاہ اور کلیسا کے مابین ایک دوسرے کے خلاف سازشیں ہوتی ہوں گی۔ قتل ہوتے ہوں گے یعنی مرڈران وی کتھڈرل۔ میں نے سرنگ میں جا کر تنگ زینہ اترنا شروع کیا جس میں ایک مدھم بلب روشن تھا۔ زینہ تنگ اور سرد اور پتھریلا اور قلعہ دولت آباد اور فتح پور سیکری کے زینوں سے زیادہ پراسرار معلوم ہوا۔ سیڑھیاں اترتے اترتے خیال آیا (جیسے پانچ سال قبل باکو کے بحری تیل کے کنٹرول روم میں خیال آیا تھا) کہ فرض کرو ایک عدد سی آئی اے ایجنٹ یہاں چھپا ہوا ہو۔ اور وہ نکالے پستول اور یوں گویا ہو۔ روسیوں کے جو رازہائے سربستہ تم کو معلوم ہیں فوراً بتاؤ۔ سب مرین سمندر میں موجود ہے فوراً فن لینڈ پہنچا دے گی۔ میں یہ سب تصور کرتے کرتے سیڑھیاں اتر رہی تھی کہ بالآخر ایک روشن دروازہ نظر آیا جو کیتھڈرل کے ہال میں کھلتا تھا۔ کونسرٹ ختم ہو چکا تھا۔

فرانسیسی موسیقار کہ اب تک پردۂ حجاب میں تھا اب سامنے آکر جھک جھک کر لاتعداد تالیوں کا شکریہ ادا کر رہا تھا۔ مجمع بکھرنا شروع ہوا۔ میں نے اوپر نظر ڈالی۔ شاہی بالکنی خالی ہو چکی

تھی۔ میں نے ہال کے انبوہ کثیر میں ساتھیوں کو ڈھونڈنا شروع کیا۔ وہ کہیں نہ ملے۔ اتنے میں فربہ انگریزی ترجمان بھیڑ چیرتا بھاگتا ہوا آیا اور کتابی اردو میں بولا "بی بی جی جملہ مصنفین آپ کے متلاشی ہیں۔" یہ روسی نوجوان انگریزی کا ترجمان تھا مگر کتابی اردو ہندی بھی خوب بولتا تھا۔ ایرا بامحاورہ فرانٹے کی اردو بولتی تھی اور لکھنؤ یونیورسٹی میں پڑھ کر آئی تھی۔

کلیسا سے ملحق خانقاہ اور شاہی قبرستان کے صحن چمن میں لوگ باگ ٹہلتے پھر رہے تھے۔ باہر گول پتھروں کے فرش والے چوک میں زرد ٹوپیوں والی نورڈک لڑکیاں اور سن کے سے پیلے بالوں والے نوجوان لالہ کے گل دستے سنبھالے ہنستے بولتے گزر رہے تھے۔ بالٹک اسکینڈ نیوین گوتھک کائنات۔ آدھی رات کے آسمان پر دودھیا اجالا پھیلا ہوا تھا۔

TWILIGHT OFTHE GODS

یہ واگنر کی موسیقی کی دنیا تھی۔

اور صبح کو شیشے کی دیواروں والے ہال میں بریکفاسٹ کی میز پر دوشنبہ کی تاجیک شاعرہ گل رخسار صفیوا حافظ کے رنگ میں کہی ہوئی اپنی تازہ عشقیہ غزل سناتی ہے۔ یہ لوگ ڈیکیڈنٹ ہوتے جا رہے ہیں صاحب۔

ماسکو میں ایک دفعہ پھر کوہ قفقاز جانے والے طیاروں کا ایرپورٹ۔ دو ہینڈسم جارجین لڑکے چوکلیٹ کے ڈبے ہاتھ میں لیے طیارے میں آئے۔ چوکلیٹ مسافروں کو دی اور ہنستے ہوئے کوک پٹ میں چلے گئے "بڑے خوش اخلاق پائلٹ ہیں"۔ میں نے ایرا سے کہا۔

"جارجین بہت خوش دل اور پرخلوص لوگ ہیں"۔ ایرا نے جواب دیا۔ یورپین روسی پوشکن ٹالسٹائی اور چے خف سمیت اوران کے زمانے سے کوہستان قفقاز کے باشندوں کو بہت رومینٹک سمجھتے ہیں اوران کے مداح ہیں۔

اب جارجین ایرہوسٹس نے مسافروں کو مٹھائی اور شطرنج کے ڈبے اور بورڈ تقسیم کیے۔ مزید آدھ گھنٹے گزر گیا۔ جہاز چل کر ہی نہیں دیتا۔ ایک گھنٹہ گزر گیا۔ پچھلے حصے میں کافی گہما گہمی تھی۔ ڈاکٹر سنگھ بہت گھبرا رہے تھے۔ میں نے کہا ڈاکٹر صاحب اب بھی وقت ہے ریل سے طبلسی

چلے جایئے یہاں کچھ بھروسہ نہیں۔ کل کے چھوکرے پائلٹ۔ لمبا سفر۔ اوپر آسمان جس پر یہ لوگ کہتے ہیں کہ بھگوان بھی نہیں ہے۔ نیچے پہاڑ ہی پہاڑ۔ اور جہاز یہیں سے نہیں اڑ رہا۔ لڑکوں کو چلانا نہیں آ رہا۔ معلوم ہوا ایک صاحب کا اسباب جو کہیں اور جا رہے تھے غلطی سے اس طیارے میں آ گیا تھا اور وہ اب تک ڈھونڈا جا رہا تھا۔ روسی خصلتاً کافی ہندستانی ہیں۔

قفقاز کے حسین ترین پہاڑوں پر سے نیچے نیچے اڑتے ہوئے جہاز پریوں کے دیس چلا۔ کوہ قاف۔ بنگلہ دیشی وفد خاموش اور الگ تھلگ رہتا تھا۔ ان میں سے ایک صاحب محمد الیاس چونچال اور خوش خلق آدمی تھے۔ ایک نوجوان راحت خاں صاحب سب سے زیادہ رنجیدہ صورت تھے۔ میں نے ان کے ساتھ شطرنج شروع کی۔ اچھا کھیلتے تھے حسب معمول دو تین روسی مسافر قریب آ کر کھیل دیکھنے لگے۔ روسی قوم کو شطرنج کا خبط ہے۔ نیچے آبشار۔ بادل۔ دلفریب کوہسار۔ روپہلی ندیاں۔ اسی جگہ کو سفید فام نسلوں کا گہوارہ کہا جاتا ہے۔

سحر گرجستان

کوہ قاف کے دو پری زاد رائیٹر طبلسی ایرپورٹ پر موجود تھے۔ ان کے ساتھ ہم لوگ ہوٹل آیوریا پہنچے جو ایک پہاڑی پر واقع ہے اور چاروں طرف بے حد تیز ہوا چل رہی تھی۔ طبلسی یا بلسی جو پہلے طفلس کہلاتا تھا اور اسٹالن کا وطن ہے۔ باکو کے مانند ایک حسین افسانوی شہر ہے۔ تیز رو پہاڑی ندی کرا چوڑی نہر کی طرح بہتی ہوٹل کے نیچے سے گزرتی ہے۔ سامنے سرسبز شہر۔ گرجا۔ پرانے مکانات، جدید ترین عمارتیں ایک پہاڑ کی چوٹی پر استادہ مدر جارجیا کا بلند و بالا مجسمہ۔ آرمینیہ کی طرح یہاں بھی قوم پرستی کا بہت زور ہے۔ ان کا رسم الخط بھی برقرار ہے۔ اور ان کی منفرد زبان دنیا کے کسی لسانی خاندان سے تعلق نہیں رکھتی۔ جارجین سرحدی پٹھانوں یا پنجابیوں کی قسم کے لوگ ہیں۔ مہمان نواز، جذباتی، فراخ دل اور خوش باش اور ایک جنگجو پہاڑی قوم کی حیثیت سے لڑائی بھڑائی اور سورمائی کی زبردست روایات کے مالک۔ ایک زمانہ تھا کہ یہ جنگجو جارجین عیسائی اور ان کے ہمسائے جنگجو مسلمان داغستانی اور آذری وغیرہ مستقل ایک دوسرے سے لڑا بھڑا کرتے تھے۔ جارجین بے حد پکڑ ہیں کھانے کی میز پر بار بار کھڑے ہو کر جام صحت نوش کرتے ہیں "جارجین ٹوسٹ"۔ جام صحت سارے روس میں مشہور ہیں۔ دنیا کے قدیم ترین مسیحی ملکوں میں سے ایک جارجیا تھا۔ سونے اور جواہرات کی پہاڑوں میں فراوانی۔ سینکڑوں مذہبی تصاویر سونے اور ہیرے جواہرات سے مزین عجائب خانوں اور گرجاؤں میں رکھی ہیں۔ میری ایک بے وقوفی کی تھیوری یہ تھی کہ اس ملک میں گرجاؤں کی بہتات کی وجہ سے عربوں نے اسے گرجستان کہا ہوگا۔ (اس کا دوسرا عرب نام اجرجان ہے) اب جو غور کیا تو اچانک انکشاف یہ ہوا کہ جارجیا سینٹ جارج کے نام پر آباد ہے۔ جارج کو عربی میں گرجیس یا جرجیس کہا جاتا ہے۔ (ایک حضرت جرجیس نبی بھی قصص الانبیا میں موجود ہیں) لہٰذا گرجستان۔

آذر بائیجان کی مانند یہاں بھی سیاحوں کے لیے مصنوعی خنجروں اور تلواروں پستولوں کا بہت زور ہے۔

طبلسی کے اکثر پرانے محلے طہران کی یاد دلاتے ہیں۔ وہی کلچر بیلٹ ہے۔ علاوہ ازیں جارجیا ایران کا بھی ایک صوبہ رہ چکا ہے۔ ان کے سولھویں سترھویں صدی کے میناتورعین مین صفوی ایرانی میناتور کا چربہ ہیں۔ بالخصوص شاہنامہ فردوسی کا جارجین مصور، ترجمہ، نظامی کی یوسف وزلیخا وغیرہ بقیہ پرانی مصوری میں ایرانی اسلامی اور بازنطینی مسیحی روایات کا اثر جھلکتا ہے۔

فیونی کلر ریلوے اور بجلی کی جھولے والی کرسیوں اور کاروں کے ذریعے ہم ان سرسبز پہاڑوں پر گئے جہاں قدیم گرجا گھروں اور خانقاہوں میں جارجین آرٹ کے یہ نوادر محفوظ ہیں۔ ایک پہاڑی کے دامن میں ایک جارجین کنبہ پکنک منا رہا تھا۔ قوی کھاجا، نان، ابلے انڈے، شہد آور شراب کی بوتلیں چادر بچھائے بیٹھے تھے اور منتظر تھے کہ ہم ان کی شرکت کریں۔ کہیں سے گٹار بجاتے دو نوجوان نمودار ہو گئے اور سب نے مل کر گانا اور رقص کرنا شروع کر دیا۔ ایرا ان کے جارجین فوک ڈانس میں شامل ہوگئی۔ ہم لوگ پہاڑی پر چڑھے۔ ایک طرف ایک قلعہ نظر آرہا تھا جو ساتویں صدی عیسوی میں مسلم عرب حملہ آوروں سے مدافعت کے لیے بنایا گیا تھا۔ بلند و بالا تاریک درختوں میں چھپے چھٹی صدی عیسوی کے ایک گرجا کا کافی حصہ منہدم ہو چکا تھا۔ ہم لوگ موم بتیاں جلا کر اس کے تہہ خانوں میں اترے۔ ایک تہہ خانے میں ایک ہزار برس پہلے ایک ایسا چیف راہب رہتا تھا جس نے پچاس برس تک سورج کی روشنی نہیں دیکھی۔ اور یہیں مر گیا۔ اس کا تابوت مع ڈھانچے کوٹھری میں اسی طرح رکھا تھا۔ ایک اور تہہ خانے میں راہبوں کی کھوپڑیوں اور ہڈیوں کا انبار نظر آیا۔ ان زمین دوز کمروں اور گیلریوں میں جنگل کی ہوا سیٹیاں بجاتی پھر رہی تھی اور فرش پر بکھری کھوپڑیوں میں وہ رہاب اب بھی موجود تھے۔ ذرا اونچائی پر ایک اور کیتھڈرل استادہ تھا۔ شکستہ گرجا مسلمانوں کی آمد سے قبل کا تھا یہ دوسرا کیتھڈرل مسلم دور کی یاد دلا رہا تھا۔ کیونکہ اس کے فرش پر جو سنگ مزار تھے ان سب پر اسلامی محرابیں بنی ہوئی تھیں۔ بہت اوپر ایک روشن دان کے پاس "خدا کی آنکھ" منقش تھی جو بغیر پلک جھپکے اس ویران کلیسا کو تک رہی تھی۔

طبلسی سے ایک اور پرانا کیتھڈرل۔ احاطے میں جارجین سیاحوں کا ہجوم۔ اندر ہال میں شمعیں فروزاں ہیں جو گرجا میوزیم بنادیے گئے ہیں۔ ان میں شمعیں بہ طور روایت و آرائش روشن کی جاتی ہیں۔ ہال کا فرش مزاروں سے پٹا پڑا تھا۔ مسیحی ممالک کا قاعدہ تھا کہ ان کے بادشاہ مشاہیر اور بڑے پادری گرجا کے اندر ہی فرش کی سطح کے نیچے دفن کیے جاتے تھے۔ بارھویں صدی کے اس کیتھڈرل میں قربان گاہ کے عین نیچے مجھے ایک کتبہ عربی میں لکھا نظر آیا۔ میں نے بیٹھ کر غور سے پڑھنے کی کوشش کی۔ کتبے کا نصف حصہ اولڈ جارجین میں تھا۔ نصف عربی میں جو کافی مٹ چکی تھی۔ ''ابن ملک شاہ—'' اور چند جملے بمشکل پہچانے جاتے تھے۔ ایرا بھی نزدیک بیٹھ کر بڑے انہماک سے ان الفاظ کو پڑھنے میں کوشاں ہوئی۔ ہمارے گرد جارجین لوگوں کا مجمع لگ گیا۔ ''کچھ قرآن کی سی آیات معلوم ہوتی ہے۔'' ایرا نے کہا۔ بڑے تعجب کی بات تھی۔ کیتھڈرل میں عین قربان گاہ کے نیچے ابن ملک شاہ کا مزار۔ میں نے پوری عبارت کاغذ پر نقل کی۔ ساتویں سے دسویں صدی عیسوی تک جارجیہ خلافتِ عباسیہ اور اس کے بعد سے سلاطین سلاجقہ کا ایک صوبہ تھا۔

ملک شاہ سلجوقی کا کوئی بیٹا شاید جارجیا کا گورنر رہا ہو اور وفات کے بعد اسے یہاں دفن کیا گیا ہو۔ مگر اسے گرجا میں کیوں دفن کیا گیا؟ ممکن ہے اس کی ماں گرجستانی عیسائی شہزادی رہی ہو یا ممکن ہے اہلِ گرجستان نے بہ طور عزت و تکریم مسلمان سلجوقی حاکم کو اس گرجا میں جہاں ان کے بادشاہ دفن ہوتے تھے، سپردِ خاک کیا ہو۔ بدقسمتی سے کتبے میں مرحوم کا نام بالکل مٹ چکا تھا۔ بعد میں لینن گراڈ جا کر میں نے ایک عراقی شاعر سے اس شکستہ عبارت کو DECIPHER کروایا۔

......''ابن ملک شاہ...... ہمارے سلطان کی تاریخ میں......واسطے اللہ کے جو ہماری تکالیف اور مصائب کا خاتمہ کرنے کے لیے بہ طور امداد ہمیں بیماری اور موت بھیجتا ہے......اور آخر میں ہم......گرمی سے بچانے کے لیے سایہ......ایک اور جگہ پر— ایک اور مکان...... ابدی آرام......ہم وعدہ کرتے ہیں کہ مرحوم کا بیٹا ہمارا بادشاہ ہوگا۔''

نہ معلوم اس بے چارے شہزادے پر کیا گزری تھی کس طرح مرا۔ اور اس کی عیسائی

جارجین رعایا نے وعدہ بھی کیا کہ اس کا بیٹا ان کا دوسرا حاکم ہوگا۔ اس دھندلے لوحِ مزار کی بے ربط عبارت کے پیچھے جانے کیسی کہانی کتنا بڑا المیہ کون سا تاریخی موڑ چھپا ہوگا۔ مجھ سے میرے روسی دوستوں نے کہا۔ میں اس عبارت کو جارجین اکیڈمی آف سائنسز کے پاس بھیجوں تاکہ وہ اس منفرد مزار کے بارے میں تحقیق کریں۔ یہ سب کرنے کا پھر وقت نہ ملا۔

ابن ملک شاہ کی قبر پر سے لوگ گزرتے رہے اور اونچی برنجی شمع دانوں میں موم بتیاں جھلملایا کیں ہم لوگ اس کیتھڈرل سے نکل کر پھر جدید طبلسی کی طرف روانہ ہوئے۔ جس کی سڑکوں پر موٹروں کی فراوانی اور ٹریفک سے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ایک مغربی سرمایہ دار عیش پرست شہر ہے۔ بے شمار موٹریں اب سوویت یونین میں عموماً نظر آتی ہیں مگر طبلسی سب شہروں سے بازی لے گیا۔

شہر میں دریا کے کنارے ٹیلے پر ایک اور ساتویں صدی عیسوی کا قلعہ بند گرجا (یہ سارے قلعہ بند گرجا مسلمانوں سے بچانے کے لیے بنائے گئے تھے) ہم لوگ اِدھر اُدھر گھومتے اندر داخل ہوئے تو ایک غیر متوقع منظر دکھائی پڑا۔ گرجا کا گول وسطی ہال ایک تجرباتی تھیٹر میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ آرک لائٹس کے نیچے گول اسٹیج پر نوجوان لڑکے اور لڑکیاں ایک ڈرامے کی ریہرسل میں مصروف تھے۔ ڈرامہ نگار و جے تندولکر بڑے انہماک سے ناٹک دیکھنے میں مشغول ہوئے۔ بنگلہ دیشی وفد کے لیڈر ڈاکٹر مظہر الاسلام اور ہمارے ڈاکٹر سنگھ میرے برابر کی کرسیوں پر رونق افروز تھے۔ میں بھی کھیل دیکھنے میں منہمک تھی اچانک خراٹوں کی آواز نے چونکا دیا۔ دونوں حضرات بڑے اطمینان سے محوِ خواب اور بڑے زور زور سے خراٹے لے رہے تھے۔ میں نے ان کو جگانے کی کوشش کی۔ چونک کر اٹھ بیٹھے۔ چند منٹ بعد پھر اُتنا شغل۔

جارجین نامی تماشہ گر، اور موسیقار ہیں۔ ان کی فلم انڈسٹری بہت ترقی یافتہ ہے۔ شام کو ہم لوگ ایک بہت ہی عظیم الشان سات منزلہ کونسرٹ ہال میں گئے جہاں ایک ہردلعزیز و معروف پوپ گروپ تازہ ترین اسٹیج کرافٹ کے ساتھ اپنے کمالات کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ ''جدید موسیقی'' کی کوئی سیاسی سرحدیں نہیں ہیں۔ ہم لوگ کونسرٹ سننے میں محو رہے۔ خر۔ خر۔ خر۔ ڈاکٹر مظہر الاسلام

اور ڈاکٹر سنگھ سقف شگاف خراٹے لے رہے تھے۔

طبلسی سے دور ایک خوب صورت پہاڑی پر ایک اور پرانا قلعہ، گرجا اور قبرستان جس میں جارجین مشاہیر دفن ہوتے ہیں۔ سیاحوں کا جم غفیر۔ قبریں ایک سے ایک خوب صورت ان پر مرمریں مجسمے اور تازہ گل دستے۔ ایک مشہور جارجین ایکٹر کی قبر اور پہاڑی پر ایک قدیم گرجا کا کھنڈر میلوں دور تک سرسبز گھاس بل کھاتے پہاڑی راستے جن پر سے موٹروں کی قطاریں گزر رہی ہیں۔ پہاڑی پر نوجوانوں کا ہجوم جو بشاش گانے گا رہے ہیں۔ گرجا کے اندر ریکارڈیڈ موسیقی متواتر بج رہی ہے۔ وادی میں دو چوڑی ندیاں بہہ رہی ہیں حد نظر تک پانی اور سبزہ۔

ایک سرسبز پہاڑی گاؤں۔ شفاف سڑکوں پر پائن کی چوبی پھول پٹ پٹ گر رہے ہیں۔

ایک شیڈ میں دو مزدور، لنچ ابلے انڈے۔ نان پنیر میں مصروف۔ ایک عمارت سے دو بچے گل دستے لیے دوڑے دوڑے نیچے آتے ہیں۔ اونچی گھاس سے ڈھکے ایک ٹیلے کے اندر غار نما خالی مکان، دروازے پر زرد خودرو پھولوں کا سیلاب۔ ایک ہزار سال قبل عرب حملہ آوروں سے بچنے کے لیے کسان یہ زمین دوز مکان بنا کر ان میں رہتے تھے۔ ایک جارجین بتاتا ہے۔

اور پرانا جارجیا۔ بادشاہ۔ بانکے شہزادے۔ ڈیوک جابر جاگیردار۔ ان کے دیہاتی محل ایک بڑے زمیندار کے چوبی مکان میں جواب میوزیم ہے۔ تخت پر ایرانی قالین بچھا ہے۔ صوفے پر ایرانی وضع کی قبائیں۔

عصر حاضر۔ طبلسی کے آرٹسٹوں کے کلب میں ایک نامور مصور کا ون مین شو۔ بے حد موڈرن تصاویر۔ مصور ساری دنیا کے آرٹسٹوں کی طرح ایک کینوس کے نیچے چپ چاپ کھڑا ہے۔

طبلسی سے روانگی کی صبح اہل بنگلہ دیش ایک لاؤنج میں فروکش تھے۔ باہر ایک مرمریں جارجین حور نما فوارے کی اونچی پھواریں دھوپ میں جگمگا رہی تھیں۔ ہوٹل آئیویر (کہ آئیوریا جارجیا کا قدیم نام ہے) کے سامنے کوہستان اور وادیوں میں حد نظر تک طبلسی پھیلا ہوا تھا۔ بہت تیز ہوا چل رہی تھی۔ نیچے دریائے کرا کا پانی جو جانے کتنے ہزاروں لاکھوں برس سے، طوفان نوح کے بعد سے اسی تندروی سے بہہ رہا تھا۔ اس کی رفتار میں رتی بھر کمی نہیں آئی تھی،

لمبے بند ے پہنے سیاہ چشم لڑکیاں اور بانکے جارجین ہوٹل میں ادھر اُدھر آ جا رہے تھے اور ان سب کے اجداد نے کم خونریزیوں میں حصہ نہیں لیا تھا نہ کم ستائے گئے تھے۔ انسان بڑا سخت جان ہے ان ہی خانقاہوں میں سے کسی ایک میں جو دور پہاڑوں میں پوشیدہ تھیں جوزف اسٹالین پادری بننے کے لیے داخل ہوا تھا اور مذہبی طالب علم کا سیاہ لبادہ پہنے اسی سامنے والے دریائے کرا کے کسی پُل سے گذرتا ہوگا۔

چلتے وقت کوہ مولولا کی پر پھر بادل گھر آئے۔ طلسماتی طبلسی دھند میں کھو گیا۔

بابِ یار

کیو۔ ہیروسٹی۔ ایرپورٹ پر اسٹیپسن نیلوائیکو، یوکرینی ہندی داں مترجم ادیب استقبال کے لیے موجود تھا، وہ چار برس کا تھا جب نازیوں نے اسی شہر پر قبضہ کیا۔ اسٹیپسن کو بابِ یار بھی یاد ہے جہاں نازیوں نے اسی ہزار (80000) یوکرینیوں کو جس میں بیشتر یہودی تھے قطار میں کھڑا کر کے مشین گنوں سے بھون ڈالا تھا۔ شہر سے باہر یادگار شہدا کی پرشکوہ عمارت اس میدان میں استادہ ہے جہاں ایک محاذ پر چالیس ہزار روسی جرمن حملہ آوروں کا مقابلہ کرتے مارے گئے تھے۔ باہر گل بار درختوں کے نیچے وہ ٹینک کھڑے تھے جو اس محاذ پر استعمال کیے گئے۔ یوکرینی بچے ان پر چڑھ کر کود پھاند رہے تھے۔ ان کے دادا دادیاں اسی جگہ کٹ کٹ کر مرے تھے۔ وہ میدان جنگ اب ایک خوب صورت پارک ہے۔ جرمنوں نے کیو کو تباہ و برباد کر دیا تھا۔ لینن گراڈ کی طرح اسے بھی اسی نفاست سے دوبارہ تعمیر کر لیا گیا۔ کیو یاد کیجیے گا وہی شہر ہے جس کے آرچ ڈیوک ولادی میر 980–1015 عیسوی نے ڈر کے مارے مسلمان یہودی ہونے کے بجائے عیسائی ہو کر مسیحی ملک و قوم روسیہ کی بنیاد رکھی تھی۔ کیو ولادی میر کا شہر ہے۔ ان گنت طلائی گنبدوں والے عالیشان گرجا۔ محلات۔ باغ دریائے ڈینیپر کے کنارے اس کا بڑا مجسمہ استادہ ہے۔ اس جگہ ولادی میر نے خود دریا میں ڈبکی لگا کر بپتسمہ حاصل کیا اور اپنی رعایا کو ڈبکیاں لگوا کر عیسائی کیا۔

قدم قدم پر ولادی میر۔ ڈاکٹر سنگھ نے مجھ سے چپکے سے پوچھا ''یہ بلڈی میر کون تھا جس کا یہ لوگ ہر وقت ذکر کرتے ہیں''۔

ولادی میر اور اس کے جانشینوں نے دو سو گرجا کیو میں بنوائے۔ زوال بازنطین کے بعد کیو تیسرا روم کہلایا۔

بارھویں صدی کی ایک خانقاہ — اور اس کے زیرِ زمین ایک اور راہب خانہ — گیلریوں

کی بھول بھلیاں۔ زمین دوز حجرے اور انڈر گراؤنڈ لامتناہی گیلریوں کے اندر دو رویہ بڑے بڑے طاقچوں میں سوحنوط شدہ لاشیں۔ اس زمین دوز خانقاہوں میں رہنے والے راہبوں اور پادریوں کے علاوہ کیو کے بادشاہوں، ملکاؤں اور شہزادوں اور شہزادیوں کی ممیاں اس تزک و احتشام سے محفوظ کی گئی تھیں کہ فراعنہ مصر کی ارواح شرما دیں۔ یہ طویل سنگلاخ پراسرار گیلوریاں زمین سے کئی سو فٹ نیچے اب ایرکنڈیشنڈ کر لی گئی ہیں۔ طاقچوں میں برقی روشنی۔ سات آٹھ سو برس پرانی ممیاں سیاہ لبادوں میں ملبوس سب کے چہرے سیاہ کپڑے سے پوشیدہ شاہی خاندان کے افراد کے سروں پر تاج۔ شہزادیوں کے پیروں میں سبک جڑاؤ مخملیں جوتیاں خشک سیاہ ہاتھ۔ طاقچے میں بارہ سیاہ پوش ممیاں ایک قطار میں لیٹی ہیں۔ یہ بارہ راہب یونانی سگے بھائی تھے جو بازنطین سے یہاں آئے تھے۔ ان میں سے دو بہت چھوٹی لاشیں ہیں۔ کمسن مرے۔

گیلریوں میں سیاحوں کا ہجوم۔ برقی قمقموں کے نیچے مزید طاقچوں میں مقدس تصاویر فروزاں۔ جرمن اوپر کی خانقاہ تباہ کر کے چلے گئے۔ اس انڈر گراؤنڈ کلیسائی ممی خانے کا ان کو پتہ نہ چلا۔ دراصل زندہ یوکرینیوں کو موت کے گھاٹ اتارنے سے فرصت نہ تھی۔ سات سو برس پرانی یوکرینی لاشوں کا کیا کرتے۔ بڑا لرزہ خیز حیرت انگیز مقام تھا۔ ہم لوگ زمین پر کھلی ہوا میں واپس آئے۔ احاطے میں پھلوں کے تازہ رس اور آئس کریم کی سلوٹ مشینوں کے گرد بچوں کا ہجوم۔ روشن آسمان۔ زندگی کی چہل پہل اور تازگی۔ زرد پھولوں کا سیلاب۔

کیو سے باہر عظیم آبی شاہراہ پر دو اسٹیمر دور دور جارہے تھے۔ ایک جہاز میں دل آویز موسیقی بج رہی تھی جو دور ساحل پر صاف سنائی دیتی تھی۔ شوقیہ مچھلی پکڑنے والوں کے سنسان طویل آبی پلیٹ فارم کے سرے پر ایک شخص ہیٹ لگائے جنگلے پر چپ چاپ جھکا پانی میں بنسی ڈالے کھڑا تھا۔ میں نے اس کے قریب جا کر اس کی تصویر لے لی اور وہ بے نیازی سے مچھلی کا منتظر رہا۔

مشہور عالم ''روسی بازنطینی'' گرجا جرمن بمباروں نے تباہ کر دیے تھے۔ ان کو دوبارہ اسی طرح تعمیر کر لیا گیا۔ ان کے اندر کے حسین مذہبی فریسکو جو برباد ہو گئے تھے۔ ان کو دوبارہ انتہائی دیدہ ریزی اور جانفشانی سے ملک کے بہترین مصوروں نے دوبارہ تخلیق کیا ہے۔

شہر کے اندر ایک کیتھڈرل میں اتوار کی سروس۔ ہال میں حسب معمول معمر مرد عورتوں کا ہجوم۔ چند نوجوان بھی موجود ہیں جو ہماری طرح ٹورسٹ آئے ہیں لیکن کوایئر نوجوان لڑکیوں پر مشتمل ہے۔ زرق برق لبادوں میں ملبوس پادری الطار کے نیچے کھڑے مذہبی رسوم ادا کر رہے ہیں۔ میں نے بھیڑ میں گھس کر پادریوں کی تصویریں اتارنی شروع کیں۔ ایک جواں سال اسقف نے مجھے دیکھ لیا فوراً ہاتھ کے اشارے سے منع کیا میں وہاں سے بھاگی۔

پھاٹک پر سیاہ پوش بوڑھی یوکرینی کسان عورتیں اندر جانے کی منتظر تھیں۔ ایک طرف وجے تندولکر اپنا کیمرہ سنبھالے کھڑے تھے۔ خشکی سے فرمایا۔ سوویت یونین آتے وقت میرا خیال تھا مجھے اس قدر فیکٹریوں اور اجتماعی فارم دکھلا کر برین واش کریں گے کہ میں واپس جا کر کمیونسٹ ہو جاؤں گا مگر ان لوگوں نے اتنے بے شمار چرچ دکھلائے ہیں کہ خدشہ ہے عیسائی نہ ہو جاؤں۔

یوکرینی بھی بے حد خلیق اور مہمان نواز لوگ ہیں۔ کیو سے روانگی کے وقت سارے یوکرینی دوست اور میزبان جذباتی ہو رہے تھے۔ ایسی نرم دل قوم نے کیا مصیبتیں جھیلی ہیں۔ تیز رفتار لکژری ٹرین رات بھر یوکرین کی سیاہ مٹی پر چلا کی "اسٹیپ" کہ سینکڑوں ہزاروں میل وسیع میدانوں میں سے گزر کر دوسرے دن ٹرین ماسکو وارد ہوئی۔

ایک بار پھر ریڈ اسکوائیر ہوٹل روسیہ۔ ہوٹل میں امریکن اور مغربی سیاحوں کا ہجوم پہلے سے زیادہ۔ لیکن سرخ چینی کوئی نہیں دکھلائی دیتا۔ ہوٹل روسیہ غالباً دنیا کا سب سے بڑا ہوٹل ہے (چھ ہزار کمرے) دس ہزار مہمانوں کے لیے گنجائش۔ پورے تینتیس میل کی طوالت کی گیلریاں۔ فوایئر میں ایک اور رنگارنگ گروہ بیرونی ممالک سے آ کر اتر رہا تھا۔ یہ سب پشکن فیسٹیول کے لیے وارد ہوئے تھے۔

اپنے کمرے میں واپس پہنچ کر میں اینہ کے ہاں رومانیہ جانے کی تیاری میں مصروف تھی۔ اتنے میں سوویت رائیٹرز یونین کی اردوداں سکریٹری مریم سلگانک نے نزول اجلاس کیا۔ فرمایا۔ بخارسٹ پھر چلی جانا۔ پہلے پشکن فیسٹیول میں شرکت کرلو اور روسی فیڈریشن میں میر کر آؤ۔

اسی فلور کے کیفے ٹیریا میں فیض صاحب حلقہ مریداں میں بیٹھے نظر آئے۔ موصوف ریگا

سے سیدھے ماسکو آ گئے تھے۔ میں نے پوچھا آپ بھی پشکن فیسٹول کے لیے چل رہے ہیں۔ فرمایا چلے چلیں گے۔

دوسری شام کینیڈا، آسٹریلیا، فرانس، مشرقی یورپ، افریقہ اور عرب ممالک سے فیسٹول کے لیے آئے ہوئے ادیبوں کو بھر کر لگژری ٹرین "سرخ تیر" لینن گراڈ کی طرف چلی۔ فیض صاحب مع حلقۂ مریداں ایک بار پر جا بیٹھے۔ ایرا، میں اور چند دوسری خواتین ساواروں کی طرف گئیں۔ اسٹیورڈلڑکیوں نے چائے اور چوکلیٹ کمرے میں پہنچائی۔ صبح کو ٹرین لینن گراڈ پہنچی۔ اسٹیشن پر شہر کا میونسپل بینڈ بجا۔ لینن گراڈ ایک مغرور اور خود پرناز اں شہر ہے اور اس کا یہ غرور قطعی جائز ہے۔

اسٹیشن سے لینن گراڈ چند قدم کے فاصلے پر ہے۔ ہم لوگ پیدل اس کی طرف روانہ ہوئے۔

پچھلی مرتبہ 1969 میں ہنگری کی کلاراسوجی اسی فوایئر میں کھڑی ملی تھی۔ آج اسے مرے کئی سال ہو چکے تھے (بوڈاپسٹ سے ایک روز ایک سیاہ حاشیے والا کارڈ ہنگرین زبان میں اس کے شوہر کی طرف سے میرے نام بمبئی آیا تھا) اور باقی سب جو پچھلی مرتبہ جمع ہوئے تھے اب کہاں کہاں ہوں گے۔

مغربی یورپ سے واپسی پر پیٹر اعظم ایک حبشی لڑکا اپنے ساتھ لایا تھا۔ اس کا نام ابراہیم حنی بل (غالباً حنبلی تھا) اور وہ ابی سینیا کا مسلمان تھا۔ پیٹر اعظم نے اسے اپنا باڈی گارڈ مقرر کیا۔ پھر جنرل بنایا۔ ابراہیم عیسائی ہو گیا اور زار نے اس کی شادی ایک روسی رئیس زادی سے کر دی۔ الگزینڈر پشکن جو 1799 میں ماسکو میں پیدا ہوا، ابراہیم حنبل کا نواسہ تھا۔

الگزینڈر پشکن کا پڑپوتا جو ایک ریٹائرڈ پبلشر ہے ہمارے ساتھ فیسٹول میں شرکت کر رہا ہے خاموش طبیعت۔ منکسر المزاج اس کے بیس سالہ لڑکے الگزینڈر پشکن کی شکل میں اپنے نامور جدِ امجد کی شباہت موجود ہے۔ GENES کا سفر۔

دوسری صبح ہم لوگ شہر سے باہر زار کے محل کی طرف روانہ ہوئے جس کے نزدیک وہ اسکول ہے جس میں پشکن نے پڑھا۔ کوچ میں سب سے اگلی سیٹ پر بیٹھے ایک سر منڈے افغان نے باتیں شروع کیں (افغان نہ جانے سب کے سب سر کیوں منڈواتے ہیں) وہ کافی بڑا بور

نکلا۔ گھنٹے بھر بعد میں نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔ فیض صاحب پچھلی سیٹ پر تنہا بیٹھے تھے۔ مہاتما بدھ کی طرح۔ سگریٹ پی رہے تھے۔ آپ میری فصیح و بلیغ فارسی راستے بھر سنتے آ رہے ہیں۔ میں نے گھبرا کر کہا۔ دوسری سیٹ پر عراقی شاعر جس کا نہایت غیر شاعرانہ نام عبدالرزاق عبدالواحد تھا۔ اپنے روسی ترجمان ایگورے کے ساتھ بے نقط کی عربی بولتا چلا آ رہا ہے۔

محل پشکن میوزیم میں پہنچ کر میرے افغان اور فیض صاحب کے ساتھ لگ گیا وہ روسی زبان کا ماہر تھا۔ اب اس نے خود کو ہمارا گائیڈ مقرر کر لیا۔

''بقول ماجد علی آئیڈیا ہو گیا۔ اب باہر چلتے ہیں۔'' میں نے کہا فیض صاحب اور میں کچھ دیر بعد زینے سے اتر کر نیچے آ گئے۔

افغان محل سے برآمد ہوا۔ لپکا ہوا آیا۔ ہم لوگ شاہی باغ کی طرف چلے وہ پیچھے پیچھے۔ فیض صاحب نے بہ زبان فارسی اس سے کہا ان کی والدہ بھی افغان تھیں۔ وہ بہت خوش ہوا۔ مگر اس نے بخشا نہیں۔ کوچ میں پھر ساتھ واپس آیا۔

شام کو میں نے دیکھا کہ عراقی شاعر عبدالرزاق عبدالواحد فیض صاحب کے حلقہ مریداں میں بیٹھا ہوا ہے۔

ارمتاژ۔ نچلے ہال میں دونوں طرف مرمریں مجسمے استادہ تھے۔ گائیڈ لڑکی نے کہا......

''یہاں پہنچ کر روسی ملاحوں نے انقلاب کا آغاز کیا۔'' ڈاکٹر سنگھ بڑی سنجیدگی کے ساتھ مجھ سے بولے۔ ''کمال ہے۔ روسی ملاحوں نے کتنی اچھی مورتیاں بنائیں''۔ ڈاکٹر سنگھ کا جواب نہیں تھا۔

ارمتاژ میں چودہ ہزار نایاب تصاویر ہیں۔ بارہ ہزار مجسمے۔ پچیس لاکھ نوادر۔ چار سو کمروں میں سجی یہ چیزیں صرف ایک ایک منٹ دیکھنے کے لیے پورے بارہ سال چاہئیں۔

شام کو فیض صاحب ماسکو واپس چلے گئے۔ ایک روز صبح ہم نے لینن گراڈ سے نکل کر بذریعہ کوچ شمال کا رخ کیا۔ شاہراہ پر دونوں طرف صنوبر کے گھنے جنگل۔ جھیلیں۔ زرد پھولوں کے تختے۔ خوب صورت قصبے۔ چوڑے دریا۔ طلائی اور روپہلی۔ گنبدوں والے گرجا۔ ہم لوگ دوبارہ لیٹویا اور لیتھونیا کی طرف جا رہے تھے۔

پشکن فیسٹیول

کرسس کارڈ کنٹری اسکوف کے راستے میں ہماری کوچیں ایک گاؤں میں رکیں۔ بارش ہو رہی تھی اور قومی پوشاک میں ملبوس بہت بڑا ہجوم ہمیں خیر مقدم کہنے کے لیے سبزے پر موجود لڑکے اکارڈین بجا رہے تھے۔ مردوں نے کواس سے بھرے مگ پیش کیے بچے اور لڑکیاں لالے کے گل دستے لیے کھڑی تھیں۔ بارش تیز ہو گئی۔ ٹیلی ویژن والوں نے فلم بندی شروع کر دی۔

بنگلہ دیشی وفد ماسکو سے ڈھاکہ واپس جا چکا تھا صرف اس کے قائد فیسٹیول کے لیے ٹھہرا لیے گئے تھے۔ موصوف کو اپنی تصویریں کھنچوانے کا بے حد شوق تھا۔ برستی بارش میں وہ نہایت مستقل مزاجی سے ٹیلی ویژن کیمرے کے سامنے کھڑے رہے۔

کچھ دیر بعد ہم لوگ آگے روانہ ہوئے۔ بوڑھی عورتوں نے اپنی پوپلی مسکراہٹ سے الوداع کیا ایک بہت چھوٹا بچہ جس نے خودرو پھولوں کا ایک گچھا مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا اپنے ننھے ہاتھوں سے ٹاٹا کرتا رہا پھر بارش کی دھند میں چھپ گیا۔

اسکوف میں قرون وسطیٰ کا بڑا کریملن (قلعہ) دریا کے کنارے استادہ ہے اور نقرئی گنبد والے گرجا۔ عبادت خانے میں ہیرے جواہرات سے جڑی ضخیم انجیلوں اور ہیرے جواہرات سے جڑے آئیکنوں کی سارے یورپین روس، جارجیا اور یوکرین کی طرح یہاں بھی افراط ہے۔ روسی چرچ دنیا کا امیر ترین کلیسا تھا۔

کریملن کے فصیل سے زار اپنے مجرموں کو نیچے پھنکوا کر ہلاک کروا دیتے تھے۔ ماسکو سے آئی ہوئی ایک فلم کمپنی فصیل کے نیچے شوٹنگ کر رہی تھی۔ دھوپ نکل آئی تھی۔ کینڈین شاعر اس کی بیوی اور میں اور مسز سنگھ ٹہلتے ہوئے قلعے کے تیرھویں صدی میں بنے گرجا کے اندر چلے گئے۔ ایک کمرے میں پادری نماز جنازہ پڑھانے میں مصروف تھا۔ اسی طرح کا کھلا نقشین تابوت اور

سوگوار مزدور میں نے پانچ سال قبل ماسکو سے باہر ایک گرجا میں دیکھے تھے۔ یہاں چند سیاح بھی موجود تھے۔ سوگوار رو رہے تھے۔

ایسٹونیا کی سرحد پر پچوری ایک انتہائی خوب صورت، پرستانی میڈیول خانقاہ جس کے اندر چورانوے راہب موجود تھے۔ ان میں سب سے بوڑھے کی عمر ایک سو تین برس تھی اور سب سے کم عمر ایک چوبیس سالہ لڑکا تھا۔

خانقاہ کے پھاٹک کے نیچے سڑک پر سے ایک بوڑھا گذرا۔ روسی بلاؤز۔ گھنی سفید داڑھی۔ موٹے جوتے ہاتھ میں عصا۔ کمر سے بندھا پٹکا اور بنڈل۔ ٹالسٹائی کا ایک کردار۔ پرانا روس اس جگہ ایک پینٹنگ کی طرح موجود تھا۔

قصبہ میخائیلوسکو میں پشکن کی ماں کی زمینداری تھی جہاں شاعر زار کے حکم سے کچھ عرصہ جلاوطن رہا۔ یہ سارا علاقہ حسین ترین کرسمس کارڈ کنٹری ہے۔ پشکن کے مکان کے چاروں طرف پائن کے شاندار جنگل، ندیاں، جھیلیں، باغات، باغ میں سے گزرتی ندیوں پر خوب صورت پل۔ پشکن کا مکان اسی طرح سجا سجایا موجود تھا۔

پشکن فیسٹیول کے آخری دن صنوبر کے ایک جنگل میں پچاس ہزار شمالی روسیوں کا مجمع جو ہاتھوں میں لالہ کے گچھے لیے جوق در جوق اس سبزہ زار کی طرف آرہے ہیں جہاں ایک طرف کتابوں کی دکانیں لگ رہی ہیں۔ روسی بے تحاشہ کتابیں خریدتے ہیں۔ کوچ کے ڈرائیور نے اپنے ڈیش بورڈ کے اوپر کتابیں رکھی ہوئی ہیں۔ اور وہ آپ سے آٹوگراف لیتے۔ سوویت یونین میں ہر فرد و بشر کو غیر ملکی ادیبوں سے آٹوگراف لینے کا اس طرح جنون ہے، جس طرح ہمارے یہاں فلم اسٹاروں کو گھیرا جاتا ہے۔ اس جنگل میں ہم لوگوں نے ہزاروں آٹوگراف بکس پر دستخط کر کے دیے۔ پہلے پولس کی سپاہیوں نے جو بندوبست پر مستعد تھے آٹوگراف بکس مجمع سے لے لے کر پہنچانی شروع کیں۔ آخر میں وہ بھی تھک گئے اور ہجوم کی قطار کم ہونے میں نہ آئی اس میں ہر عمر کے مرد و عورتیں اور نوجوان لڑکے لڑکیاں شامل تھے۔

بہت وسیع ڈائس پر مندوبین کی تقاریر شروع ہوئیں۔ پچاس ہزار کا مجمع گھاس پر نہایت

عقیدت سے بیٹھی سن رہا تھا۔ میں نے اپنی البدیہہ تقریر بہ زبان انگریزی علامہ اقبال کو QUOTE کیا جو ایسے موقع پر بہت کام آتے ہیں۔ ایرا نے روسی میں ترجمہ کیا۔ بنگلہ دیشی قائد نے ٹیگور سے شروع کر کے ٹیگور پر ختم کیا۔

پشکن گوری (پشکن کی پہاڑی) کے جدید ترین وضع کے ہوٹل میں رات کے وقت ایرا کے کمرے میں فیسٹیول کے منتظم روسی، ایک اور روسی دوست اور اس کی تاتاری بیوی سے سیاسی بحث چھڑ گئی۔ رات کے دو بج گئے۔ بحث ختم ہونے میں نہ آتی تھی۔ تین بج گئے۔ میں نے دوستوں سے کہا میری فلور تک ساتھ چلے چلیں۔ ایرا کو شب بخیر کہہ کر ہم چوتھی منزل پر آئے۔ اپنے دروازے پر پہنچ کر کنجی لگائی۔ دروازہ کسی طرح نہ کھلا۔ تینوں روسیوں نے کوشش کی۔ دروازہ نہ کھلا۔ آدھ گھنٹہ گزر گیا۔ پشکن کی پہاڑی پر مرغ نے اذان دی۔ دروازہ تب بھی نہ کھلا۔ اتنے میں ایک بوڑھی ملازمہ آنکھیں ملتی ہوئی آئی۔ روسی دوست سے کنجی لے کر دیکھی اور بولی۔ یہ غلط کنجی اور غلط فلور ہے۔

صبح کو بریکفاسٹ کے لیے نیچے جاتے ہوئے کینیڈین شاعر کی کمسن لڑکی زینے پر ملی اس نے اپنے چھجے والی ہیٹ پر زرد پھول اڑس رکھے تھے اور وہ یونان کی سنتھیا معلوم ہو رہی تھی۔

بریکفاسٹ کے بعد ہم لوگ پیدل اس گرجا کی طرف چلے جس میں پشکن دفن ہیں۔ راستے میں مرغ بانگ دے رہے تھے اور کاٹجوں سے دھواں نکل رہا تھا۔

گرجا کے ہال میں شمعیں روشن تھیں۔ سوویت کوایر نے وہ حمدیں گائیں جو 1837 عیسوی میں پشکن کی تدفین کے روز اسی جگہ گائی گئی تھیں۔ ترک کمیونسٹ مندوب اور ایتھوپین کمیونسٹ مندوب سر ہلا کر چپکے سے مجھ سے بولے "یہ ڈیکیڈنس ہے۔" مذہبی گیت گائے جا رہے ہیں۔

پشکن گوری سے واپسی پر میلوں دور تک نرگس کے پھولوں کے تختے دریاؤں کی طرح لہریں مارتے نظر آ رہے تھے۔ جنگلوں میں پھولوں کی افراط تھی۔ ایک دیہاتی قبرستان کے پھاٹک پر کوچیں رکیں۔ یہاں پشکن کی ایک محبوبہ اینا کرین کا مزار تھا۔ گورستان پائن کے جھنڈ میں

پوشیدہ تھی۔ نزدیک ندی بہہ رہی تھی۔ اس بار ایسے چوبی مکان جو روسی پریوں کی کہانیوں کی تصاویر میں نظر آتے ہیں۔ قبرستان میں ہر لوح مزار پر متوفی کی تصویر اور تازہ گل دستے غالباً یہ CULT OF THE DEAD ان کے بازنطینی ماضی کی یادگار ہے۔ ایک بوڑھی عورت ایک قبر کے پاس خاموش کھڑی تھی۔ سنگ مزار پر ایک نوجوان کی تصویر۔ شاید اس کا بیٹا تھا۔

''یہاں سوویت یونین میں ہر جگہ ہر قبر پر تازہ گل دستے شاید گورنمنٹ صبح صبح ہر جگہ رکھوا دیتی ہے۔'' مسز سنگھ نے ایک اور نادر خیال کا اظہار کیا۔

نووگراڈ۔ روس کا قدیم ترین پایۂ تخت اور اسکوف کی طرح پرانی خالص روسی تہذیب کا گہوارہ۔ اسکوف کی طرح ایک اور پرستانی شہر جوڑا۔ دریا۔ قدیم قلعہ۔ نقرئی گنبدوں والے کلیسا۔ میوزیم میں روس کے نادر ترین آئیکنوں، مذہبی فریسکوز اور مذہبی تصاویر کا عظیم الشان ذخیرہ موجود ہے۔

قرون وسطیٰ کے ایک مرچنٹ پرنس کا دومنزلہ گھر۔ چوبی زینہ اوپر وسیع کمرے۔ بھدا فرنیچر۔ سنگلاخ دیواریں۔ آئیکن۔ موٹے لبادے۔ زینے پر ایک بچ پر بیٹھی تھی۔ صحن میں مرغیاں پھر رہی تھیں اور دھوپ میں عبدالرزاق اپنے روسی ترجمان نوعمر عربی داں ایگور سے باتوں میں مصروف تھا۔ ایگور اس مکان کی تہذیبی کائنات کا وارث تھا۔

شہر سے باہر ایک ٹیلے پر بہت ہی قدیم تاریخی قبرستان نیچے دریا۔ قرون وسطیٰ میں سویڈن۔ مغرب میں پولینڈ۔ جنوب مغرب میں ترکی۔ پرانے روس کے تین روایتی دشمن تھے۔

قبرستان سے ملحق ایک بہت ہی پرانا شکستہ گرجا۔ اس کے گرد تیز ہوا چل رہی تھی۔ میں نے اس کی شکستہ کھڑکی سے اندر جھانکا جہاں ایک ہزار سال کا ملبہ موجود تھا۔ اچانک بورافغان نظر آگیا دوسری کھڑکی میں سے جھانک کر اس نے دفعتاً غیر متوقع اردو میں کہا ''بہت تیز ہوا چل رہی ہے۔'' اور غائب ہوگیا۔

واپس اسکوف۔ ہوٹل کے کچھ فاصلے پر اوپن ایر بال روم میں رقص ہو رہا تھا۔ باگ رات کے اجالے میں سڑکوں پر ٹہلتے پھر رہے تھے۔ شمال کی ود سپید راتوں کا زمانہ ختم نہیں ہوا۔

ملیشیا سے آیا ہوا ایک عجیب سا آدمی (یعنی ذرا PECULIAR) سیاہ ٹوپی۔ پتلون پر ایپرن۔ اپنے روسی مترجم کے ساتھ ایک درخت کے نیچے کھڑا بڑے انہاک سے ناچ ملاحظہ کر رہا تھا۔ میں نے ڈاکٹر سنگھ سے کہا یہ آدمی عجیب سا لگتا ہے۔ کہنے لگے۔ یہ بھی اپنے دیس کا مہاتیکھک ہوگا۔ ڈاکٹر صاحب بعض دفعہ بڑے پتے کی باتیں کہہ جاتے ہیں۔

اسکوف شمالی روسی ریلوے کا ہیڈکوارٹر ہے۔ شہر کے مختلف اداروں نے مختلف مندوبین کو الگ الگ مدعو کیا تھا۔ ریلوے کلب نے مجھے ڈاکٹر سنگھ اور بنگلہ دیشی نمائندے کو دعوت دی۔ چلنے سے پہلے میں نے ڈاکٹر سنگھ کو پشکن پر BRIEF کیا۔ اور کہا بس آپ ہندی ادب کی جنرل تصویر کھینچ کر یہ کہتے جائیے گا کہ پشکن اور اس کے آدرشوں نے بھی ہندی ادب کو متاثر کیا۔

''ٹھیک ہے۔''

کلب کا ہال ریلوے مزدور مرد وعورتوں سے پُر تھا جو ہندستانی ادب پر تقریر سننے کے بے حد مشتاق نظر آتے تھے۔ بنگلہ دیشی ادیب نے ''ٹیگور اور پشکن''۔ ''ٹیگور اور پشکن''۔ بار بار کہا جس کا ترجمہ ان کے بنگالی ترجمان بورس نے کیا اور مجھے ''غالب اور گیٹے کا'' کا مشہور لطیفہ یاد آیا۔

تقاریر کے بعد شمالی روسی ریلوے کے افسر اعلیٰ ہم تینوں کو اوپر کھانا کھانے کے لیے لے گئے۔ دوسری منزل پر ایک کمرے میں ضیافت کی میز چنی ہوئی تھی۔ ایک جارجین شاعر اور روسی میزبانوں نے ٹوسٹ پینے شروع کیے جو چار گھنٹے تک چلا کیے ڈاکٹر سنگھ بھلے آدمی تھے۔ شراب چھوتے نہیں تھے وہ چپ چاپ بیٹھے رہے۔ اب چائے کا دور چلا۔ ایک روسی ریلوے افسر چائے کا سامان اٹھا اٹھا کر کمرے میں لا رہا تھا۔ اخلاقاً میں نے جا کر اس کی مدد شروع کی اور سب کو چائے سرو کرنے میں مشغول ہوگئی۔ روسی ریلوے کے افسر اعلیٰ نے جو ایک جنرل تھے فوراً ایک بیج مجھے دیا اور کہا آج سے تم ہماری یونین کی ممبر ہو۔ ہم لوگ چار بجے اس میز پر بیٹھے تھے۔ نو بجے رات کا کھانا شروع ہوا۔ باہر سورج چمک رہا تھا۔ روسی جنرل بہت شفیق اور سوئٹ بزرگ تھا۔ اس نے دوبارہ کہا تم یونین کے ممبر ہو۔ بہترین روسی چوکلیٹ کا عظیم الجثہ ڈبہ مجھے تھما کر بہت

جذبے سے دہرایا۔"تم ہماری یونین کی ممبر ہو۔"ہم لوگ کوچ میں آکر بیٹھے۔ایک روسی شرمایا ہوا سا ایک کونے میں کھڑا تھا۔اس نے ایرا سے کچھ کہا اور مجھے ایک قلم پیش کیا۔"آپ ہمارے ریلوے ورکرز یونین کی ممبر ہیں۔"چونکہ میں نے بطور مہمان علاحدہ بیٹھے رہنے کے بجائے ان لوگوں کے ساتھ مل کر چائے بنائی اور سرو کی تھی۔اتنی سی بات سے یہ لوگ اس قدر متاثر ہوئے تھے۔

اسکوف کے تھیٹر ہال میں شمالی روس کے ناچ۔آخری رات ہوٹل میں الوداعی ضیافت۔ ٹوسٹ پہ ٹوسٹ پیئے جارہے تھے۔حسب دستور میز پر کے مار مار کر روسی جن کی داد دیتے تھے بے حد شور مچ رہا تھا۔میں نے کھڑے ہوکر WATER MENERAL پر ہندوستان کی طرف سے جامِ صحت تجویز کیا۔تالیوں کے شور سے چھت اڑ گئی۔پورے مجمع میں میرے اور ڈاکٹر سنگھ اور کینیڈین شاعر اور ان کی بیوی کے علاوہ انگلش اسپیکنگ شخص اور کوئی نہ تھا۔فیسٹیول کے خوش مزاج منتظمِ اعلیٰ کے لیے کینیڈین شاعر ان کی بیوی اور میں نے"فور ہی از اے جولی گڈ فیلو" گایا۔اس وقت اس سلاو مجمع میں اچانک ہم تینوں اینگلو سیکشن اور برٹش کولونیل روایت کے نمائندے بن گئے۔جگ سا پزل کے مختلف ٹکڑے۔

شہر کا لینن والگا کے کنارے بارش ہو رہی ہے۔اس روسی سیاح کا شہر ہے جو سولھویں صدی میں ہندوستان آیا تھا۔اس کا مجسمہ دریا کے کنارے بارش میں بھیگ رہا ہے۔

ایک اور دریا کے کنارے ایک خوابیدہ پکچریسک شہر تورزوک اس میں ایک اور پشکن میوزیم۔ماسکو جاتے ہوئے پشکن اس مکان میں قیام کر کے صاحب خانہ کی لڑکی سے فلرٹ کرتا تھا۔ایک کمرہ میں وہ کنگھا تک موجود ہے جس سے پشکن کی گاڑی کے گھوڑے کی ایال سنواری جاتی تھی۔یہاں میر و غالب کے مکان تک مٹ گئے۔

شمالی روس کا علاقہ ایک سلاونورڈک پرستان ہے۔کوچ کے ذریعے ایک ہزار میل کی سیاحت کر کے واپس ماسکو۔کریملن کے ہال آف کانگریس میں بیلے کے پروگرام۔کٹھ پتلیوں کے تھیٹر۔ریڈیو اسٹیشن۔سنیما۔ماسکو کی مانوس معمولات واپس ہوٹل روسیہ میں وجئے تندلکر

(پشکن فیسٹیول کے لیے نہیں گئے تھے) مجھ سے کہتے ہیں ایک طالب علم تاشقند سے آیا ہے۔ آپ کو پوچھتا تھا۔ شام کو اس کا فون آیا سلیس بامحاورہ اردو بول رہا تھا۔ ''میں شہرت عظیموف ہوں۔ آپ کے ناولوں پر ـــــ ''

''پی ایچ ڈی ـــــ؟'' میں نے اس کی بات پوری کی ''میاں اور کوئی معقول کام کرو۔'' میں نے اسے بھی سمجھایا۔

شام کو وہ از بک بچہ ملنے آیا۔ بڑی مشکل سے اس نے میری کتابیں لاہور سے حاصل کی تھیں۔ سفینۂ غم دل کہیں سے مستعار لے کر ایک ایک صفحہ کی فوٹو کاپی بنائی تھی اور نہایت انہماک سے اس کے مطالعے میں مصروف تھا۔ کبھی ہندوستان نہیں آیا تھا مگر نہایت صاف اردو بولتا تھا۔

رائیٹرز یونین کلب میں ٹی وی کیمرہ والوں کی یلغار سے نکل کر طعام خانے میں گئی جہاں ایرا منتظر تھی۔ ایرا جسے اپنی صورت شکل کے لحاظ سے ایک بیلرینا ہونا چاہیے تھا۔ ایک انتہائی پرخلوص لڑکی تھی اور شدید حس مزاح کی مالک۔ ہال میں الوداعی لنچ شروع ہونے والا تھا۔ اپنی اپنی پلیٹیں لے کر ہم لوگ بالکنی میں جا بیٹھے جہاں سے فری میسن حضرات نیچے ادا کی جانے والی پراسرار رسوم دیکھتے ہوں گے۔ نیچے ایک کونے میں عبدالرزاق عالم خوشی میں ایگور سے مصروف گفتگو تھے۔ یہ ذہین اور بشاش ترجمان لوگ اتنے دن ساتھ رہ کر ہمزاد سے بن جاتے ہیں۔ ادا، ایرا، ایگور، بورس۔

باہر بارش میں درختوں کے زرد پھول گر رہے تھے۔ سہانی ہوا چل رہی تھی۔ ایک شرابی ایک درخت کے تنے سے لگا کھڑا ہے۔ عبدالرزاق اور ایگور باہر نکلے اور مارچ کرتے کسی طرف کو چلے گئے۔ نزدیک میں میوزک کنزرویٹری کا پھاٹک کھلا دو نوعمر لڑکے وائلن کا کیس سنبھالے باہر نکلے بارش ہوتی رہی۔

''نوو گراڈ میوزیم میں تمھارے قدیم ترین اجداد کی باقیات اور ان کے گاؤں اور جھونپڑوں کے موڈل دیکھ کر آئی ہوں۔'' میں نے شام کو نتاشا اور سلادا سے کہا۔ وہ میرے کمرے میں دریچے کے پاس بیٹھے تھے۔ ماسکو دریا بہہ رہا تھا۔ دور دور تک ہزاروں میل کی وسعت پر

پائین کے جنگل سائیں سائیں کر رہے تھے جیولوجیکل وقت کے مقابلے میں انسان تہذیب کا اتنا مختصر وقفہ اور انسان کی اتنی زبردست ترقی — اور انسان کی یہ حیرت انگیز ہمت اور سخت کوشی۔ ناقابل یقین ہوتی اگر ہم خود انسان نہ ہوتے۔

کینیڈین شاعر اس کی بیوی اور بیٹی۔ عراق شاعر عبدالرزاق، وہ داغستانی ادیب جو روسی فیڈریشن کی شاہراہوں پر کوچ میں بیٹھے بیٹھے جب بھی مجھے یا عبدالرزاق کو دیکھتا الحمد شریف پڑھنے لگتا۔ شاید یہ بتانے کے لیے اتنی عربی تو اسے بھی آتی ہے۔ ہم لوگوں نے اس کا نام ''داغستانی ملا کا بیٹا'' رکھ لیا تھا۔ ترک شاعر، ایتھوپین طالب علم، بور افغان، امریکہ پلٹ روسی شاعرہ، تاجکستانی شاعرہ، گل رخسار صفیوا، جگ سانپر ل کے مختلف ٹکڑے ان سے تصویر بنتی ہے۔

روانگی کی صبح ہوٹل کے فوائر میں شہرت عظیموف تحائف اور لالہ کا گچھا سنبھالے اور ایرپورٹ پر ایرا کی آخری جھلک سموری ٹوپی پہنے لالہ کا گچھا سنبھالے۔ اللہ حافظ۔

اچھا لینن حافظ۔

نوٹ: مکتبہ اردو ادب، لاہور نے اسے کتابی صورت میں شائع کیا تھا لیکن اس میں سنہ درج نہیں ہے۔ نہ ہی کسی رسالے میں شائع ہونے کا سراغ مل سکا۔

آئینہ جہاں برصغیر کی ممتاز اور منفرد فکشن نگار قرۃ العین حیدر کی کلیات ہے۔ قرۃ العین حیدر نے اپنا افسانوی سفر 1943 سے شروع کیا۔ جو ان کے انتقال تک جاری رہا۔ اس دوران انھوں نے تقریباً 75 افسانے لکھے جو ان کے پانچ افسانوی مجموعوں میں شامل ہیں۔ پانچ ناولٹ، نو ناول اور گیارہ رپورتاژ تحریر کیے۔ ان کے علاوہ درجنوں مضامین، خاکے، بچوں کی کہانیاں اور دوسری زبانوں سے تراجم کیے۔ پوری زندگی صحافت میں گزاری (پرنٹ میڈیا اور الکٹرونک میڈیا) درجنوں دستاویزی فلمیں بنائیں۔ مصوری اور موسیقی کا بھی بے حد شوق تھا۔ درجنوں پینٹنگ بنائی لندن اور ہندوستان میں نمائش بھی ہوئی۔ انگریزی میں سیکڑوں صحافتی مضامین لکھے انٹرویوز اور فلم ریویو کیے، اردو ادیبوں کو انگریزی میں ترجمہ کیا۔ خود درجنوں انٹرویو دیے۔ محقق کا فریضہ بھی انجام دیا اور کئی کتابیں مدون کیں۔ یہ کلیات ایک عہد ساز ادیبہ کے کارناموں کو مجتمع کرنے کی ایک محققانہ کوشش ہے۔ حکومت ہند نے ان کی علمی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ''پدم شری'' اور ''پدم بھوشن'' جیسے انعامات سے سرفراز کیا تھا۔ اس جلد میں ان کے رپورتاژ ہیں۔

کتاب کے مرتب ڈاکٹر جمیل اختر اردو کے معروف ادیب، محقق، مصنف اور نقاد ہیں۔ فکشن کی تحقیق ان کا خصوصی میدان ہے۔ قرۃ العین حیدر کی کلیات اسی تحقیقی سلسلے کی ایک کڑی ہے اس سے قبل بلونت سنگھ کی کلیات آٹھ جلدوں میں شائع ہوچکی ہیں عصمت چغتائی، بلونت سنگھ اور قرۃ العین حیدر کا نیا افسانوی مجموعہ بھی ان کا تحقیقی کارنامہ ہے۔ اشاریہ آج کل کی تدوین کے ذریعے اردو میں اشاریہ سازی کو ایک تحریک کی شکل دی۔ زندگی نامہ قرۃ العین حیدر اور گوپی چند نارنگ ان کے علمی کمالات کے نئے زاویے کو پیش کرتے ہیں۔ ان کے ادبی کارناموں کی داستان بہت طویل ہے۔ اب تک مختلف موضوعات پر ان کی چالیس سے زائد کتابیں قومی اور بین الاقوامی اداروں سے شائع ہوچکی ہیں جن میں چار کتابیں آکسفورڈ پریس سے بھی شائع ہوئی ہیں اور انھیں کئی ادبی ایوارڈز بھی مل چکے ہیں۔

ISBN: 978-93-5160-123-4
9 789351 601234
HCPUL
New Delhi
₹ 182/-

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
فروغ اردو بھون، ایف سی، 33/9،
انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولا، نئی دہلی۔ 110025